# اسلامی معاشیات

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ،
اسلام کے معاشی نظام کا ایک تحقیقی مرقع، روئے زمین کے مسلمانوں
کے قلوب کی پکار کا بروقت جواب۔ مولینا گیلانی کا مجتہدانہ کارنامہ،
قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس
کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں

سید مناظر احسن الگیلانی



ناشران

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

بندر روڈ، کراچی — حیدرآباد

قیمت [redacted] مجلد

# اسلامی معاشیات

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ

اسلام کے معاشی نظام کا ایک تحقیقی مرقع، روئے زمین کے مسلمانوں

کے قلوب کی پکار کا بروقت جواب۔ مولینا گیلانی کا مجتہدانہ کارنامہ

قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس

کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں


## سید مناظر احسن الگیلانی



ناشران

## شیخ شوکت علی اینڈ سنز

بندر روڈ، کراچی — حیدرآباد

قیمت [redacted] مجلد

---

بلقیس اقبال اہلیہ شیخ شوکت علی مرحوم نے
میسرز شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب
کشمیری بازار لاہور سے
دائمی حقوق طباعت و اشاعت
حاصل کر کے شائع کیا

---

طبع اوّل :- ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن
سنہ ۱۹۴۷ء

طبع دوم :- جنوری سنہ ۱۹۶۲ء

ضخامت :- ۵۷۶ صفحات

قیمت :- 40/
[redacted] روپے

قیمت جلد چرمی :- [redacted] روپے

# فہرست

## باب اوّل

### اسلامی معاشیات

## باب دوم



ختم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فاتحۃ الکتاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

"اسلامی معاشیات" کے نام سے وہی کتاب آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے جس کے متفرق ابواب مختلف مقالوں کی شکل میں ہندوستان کے بعض علمی مجلات (معارف اعظم گڈھ، سیاست حیدرآباد دکن وغیرہ میں) بھی شائع ہو چکے ہیں۔

بجز چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر رسالے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اُردو ہی نہیں بلکہ عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی ہے، گویا یہ ایک بالکل نئی راہ تھی جس پر چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔

بظاہر مضمون کی ندرت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ عموماً اہل علم و نظر کی طرف سے مقالات کے اس سلسلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ قدیم و جدید دونوں حلقوں سے مصنف کی کافی ہمت افزائیاں ہوئیں بلکہ ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی ہمت انہی غیر معمولی قدر افزائیوں نے پیدا کی۔

جن مسائل و مباحث کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں تو یہ ساری چیزیں کتابوں ہی میں ہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات کے بحر محیط سے ان ہی موتیوں کا چننا اور چن کر اس طریقہ سے ان کو مرتب کرنا کہ انسانی معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اسلام کا بھی ایک مستقل معاشی نظام لوگوں کے سامنے آجائے، بظاہر آسان نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ باوجود اس کوشش کے جو اس راہ کی پہلی اور ابتدائی کوشش ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ ابھی اس کی دشواریاں باقی ہیں اور بہت زیادہ باقی ہیں۔ صحیح معنوں میں وہی آدمی اس راہ میں کامیاب ہو سکتا ہے جو ایک طرف فنی طور پر عصر حاضر کے جدید علم (معاشیات) کا ماہر حکیم ہو اور دوسری طرف اسلامی حقائق و مسائل کے حقیقی سرچشموں تک اس کی رسائی ہو۔ قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں ائمہ اسلام نے "اسلامی آئین" کو جس شکل میں مرتب کیا ہے، براہ راست ان کے مطالعہ کا اس کو موقع ملا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ تعلیمی نظام کی خرابی اب تک اس قسم کی جامع قابلیت رکھنے والوں کی پیدائش میں شدید رکاوٹ کی شکل اختیار

کئے ہوئے ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات پہلا علمی ادارہ ہے۔ جس میں اس تعلیمی مافات کی تلافی کی کوشش ایک حد تک کی گئی ہے اور جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کی طرف قدم اُٹھایا جارہا ہے گرچہ رفتار جیسی کہ چاہیئے۔ بوجوہ مختلف تیز نہیں ہے۔

تاہم مستقبل میں کچھ توقع کی جاسکتی ہے تو اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد ہی سے کی جاسکتی ہے سچ پوچھیئے تو جس بری بھلی ناقص اور ادھوری شکل میں یہ کتاب بھی جو مرتب ہوسکی ہے وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبۂ دینیات کے تعلیمی ماحول ہی کا یہ نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے متفرق ابواب جس وقت شائع ہونے کے لئے پریس میں دیئے گئے تھے، اس وقت بھی میں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ شعبۂ دینیات کے ایم۔ اے میں ایک اُمیدوار (برادر عزیز مولوی محمد یوسف الدین ایم۔ اے سلمہٗ) نے اپنے امتحانی مقالہ کا عنوان اسی مضمون کو قرار دیا تھا۔ اور ان کے اصرار سے خاکسار نے ان کی اس مہم کی نگرانی کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ میری یہی نگرانی بن گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ برادر موصوف نے نہ صرف ایم۔ اے کے امتحانی مقالہ کے تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی، بلکہ ایم۔ اے پاس ہوجانے کے بعد لگے ہاتھ مجلس تحقیقات علمیہ (ریسرچ بورڈ) کی زیر نگرانی اسی موضوع پر ڈاکٹریت کے لئے بھی مقالہ تیار کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔ شعبۂ معاشیات کے صدر استاد جلیل ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی خصوصی امداد اور تھوڑی بہت خاکسار کی راہ نمائی میں انھوں نے "اسلام کے معاشی نظریئے" کے عنوان سے دو ضخیم جلدوں میں ڈاکٹریت کے اس مقالے کو مرتب کرکے مجلس کے سامنے پیش بھی کردیا ہے۔ عنقریب اس کا نتیجہ بھی شائع ہو جائے گا ایک طرف تو اس سلسلے میں ان کا یہ کام مکمل ہوگیا اور دوسری طرف خاکسار کو بھی اس راہ میں جو چیزیں ملیں وہ اس کتاب کی شکل میں پیش ہورہی ہیں۔ پس ڈاکٹریت کا وہ مقالہ جو برادر موصوف نے مرتب کیا ہے اور خاکسار کی یہ کتاب، دونوں کے دونوں کام شعبۂ دینیات ہی کے خصوصی نظام تعلیم ہی کے ثمرات قرار پاسکتے ہیں۔ گویا ان دونوں کاموں کی راہ سے اردو زبان میں ایک قطعی جدید علم کا جدید سرمایہ اور اس سرمایہ کافی ذخیرہ انشاءاللہ مہیا ہوجائے گا اور یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ آئندہ اس راہ پر کام کرنیوالوں

کے لئے شعبۂ دینیات اور اس کے ماحول کی یہ خدمت ایک اچھے مقدمہ کا کام دے گی۔

اس موقع پر اس کا اظہار بھی غالبًا نامناسب نہ ہوگا کہ گو کہنے کی حد تک تو یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع پر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ افادہ کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کام بجائے خود اپنی ایک مستقل رکھتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشیات کا مطالعہ کرنے والے ان میں سے کسی ایک کتاب کو دیکھکر دوسرے کے مطالعہ سے بے نیاز اور مستغنی نہیں ہو سکتے۔ برادر موصوف کے سامنے تو ان کے ممتحنین ہیں، لیکن خاکسار نے جن لوگوں کو پیش نظر رکھکر کام کیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کچھ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصًا اس کتاب کے جن ابواب کو مقالوں کی شکل میں اب تک شائع نہیں کرایا گیا تھا۔ اور ان کی ضخامت بھی کافی ہے۔ ان ابواب میں نہ صرف اسلام کے معاشی نظام کے بعض اساسی کلیات ہی ملیں گے بلکہ قرآنی آیتوں کے ایک بڑے حصہ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی دفعہ اس کی تفسیر اور ان کے مطالب کے متعین کرنے کی اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ روزمرہ ہم قرآن کی جن آیتوں کی سرسری طور پر تلاوت کرتے ہیں غور کرنے کے بعد ان میں کیسے عجیب و غریب حقائق و اسرار پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ فقیر کے نزدیک کتاب کا یہ حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے...

ناظرین سے اُمید ہے کہ ذرا تھم کر توجہ کے ساتھ کتاب کے اس حصہ کا مطالعہ فرمائیں گے، گویا یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ فنی حیثیت سے علماءِ معاشیات کی نگاہوں میں خواہ یہ کتاب اہمیت حاصل کرے یا نہ کرے لیکن قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو انشاء اللہ اس کتاب کے ذریعہ سے بعض ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جو اس کے سوا شاید اور کہیں نہیں ملیں گی۔ اور قرآن کے ایک خادم سے سچ پوچھیے تو اسی قسم کی خدمات کی صحیح توقع کرنی چاہیئے۔ معاشیات زیر التعلیمی مضمون ہے اور مجھے اقرار کرنا چاہیئے کہ اس فن کے مطالعہ کا بھی تھوڑا بہت موقع اگر مجھے کچھ ملا ہے تو[1] اس کی حیثیت بالکل ایک سرسری اور ابتدائی مطالعہ کی ہے اور وہ بھی دار الترجمہ سرکارِ عالی کا صدقہ ہے

---

[1] علاوہ دار الترجمہ سرکاری کی کتابوں کے پروفیسر الیاس برنی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی بعض کتابوں اور مقالات کے پڑھنے کا بھی موقع اس سلسلے میں مجھے ملا ہے۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اپنے برادر اصغر مولوی سید مناظر احسن گیلانی ایم۔ اے لکچرار معاشیات کلیہ چادر گھاٹ حیدر آباد دکن کا ذکر بھی اس لئے ضروری ہے کہ انہی کے اطمینان دلانے کے بعد مجھے اپنے بعض خصوصی نظریات کے اظہار کی جرأت ہوئی۔ فاللّٰہم متعہ بطول حیاتہ واید

گراس کی بعض ترجمہ کرائی ہوئی کتابوں تک میری رسائی ہو سکتی تھی۔ اور اب اس کا افسوس ہوتا ہے کہ بجائے قدیم طریقہ تعلیم کے اپنی تعلیمی زندگی میں کاش مجھے بھی کسی ایسے ادارہ میں پڑھنے کا موقع ملتا۔ جیسا کہ جامعہ عثمانیہ کا شعبہ دینیات ہے، تو غالباً اس ناقص کام کو زیادہ بہتر اور مکمل شکل میں پیش کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہوتا۔ لیکن بالکلیہ پرانے قدیم نظامی درس کے ایک مستفید کی طرف سے جو کچھ بھی جس صورت میں یہ ہدیہ پیش ہو رہا ہے۔ میری معذوریوں کو سامنے رکھکر کوتاہیوں سے لوگ چشم پوشی کریں گے، یہ ایک رُخ کی بات ہے جو ایک رخی تعلیم کے ایک طالب العلم کی طرف سے پیش ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اسی کو سامنے رکھکر کام کرنے والے اس کام کو بتدریج مکمل کرلیں گے۔ تا اینکہ "معاشیات" کی دنیا میں اسلامی معاشیات" بھی اپنی ایک مستقل جگہ اور صحیح مقام حاصل کرے۔ وان اریدالا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

حق تعالےٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کی راہ کو اس حقیر کام سے درست فرمائے۔ آرزو اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے ؎

دل آزردۂ مارا بہ نسیمے بنواز   یعنی آں جاں زتن رفتہ بہ تن باز رساں

کاش۔ زندۂ اسلام و مردہ مسلمانوں کی زندگی کا پھر اسی طرح سبب بنجائے جیسے کسی زمانہ میں بنا ہوا تھا۔ ہذا والسلام۔

خاکسار

**مناظر احسن گیلانی**

۲۳۔ رمضان المبارک۔ ایک بجے شب مطابق
یکم ستمبر ۱۹۴۵ء جوار الجامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

ڈ

# مقدمہ

از مولانا سید عبد القدوس ہاشمی، مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

ہر طرح کی تعریف و توصیف زیبا ہے صرف ایک ذات پروردگار کے لئے جس نے اس ساری کائنات کو پیدا کیا اور اپنی ربوبیت و رحمت سے ان سب کی احتیاجات پوری کرتا ہے اور لاکھوں صلوٰت و سلام اس نبی برحق پر جس کو انسانیت کا معلمِ کامل بنا کر بھیجا گیا اور جس نے جینے کا سلیقہ سکھایا۔ اور ان تمام اہلِ ایمان انسانوں پر جنھوں نے اچھی طرح ان کی پیروی کی یا آئندہ پیروی کریں۔

خدائے رحمٰن و رحیم اپنی رحمت میں جگہ دے، مولانا سید مناظر حسین گیلانی مرحوم کو، وہ میرے بزرگ تھے، برسوں ہمسایہ رہے، سولہ سال سے زیادہ عرصہ تک میں نے اُن کے علم و فضل سے کسبِ فیض کیا ہے۔ وہ میرے ہموطن بھی تھے اور ہمدرد بھی، جزاہ اللہ عنی خیرَ الجزاء مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ دینیات میں رئیسُ الاساتذہ کی حیثیت سے جہاں بہت سے تشنگانِ علوم کو سیراب فرمایا، وہاں عام لوگوں کو بھی اپنے علم و فضل کے فیض سے محروم نہ رکھا۔ بلکہ تحریر و تقریر کے ذریعہ زندگی بھر فائدہ ہی پہنچاتے رہے۔ اور ان کے قلم نے بہت سی قیمتی تصانیف بھی ہمیں عطا کیں جو مقبول و معروف ہیں۔ ان تصانیف میں سے ایک مشہور تصنیف ہے "اسلامی معاشیات" مولانا نے اس کتاب میں دین اسلام کی عطا کردہ ان ہدایات کا ذکر فرمایا ہے جن کا تعلق انسان کی معاشی زندگی سے ہے۔ مولانا ایک عالم دینیات تھے، آج کے متعارف معنوں میں جدید فنِ معاشیات کے ماہر نہ تھے، اس لئے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ اس کتاب کی ترتیب معاشیات کی درسی کتابوں کے قاعدہ پر صرف دولت، پیدائش دولت، تبادلہ اور مالیاتِ عامہ کے مقررہ ابواب پر ہو گی لیکن اس کے باوجود مطالعہ کرنے والوں کو اس کتاب میں ایسی بہت سی قیمتی معلومات

ایک جگہ مل جائیں گی جن سے مندرجہ بالا چاروں ابواب کی تکمیل ہو سکے۔ اور یہ واضح ہو جائے کہ خداوند تعالےٰ نے اپنے بندوں کو معاشی تگ و دو کے سلسلے میں کیا کیا ہدایتیں عطا فرمائی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ معاشیات اتنا ہی قدیم علم ہے جتنا کہ اس زمین پر انسانی وجود یہ سمجھنا دانائی نہیں ہے کہ آدم اسمتھ سے پہلے یہ فن دنیا میں نہ تھا۔ انسان اپنی ضرویات کا احساس ہمیشہ ہی سے رکھتا تھا۔ اس کی تکمیل کے لئے مختلف قسم کی جدو جہد بھی کرتا ہی رہا ہے ابتدائے عہدِ تمدن ہی سے انسان کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ مختلف اشخاص اور مختلف جماعتوں ہی کے ذریعہ انسانی ضروریات کی تکمیل ممکن ہے۔ کسی فرد کی انفرادی کوشش سے سب کچھ مہیا ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے تبادلہ کا سوال بھی بہت دن ہوئے پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ قواعد و ضوابط بھی ہر تمدن میں موجود تھے معیار تبادلہ یعنے زر بھی بہت دنوں سے موجود ہے۔ جماعتی زندگی اور حکومت بھی بڑی قدیم بات ہو گئی ٹیکس اور مالیاتِ عامہ کے مسائل بھی پیدا ہوتے اور حل کئے جاتے ہی رہے ہیں۔ اب ذرا سوچئے تو کہ معاشیات احتیاج، پیدائش دولت، تبادلہ اور مالیاتِ عامہ پر بحث کے علاوہ اور کسی بحث کا نام ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ تحریر و تدوین میں یہ فن آدم اسمتھ سے پہلے نہیں آیا تھا، کون ہے جسے حضرت امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور امام سرخسی کی ضخیم کتاب المبسوط کی تیس جلدوں میں معاشیات کا علم مدوّن و منضبط نہ نظر آتا ہو۔ اور میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ کچھ مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے جو کتابیں یونانی سُریانی اور چینی وغیرہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں ان میں بھی معاشی مسائل پر بحث کسی نہ کسی قدر ضرور موجود ہے۔ ہاں طرز بیان اور ترتیب بحث ہر زمانہ میں مختلف رہی ہے۔ اور آج بھی قدیم زمانہ کی کتابوں سے مختلف انداز میں اس فن پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

بات اصل یہ ہے کہ انسانی مسرت اور فلاح کا دارومدار دو امور پر ہے۔

(۱) ضروریات زندگی کی تکمیل۔

(۲) خطرات سے مامونیت کا یقین۔

ہو سکتا ہے کہ انسانی ضروریات کو وسیع معانی میں استعمال کر کے آپ ذہنی سکون

اور خطرات سے مامونیت کو بھی عام انسانی ضروریات میں شامل کر لیں۔ لیکن یہ بہر حال ضروری ہے کہ انسان اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو ورنہ مسرت اور فراغ بالی اس سے کوسوں دور ہی رہے گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ انسان کے لئے غذا لباس رہائش جاہ، شہرت، صحت، سب کچھ بدرجۂ اعلیٰ مہیا کر دینے کے بعد بھی آپ اُسے خوش و مسرور نہیں کر سکتے جب تک کہ اس کے قلب میں یہ یقین نہ پیدا کر دیں کہ مستقبل میں وہ تکلیف و مصیبت سے مامون رہیگا۔

ورنہ ایک ایسے شخص کا تصور تو کیجئے جسے ہر قسم کی راحت مہیا کر دینے کے بعد یہ بھی کہدیا گیا ہو کہ دوسرے روز اُسے آگ میں ڈالدیا جائے گا، کیا اس کی رات سکون، اطمینان اور مسرت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جو بہت ہی محفوظ اور ہر طرح مامون ہو مگر نہ پیاس بجھانے کو اُسے پانی میسر آئے اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی، وہ اس مامون و محفوظ جگہ پر کتنی خوشی و مسرت محسوس کرے گا۔ اور کتنی دیر تک ٹھہر سکے گا۔

غرض یہ کہ انسان کی پرُفلاح اور کامیاب و مسرور زندگی کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں، اس کے بعد ہی اس کے ذہن و دماغ کو وہ حقیقی سکون مہیا ہو سکے گا جسے خوشی اور کامرانی کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس دین کے اختیار کرنے کا حکم دیا جس میں ان دونوں باتوں کے حصول کا یقینی ذریعہ اور متعین طریقہ بتایا گیا ہے اور اس طریقۂ زندگی سے اپنی بیزاری کا اظہار فرمایا جس میں ترک دنیا اور رہبانیت کو کمال زندگی اور رہبانیت قرار دیا جاتا تھا۔

**کارآمد مذہب** ہر وہ دین، مذہب یا طریقۂ زندگی جو انسان کو خوشحالی و فراغبالی کے ساتھ مسرور زندگی بسر کرنے کی تعلیم نہ دیتا ہو، انسان کے ناپختہ دماغ کی پیداوار ہے۔ خدا اور خدا کے سچے رسولوں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں؛ چاہے وہ موجودہ پولوسی مسیحت ہو یا سنیاس یوگ، اسی طرح جو مذہب دنیا کملانے میں اصول و اعتدال کی تعلیم نہ دے وہ خدا کا پسندیدہ طریقۂ حیات نہیں چاہے وہ عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی طرف جعل سازی سے منسُوب کر دیا گیا ہو۔ یا حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی طرف، وہ مذہب اور وہ دین ہمارے لئے کس کام کا ہے جو ہماری صبح و شام کی معمولی زندگی کے

ہر مرحلہ پر ہماری رہنمائی نہ کرتا ہو، جو ہمیں یہ نہ بتا سکتا ہو کہ ہم کس طرح زندگی بسر کریں۔ وہ ایک فضول سا مردہ فلسفہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر ایک کارآمد طریقۂ حیات نہیں ہو سکتا۔

اسلام عالم انسانیت کے لیے خدائے بزرگ و برتر کا بھیجا ہوا اور پسند کیا ہوا طریقۂ حیات ہے جس کی عملی تکمیل خود صاحبِ وحی محمد رسول اللہ نے کرکے نمونہ قائم کر دیا اور ان کے صحابہ نے اس نمونہ کے بموجب عمل کر کے دکھا دیا۔ یہ ایک مکمل ضابطہ ہے جس میں انسان کی پوری حیات کے لئے اور ہر ہر مرحلہ کے لئے واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس لئے جہاں اسلام نے عقائد اور عبادات کی تعلیم عطا کی ہے، وہاں معاملات، اور معاشیات کے متعلق بھی واضح احکام دیئے ہیں، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کوئی متعین معاشی نظام موجود نہیں ہے۔ وہ نہ معاشیات کے فن کو سمجھتے ہیں نہ اسلامی احکام سے واقف ہیں، بھلا وہ دین جو قرآن مجید کی بنیادوں پر قائم ہو، معاشی احکام و قوانین سے کیسے خالی ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کی سب سے پہلی آیت میں خدائے بزرگ و برتر کی صرف ایک صفت کا ذکر ہے۔ اور وہ ہے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کیا دنیا کا کوئی ماہر معاشیات بتا سکتا ہے کہ معاشیات خدا کی ربوبیت سے پوری طرح استفادہ اور اس کے قانونِ ربوبیت کی شناخت کے علاوہ کسی اور شے کا نام ہے؟

جدید معاشیات میں عاملین پیدائش چار یا پانچ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ زمین، سرمایہ، محنت، تنظیم، اور (انٹرپرائز) یعنی ہمت و مستعدی، ذرا غور سے دیکھیے کہ ان میں زمین اور محنت کے سوا اور کسی کی کوئی حقیقت بھی ہے؟ سرمایہ پچھلی محنت کی پیداوار ہے تنظیم اور مستعدی "محنت کی ایک قسم" اب یہ حقیقی عامل پیدائش صرف دو رہ گئے، زمین اور محنت معاشیات کا مسلمہ اصول ہے کہ انسان ان دونوں عوامل میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا دونوں عطیۂ رب العالمین ہیں۔ نہ زمین میں ہماری سعی سے کوئی اضافہ ممکن ہے، اور نہ محنت کی وحدتوں میں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ جو شخص جدید معاشیات کی مبادیات سے بھی تھوڑی سی بہت واقفیت رکھتا ہے، اس کے لئے خدا کی ربوبیت سے انکار کی کوئی گنجائش باقی رہجاتی ہے؟ کوئی جاہل انکار کرے تو کرے، لیکن جو شخص جدید معاشیات کو جانتا ہے وہ

اس سے انکار کبھی نہیں کر سکتا۔

**علم معاشیات** معاشیات ایک علم ہے جس میں انسانی احتیاجات اور اس کی تکمیل کے طریقے اور ذرائع سے بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے اس فن میں ابتداءً ... صرفِ دولت، پھر پیدائشِ دولت، اس کے بعد تبادلہء دولت، اور آخر میں جماعتی ضروریات اور اس کے لئے محصول اندازی وغیرہ کی تفصیلات ذہن نشین کرائی جاتی ہیں اسے مالیاتِ عامہ کہا جاتا ہے۔

تعلیم و تفہیم کی غرض سے معاشیات کو تین قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) تشریحی معاشیات، یعنی ڈسکرپٹو اکالوجی

(۲) نظریاتی معاشیات، یعنی اکالونمک تھیوری یا اکالونمک انالیس

(۳) تطبیقی معاشیات، یعنی اپلائڈ اکالوجی

پہلی قسم یعنی تشریحی معاشیات میں کسی مخصوص معاشی موضوع سے متعلق حقائق اور صورتِ حال کی پوری تفصیل و تشریح ایک جگہ جمع کر لی جاتی ہیں۔ مثلاً پاکستان میں صنعت پارچہ بافی سے متعلق سارے تفصیلی حالات اور ضروری اعداد و شمار خام مال کی بہم آوری، تیاری کے مختلف مراحل اور پھر تیار شدہ مال کی کھپت سے متعلق حقیقی معلومات ایک جگہ جمع کر لی جائیں۔

دوسری قسم نظریاتی معاشیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوتا ہے۔ اس میں کیا اصول و ضوابط کارفرما ہوتے ہیں۔ طلب، رسد، بازار، تبادلہ وغیرہ میں کیا کلیات کارفرما ہوتی ہیں، اور وہ کیا معاشی ڈھانچہ ہے جس پر یہ نظام قائم ہے

تیسری قسم تطبیقی معاشیات میں پہلی قسم کے ماتحت مہیا شدہ معلومات پر دوسری قسم کے نظریات و کلیات کی تطبیق کر کے ان کے علل و اسباب کی تلاش کی جاتی ہے مثلاً پہلی قسم کے ماتحت معلومات جمع کی گئیں تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں کپڑے کی پیداوار روز بروز بڑھ رہی ہے، دوسری قسم نے یہ اصول بتائے کہ خام مال کی با آسانی بہم آوری، محنت کی کافی مقدار کا حصول اور طلب کی زیادتی جب یہ تینوں باتیں موجود ہوں اور کوئی وجہ مانع نہ پائی جائے تو کپڑے کے مال کی پیداوار میں روز بروز

اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ تاآنکہ ایک حد پر پہنچکر رسد طلب سے بڑھ جائے۔ تیسری قسم کے ماتحت اسی اصول کو پاکستان میں کپڑے کی پیداوار پر جاری کرکے اس کی زیادتی کے وجوہ و اسباب بیان کیئے جائیں گے۔ اور یہ بتایا جائے گا کہ روئی کافی مقدار میں بہ آسانی ملجاتی ہے محنت کافی مقدار میں اس لئے قابل حصول ہے کہ آبادی کثیر ہے۔ اور عوام محنت کش ہیں۔ طلب میں مقامی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ دوسرے ممالک کی طلب نے بھی اضافہ کردیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ میں اس مختصر سی تحریر میں معاشیات کی ان تینوں اقسام میں سے کسی ایک پر بھی بحث نہیں کرسکتا، اور نہ یہ میرا منصب و مقام ہے۔ حتیٰ کہ صرف دوسری قسم کی بحث چہارگانہ کے لئے بھی ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اور یہ مختصر سا مقدمہ اس کے لئے کافی نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ آپ کو یاد آ جائے کہ معاشیات میں یہ اور اسی قسم کے مباحث پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے ایک کارآمد اور ضروری علم ہے۔ اگر یہ ضروری علم ہے تو اس کے لئے ہمیں مذہب اسلام میں مکمل ہدایات بھی ملتی ہیں یہ نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول انسان کو پہچاننے میں نعوذ باللہ غلطی کرگئے ہیں۔ اور اتنی ضروری ہدایات سے قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور اسلامی فقہ کا یہ عظیم الشان ذخیرہ بالکلیہ خالی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام نے کوئی معاشی لائحہ عمل نہیں دیا ہے یا اسلام میں کوئی متعین نظامِ معیشت موجود نہیں ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، انھیں معاشیات اور اسلامیات دونوں کا مطالعہ گہری نظر سے اور کسی قدر وسعت کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ طرز بیان ہر زمانہ میں بدلتے رہے ہیں۔ اور فقہائے کرام کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا طریقہ اور ان کا طرز بیان آجکل کی کتب معاشیات سے یقیناً مختلف تھا اس لئے مطالعہ کرنے والوں کو تھوڑی سی دقت محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ ان تمام مباحث پر جو آج علم المعیشت میں زیر بحث آتے ہیں ان پر بڑی تفصیلی بحثیں آپ کو اسلامیات خصوصاً فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی۔ اور شاید کوئی ایسی بحث باقی نہ رہے گی جس میں آپ بیان کی تشنگی محسوس کرسکیں۔ آپ کو صرف دولت کی پوری بحث مل جائے گی۔ پیدائش دولت کے عوامل اور محنت و سرمایہ کی بحث ملے گی، تبادلہ دولت، اس کے مختلف طریقے، مقایضہ، زر ثمن

بیع سلم، بیع سلف، حوالہ، ربا، معیار تبادلہ، زر کا پھیلاؤ، احتکار، تقابل وغیرہ، ساری بحثیں ملجاویں گی۔ اسی طرح سے مالیات عامہ میں مالگذاری، راہ داری، طریف، زکوٰۃ، ہنگامی ٹیکس، ملکیت عامہ، ملکیت خاصہ، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے متعلق تفصیلی بحثیں اور واضح ہدایات آپ کو نظر آئیں گی۔

مولانا مناظر حسن گیلانی مرحوم کی زیر نظر کتاب اس سلسلہ مطالعہ میں آپ کے لئے کافی مددگار ثابت ہو گی۔ اس میں بہت سی قیمتی معلومات مولانا مرحوم نے اکٹھی کر دی ہیں جو ہزاروں صفحات کے برسوں مطالعہ کے بغیر مہیا نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی اس موضوع پر دو چار کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں۔ مثلاً مولانا حفظ الرحمٰن کی کتاب اسلام کا اقتصادی نظام، ڈاکٹر یوسف الدین کی کتاب، اسلام کے معاشی نظریئے (دو جلدیں) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب، معاشی مسئلہ کا اسلامی حل۔ اردو ادب میں بے مثال کتاب اپنی علمی اور تحقیقی معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ پاکستان کی ہر یونیورسٹی اس کتاب کے پڑھنے کی اپنے طلباء سے سفارش کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اسلامی معاشیات

## عاملین پیدائش اور اسلام

"اسلامی معاشیات" جو میری اس کتاب کا عنوانِ بحث ہے۔ قبل تفصیلی مباحث کے، میں چاہتا ہوں کہ پہلے معاشی سہولتوں کے ذرائع یا عاملینِ پیدائش FACTORS OF PRODUCTION اور ان سے استفادہ کے متعلق اسلام کا جو نقطۂ نظر ہے اس پر ایک اجمالی تبصرہ اسلامی وثائق و مستندات کی روشنی میں کروں، آئندہ مباحث کے سمجھنے میں انشاءاللہ تعالیٰ اس سے بڑی مدد ملے گی۔

## معاشی وسائل کی نشان دہی انسان کے اندر اور باہر

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جن بے پناہ تسخیری قوتوں کا پتہ قرآن نے اپنے مشہور مسئلہ خلافت میں دیا ہے اور ان قوتوں کی بنا پر آدمی سے باہر صرف زمین ہی نہیں، بلکہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ سب کی پیداواروں پر

رِزْقًا لِّلْعِبَادِ (ق 6/1) روزی بندوں کیلئے ہے

کی قدرتی مہر لگا کر نسلِ انسانی کے رزقی اور معاشی نظام میں جو غیر محدود فراخی اور بے انتہا کشادگی پیدا کی ہے اگر اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شیخ سعدیؒ کی مشہور تعبیر ؎

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

### عالم کا نظام "نانے بکف آری" کا نظام ہے

کی بنیاد پر یہ کہنا مبالغے سے خالی ہو گا کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کائنات کا یہ سارا نظام "نانے بکف آری" کا نظام ہے۔ یعنی قدرت نے اس نظام کو اسی لئے قائم فرمایا ہے "تاکہ اپنی معاشی سہولتوں کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ آدمی اس سے استفادہ کرے نفع اٹھائے، پھر نانے بکف آری کے اس مہیب اور عظیم کارخانے کو قرآن کا انسان کے سامنے رکھنا اور

زمین کے اندر قوتی (غذائی) مواد کا جو ذخیرہ محفوظ کیا گیا ہے اس کی طرف

وقدر فیہا اقواتہا — ناپ تول کر رکھ دیئے اقوات (غذائی

(حم سجدہ ع ۱) — ذخیرے) اس کے (یعنی زمین کے) اندر

کے الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے

سواءً للسائلین۔ — برابر ہے تلاش و جستجو کرنے والوں کیلئے

کا صلائے عام اور ان تمام معاشی پیداواروں کو "فضل اللہ" کے احترامی نام سے موسوم کر کے جد و جہد کی توانائیوں کو

وابتغوا من فضل اللہ (الجمعہ ع ۲) — اور ڈھونڈو اللہ کے فضل کو

**مرد و عورت کا معاشی میدان میں مساوی حصّہ**

کے تشریعی حکم سے بیدار کرنا اور اس قید کے ساتھ بیدار کرنا

للرّجال نصیب ممّا اکتسبوا وللنّساء نصیب ممّا اکتسبن (النساء ع ۵)

مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں اور عورتوں کیلئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں!

تا کہ ایک طرف تو یہ معلوم ہو کہ ان معاشی ذرائع سے استفادہ کا حق نسلِ انسانی کی کسی خاص صنف کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے یہ میدان کھلا ہوا ہے اور دوسری طرف لوگوں کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن کا مشہور قدرتی قانون

**اُجرت بمقدارِ محنت**

لیس للانسان الا ماسعیٰ — نہیں ہے آدمی کیلئے مگر وہی جو اس نے کمایا اور

وان سعیہ سوف یریٰ (النجم ع ۳) — قریب ہے کہ دکھلائی دے اسے اپنی کمائی۔

کا تعلق جس طرح اخروی معاملات اور نتائج سے ہے۔ اسی طرح یہ قانون دُنیاوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے، جیسے معادی زندگی میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہو گا جو اس نے کمایا ہے اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہو گی۔ یوں ہی معاشی زندگی میں ہر ایک کا نصیب اور حصّہ اس کی محنت اور مشقت و کاوش کی مناسبت ہی پر مبنی ہے۔ وہ جتنی محنت و جانفشانی کرتا ہے۔ اسی حساب سے وہ حصّہ بھی پاتا ہے ــ پھر

**سرمایہ اور قرآن**

سورۃ النسار کی آیت

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی — اور نہ حوالہ کرو کم عقلوں کو اپنے اموال وہی

جعل اللہ لکم قیاما۔ — جسے بنایا ہے اللہ نے تمہارے لئے سہارا

"اموال" یا "سرمایہ" اور اصل ہی کو انسان کے معاشی نظام کے قیام و بقا کا ضامن ٹھہرانا اور اس میں محتاط

رہنے کی تاکید فرمائی، اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کے قصّے میں

**محنت اور قرآن**

ان خیر من استاجرت — یقیناً جسے تو نوکر رکھے۔ اس میں اچھا وہ ہے

القوی الامین (القصص ع۳) — جو قوت والا ہو، اور امانت والا۔

**محنت کی اساسی شرط** کے الفاظ سے جسمانی محنت و مزدوری کی بنیاد کو دو لفظوں "القوی" اور "الامین" کے ذریعے ظاہر کرنا یعنی اس قسم کے کاروبار کیلئے جس کی سرانجامی میں دماغ سے زیادہ ہاتھ پاؤں کی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ توجہ دلائی جاتی ہے کہ صحیح نتائج کی اُمید اسی وقت لگائی جاسکتی ہے۔ جب کام کرنے والے جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ اپنے فرض اور خدمت کی بجاآوری میں خیانت اور بددیانتی سے کام نہ لیں، بلکہ "الامین" ہوں۔

**تنظیم اور قرآن** | پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصّے میں بادشاہِ مصر سے اُن کی گفتگو، اس گفتگو میں حضرت یوسف علیہ السلام کا تنظیمی کاروبار کے سلسلے میں یہ فرمانا کہ

اجعلنی علی خزائن الارض انی — مقرر کر مجھے زمین کی پیداوار (وں) پر، میں

حفیظ علیم (سورہ یوسف ع۶) — نگرانی کرنے والا اور علم والا ہوں۔

**تنظیمی کاروبار کے ضروری شرائط** | یعنی زمین کی پیداوار اور (خزائن الارض) کے نظم و ترتیب اور بندوبست کے لئے جب حضرت نے اپنے آپ کو پیش کیا، تو اس وقت تنظیمی کاروبار کیلئے جن صفات کی ضرورت ہے ان کو بھی دو لفظوں (حفیظ و علیم) کی شکل میں ظاہر فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے کام میں ایک تو حفظ (یعنی حفاظت و نگرانی، دیکھ بھال کا سلیقہ ناگزیر ہے) دوسرے علیم (یعنی نظم کرنیوالے کی معلومات کو وسیع ہونا چاہئے) گویا جسمانی طاقت سے زیادہ اس سلسلہ میں دماغی اور ذہنی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ بظاہر قرآن کے یہ چند اشارے ہیں، مگر میرے خیال میں یہ ایسے اشارے ہیں کہ غالباً غور کرنے والے ان میں وہ سب کچھ پاسکتے ہیں جو معاشیات کی کتابوں میں آج ہزار ہا ہزار اوراق کے اندر بھی عاملین پیدائش (FACTOR OF PRODUCTION) یعنی زمین، سرمایہ، محنت، تنظیم کے متعلق بشکل مل سکتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ علماء معاشیات جن نتائج تک سالہا سال کی فکر و نظر، تحقیق و تجسّس کے بعد پہنچے ہیں۔ قرآن نے چند الفاظ میں ان آخری نتائج کو اشاروں اشاروں میں بیان کر دیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اپنی اپنی جگہ ان ہی امور کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے تفصیلی بحث کی جائے گی۔ اس وقت ان کے ذکر سے مقصد صرف اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو عام طور پر اسلام کے متعلق بھی بعض قلوب میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مذہب، اور دین کے غلط نام سے مختلف اقوام عالم کے اندر جو معاشی گریز، اور رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ خیال کر لیا گیا ہے کہ اسلام بھی چونکہ مذہب ہے۔ اس لئے معاشی

مسائل کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی وہی ہوگا۔ حالانکہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ مگر گذشتہ بالا چند سطروں میں جو کچھ بھی کہا جا چکا ہے کیا ان کو دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے کوئی اپنے اندر اس وسوسہ کی گنجائش پاسکتا ہے کہ

## مغرب کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ میلانات

مغرب کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ میلانات کیلئے اسلام میں کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ "جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے سب کچھ تمہارا ہے" اسی لئے ہے کہ جس حد تک اپنی احتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔

اسلام کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے دوام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام کو کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہو سکتی ہے۔ جس میں غریب انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس میں کچھ بھی تمہارا نہیں ہے۔ انسانیت کا کمالی ارتقا اسی گریز اور فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو ان امور کے متعلق اختیار کیا جائے۔ حتیٰ کہ اسی بنا پر صرف سُنا نہیں گیا ہے۔ بلکہ دیکھا جا رہا ہے کہ کتنوں کے بدن سے کپڑے اتروائے گئے۔ الن کے مُنہ سے لقمے چھینے گئے۔ ان پر پانی بند کیا گیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس جنون نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ اسی آدمی کو جو ہوا کے بغیر عام فطری حالت میں غالباً چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی بیچارے کو "حبس دم" وغیرہ کے نام سے ہوا میں سانس لینے کے حق تک سے محروم کیا گیا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہوا، پانی، کھانا وغیرہ تو خیر بڑی چیزیں ہیں۔ معاشی ضرورت کے لحاظ سے جن کا درجہ ان سے برتر ہے۔ مثلاً الذہب (سونا) الفضہ (چاندی) کے القناطیر المقنطرہ (ڈھیر کے ڈھیر) الخیل المسومۃ (نشان زدہ گھوڑے) الانعام (مویشیاں) الحرث (کھیتی)، وغیرہ چیزوں تک کے متعلق جو قرآن

| | |
|---|---|
| زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوَاتِ | سنواری گئی ہے آدمی کیلئے خواہشوں کی چاہ یعنی |
| مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ | عورتوں کی اور بیٹیوں کی، ڈھیروں ڈھیر سونے |
| الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ | اور چاندی کی، خوبصورت گھوڑوں کی اور مویشیوں |
| الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (آل عمران ۳) | اور کھیتیوں کی۔ |

کا اعلان کرتا ہو۔ یعنی مدعی ہو کہ جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے۔ اُسی نے آدمی کی جبلت میں ان امور کی گوارائی پیدائشی طور پر پیدا کی ہے۔ جیسا کہ لفظ "زُیِّنَ" کے مجہول صیغہ کا اقتضا ہے۔ یعنی ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حبّ و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو ان امور کے میلان اور حُب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور جو آدمی کی فطرت سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ واقعہ یہی ہے اور ان امور کو تو کسی نہ کسی حد تک ضروریاتِ معاشی میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے لیکن قرآن تو صاف صاف لفظوں میں مالابدمنہ (NECESSARIES) ضروریات سے گذر کر آسائش و راحت

رفاہیت وزینت وغیرہ کے ساز وسامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتویٰ ہی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ "زینت اللہ" اور "الطیبات من الرزق" (LUXURY) کے استعمال سے گریز کرنے والوں کو اس عتابی استفہام

قل من حرم زینۃ اللہ التی — بولئے کس نے حرام کی ہے اللہ کی آرائش

اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق — کو، جسے اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا

(الاعراف ع ۴ پ ۸) — اور صاف ستھری روزی کو!

**دنیاوی نعمتوں کی نفرت اُخروی نعمتوں کی نفرت کا مقدمہ ہے**

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتوں سے "الحیواۃ الدنیا" اور اس معاشی زندگی میں ان سے بھاگ بھاگ کر اپنے اندر عادتی چڑ اور کراہت پیدا کرلیں گے۔ ان کے کراہت زدہ قلوب پر اخروی نعمتوں کی قدر وقیمت کا کتنا وزن باقی رہ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام تک کو

**خود پیغمبرؐ سے سوال**

یا ایہا النبی لم تحرم — اے نبی! کیوں حرام کرتے ہیں آپ اس

ما احل اللہ لک (التحریم ۲۸) — چیز کو جسے حلال کیا ہے اللہ نے آپ کیلئے

کے الفاظ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا۔ جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ "روحانیت" کے بلند سے بلند مقام تک میں ان چیزوں سے گریز، جنہیں قدرت نے معاشی استفادہ کیلئے پیدا کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مفید تر کیا ہوگا بلکہ باعثِ ضرر ہی ہو سکتا ہے۔ علامہ ابوبکر بن الجصاص اس بنیاد پر فرماتے ہیں۔

ان لا فضیلۃ فی امتناع — جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ حلال فرما چکا ہے ان کے کھانے سے

اکلہا (ص ۴۵۲ جلد ۳) — پرہیز کرنے میں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

**روحانیت کی اخروی منزل بھی معاشی ترقیوں کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے**

اور سچ تو یہ ہے کہ جب شاہی[1] ساز وسامان کو بھی قرآن انسانیت کے ارتقاء کی آخری منزل یعنی "نبوت" کے منافی نہیں خیال کرتا باوجود پیغمبر اور خدا کے رسول ہونے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات میں شیش محل، عرش

---

[1] یورپ زدوں کا ایک گروہ، جسے اپنی یورپ زدگی کا احساس بھی نہیں ہے۔ کچھ مدت سے اس قسم کے خیالات پھیلا رہا ہے کہ بادشاہی یا ملوکیت کا اسلام سخت مخالف ہے اور اسی لئے تیس سال عہدِ خلافت راشدہ کے بعد اس کا خیال ہے کہ تیرہ سو سال تک محمد رسول اللہؐ کی اُمت اپنے پیغمبر کی باغی رہی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں بہت ناکام رہی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تیرہ سو سال کے مقابلے میں تیس سال کی وہ بھی بمشکل کامیابی کیا کامیابی قرار پا سکتی ہے۔ لیکن وہ قرآن کے سلیمانی قصص کا کیا جواب دیتے ہیں (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

وتخت وکرسی، محاریب وتماثیل، قدور راسیات (بڑی بڑی دیگیں) صافنات الجیاد (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بنّاء (معمار) غوّاص (غوطہ زن) جنود (افواج) سب ہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور ان تمام امور کو قرب الٰہی کے مقاماتِ عالیہ کے منافی نہیں قرار دیتا۔ تو مجھے ان پر تعجب نہیں ہے جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ حیرت ان پر ہے جو یہ جاننے کے باوجود کہ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔ اس بدیہی دعویٰ کو نظری قرار دے کر اس کے ثبوت میں بلاوجہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور بعض کمزور یا ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے گویا باور کراتے ہیں، کہ خدانخواستہ اگر یہ چند روایتیں نہ ہوتیں تو اعتراض کرنے والوں کا گویا اعتراض باقی رہ جاتا۔ میرے خیال میں تو "اسلام رہبانیت نہیں ہے"۔ اس کو دعویٰ قرار دے کر دلیل پیش کرنے کی زحمت اٹھانی ایسی بات ہے جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ روشنی تاریکی نہیں ہے۔ اور اس پر استدلال کے لئے بھی تیار ہو جائے۔ ایسوں کیلئے جو اسلام کی طرف رہبانیت کو کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال کی تردید کے لئے قرآن کو جہاں سے بھی کھول کر دکھایا جائے گا، غالباً یہ کافی ہو سکتا ہے۔ جس کتاب کی جوہری تعلیم ہی اس پر مبنی ہو کہ قدرت نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے انسان ہی کیلئے پیدا کیا ہے اور اس نظریہ کو مختلف پیرایہ میں بار بار، ہر تھوڑی دیر کے بعد دہرایا گیا ہو۔ اس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی "معاش گریز" خیال کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے؟ اگر اس کا ارادہ کیا جائے کہ قرآن نے تفصیلاً کن کن چیزوں کے افادی پہلوؤں سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارا ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کو نقل کرنا پڑے گا۔ برّ و بحر و شجر و حجر سفلیات وعلویات میں آخر ایسی کونسی اہم چیز ہے جس کے افادی پہلوؤں کی طرف قرآن نے صراحتاً یا کنایۃً اشارہ نہیں کیا ہے۔ انسان ان چیزوں سے اپنی معاشی سہولتوں کے حصول میں جن جن طریقوں سے کام لیتا رہا ہے اور لے رہا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو قرآن باوجودیکہ کوئی خالص معاشی کتاب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ان طریقوں کی طویل فہرست قرآنی آیات کی روشنی میں بہ آسانی مرتب ہو سکتی ہے۔ مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، شکار کے مختلف طریقے۔ یعنی آلات حیلی سے شکار، شکاری کتوں، شکاری پرندوں (باز بحری وغیرہ) سے شکار، خشکی کے شکار، دریائی جانوروں کا شکار، مویشیوں کی پرورش، بری وبحری جانوروں، پرندوں کے مختلف

---

بقیہ صفحہ گذشتہ: ۱۔ اسرائیلیوں پر احسان جتلاتے ہوئے جعلکم ملوکا کو بھی خدا کا احسان ٹھیرایا گیا ہے نظریہ ملوکیت اگر غلط ہے تو ان آیتوں کی کوئی نئی تفسیر تیار کرنی چاہئے۔ پس سچ یہ ہے کہ جمہوریت ہو یا ملوکیت۔ اس کا حال وہی شاعری کا ہے یعنی حسنہ حسن وقبیحہ قبیح (اچھی شاعری اچھی چیز ہے بری شاعری بری چیز ہے) اور بھلائی و برائی کا معیار ہو نہیں قرآن ہے۔

اجزا، گوشت، کھال، اون، بال، دودھ، شہد وغیرہ سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں، تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی وغیر حیوانی، بری و بحری سواریوں کے ذریعہ مواصلات و حمل و نقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت و حرفت اور اس کے مختلف بسیط و مرکب، سادہ اور پیچیدہ شعبے مثلاً آہن گری، بخاری، زرگری ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معماری، سنگ تراشی، کان کنی، غواصی، مزدوری، اور مزدوری کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمت، کاروباری تنظیم وغیرہ وغیرہ تقریباً وہ ساری چیزیں جن سے بعض معاشی علما نے معاشی تختے مرتب کر کے اہلِ علم سے داد حاصل کی ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان تختوں کی خانہ پُری صرف قرآنی آیات سے اگر کوئی کرنا چاہے۔ تو مشکل ہی سے کوئی خانہ خالی رہ سکتا ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ ان امور کی طرف بجائے وحی اور نبوّت کے آدمی کی رہنمائی عقل و حواس سے کی گئی ہے اسی لئے قرآنی آیات میں ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے ضمناً ہی آیا ہے۔ تاہم اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاشی امور سے قرآن مسلمانوں کو کتنا قریب رکھنا چاہتا ہے۔

**زراعت و باغبانی کے ساتھ قرآن کا خصوصی تعلق**

علی الخصوص زراعت و باغبانی کے متعلق تو قرآنی اشارات کی نوعیت ضمنی مباحث سے یقیناً زیادہ نظر آتی ہے۔ حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا ہے۔ خصوصاً قریشِ مکہ، ظاہر ہے کہ ان کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا۔ لیکن باوجود اس کے بار بار مختلف پیرایوں میں قرآن ابر و باد، برق و رعد، لواقح (حاملہ، یا حمل سونی ہواؤں) بارش اور ان کے ساتھ کسانوں کے جذبات، خوف و طمع کا جو تعلق ہوتا ہے، مسلسل ذکر کرتا چلا جاتا ہے۔ لہلہاتی کھیتوں، ہرے بھرے گھنے باغوں، ان کے مختلف موسمی حالات کا تذکرہ اس کتاب میں دُہرو دُہرا کر اس طرح کیا گیا ہے کہ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کتاب کا خطاب زیادہ تر انہی لوگوں سے ہے جو کاشتکاری اور باغبانی کے پیشوں میں مشغول ہیں۔ لوگوں کا قرآن کے متعلق خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن میرا ذاتی رجحان تو یہی ہے کہ گویا اس راہ سے مسلمانوں میں انسانی معاش کے اس اہم باب سے، گہنہ زیادہ مناسبت پیدا کرانا[1] شاید یہ بھی مقصود ہو۔

---

[1] بخاری میں ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس میں ہے کہ آلاتِ کشاورزی کو دیکھ کر انہوں نے فرمایا کہ جس گھر میں یہ داخل ہوتے ہیں وہاں ذلت داخل ہوتی ہے اور اس قول کو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس زمانہ میں یہود کا یہ دستور تھا کہ وہ باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے تھے اور جیسے ہندوستان کے ہندوؤں کا قاعدہ ہے کہ ان کے کسان بیل گائے، گوبر، مٹی، پتے، کھیتوں کی ساری غلاظتیں اپنے گھروں کے آگے اور ارد گرد پھیلائے رکھتے ہیں یعنی کہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

**معاش گریز رجحانات کے متعلق قرآن کا ایک تاریخی بیان**

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی خطاب کا جو دائرہ ہے رہبانیت جیسی معاش گریز زندگی والے یں نہیں سمجھتا کہ اپنے لئے اس دائرے میں وہ کہاں گنجائش نکال سکتے ہیں، صرف یہی نہیں کہ معاشی زندگی کا جو نقشہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کیلئے گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ خود قرآن نے اس غیر فطری مسلک کے متعلق جس تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی جس قوم کو جس زمانہ میں جو دین بھی دیا گیا۔ کسی دین میں رہبانیت کے معاش گریز مسلک کا مطالبہ خدا کی طرف سے کبھی نہیں کیا گیا۔ گویا "لا رہبانیت" کی صفت صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بنی آدم کو خدا کی طرف سے جو دین ملا ہے کسی میں اس کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے قرآن میں اس مسلک کے متعلق جو یہ مشہور الفاظ پائے جاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| رهبانية ابتدعوها ما كتبنا ها | رہبانیت، جسے انہوں نے خود تراش لیا ہے |
| عليهم فما رعوها حق رعايتها | نہیں فرض کیا ہے ہم نے اس کو ان پر، پھر نگرانی |
| فاتينا الذين آمنوا منهم اجرهم | نہ کی انہوں نے رہبانیت کے (اصولوں کی) |
| وكثير منهم فاسقون (الحدید ۲۷) | جیسی نگرانی انہیں کرنی چاہئے تھی۔ پھر دی ہم نے |
| | ان کے ایمان والوں کو ان کی مزدوری، اور بہتیرے |
| | ان کے فساق ہیں۔ |

**قرآن کے تاریخی بیان کا تجزیہ**

دیکھنے میں تو بہ ظاہر یہ گنے چنے چند الفاظ ہیں، مگر میرے خیال میں اس آیت کا ایک ایک ٹکڑا "رہبانیت" کی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ مثلاً پہلا جز "ابتدعوہا" (ان لوگوں نے خود تراش لیا ہے) ظاہر ہے کہ رہبانیت کو بجائے کسی دین اور مذہب کے ان نظریات میں شامل کر دیتا ہے جو براہِ راست انسانی نظر و فکر کے مرہونِ منت ہیں۔ گویا یہ ایک قسم کا فلسفہ ہے۔ مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں میں مختلف عوامل و مؤثرات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گذارنی چاہی ہے۔ تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کے رواقئیین و

---

(صفحہ گذشتہ سے آگے) زمین تک کو گوبر سے لیپتے ہیں۔ حدیث میں بظاہر کاشتکاروں کے اس عام عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، دوسری حدیث میں بھی ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اپنے افنیۃ (آنگنوں) کو پاک صاف رکھو اور یہود کے جیسا نہ بناؤ۔ قرآن میں الزارعون کو حق تعالیٰ نے اپنی صفت بتائی ہے۔ اسی الٰہی صفت سے اتصاف کیا باعثِ ذلت و اہانت ہو سکتا ہے؟ علمائے اسلام کا ایک بڑا طبقہ زراعت کو تمام معاشی پیشوں پر ترجیح دیتا ہے اگرچہ بعضوں نے تجارت کو بہتر قرار دیا ہے، لیکن یہ گفتگو افضلیت میں ہے ۱۲۔

اشراقیین، اسکندریہ کے فلاطونین، ہندوستان کے جوگیہ وغیرہ نے فلسفہ کے ایک مکتبِ خیال کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔

دوسرا جزء "ماکتبناھا علیھم" (یعنی ہم نے اس نظریۂ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہیں کیا) جس کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین، دھرم وغیرہ کے نام سے ملتا رہا ہے اس میں اس غیر فطری نظریۂ حیات کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس جزء سے صرف اسلام ہی کی براءت رہبانیت سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی دین، ابراہیمی ملت ہو یا نوحی دعوت، کسی کا رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کے اس تاریخی بیان کو پڑھنے اور ماننے کے بعد بھی میں ان بزرگوں پر تعجب ہوتا ہے جو کبھی عیسائی، کبھی کسی اور دین کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ شاید ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے گویا کسی دین میں کبھی اس قسم کی راہبانہ زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کے نصِ صریح کی یہ خلاف ورزی نہیں ہے؟

تیسرا جزء "فمارعوھا حق رعایتھا" یعنی جن لوگوں نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصولِ حیات تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی گذارنی چاہی۔ قرآن کا یہ تاریخی بیان ہے کہ اس میں بھی جیسا کہ چاہیے تھا کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ جس کی وجہ ظاہر ہے، بعض خاص حالات مثلاً شدید ناکامی یا کسی سخت شخصی یا اجتماعی حادثہ سے متأثر ہو کر بعض زود اثر شدید الانفعال نفوس دنیا اور دنیاوی تعلقات سے دل کو سرد کر کے اس قسم کی خیالی، صرف خیالی زندگی کا نقشہ طے کرنے کی حد تک تو طے کر لیتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو جن فطری توانین میں آدمی کی جبلت جکڑی ہوئی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ان توانین سے مسلسل جنگ میں انہوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت اور قوانینِ قدرت سے جنگ چھیڑ دینے کے بعد مسکین انسان کامیابی کی بھلا کیا توقع کر سکتا ہے؟ کامل استقلال اور غیر معمولی ضد سے بھی اگر کام لیا جائے پھر بھی پوری کامیابی قطعاً ناممکن ہے، اور یہی خبر قرآن ان کے متعلق دیتا ہے۔

چوتھا جزء "فآتینا الذین آمنوا منھم اجرھم" یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی مزدوری مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا جن غیر ضروری مشقتوں کو وہ برداشت کرتے ہیں۔ ان میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے اس کی مزدوری ان کو مل جاتی ہے؟ بظاہر یہی خیال گذرتا ہے۔ لیکن اگر

واقعی قرآن کا یہی مطلب ہوتا، تو چاہئے تھا کہ "الذین آمنوا" (یعنی۔ ان میں جو ایمان والے ہیں) کی جگہ کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی کہ ان میں جن لوگوں نے اس اصول کی نگرانی کی۔ یعنی (الذین رعوہا) انہیں ان کا اجر دے دیا گیا، مگر جب یہ اسلوب بیان نہیں اختیار کیا گیا تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو صرف اپنے ایمان کا معاوضہ ملتا ہے۔ باقی جن غیر فطری مشاغل اور حالات میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے جو دُکھ اور مصیبت وہ اٹھاتے ہیں چونکہ وہ خدا کی مرضی اور مطالبے کے تحت نہیں، بلکہ اپنی خواہش اور اپنی مرضی، اپنے تراشیدہ فلسفہ کے زیر تحت اٹھاتے ہیں۔ اس لئے خدا کے پاس اگر اس کا کچھ اجر نہ ہو۔ تو عقلاً و دیناً اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پس اس کو جو کچھ ملے گا ایمان کے تحت ملے گا۔ اور یہ حال تو ان کا ہے جو اپنی زندگی میں ایمان اور ایمانی اقتضاؤں پر قائم بھی رہے ہوں۔ ورنہ اس کے بعد آیت کا آخری جزء "کثیر منہم فاسقون" (یعنی ان میں اکثر و بیشتر فاسق ہو جاتے ہیں) یہ تو ہر ملک کی اشراقیت ۔۔ اور رہبانیت کے آخری انجام کی ایسی رپورٹ ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے غالباً دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ کلیسا اور پوپی نظام کی پوری تاریخ ہندوستانی جوگیوں، بوگیوں، بھگشوؤں، مونکیوں، وام مارگیوں اگھوریوں وغیرہ کے ہزارہا ہزار سال کے ناگفتہ بہ حوادث و واقعات دہرانے پڑیں گے۔

**معاش گریز رجحانات کا آخری انجام فسق ہے**

سچ یہ ہے کہ قدرتی قوانین سے جنگ کرنے کا آخری انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوا ہے قرآن کی ترتیب کا بھی یہی اقتضا ہے۔ کہ ابتداء میں جو اپنے آپ کو اس زندگی میں ڈالتے ہیں، تازہ جوش اور تاثرات کے تحت ایک حد تک وہ تو نباہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان ہی بے چاروں کی ظاہری شکل و صورت اختیار کر کے جو ان کے جانشین بنتے ہیں۔ چونکہ ان تاثرات سے وہ قطعاً خالی ہوتے ہیں بلکہ عام طور پر عوام میں اس عجیب و غریب زندگی رکھنے والوں کے متعلق جو حسنِ ظن پایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر اس گروہ میں وہ شریک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ظاہری راہبانہ شکل و صورت جس سے بظاہر ترکِ دنیا کا یہ اعلان کرتے ہیں۔ اسی کو پوری طاقت کے ساتھ حصولِ دُنیا کا ذریعہ بنا لیتے ہیں جن کے یہ جانشین ہوتے ہیں۔ عوام کا ان کے ساتھ جو روایتی حُسنِ ظن باقی رہتا ہے۔ اس کے پردے میں پھر یہ کرتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا نمایاں جرم چونکہ ان کا معاشی جرم ہوتا ہے۔ یعنی ہر قسم کے اکتسابی مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر ایک طرف تو توانائی کے اس بھارے سرمائے کو جو قدرت انہیں عطا کرتی ہے رائگاں اور ضائع کرتے رہتے ہیں اور ٹھیک کسی عضو کے ناسور کا جو حال ہوتا ہے کہ خونِ حیات کو پیپ اور ریم بنا بنا کر ضائع کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف ایسے اعضاء جو اس کے قریب ہوتے ہیں

ان کی غذا بھی کھینچتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے بیچارے عوام کے گاڑھے پسینوں کی کمائی کو مختلف حیلوں سے بایں طور چوستے رہتے ہیں۔ کہ ان سے یہ جو کچھ لیتے ہیں۔ اس کے معاوضے میں ان کو کچھ نہیں دیتے۔ چند فرضی ڈھکوسلے جن سے ان کا ضمیر خود بھی واقف ہوتا ہے۔ ان بے چاروں کی تسلی کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ اتنا بڑا سخت جرم کہ ان کے دوسرے بعض بدترین فاسقانہ جرائم سے خاموشی اختیار کرنے کے باوجود قرآن نے نہایت تند لہجہ میں ان کے اس جرم کا اعلان ان کے الفاظ میں کیا ہے۔

ان كثيرا من الاحبار والرهبان
ليأكلون اموال الناس بالباطل
ويصدون عن سبيل الله
والذين يكنزون الذهب والفضة
ولا ينفقونها في سبيل الله
فبشرهم بعذاب اليم ۔ يوم يحمى
عليها في نار جهنم فتكوى بها
جباههم وجنوبهم وظهورهم
هذا ما كنزتم لانفسكم فذو
قوا العذاب بما كنتم تكنزون
(التوبہ ۵/۱۰)

بہت سے احبار (مذہبی علماء) اور رہبان
(مذہبی مشائخ) کھاتے ہیں لوگوں کا مال بذریعہ
باطل (جھوٹ) کے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ
سے، اور جو دفینہ کرتے ہیں سونا اور چاندی
نہیں خرچ کرتے اُسے اللہ کی راہ میں تو ان
کو مژدہ دے دیجئے دکھ بھرے عذاب کا
اس دن تپایا جائے گا ان پر وہی دفینہ جہنم
کی آگ میں۔ پھر داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں
اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں۔ یہ وہ ہے
جسے تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے۔ پس چکھو
عذاب اس چیز کا جسے تم نے جمع کیا تھا!

اکل اموال الناس بالباطل " جس کا حاصل مطلب یہی ہے کہ کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال کھانا۔ اس الزام کو قرآن ان پر عائد کر کے ایک اہم معاشی اصول کی طرف راہنمائی کر رہا ہے۔ جس کا ذکر دوسرے مقامات میں متعدد بار کیا گیا ہے۔ یعنی بظاہر قرآن کا یہ نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی اپنی جگہ نظامِ جسدی کی خدمت انجام دیتا ہے، اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو جسم سے آپریشن کر کے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعتی جسد کا جز بن کر فرد کو جینے کا حق عمومی طور پر اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح یہ دوسرے فرد سے نفع اٹھاتا ہے۔ اسی طرح چاہیئے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق یہ بھی دوسروں کو خواہ کسی شکل میں ہو نفع پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ عام معاشی نظام کی بنیاد اسی داد و ستد لین دین پر مبنی ہے۔ مثلاً کاشتکار غذا دیتا ہے۔ پارچہ باف کپڑے بُنتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، معلم علم تقسیم کرتا

ہے۔ لیکن بزرگوں کے ان جانشینوں نے جو عوام کے حسنِ ظن کی بنیاد پر ان سے مال لے کر کھاتے ہیں، کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ عوام سے جو کچھ لیتے ہیں۔ اس غریب عامی کو اس کے معاوضے میں مادی شکل میں نہ سہی، کسی اور شکل میں، مثلاً ذہنی، عقلی، روحانی فوائد میں سے کسی فائدے کی شکل میں ان کو یہ کیا دیتے ہیں۔ سب کا حال تو یہی نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ قرآن کا بیان ہے۔ ان کی اکثریت، یہ واقعہ ہے کہ کسی کو کچھ نہیں دیتی اور جہاں تک میرا خیال ہے، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں دے رہے ہیں۔ "اکل اموال الناس بالباطل" کی آخر اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی ہے۔ چور بھی مثلاً کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال اڑا لیتا ہے۔ لیکن اس مذہبی چوری سے غریب بدنام۔ مجرم چور کی چوری کو کیا نسبت؟

بہرحال، یہاں تک تو اس طبقہ کی اکثریت کے معاشی جرم کا ذکر ہے۔ آگے حصولِ معاش کے اس غلط ذریعہ کو اختیار کر لینے کی وجہ سے جن اعتقادی اور ایمانی شرارتوں کے یہ مرتکب ہوتے ہیں، غریب عوام پر جہل کا کمبل اڑھا کر اللہ کی سیدھی راہ سے لوگوں کو جن جن خاص طریقوں سے یہ روکتے اور بھٹکاتے ہیں، قرآن میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق معاشی مسائل سے نہیں ہے، اس لئے اس کی بحث یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ اس کے بعد ایک اور طبقہ کا ذکر ہے جو زائد از ضرورت آمدنی کو خدا کے بتائے ہوئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی جگہ "کنز" کرتا ہے یعنی اسے جمع کرتا ہے۔ پھر دوسری زندگی میں جن حالات سے ان کنز کرنے والوں کو دوچار ہونا پڑے گا اس کی تفصیل کی گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کنز کرنے والوں اور ان کے اخروی عواقب و نتائج کا اس موقع پر ذکر یعنی "راہبانیت" والوں کے ساتھ ان کا تذکرہ اپنے اندر کیا کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ راہبانہ زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت جس طرح خداداد توانائیوں کے سرمائے کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یوں ہی ضائع کرتی رہتی ہے اور اپنی انفرادی قوت سے جماعتی جسد کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتی۔ اسی طرح زائد از ضرورت آمدنی والے اپنے مالی سرمایہ سے بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنا بنا کر اس کے افادی پہلوؤں کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ دونوں طبقوں میں یہی اشتراکی مناسبت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جن اخروی سزاؤں کا ذکر فرمایا گیا ہے اگرچہ بظاہر ان کا تعلق کنز والوں سے ہے۔ لیکن جب دونوں کے جرائم کی نوعیت میں تناسب ہے تو کیا سزا کی نوعیت میں بھی تناسب نہ ہوگا؟ بلکہ کنز والے اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے نفع نہیں پہنچاتے تو کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال بھی تو نہیں کھاتے۔ لیکن احبار و رہبان کی اکثریت، جیسا کہ گذر چکا، علاوہ اس کے "اکل اموال الناس بالباطل" کے جرم میں بھی مبتلا ہے اور اس لحاظ

سے اس طبقہ کا معاشی جُرم بظاہر کنز والوں سے زیادہ سخت معلوم ہوتا ہے[۱]۔ قرآن میں اس موقع پر کنز والوں کا ذکر ہو سکتا ہے کہ ایک خاص تاریخی واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا جو عہد ہے۔ اس کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کا یہ وہ زمانہ تھا خصوصاً یورپ اور ہندوستان کا یہ وہ عہد تھا جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں اس طرح دبوچ لیا تھا کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ یورپ میں تو اعترافِ جُرم کا ایسا ہتکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا کہ ہر عامی اپنے جرائم کا پادری کے سامنے اقرار کر کے بظاہر خدا کی گرفت سے تو سمجھتا تھا کہ اسے نجات مل گئی۔ لیکن درحقیقت وہ پادریوں کی گرفت میں آجاتا تھا۔

پھر سلاطین کا کلیسا کے نیچے اس طرح دب جانا کہ گویا پوپ کے فرمان کی خلاف ورزی قریب قریب حکومت سے دست برداری کے مترادف بن چکی تھی۔ نیز خدا کی رحمت کا عام بیوپار کلیسائی نظام میں عام طور سے جو جاری تھا آٹھ آٹھ آنے اور دس دس آنے سیر خدا کی رحمت کو پادری عام طور سے بیچ رہے

---

[۱] آیت قرآنی ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ (نہیں خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کی راہ میں) یہ اسی کا حاصل مطلب ہے۔ علماء کا اگرچہ اس پر اب اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے یعنی اموال پر شریعت نے جو زکوٰۃ عائد کی ہے اس کو ادا کرنے کے بعد جو روپیہ جمع کرتا ہے وہ ان سزاؤں کا مستحق نہیں ہے جن کا ذکر اس کے بعد کیا گیا ہے۔ لیکن صحابیوں میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ زائد از ضرورت روپیہ کے کنز کرنے کے سرے سے مخالف تھے۔ تفصیل کیلئے دیکھو میری کتاب "الغفاری" جس میں بتایا گیا ہے کہ مطلقاً مال جمع کرنے کو حضرت ابوذر غفاری حرام سمجھتے تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کے خیال کی بنیاد ایک اہم معاشی اصول پر مبنی تھی۔ اس مسئلہ کے تفصیلی مباحث کا ذکر آئندہ قانونی ابواب میں بھی آئے گا۔ یہاں ایک خاص مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے یعنی احبار اور رہبان کا جو طبقہ جماعت کو تعلیماً تہذیباً، تدریساً یا تالیفاً، وعظاً یا تذکیراً یا کسی اور ذریعہ سے واقعی نفع پہنچاتا ہے۔ اور اس کاروبار میں اپنا وقت خرچ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام سے ان کو کچھ امداد ملتی ہو۔ تو یقیناً اس امداد کو "اکل اموال الناس بالباطل" ہم قرار نہیں دے سکتے۔ خصوصاً قدرِ ضرورت سے زیادہ آمدنی اس راہ سے جو ہو وہ سبیل اللہ میں جب خرچ کی جائے، مثلاً اشاعتِ اسلام، تاسیسِ مدارس و مکاتیب، نشر کتب وغیرہ میں اگر خرچ کی جائے تو جیبو یا زی کے عام شعبے فتوحات کے اس سلسلہ میں مذہبی طبقہ کیلئے اب بھی بہتر سمجھتا ہوں۔ کیا پیغمبر سے بھی بڑا نمونہ کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ نبوت سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گلہ بانی بھی کی تھی اور تجارت بھی۔ لیکن سوال منصبِ نبوت پر سرفرازی کے بعد کا ہے۔ انسانوں کی رکھوالی کے سوا کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ آدم کی اولاد کا یہ سب سے بڑا راعی پھر کسی معاشی مشغلہ میں مشغول ہوا۔ خدیجہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت ان کی وفات ہی کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی
(باقی صفحہ آئندہ میں)

رہے تھے۔ آسمان پر وہی کھولا جاتا تھا، جسے پادری زمین پر باندھتے تھے۔ یہ اور اسی قسم کی بیسیوں ترکیبیں تھیں جن کے ذریعہ سے عوام کی کمائی پر کلیسا کے نمائندوں کا پورا اقتدار قائم تھا۔ من مانے طور پر جس کسی سے جس قدر جس وقت چاہتے تھے، عیسائی مذہب کے یہ احبار (علماء) اور رہبان ومشائخ، وصول کیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہوچکے تھے۔ معمولی معمولی گرجے میں لاکھوں کی دولت بصورتِ "کنز" جمع رہتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلے میں فوجی مصارف کی جب ضرورت ہوئی اور شاہی خزانہ ان مصارف کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو روم کے اس قیصر کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد چرچوں اور گرجوں ہی سے ملی۔ تقریباً یہی حال

---

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) میں قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ حتیٰ کہ طائف کے رئیس نے پیغمبر کی غربت ہی کو انکارِ نبوت کی دلیل ٹھہرایا تھا۔ پھر ہجرت کے بعد مدینہ جب آئے اور کچھ ہی دن بعد وہ سب آگئے جن کے مصارف کا بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، جن میں آپ کے مولیٰ زیدؓ اور آپ کی دائی کھلائی ام ایمنؓ بھی تھیں۔ تو اس وقت تک جب تک اسلامی فتوحات کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ آخر خود پیغمبر اور آپ کے اہل وعیال لوگ لواحق وغیرہ کی گذر بسر کا ذریعہ کیا تھا۔ سیرت نگاروں نے اگر اس کا ذکر نہیں کیا تھا تو کیا بخاری کے متعدد مقامات میں یہ روایت انس بن مالک خادم خاصؓ کی بھی موجود نہ تھی کہ "کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم النخلات حتی افتتح قریظۃ والنضیر" یعنی جب تک بنی قریظہ اور بنی نضیر کی جائداد قبضہ میں نہ آئی تھی۔ دستور تھا کہ لوگ رسول اللہ صلعم کیلئے کھجور کے کچھ درخت مختص کردیتے تھے جس کے معنی یہی ہوئے کہ ہجرت کے چار پانچ سال تک صحابہ کرام جن کی حیثیت گویا مریدوں کی تھی خدمت کی اس سعادت سے سرفراز ہوتے رہے اور یوں بھی متفرق روایتوں میں مختلف طریقے سے انصار کی ان خدمات کا تذکرہ حدیثوں میں آتا ہے بلکہ صدقہ نہ لینا اور ہدیہ لینا۔ بعض صحابہ نے تو اسی ذریعہ سے آپ کو پہچانا، سلمان فارسی کا حال پڑھئے۔ شہدائے اُحد میں مخیریق نامی صحابی جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے۔ اماء یہ روض الانف مختلف کتابوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہی نہیں بلکہ سات سات باغ آنحضرتؐ کے حوالے کردیئے: "اموالی لمحمد یضعہا حیث یشاء" (یعنی میرے باغ آنحضرتؐ کے سپرد ہیں جو چاہیں کریں) برقہ، دلال، صائفہ، حسنیٰ، الاعواف، المثیب، مشربۂ ام ابراہیم، ان باغوں کے نام تھے۔ مخیریق جب اُحد میں شہید ہوگئے تو جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین انصرف مالہ اوقافا وھو اول حبس حُبِسَ فی الاسلام (روض الانف ص ۱۳۳ ج ۲) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باغوں کو وقف فرمادیا اور اسلام کا یہ پہلا وقف تھا۔ آخری باغ میں ایک جگہ بھی تھا، ماریہ قبطیہ ام المومنین کا مسکن وہی تھا، اسی لئے ان کے نام کی طرف منسوب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ علماء اور مشائخ جن بزرگوں کی حیثیت واقعی "کالنبی فی امتہ" کی تھی بقدر ضرورت اگر وہ فتوحات کے لینے سے انکار نہیں کرتے تھے تو ان کے سامنے بھی نبوت ہی کا ایک نمونہ تھا۔ ۱۲۔

ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں نے پیدا کر رکھا تھا۔ خود محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ہاتھ آیا تھا وہ ہنود مذہب کے احبار و رہبان کی "کنز" کی ہوئی دولت ہی تھی۔ اس زمانہ میں بھی زار کی حکومت پر انقلاب برپا کر کے جب اشتراکیوں نے اقتدار حاصل کیا تو کون نہیں جانتا، کہ شاہی خزانوں اور امراء کے اندوختہ دولت کے ساتھ بالشویک حکومت کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روسی گرجوں ہی سے ملی۔ والقصہ بطولہا۔

بہرحال تاریخ کے ان واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور مل سکتا ہے۔

"ترکِ دنیا" کو "حصولِ دنیا" کا آلہ بنا کر زندگی گذارنے والوں کا زور اگرچہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے، لیکن پھر بھی ہر ملت و مذہب میں ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والوں کا تقریباً دنیا کے ہر خطوں اور ملتوں میں موجود ہے۔ اور گو، اب الذہب والفضۃ کی ریل پیل کا حال ان کے یہاں اس پیمانہ پر تو نہیں ہے جو کبھی تھا۔ تاہم ان کے بعض سربرآوردوں میں عہدِ ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہیں، سب کمائیں، خون کا پسینہ بنا کر کمائیں اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لئے دیئے، کرے دھرے بغیر یہ وصول کرتے رہیں اس سے صرف یہی نہیں کہ ان کی اکتسابی قوتیں اپنے افادی اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسلٍ قبروں میں دفن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے اس عجیب و غریب سستے اور آسان روزگار کو دیکھ کر کتنے دلوں میں ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہے، خدا ہی جانتا ہے۔ کہ اس ریس کے سلسلے میں مکر و فریب، خدع اور دجل کے جالوں میں کتنے غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنس کر اپنے بیوی بچوں کے منہ سے نوالوں کو چھین چھین کر ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا اور ہو رہا ہے۔ چونکہ خدا اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جن سزاؤں کا ذکر قرآن میں ان کے متعلق کیا گیا ہے۔ اگر آخرت میں ان کے یہ مستحق ہوں تو شاید ان کے حق میں یہ زیادتی نہ ہوگی۔ آخر کچھ تو مصلحت ہے کہ احبار و رہبان کی اکثریت جس "اکل بالباطل" کی مرتکب ہے۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان سزاؤں کا حق تعالیٰ نے یہاں کیوں تذکرہ فرمایا۔

**اسلام کے مذہبی خدام کی خصوصیت**

شاید قرآن کے اسی طرزِ عمل کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقوں کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت و امانت سے صرف کرتا تھا اور اس لئے جو امداد اسلامی حکومت یا عام مسلمانوں

سے ان کو ملتی تھی۔ یہ " اکل بالباطل " (یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال کھانا) نہ تھا۔ لیکن قرآن کی انہی دھمکیوں سے غالباً وہ اتنے متاثر تھے کہ اس امداد کا لینا بھی انہوں نے پسند نہیں فرمایا۔ اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے دوسرے دھندے انہوں نے اختیار کئے۔ اکبر کے دربار میں جب فقہائے اسلام پر تنقید شروع ہوئی تو مفت خور برہمنوں اور سادھوؤں کو جس دربار میں ہر قسم کے انعام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اسی دربار کا مشہور وزیر ابو الفضل اسلامی فقہا کے متعلق کہا کرتا کہ " ہر جوتے گانٹھنے والے، چٹائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا۔" اشارہ اسلام کے ان علماء اور فقہاء کی طرف تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابو الفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب بن کر چبھ رہا تھا۔ فیا للعجب !!

بہرحال احبار و رہبان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گفتہ و ناگفتہ بہ حالات اور عادات میں مبتلا تھی۔ لیکن سب کی طرف ( وکثیر منہم فاسقون ) کے اجمالی اشارے پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اس ہی معاشی جرم یعنی " اکل اموال الناس بالباطل " کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی مہمات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے۔ حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں اس طبقہ کے دوسرے جرائم کچھ کم ہولناک اور شرمناک نہ تھے۔

**معاشی مسائل کی اہمیت، حدیثوں میں**

یہ تو معاشی مسائل کے ساتھ قرآن کے تعلق کا حال ہے داعئ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات اور اس باب میں آپ کے جس طرز عمل کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اس کا ذخیرہ تو اتنا زیادہ ہے کہ سب کا ذکر اگر کیا جائے تو وہی ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہ واقع ہے کہ مذہب کے غلط نمائندوں نے مذہب کے متعلق یہ عام کیفیت جو پیدا کر دی ہے کہ ادھر مذہب کا نام آیا اور دنیا کی نفرت، دنیاوی چیزوں کی عداوت میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہوا۔ خیال یہی پھیلایا ہوا ہے کہ دنیا اور دنیاوی امور سے اپنے ملنے والوں کو جو مذہب جس حد تک علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو یہی مذہب کا کمال ہے۔ لیکن آج یہ کون باور کرنے کیلئے تیار ہو گا کہ کوئی سیاسی لیڈر یا معاشی ریفارمر نہیں، بلکہ جو اپنے آپ کو انسانی تاریخ کے تمام مذہبی داعیوں اور رسولوں کا خاتم اور اپنی تعلیم کو سارے جہان کے مذہبی ذخیروں کے صحیح عناصر کا خلاصہ اور سب کی تکمیل کرنے والا قرار دیتا تھا۔ دنیا کی وہی سب سے بڑی اور دینی ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے اور پرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے اپنی امت کو پیش کرتے ہوئے التجا کرتا ہے۔

**امت کی معاشی خوشحالی کے لئے پیغمبر کی دعا**

اللھم انھم حفاۃ فاحملھم اللھم انھم عراۃ فاکسھم اللھم انھم جیاع فاشبعھم

پروردگار، یہ لوگ پیادہ ہیں (یعنی سواری نہیں رکھتے) انھیں سوار کیجئے، پروردگار یہ لوگ ننگے ہیں، انھیں پہنایئے، پروردگار یہ لوگ بھوکے ہیں، انھیں سیر کیجئے۔

**مسلمانوں کی معاشی پریشانی کو دیکھکر پیغمبر خدا کا پریشان ہوجانا**

اس کے سامنے کچھ لوگ اسی لباس میں۔ جس میں بعض مذاہب کے ماننے والوں کا رہنا مذہبی برتری کی دلیل ہے۔ یعنی کمبل بدن پر ڈالے ننگے پاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کمبل پوشوں پر سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک کا پڑنا تھا کہ

فتمعر وجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (مسلم)

اُداس پڑ گیا چہرۂ اقدس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ معاً ان لوگوں کے اس حال کو دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندر زنانہ میں تشریف لے گئے (غالباً کوئی چیز نہ ملی) پھر باہر تشریف لائے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا کر ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو جمع کرو، لوگ جمع ہوئے، ان غریبوں کی امداد پر لوگوں کو آمادہ فرمایا گیا، اور کافی امدادی سرمایہ جمع ہوگیا، جو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت جابر رضی ہی راوی ہیں کہ وہی چہرۂ مبارک جو اب تک ان غریبوں کو دیکھنے کے بعد اداس پڑ گیا تھا۔

فرأیت وجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یتھلل کانہ مذھبۃ

پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو دیکھا کہ سونے کی طرح دمک رہا ہے۔

**خوش حالی کو دیکھکر پیغمبر کے چہرہ کا دمک اٹھنا**

چہرۂ مبارک سونے کی طرح دمکنے لگا محض اس لئے کہ کچھ لوگ معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے، ان کی یہ پریشانیاں اس تدبیر سے دور ہوگئیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ پہلو جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نبی الانبیاء خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے احساسات طیبہ اسی پہلو کے متعلق کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

**اپنی آپ مدد پر لوگوں کو آمادہ کرنا**

اور یہ طریقہ کہ اس قسم کے لوگوں کی امداد دوسروں سے کرائی جائے

واقعہ یہ ہے کہ بعض خاص فوری ضرورتوں کے موقع پر کبھی کبھی یہ تدبیر بھی اختیار کی جاتی تھی، ورنہ اس احساس کے ساتھ ساتھ جس کا سراغ مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری خصوصیت عموماً یہ تھی کہ بجائے دوسروں کے خود صاحبِ ضرورت کو آپ آمادہ فرماتے کہ اپنی دشواریوں کو وہ اپنی انہی توانائیوں کے ذریعے سے حل کرے۔ جو قدرت نے آدمی میں اسی لئے پیدا فرمائی ہیں۔ حدیثوں میں اس مشہور واقعہ کا ذکر آتا ہے۔ کہ ایک صاحب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کچھ امداد کے طالب ہوئے، وہی جو ابھی ایک جماعت کو کافی امداد دوسروں سے دلا چکا تھا۔ ایک شخصی ضرورت کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار فرمایا جاتا ہے وہ سننے کے قابل ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ خود اپنے پاس سے دینے کی کوشش کی، اور نہ دوسروں سے دلوایا بلکہ ضرورتمند صاحب کو فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ آخر تمہارے پاس کوئی چیز بھی ہے ۔ ؟ وہ بچارے اتنے غریب اور نادار تھے کہ جواب میں انھوں نے عرض کیا ۔ میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے جس کے ایک حصہ کو اوڑھتا ہوں اور دوسرے کو بچھاتا ہوں اور اس کے سوا ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ افلاس اور ناداری کی یہ انتہا ہے۔ لیکن جو معاشی قوتوں کو ابھارنے اور ان کی قیمت پیدا کرنے کے لئے بھی مبعوث ہوا تھا۔ اللہ کے وہی رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس جواب پر حکم دیتے ہیں کہ جاؤ اسی پیالے اور ٹاٹ کو لے آؤ، جو دنیا کو اس کی آخری کتاب دینے آیا تھا، اگر ایک طرف اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی تو اسی دست مبارک میں آنکھوں نے دیکھا کہ غریب حاجت مند کا ٹاٹ اور پیالہ ہے، اور ٹھیک جیسے ہراج (نیلام) کرنے والے پکارتے ہیں،

من یشتری ھذین — ان دونوں کو کون مول لیتا ہے

کی صدا کانوں میں اسی دہن اطہر سے آرہی تھی۔ جو قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو بان لھم الجنة کی بشارت سنا رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔

انا اخذھما بدرھم — میں لیتا ہوں ایک درہم میں

نیلام کرنے والے صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر حاضرین کو مخاطب کرکے۔

من یزید علی درھم — ایک درہم پر کون اضافہ کرتا ہے۔

کے فقرے کے ساتھ قیمت کے اضافہ پر توجہ دلائی، بالآخر دو درہم پر بولی ختم ہوگئی، خریدار کو ٹاٹ اور پیالہ دیدیا گیا اور دو درہم جو قیمت میں وصول ہوئے تھے۔ دونوں کو حاجتمند انصاری کے حوالے کرکے ارشاد ہوا۔

اشتر بهذا طعاماً فانبذه الى اهلك واشتر بالآخر قدوماً فأتني به۔

مول لینا اس سے اناج۔ پھر اسے تو اپنے گھر والوں کے پاس ڈال دیجو۔ اور اس درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

حضرت انس جو روایت کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حاجتمند انصاری نے یہی کیا، اور کلہاڑی خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، سب دیکھ رہے تھے جو بجھی ہوئی انسانیت کو خدا سے ملانے آیا تھا۔ وہی (صلے اللہ علیہ والہ وسلم)

شد عوداً بيده

ٹھونک ایک لکڑی اپنے دست مبارک سے

لکڑی ٹھونک کر کلہاڑی انصاری کے حوالے کی گئی۔ اور اس کے بعد تاکیداً حکم دیا گیا۔

اذهب فاحتطب وبع ولا اربنك خمسة عشر يوماً

جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاؤ اور بیچو اور نہ دیکھیں تمہیں نگاہیں ہماری پندرہ دن تک (یعنی پندرہ دن تک ملاقات نہ کرنا)۔

وہ چلے گئے پندرہ دن بعد جب خدمت مبارک میں حاضر ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہے ہیں کہ حضور ان پندرہ دنوں میں دس درہم آمدنی ہوئی۔ جس میں سے چند درہم کے تو کپڑے خریدے گئے۔ اور چند درہم کا طعام (غلہ) مول لیا گیا۔ مفلس کے افلاس کا ازالہ جس کے مبارک چہرہ کو کندن کی طرح چمکا دیتا تھا۔ انصاری کی یہ رپورٹ سن کر انہی کو مخاطب کرکے فرمانے لگے۔

هذا خير لك من ان تجئ والمسئلة نكتة في وجهك يوم القيمة۔
(مجمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد ترمذی۔)

یہ بھلا ہے تمہارے لئے اس بات سے کہ تم آؤ اس حال میں قیامت کے دن کہ بھیک (سوال) داغ بنا ہوا ہو تمہارے چہرہ میں۔

جن ذاتی دلچسپیوں کے ساتھ حصول معاش کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کا نمونہ اس اسوۂ حسنۂ نبویہ میں مل رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں اس کی کتنی اہمیت تھی۔ انصاری سے جو آخری فقرہ فرمایا گیا ہے۔ اس میں کلی طور پر آپ نے گداگری کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے یہ اسلام کا ایک مستقل قانونی باب ہے۔ جس کی پوری تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔

حاصل اس کا وہی ہے کہ حتے الوسع اسلام نہیں چاہتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد اپنی توانائیوں کو بیکار ضائع کرکے دوسروں کی اکتسابی قوتوں سے ناجائز نفع اٹھائے۔

**معاشی سہولت کے لئے ایک فرض نماز کی فرضیت ساقط کردی گئی**

لوگ غور نہیں کرتے، ورنہ سچ یہ ہے کہ سورۂ مزمل میں تہجد کی نماز کی فرضیت کا قانون جب عام مسلمانوں

سے اُٹھا لیا گیا تو اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا تھا۔

| | |
|---|---|
| علم ان سیکون منکم مرضیٰ وآخرون | جان چکا ہے اللہ کہ تم میں کچھ لوگ بیمار پڑ جائیں گے |
| یضربون فی الارض من یبتغون | اور دوسرے (مسلمان) زمین پر چلتے پھرتے |
| من فضل اللہ (المزمل ۲۹/۲) | رہیں گے۔ اللہ کے فضل کو ڈھونڈتے ہوئے۔ |

جس کا یہی مطلب ہے کہ اگر شب بیداری سب پر فرض کر دی جائے گی۔ تو "فضل اللہ ابتغاء" یعنے تلاش معاش کے فریضہ سے کچھ لوگ محروم ہو جائیں گے۔ اسلام نے نماز کے فریضہ کا اٹھا لینا گوارا کیا۔ لیکن تلاش معاش کے فریضہ سے لوگوں کو روکنا پسند نہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اسلامی نقطۂ نظر کے سب سے بڑے عملی شارح ہیں۔ مختلف کتابوں میں آپ کا یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ کہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا کہ مجمع کو مخاطب کر کے ایک شخص کہہ رہا ہے۔

"جہاد کی تیاری میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے"

**حضرت عمر کا ایک عجیب تعلیمی واقعہ**

کون نہیں جانتا کہ جہاد کا شمار اسلامی شریعت کی ان ہی عبادتوں میں ہے جو خدا کی طرف سے مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں۔ اس اسلامی عبادت میں مشغول ہونے کے لئے سائل مسلمانوں سے امداد طلب کر رہا تھا۔ لیکن سنتے ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں، راوی کا بیان ہے کہ آگے بڑھتے ہیں اور صدا لگانے والے کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ اور مجمع کو مخاطب کر کے صدا لگاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| من یستاجر منی یعمل ارضہ، | کون نوکر رکھتا ہے اس کو میری طرف سے اپنی زمین میں کام کرنے کے لئے۔ |

ایک صاحب نے عرض کیا مجھے ضرورت ہے۔ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ماہوار تنخواہ طے کرنے کے بعد جہاد کی امداد طلب کرنے والے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں، وہ لے جاتے ہیں۔ اور اپنے باغ اور کھیت کے کام میں لگا دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دماغ سے اس کا خیال نہیں نکلتا ہے۔ کچھ دن گذرنے کے بعد مسجد ہی میں دریافت فرماتے ہیں، اس شخص کا کیا حال ہے جن صاحب نے نوکر رکھا تھا، انھوں نے جواب دیا کہ حضور اب تو وہ بڑے مزے میں ہے۔ تنخواہ سے کافی سرمایہ اس نے جمع کر لیا ہے، ارشاد ہوا کہ اس سرمائے کے ساتھ جو اس نے اس عرصہ میں کمایا ہے، میرے پاس ذرا اسے بھیج دینا۔ ارشاد کی تعمیل کی گئی۔ گلے میں ایک بھاری تھیلی (بیگ) لٹکائے دیکھا جاتا ہے کہ مسجد کا وہی سائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آ رہا ہے۔ جب وہ حضرت کے پاس

آگیا۔ تو آپ نے اس کی بھری ہوئی بوجھل تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| خذ هذه فان شئت فالآن | لے اس کو، پھر اب جی چاہے تو جہاد کرو، |
| اغزو ان شئت فاجلس (کنز العمال) | یا جی چاہے تو (گھر) بیٹھ! |

**قیامت بھی قائم ہو رہی ہو جب بھی معاشی کاروبار کو ترک نہ کرنا چاہئے**

معاشی کاروبار میں مشغولیت پر اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اس کی اہمیت پر کس حد تک اصرار کرنا چاہتا ہے اس کا اندازہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس مشہور حدیث سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر قیامت |
| ان قامت الساعة وفی احدکم | قائم ہو جائے۔ اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں |
| فسیلة فان استطاع ان لا تقوم | کوئی پودا ہو۔ اگر اس کے بس میں ہو کہ کھڑا |
| حتی یغرسها فیغرسها۔ | نہ ہو جب تک کہ اس کو لولے تو چاہیے کہ اس |
| (کنز العمال بحوالہ احمد) | پودے کو بو دے۔ |

**زمین کی آبادکاری بھی مسلمانوں کے قرآنی فرائض میں ہے،**

اور سچ تو یہ ہے کہ جلیل القدر حنفی امام علامہ ابو بکر جصاص کا اگر یہ استدلال صحیح ہے۔ اور بہ ظاہر اس کی صحت میں کوئی شبہہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ یعنی قرآن پاک کی آیت جس میں انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| انشاء کم من الارض واستعمرکم | اٹھا کر کھڑا کیا تمھیں زمین سے اور آبادی کرائی |
| فیها (ہود ۱۲/۵) | تم سے اس زمین میں۔ |

جصاص رحمۃ اللہ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وفیه الدلالة علی وجوب العمارة | یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی |
| للزراعة والغراس والابنية (۱۶۵ ج ۲) | باغبانی اور تعمیر کے ذریعہ سے واجب ہے۔ |

جس کا یہی مطلب ہے کہ زمین کی عمارت (آبادی) خواہ بہ شکل الزراعۃ (کھیتی) یا بشکل الغراس (باغبانی) یا بصورت الابنیۃ (تعمیرات) ہو۔ قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی بنیاد علامہ جصاص حنفی کے نزدیک جائز یا سنت ہی نہیں بلکہ واجب یا فرض ہے، گویا اس کی حیثیت وہی ہے جو نماز اور روزہ و حج و زکوٰۃ کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ عربی زبان کے طرز خطاب سے جو واقف ہے وہ

الجس ھدکے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکتا ہے۔ خصوصاً جب ہم تک ایک دو نہیں بلکہ تقریباً مشہور و مستفیض روایتوں کی شکل میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں پہنچی ہیں جن میں آپ نے صرف اسی کاشتکاری و باغبانی ہی کو نہیں جس سے کاشت کرنے والے یا باغ لگانے والے کو نفع پہنچے۔ بلکہ اس میں بھی جس سے وہ نفع گیر نہ ہوا ہو۔ اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُخروی ثواب کی بشارت سناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم ما من مسلم يزرع زرعا او يغرس غرسا فياكل منه طير او انسان او بهيمة الا كانت له صدقة۔

(رواہ البخاری فی صحیحہ)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں ہے کوئی ایسا مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت لگایا ہو، پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند کھائے، یا آدمی یا جانور، مگر یہ کہ ہوگا وہ اس کی طرف سے صدقہ

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والے کو اگر نفع نہ پہنچا تو کیا ہوا، اس نے تو اپنا فرض ادا کیا، اور جس نے خدا کے عائد کئے ہوئے فرض کو ادا کیا ثواب کا مستحق وہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔ ماسوا اس کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اس چیز کو جو عدم تھی، وجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا۔ اس سے اگر فرد کو نفع اٹھانے کا موقع نہ ملا، تو جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجا لایا۔ اور جماعت ہی نہیں، خدا کی دوسری زندہ مخلوق، مثلاً پرند یا بہیمہ (چوپائے)، اگر اس سے مستفید ہوئے تو قصداً نہ سہی ضمناً اپنے وجود اور اپنی توانائیوں کو اس نے مفید ثابت کیا، اور اسلام یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بے کار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

مذہب اور دین کے متعلق آج جو خیالات تھا پھیلے ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے کون یقین کر سکتا ہے کہ اسلام بھی باوجودیکہ ایک دین اور مذہب ہے۔ لیکن جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دنیاوی مشغلوں میں شمار کیا جاتا ہے اسلام نے ان سب پر آخری اجر و ثواب کو مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے۔ کہاں یہ نقطۂ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا، اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا، اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو

خدا کی خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مذہب کے ان غیر فطری غلط رجحانات استیصال میں اسلام نے کیا کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر کوئی مستقل کتاب لکھی جائے۔ جیسا کہ ضرورت کا اقتضاء تھا، اسلام میں بھی احبار و علماء (مذہب کے قانونی اور تشریعی پہلوؤں کے خدام) اور رہبان (صوفیہ) یعنے مذہب کی حقیقی روح اور واقعی مقصد کے محافظوں کا گروہ ضرور پیدا ہوا، اور جب تک اسلام ہے انشاء اللہ تعالےٰ یہ دونوں طبقے باقی رہیں گے...

........اور ان کو باقی رکھنا چاہیے، لیکن نہ جاننے والے خواہ کچھ ہی کہیں، یا غلط مثالوں کو دیکھ کر ان طبقات کے صحیح نمائندوں کے متعلق غلط خیالات کیوں نہ قائم کر لیے جائیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ احبار اور رہبان کے وہی افراد جو دوسرے ادیان و مذاہب میں "اکل بالباطل" پر گذارہ کرتے تھے، بحمد اللہ اسلامی اکابر و اسلاف کا دامن اس الزام سے پاک ہے۔ علماء کے طرز عمل کی طرف تو میں نے پہلے بھی کچھ اشارہ کیا ہے۔ لیکن "اکل بالباطل" یا مفت خوری میں سب سے زیادہ بدنام طبقہ صوفیہ کا ہے، جو نہ پڑھتے ہیں اور نہ پڑھنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ جہل و ناواقفیت ہر قسم کے فیصلوں پر جری ہیں۔ ان کو میں کیسے سناؤں کہ تمہارے غلط طعنوں سے جو گروہ اتنا مجروح و زخمی ہے، اسی طبقہ کا کوئی معمولی آدمی نہیں، بلکہ اساطینِ صوفیہ میں جس کا شمار ہے، میری مراد مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جو تصوف اور حقائق کے ایک خاص مکتب خیال کے پیشوا ہیں مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کسی خالص مادی معاشیات کی کتاب میں بھی یہ نظریہ مل سکتا ہے۔ میں بجنسہٖ فارسی الفاظ کے ساتھ ان کی اصل عبارت نقل کرتا ہوں۔

---

لہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضؓ فاتح مصر کا طائف میں وہط نامی جو تاکستان تھا "کان علےٰ الف الف دالیہ علیہ خشبۃ الا رتسامات البطات" ص ۱۵ شکیب ارسلان؛ یعنی دس لاکھ ڈنڈے تھے جن پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں امیر شکیب ہی نے نقل کیا ہے کہ جب طرابلس فتح ہوا اور جبل اخضر پر حضرت عمرو بن العاص رضؓ کی نظر پڑی تو فرمایا "لولا اموالی بالحجاز ما اخترت علےٰ ہذا الارض" یعنی وہط میں باغبانی کا انتظام کر چکا ہوں ورنہ طرابلس کے جہاد میں جب جبل خضر پر پہنچے تو اس کی سرسبزی دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ واقع میں طائف کی سرسبزی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ بہر حال صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقطۂ نظر کا اس سے پتہ چلتا ہے۔ آج طرابلس کے ریگستانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن جبل اخضر کا کون ذکر کرتا ہے۔ یورپ کا یہ بھی دجل ہے

حضرت سمنانی فرماتے ہیں۔

حق تعالیٰ ایں زمین و مزارع را بحکمت آفریدہ ومیخواہد کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد و اگر خلق بدانند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ و دخل کنند[1]، نہ بوجہ اسراف چہ ثواب است، ہرگز ترک عمارت نہ کنند۔

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا فرمایا ہے۔ اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین اور کھیت آباد رہیں! ور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے اگر خلق اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آبادکاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ یعنی نفع و خرچ کے طور پر آبادی نہ ہو۔ جیسے لوگ فخراً مکان پر مکان بناتے چلے جاتے ہیں۔ (جس میں نہ رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں۔) بہر حال نفع اور آمدنی کے لئے آبادکاری کے کام میں کتنا ثواب ہے۔ اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہوتا تو ہرگز آبادکاری کے کام کو نہ چھوڑتے؛

و اگر بدانند کہ از ترک عمارت و گذاشتن زمین[2] معطل چہ گناہ حاصل می شود، ہرگز نہ گذارند، کہ اسباب او خراب شود۔

اس طرح اگر لوگ یہ جانتے کہ آبادکاری کے کام کے چھوڑنے اور زمین کو بیکار پڑے رہنے دینے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے۔ کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیں (مثلاً تالابوں اور کنوؤں کی خبر نہ لینا، نہروں کی مٹی صاف نہ کرانا، وغیرہ وغیرہ اسبابِ آبادی، جن کی بربادی کی طرف عوام کو توجہ نہ ہوتی۔

آگے تمثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح بایں الفاظ فرماتے ہیں۔

ہر کس کہ زمینے دارد کہ ہر سال از آں زمین ہزار من غلہ می تواند کرد، اگر بہ تقصیر و اہمال نصد من حاصل کند و سبب آں صد من از علق خلق دور افتند، بقدر آں از وے باز خواست خواہند کرد (نفحات الانس جامی ص ۵۰۸ مطبوعہ کلکتہ)

جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کوتاہی اور کاہلی و سستی سے (بجائے ہزار من کے) نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہو اور اس کی وجہ سے سو من غلہ مخلوق کے علق میں نہ پہنچ سکا تو (قیامت کے دن) اس سے اس سو من کی باز پرس ہوگی۔ اور اسی کے برابر اس سے داپس مانگا جائے گا۔

---

[1] یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ دینی غرض یا نیت ہی کی وجہ سے ثواب کا پہلو پیدا نہیں ہوتا بلکہ دنیاوی نفع اور آمدنی کو نصب العین بنا کر جو معاشی کاروبار میں مشغول ہے اس کو بھی اخروی ثواب کا امیدوار قرار دیا گیا ہے۔ ۱۲

وہی مذہب وہی ثواب آخرت جسے غلط کاروں نے ایک مدت تک تقریباً تمام اقوام و امم میں ترک دنیا اور معاشی کاروبار سے، بھگانے، نفرت دلانے کے آلے کی حیثیت سے استعمال کیا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے۔ کہ کسی "سگ دنیا" حریص نے نہیں بلکہ اسلامی رہبان (صوفیہ) کا جو سر گروہ ہے، وہ اسی مذہب اور ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور بغیر کسی ذغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے خلاف زندگی کرنے والوں بلکہ دنیادی کاروبار میں پوری توجہ اور انہماک سے کام نہ لینے والوں تک کو بازخواست کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آج مثلاً ہندوستان کے ان کاشت کاروں کو جنہوں نے محض اپنی آبائیت اور قدامت پرستی کے تحت کشاورزی کے جدید آلات اور طریقوں کو ترک کر کے اس ملک کی پیداوار کو تقریباً سارے جہاں کی پیداوار کے مقابلہ میں انتہائی پستی کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے کسان زمین کے جس رقبہ سے ستو ستو من غلہ نکالتے ہیں۔ ہندی کسان اپنے باپ دادوں کے تقلیدی آسیب کا مارا ہوا کسان اسی رقبہ سے بمشکل دس من نکالنے میں بھی دشواری محسوس کرتا ہے آج کس کے پاس دنیا کے کس خطہ میں کس قوم کے پاس ایسا دین اور مذہب ہے جو ہندی کسانوں کے اس طرز عمل کو، مذہبی گناہ دینی جرم بتا کر، ان کی عملی قوتوں میں بیداری پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام ہی جس گروہ کو تارک الدنیا فقیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی گروہ کا ایک پیشوا جو یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے۔ کہ کسان کی کاہلی اور قلت توجہ کی وجہ سے پیداوار کی جو مقدار زمین سے باہر نہ آسکی۔ اور خلق خدا کے حلق تک نہ پہنچ سکی۔

بقدر آں از وے باز خواست خواہند کرد      اسی کے برابر اس شخص سے تاہی پرسش مانگا جائے گا

**آخرت کی آبادی کے لئے دنیا کو آباد کرنا**

یقیناً یہ اسی دین کا پیغام ہے جس نے "استعمار الارض" یعنی زمین کی آبادی کو بھی انہی فرائض میں داخل کر دیا ہے، جن کی بجا آوری پر مذاہب میں جنت کی آبادی کے وعدے کئے گئے ہیں۔ آخرت کو آباد رکھنے کے لئے دنیا کو آباد کرو، بتایا جائے کہ اسلام کے سوا اس نظریہ کی دعوت کس نے دی ہے۔ اور کون دے رہا ہے اپنی تو آبادیاں

ـه لیکن کسی کے سامنے یقیناً اس کی ذمہ داری حکومت بھی ہے جو دکھانے کی حد تک تو بہت کچھ دکھا رہی ہے۔ کسانوں اور کاشتکاروں کی راہنمائی کیلئے مستقل ڈیپارٹمنٹ ہر ہر صوبہ میں لاکھوں لاکھ روپے کے مصارف سے قائم ہیں۔ لیکن دکھانے کے دانتوں کے پیچھے چونکہ واقعی کھانے والے دانت نہیں ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی زراعت اس بیسویں صدی میں بھی ماضی کے ہزارہا سال کے آثار قدیمہ کا ایک نمونہ بنی ہوئی ہے۔ فاللّٰھم لا تسلط علینا من لا یرحمنا۔

کو تعطل اور بے کاری کے عوارض سے مفلوج کرکے باندائی[5] زندگی گذارنے والے حضرات اپنے اس مسلک کے متعلق کیا کیا مالیخولیا پکاتے رہتے ہیں۔ لیکن صوفیانہ نقطۂ نظر سے بھی جس نے اسلامی نظریات کی شرح کی ہے وہ آخر میں اس اعلان پر اپنے مذکورہ بیان کو ختم کرتا ہے۔ حضرت علاؤ الدولہ سمنانی آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی

| | |
|---|---|
| از کاہلی ترک عمارت زمین کندہ آنرا ترک دنیا | اپنی کاہلی سے زمین کی آبادی چھوڑ بیٹھا ہو |
| و زہد نام نہد، جز مطابعت شیطان چیزے | اور اس کا نام اس نے ترکِ دنیا اور زہد |
| دیگر نیست۔ | رکھا ہے۔ تو یہ شیطان کی پیروی کے |
| (ص ۵۰۰ نفحات) | سوا اور کچھ نہیں ہے۔ |

اور قرآنی حکم سے اعراض کرکے جو دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا گروہ شیطان کی پیروی نہیں کر رہا ہے تو اور کیا کر رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس قرآن نے

| کائنات کے جمالی پہلوؤں کی طرف چند قرآنی اشارے | انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا (الکہف ۱۵) | ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اسے زمین کا سنگار بنایا ہے۔ |
|---|---|---|

کا اعلان کرکے "ما علی الارض" (یعنی روئے زمین پر جو کچھ ہے) اس کو زمین کی آرائش اور اس کا بناؤ سنگار۔ قرار دے رہا ہو، تو پھر زمین کی پیداواروں میں دخل، یعنی آمدنی اور نفع ہی کا پہلو کیوں پیش نظر رکھا جائے۔ خود اسی قرآن میں رب انسانی سواریوں تک میں یہ چاہا گیا ہے۔ کہ نفع کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھا جائے۔ کہ ان سے ایک قسم کی آرائش اور زینت ہوتی ہے۔ تو خدا نے اور جن چیزوں کو زینت کے لئے بھی پیدا کیا ہے۔ ان سے علاوہ مادی منافع کے زینت کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ گھوڑوں، خچروں، گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| الخیل والبغال والحمار لتر کبوھا | گھوڑے، خچر، گدھے اسی لئے ہیں کہ ان پر |
| وزینۃ (النحل ۱۴) | سواری کرو۔ اور وہ آرائش ہیں۔ |

صبح اور شام کے سہانے وقتوں میں خصوصاً دیہات کی صبح و شام میں جو یہ منظر

---

[5] باندا بہاری لفظ ہے، عموماً درختوں پر ایک نباتی تنے، جسے دوسرے صوبوں میں شاید قرمن خواہ کہتے ہیں بہار میں اس کا نام یہی ہے، یا اپنی غذا زمین سے خود حاصل نہیں کرتا، بلکہ دوسرے درختوں پر سوار ہو کر ان کی حاصل کی ہوئی غذا سے پیٹ پالتا ہے۔

سامنے آتا ہے کہ گاؤں کی مویشیاں آپس میں ملی جلی صبح کو آبادی سے نکلکر چراگاہوں کی طرف جارہی ہیں اور شام کو واپس آتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| ولکم فیہا جمال حین تریحون و | تمھارے لئے ان مویشیوں میں جمال و حسن ہے |
| حین تسرحون۔ | جب تم شام کو انھیں گھر واپس لاتے ہو اور |
| (النحل ۱۴) | صبح کو جب انھیں چراگاہ کی طرف لیجاتے ہو |

کے چونکا دینے والے فقرے سے قرآن انسانی فطرت کی جمالیاتی جستجو کو "ایک لذیذیافت" اس سہانے منظر کی طرف متوجہ کر کے عطا کرتا ہے۔

اسی طرح لباس کا ذکر کر کے ستر پوشی اور الحر والبرد (سردی و گرمی سے) سے حفاظت کے جو فوائد ہیں ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ حسن و زیبائی سج دھج کے جو نتائج لباس سے حاصل ہوتے ہیں، ان پر بھی متنبہ کرتے ہوئے سورۂ الاعراف میں فرمایا گیا۔

| | |
|---|---|
| یا بنی آدم قد انزلنا علیکم | اے آدم کے بچو، ہم نے اتارا تم پر لباس |
| لباساً یواری سوآتکم | جو چھپاتا ہے شرم گاہوں کو تمھاری |
| وریشاً (الاعراف ۳) | اور وہ آرائش (بھی ہے) |

اس کے سوا آگے۔

| | |
|---|---|
| خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ | اپنی آرائش کو اختیار کرو، ہر سجدہ گاہ |
| (الاعراف ۳) | کے پاس |

کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں تو لباس کو زینت اور زینت کو لباس قرار دیتے ہوئے بظاہر اس طرف اشارہ ہے کہ جس لباس سے بجائے سنورنے کے آدمی کی ہیئت اور بگڑ جائے، اسے لباس ہی نہیں قرار دینا چاہئے۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عام دستور تھا کہ نیا جوڑا جب زیب تن فرماتے تو اس وقت بے ساختہ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے۔

| | |
|---|---|
| الحمد للہ الذی کسانی ما اواری | ستائش ہے اس اللہ کے لئے جس نے پہنائی |
| بہ عورتی واتجمل بہا فی حیوتی۔ | مجھے وہ چیز جو چھپاتی ہے میرے ستر عورت کو |
| | اور جمال حاصل کرتا ہوں میں اس سے زندگی میں۔ |

مردوں کے ساتھ بھی اسلام کا جمالیاتی نقطۂ نظر | شکر کے ان الفاظ میں "فی حیاتی کی قید" قید تو غالباً اظہار واقعہ کے لئے ہے ورنہ اسلام کا جمالیاتی نقطۂ نظر تو حیات و زندگی کے دائرہ سے بھی آگے بڑھکر موت تک کو

اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ترمذی کی مشہور حدیث ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے۔

اذا کفن احد کما اخاہ فلیحسن کفنہ (ترمذی) — جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو چاہیے کہ اچھا کفن پہنائے اس کو۔

قبر تک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کسی بدہیئتی اور بھونڈے پن کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا تھا۔ پورے طور پر جیسا چاہیے برابر نہیں کی گئی تھی۔ حضرت انس خادم خاص نبوت کا بیان ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس رخنے کو نہ دیکھ سکے۔ کنز العمال میں ہے کہ

امر بھا ان تسد — حکم دیا کہ رخنہ کو بند کر دیا جائے۔

ایک صحابی نے جو پاس ہی کھڑے تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور! اس بیچارے مردے کو کیا نفع پہنچے گا۔ جہان کے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پوچھنے والے کو سمجھایا۔

اما انھا لا تضر ولا تنفع و لکن تقر عین الحی۔ — بیشک اس سے نہ ضرر پہنچتا ہے نہ نفع، مگر ٹھنڈی ہوتی ہے اس سے زندہ کی آنکھ۔

یعنی مردے کو نہیں، بلکہ زندوں کی آنکھیں اس سے خنکی حاصل کرتی ہیں۔ اسی کے قریب قریب دوسری روایت میں ہے۔

تطییب عن الحی — بھلا معلوم ہوتا ہے زندوں کی آنکھوں کو

قبور تک میں جو دین آنکھوں کی خنکی تلاش کرتا ہو، آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، ایسی قبر بنانے کی تعلیم دیتا ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی اور چیزوں کے متعلق حسن کاری اور حسن پسندی میں اس کا پاکیزہ مذاق کتنا بلند اور ستھرا ہوگا۔ نیک ناموں کے بدنام کرنے والے ان چند نفوس کو آج کس میں جرأت ہے جو یہ جا کر سنائے کہ جس الجھی ہوئی داڑھی، پریشان بال بے ڈھنگے لباس کو وہ مذہبی اور دینی شکل کا نام دے رہے ہیں۔ دین کے سب سے بڑے معلم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مبارک میں وہی بے دینی کی علامت شمار ہوتی تھی۔ مجمع الفوائد میں امام مالک کی سند سے یہ حدیث مذکور ہے کہ

کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم فی المسجد فدخل رجل ثائر الراس و — آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے اتنے میں ایک آدمی داخل ہوا۔ جس کے سر اور

اللحیۃ فاشار الیہ صلے اللہ علیہ وسلم بیدہ کانہ یامرہ باصلاح شعرہ ولحیتہ ففعل ثم رجع فقال صلی اللہ علیہ وسلم الیس ھذا خیرا من ان یاتی احدکم ثائر الراس کانہ شیطان،

داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے پریشان تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا، گویا اُسے حکم دے رہے ہیں کہ اپنے بال اور داڑھی کو درست کرے، اس شخص نے تب یہی کیا، اور واپس پلٹ کر آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ اچھا نہیں ہے اس بات سے کہ تم میں سے کوئی آتا ہے سر کے بالوں کو پریشان کئے ہوئے. گویا کہ وہ کوئی شیطان یا بھوت ہے۔

**بدوضع و بدہیئت شکل شیطان کی شکل ہے**

"کانہ شیطان" کے آخری الفاظ بہت زیادہ قابلِ توجہ ہیں، ان کے لئے جنھیں اپنی "ثائر الراس واللحیہ" والی شکلوں پر ملکوتیت کا مغالطہ لگا ہوا ہے جن مسلمانوں کو اپنی داڑھی کے جنگلوں پر ناز ہے۔ وہی جنھیں تو بجھکر بجا۔ مسلمان ہونے کے کبھی کبھی سکھ ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کو نبوت محمدیہ کے سب سے بڑے مذاق شناس فاروقِ اعظم کا یہ اثر یاد رکھنا چاہیئے جسے بخاری کی شرح علامہ محمود بدرالدین عینی نے نقل کیا ہے۔

**داڑھی کے متعلق حضرت عمر کا ایک دلچسپ واقعہ**

انہ رای رجلا قد ترک لحیتہ حتی کبرت فاخذ یجذبھا ثم قال ائتونی بجلمتین ثم امر رجلا فجز تحت یدہ

انھوں نے دیکھا ایک آدمی کو جس نے چھوڑ رکھی تھی اپنی داڑھی اتنی کہ وہ بہت بڑھ گئی تھی حضرت عمرؓ اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ پھر آپ نے قینچی منگائی اور ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے داڑھی کا جتنا حصہ ہاتھ کے نیچے تھا (غالباً بمقدار قبضہ چھوڑ کر) چھانٹ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس شخص کی داڑھی پکڑ کر کھینچ رہے تھے، یہ جملہ قابلِ غور ہے، آج ایسی داڑھیوں کو ہاتھ لگانے والا بیچارہ "کفر" کے فتوے سے کیا بچ سکتا ہے؟ اور فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بس اسی فعل پر بس نہیں فرماتے ہیں، اس کام کو ختم کرکے ارشاد ہوا۔

**درندوں کی صورت**

یترک احدکم نفسہ کانہ سبع من السباع (عینی ص ۵۸ ج ۱۰)

تمہارے بعض لوگ اپنے آپ کو کچھ اس طرح چھوڑ دیتے ہیں گویا درندوں میں سے وہ ایک درندہ ہے۔

درندوں میں سے ایک درندہ بنجانا ایک بڑا معیار ہے، ان لوگوں کے لئے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے پیدا کرنے کا لفظ قصداً استعمال کیا، کیونکہ میری شاید گذشتہ شہادتوں سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اسلام

صرف حسن پسندی اور جمال پذیرائی کے جذبات بیدار کرنے کی ہی حد تک اپنے ماننے والوں پر اصرار کرتا ہے، حالانکہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے، اس سے اگر ایک طرف حسن پسندی تو دوسری طرف حسن کاری کی حوصلہ افزائیوں پر کم روشنی نہیں پڑ رہی ہے، مگر آج جو اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، مسلمانوں تک اس آواز کو کون پہنچائے کہ تمھارے اسلاف کے فنونِ لطیفہ کا ایک بڑا شعبہ[1] جس پر آج یورپ سر دھن رہا ہے۔ ان کی جمالیاتی دلکشیوں میں اس دینی تربیت کو بھی بڑا دخل تھا۔ جو اس دین کے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی کی تھی۔ اگر صحیح مسلم کی یہ مشہور روایت صحیح ہے۔

**اسلام اور حسن کاری**

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ فاذا ذبحتم فاحسنوا الذبح واذا قتلتم فاحسنوا القتل

قطعاً اللہ نے حسن کاری ہر چیز پر واجب کی ہے تو اس لئے چاہیئے کہ تم جب ذبح بھی کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، اور جب تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو۔ یعنے سلیقے کے ساتھ۔

اور نہ صحیح ہونے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں کہ مسلم کے سوا بھی صحاح کی اکثر کتابوں میں موجود ہے، تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن و جمال کے قالب میں ڈھالے بغیر اسلام نہیں چاہتا کہ کسی مسلمان سے کوئی فعل بھی صادر ہو، سب سے آخری کام جس میں حسن کاری کا آدمی خیال نہیں کر سکتا۔ وہ قتل اور ذبح کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر جب ان افعال میں بھی پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو ان صناعات اور کاریگریوں میں جن میں عموماً آدمی کی فطرت تناسب و جمال کو چاہتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہو سکتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بعد کہ

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ — اللہ نے ہر چیز میں حسن کاری کو واجب کیا ہے

کسی مزید گفتگو کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ نیز حدیث کے اس حصہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسن پسندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی مذاق بھی نہ تھا بلکہ ہر چیز میں حسن پیدا کرنے کو اسی نے بندوں پر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کی بعض ایسی شاخیں جن کے بڑھنے سے اسلام کی جڑ کٹتی تھی اسلام نے جڑ کی حفاظت کے لئے فنونِ لطیفہ کی ایسی شاخوں کا تو کاٹ دینا ضروری خیال کیا جن میں سب سے زیادہ اہمیت تصویر کشی کو ہے۔ خرافاتی ظلمات کا وہ حیرت انگیز کارخانہ جس کا نام اصنامی نظام یا بت پرستی پڑا ہے۔ جس کی بدولت ساری مخلوقات کے آقا انسان کو سارے جہان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پڑا، اور جس کی بدولت آدمی کی دولت، اس کی عزت، صحت بلکہ نسلی خصوصیتوں پر عریانی اور عریانی تصویر دیکھ کے جو زدیں پڑ رہی ہیں اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آئندہ قانونی ابواب میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔ ۱۲

واجب کیا ہے۔ اور اسی کو واجب بھی کہنا چاہیئے تھا۔ جس سراپا حسن و جمال کے متعلق ارباب مشاہدہ کا بیان ہے
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے

| | | |
|---|---|---|
| خدا بھی جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے۔ | اللہ جمیل و یحب الجمال (مسلم وغیرہ) | بلاشبہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں۔ اور جمال کو پسند فرماتے ہیں۔ |

**احسان کا مطلب** الاستاذ الامام مولانا انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے ایمان و احسان کی شرح حدیث پڑھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان مواقع میں احسان کا (حسن پیدا کردن) لغۃً ترجمہ صحیح ہے آپ کا یہ بھی دعوٰی تھا کہ قرآن پاک میں "المحسنین" کا لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے۔ اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ جو اپنے ایمان و عمل میں حسن پسند واقع ہوئے ہوں، یعنی ایمان و عمل کے ادنےٰ درجہ پر قانع نہ ہوں، بلکہ ان امور کے حسن کا جو درجہ ہے، اس کے حصول میں کوشاں ہوں گویا "المحسنون" مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن پسند واقع ہوا ہو، ظاہر ہے یوں سر کا بوجھ اتارنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں، اس میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے، اور نہ زیادہ وقت لگتا ہے، نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حسن و سلیقہ کے ساتھ کیا جائے، اس کے لئے تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان حسن کاروں اور محسنوں کو جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو، جس کا قرآن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے، تو اپنی محنت و مشقت، جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں، بس یہ تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن کے "محسنین" سے مراد ان ہی لوگوں کا گروہ ہے جن کی زندگی خالق و مخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے، اور عموماً یہی اس سے مراد بھی لیا گیا ہے، ایمان و اسلام و احسان کی مشہور حدیث میں "الاحسان" کی جو شرح

| | |
|---|---|
| تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک | پوجو اللہ کو اس طریقہ سے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر نہ دیکھ[1] پاؤ اس کو تو اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ |

---

[1] میں نے یہ ترجمہ ان لوگوں کے مطابق کیا ہے جن پر انت الظاہر فلیس فوقک شیٔ دل کھلا ہوا ہے، بیزے اوپر کچھ نہیں ہے۔ اس حدیث صحیح کا راز واضح ہو چکا ہے۔ اور جو دیدہ آئینہ دار طلعت اوست کے مقام کو اپنا مقام بنا چکے ہیں، کسی مخلوق کو خالق کے ظہور کے بغیر ان کے لئے نا قابل تصور بات ہو چکی ہو۔ ان پر لا احب الافلین (میں ڈھل جانے والے کو پیار نہیں کر سکتا)، کی ابراہیمی تجلی چمک چکی ہو، باقی جو عالم کو عالم کے خالق سے ٹوٹا ہوا تصور کر رہے ہیں گویا کچھ ایسا خیال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ عالم پیدائش میں تو خدا کا محتاج ہے، وجود اپنے بقا میں خدا کی شاید اس کو ضرورت نہیں۔ اسی لئے مخلوق کے وجود کو خالق کے وجود سے اس طرح جدا تصور کرتے ہیں جس طرح دو مخلوق کے وجود باہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں ہر ایک کا تحقق دوسری مخلوق کے تحقق کے بغیر ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے عامیانہ غیر قرآنی رجحانات والوں کے لئے اس حدیث کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جو خدا کو اس طرح گویا ان کو دیکھ رہے ہیں، یعنی خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق رکھنا چاہیئے جیسے کسی دیکھنے بھالنے والے ذات کا مطلب یہ ہوگا کہ کیونکہ اگر خدا کو تم دیکھتے نہیں تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس لئے خدا کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیئے جیسے کسی دیکھنے بھالنے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بعض شراح حدیث نے اس کا یہ مطلب بھی لکھا ہے دیکھو النووی (شرح مسلم)

کے الفاظ میں کی گئی ہے، اس شرح سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں محسنوں کا طبقہ وہی ہے جسے عام محاوروں میں صوفیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول اگر واقعی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یعنی،

| | | |
|---|---|---|
| حسن کار صناعوں کا طبقہ خدا کا محبوب ہے | ان العبد اذا عمل عملا احب اللہ ان یتقنہا۔ (کنز العمال) | جب بندہ کوئی کام کرتا ہے۔ تو اللہ تعالے چاہتے ہیں کہ اس میں اتقان پیدا کرے۔ یعنی اس کو ٹھیک جیسا کہ چاہیئے اسی طرح انجام دے۔ |

تو میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان صناعوں اور کاریگروں میں جو لوگ اپنے اپنے مصنوعات اور اپنی دستکاریوں میں اس لیے "اتقان و استواری تناسب و موزونیت پیدا کرتے ہیں کہ ان کا خدا ان کے اس فعل کو محبوب رکھتا ہے، تو حسن کاروں کے اس گروہ کو بھی محبت کے اس امتیاز سے کیسے محروم رکھا جا سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس دین نے اپنے ماننے والوں کے لئے مشغولیت کا ایسا نظام پیدا کیا ہے کہ اس دین کے مطابق عزم کی پوری طاقت کے ساتھ جو دین دارانہ زندگی بسر کریں گے ان کے لئے کاہلی و بے کاری، اپاہج پن اور بے روزگاری کے لئے کوئی گنجائش کیسے باقی رہ سکتی؟

معلم الامۃ امام الفقہا حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جو یہ فرمایا کرتے تھے کہ

| | |
|---|---|
| انی لاکرہ ان اری الرجل فارغا لا فی عمل الدنیا ولا فی الاخرۃ۔ (مجمع الزوائد) | میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ آدمی کو فارغ دیکھوں، یعنی نہ دنیا کے کسی کام میں ہو۔ اور نہ آخرت کے کام میں۔ |

غالباً اس کا یہی مطلب تھا کہ اسلام نے مسلمانوں کی عملی زندگی کا جو دستور العمل بنایا ہے، اس

میں اس قسم کی لغو فارغ البالی کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن آہ کہ "دین" کن جبینوں کے سامنے آج بجائی جارہی ہے۔ جن کے "نظام الاوقات" میں فراغت کے سوا افسوس کہ کوئی دوسری گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کی "فارغ البالی" اور "فرصت" کے اسی عجیب و غریب ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا کا وہ "دین" بھی آج اخبار کی صفحوں میں کاہلی کے پیغام اور بے عملی کے نظام کے نام سے بالآخر بدنام ہوکر رہا۔ جس کے متعلق گذر چکا کہ "ابتغاء فضل اللہ" یا معاشی جد و جہد میں مسلمانوں کے قدم دوسروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ سورۂ مزمل میں ایک مستقل فرض نماز کی فرضیت تک کو منسوخ کردینا گوارا کرلیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ اربابِ تنقید کو طبرانی کی اس حدیث پر سنداً کچھ اعتراض ہو۔ جس میں ہے کہ "ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ اور گذر بسر کا ذریعہ شکار ہے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً نماز باجماعت کی سعادت سے میں محروم رہتا ہوں میرے لئے کیا حکم ہے۔ ترکِ جماعت کی سزا میں جس پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گھروں میں آگ لگوا دینے تک کی دھمکی دی تھی، اور ایک نابینا صحابی نے جب نابینائی کے عذر کو پیش کرتے ہوئے چاہا تھا کہ جماعت کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں، تو یہ دریافت کرنے کے بعد کہ اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے، صحابی نے اثبات میں جواب دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلا اذا (یعنی تو ایسی صورت میں تم مستثنیٰ نہیں ہو سکتے) فرمایا تھا۔ آج ایک معاشی عذر کے پیش ہونے پر سننے کی بات ہے خدا کا وہی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| نعم العمل، قد کانت قبلی | بہت اچھا شغل ہے۔ مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر |
| رسل کلھم[1] یصطاد و یطلب | گذرے سب کے سب شکار کرتے تھے اور |
| الصید و یکفیک من الصلوٰۃ | شکار کی تلاش میں نکلتے تھے۔ باقی جماعت |
| فی جماعۃ اذا غبت عنہا | کی نماز کیلئے تمہارے واسطے بس یہ کافی |

---

[1] اور بعد کو بھی جن بزرگوں کو ملتِ اسلامیہ میں انبیائے بنی اسرائیل کا مقام حاصل ہوا۔ مثلاً ولی الہند خواجہ بزرگ اجمیری قدس اللہ العزیز کے حالات میں پڑھئے، اصطیاد کے ذوق کا ثبوت ملے گا۔ سیدی الامام شیخنا و شیخ الہند برد اللہ مضجعہٗ نے گذشتہ رسولوں کے اس عمل سے حصہ پایا تھا۔ اب یاد نہیں کہ براہِ راست حضرت والا سے سنا تھا یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے کہ اپنے استاذ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ الہند فرماتے تھے کہ شکاری رزق کو اطیب الرزق اس لئے قرار دیتے تھے کہ درمیان میں کسی آدمی کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ براہِ راست خدا سے روزی حاصل ہوتی ہے۔ ۱۲

فی طلب الرزق حبك
للجماعة واهلها، وحبك
ذکر الله واهله واسع
علیٰ اهلك وعیالك حلالا
فان ذالك جهاد فی
سبیل الله۔

ہے کہ روزی کی تلاش میں جب تم کو جماعت
سے غیر حاضر ہونا پڑے تو جماعت کی محبت
جماعت والوں کی محبت اللہ کے ذکر کی محبت
ذکر اللہ میں مشغول ہونے والوں کی محبت اپنے
اہل وعیال کیلئے حلال روزی کی تلاش کی خواہش
الغرض یہ سب چیزیں جماعت کی عدم حاضری
کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ چاہئے کہ اپنے اہل وعیال کیلئے طلب حلال میں کوشش کرو کہ یہ اللہ کی راہ میں
جہاد ہے!

### معاشی جد وجہد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے

صاحب مجمع الزوائد کا جو طبرانی جیسے محدثین کی حدیثوں میں سنداً کوئی اگر
سقم پاتے ہیں تو اس پر تنبیہ کئے بغیر نہیں گذرتے۔ اس حدیث کے متعلق
سکوت اختیار کرنا اولاً یہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ کم ازکم ان کے نزدیک ان کی سند قابلِ
اعتراض نہیں۔ ثانیاً جب قرآن کا نص شاہد ہے کہ ابتغائے رزق میں حرج واقع نہ ہو۔ اسی لئے تہجد
کی فرضیت عام مسلمانوں سے ساقط ہوئی۔ تو اس میں کیا تعجب ہے۔ کہ شارح قرآن صلی اللہ علیہ و
نے اسی ابتغائے رزق کے عذر کو پیش نظر رکھ کر جماعت کی حاضری جو ظاہر ہے کہ فرض ہونے کی
حیثیت نہیں رکھتی اس سے کسی کو مستثنیٰ فرمادیا ہو، بلکہ ارشادِ گرامی کا آخری حصہ یعنی

واسع علیٰ اهلك وعیالك
حلالا فان ذالك جهادا
فی سبیل الله

اور چاہئے کہ اپنے اہل وعیال کیلئے
طلب حلال کی کوشش کرو، کہ یہ اللہ کی
راہ میں جہاد ہے!

میرے نزدیک تو سورۂ مزمل ہی کی آیتوں سے بظاہر مستنبط و ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ تہجد کی فرضیت
کے سقوط کے وجوہ بیان کرتے ہوئے قرآن میں ایک وجہ تو ابتغاء فضل اللہ اور دوسری وجہ
کے بعد و آخرون یقاتلون فی سبیل اللہ (یعنی دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں قتال اور جہاد کریں
بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی انہی دونوں عذروں کی بنیاد پر اس نماز کی فرضیت ساقط کی جاتی ہے
کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔ کہ خود قرآن نے بھی معاشی جد وجہد کو جہاد فی سبیل اللہ کا ہم وزن،
ہمدوش قرار دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت یہ فتوے دے
رہے تھے کہ "اہل وعیال کے مصارف اور نفقہ کی جستجو و تلاش میں تگ ودو، یہ بھی اللہ کی راہ

جہاد ہے ۔ اس وقت سورۂ مزمل کا یہ طرزِ بیان آپ کے پیشِ نظر نہ تھا، رونے والا اگر آجکل کے مسلمانوں کو دیکھ کر ؎ امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں (اقبال مرحوم) کے الفاظ کے ساتھ عمر بھر روتا رہا تو کیا واقعی اس کا یہ نوحہ غلط نوحہ اور اس کا یہ گریہ غلط گریہ تھا؟

یا للعجب! جس سرزمین کو نزولِ قرآن کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ آج خصوصیت کے ساتھ اسی کے فرزند ہر قسم کے معاشی کاروبار سے بے تعلق ہو کر صرف بیرونِ عرب کے مسلمانوں کے سینے کے بوجھ بن کر اپنی آبرو خاک میں ملا رہے ہیں۔[1] اور کیا کہوں، کس کی آبرو پر داغ لگا رہے ہیں ؎

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد ان کان فی القلب ایمان واسلام

---

[1] ہنگامہ برپا کر دیا گیا ہے کہ عرب ایک چٹیل ریگستانی میدان ہے، وہاں پیدا ہی کیا ہو سکتا ہے۔ مگر کہنے والوں کو کیا کہئے، جہاں اللہ کا گھر ہے، اس میں شک نہیں، وہ توبِن کھیتی کا بیابان اور وادیٔ غیر ذی زرع ہے۔ لیکن یمن و نجد، یمامہ و بحرین کے سیر حاصل خطوں کو جانے دیجئے خود سرزمینِ حجاز کا واقعی ہمیشہ سے کیا یہی حال تھا، جو آج ہے، تمہیں نے کسی موقعہ پر اسی حجاز کے ناکستان "وہط" نامی کا تذکرہ کیا تھا جس میں دس لاکھ بیلیں منڈوے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اسی حجاز میں خیبر بھی تو ہے۔ آج بھی جن لوگوں نے اس کا معائنہ کیا ہے بھا سبعۃ اودیۃ سائلۃ و نخیلا فوق التصور (الاسلام ص ۱۲۷) یعنی بہتی ہوئی سات ندیاں ہیں اور نخلستانوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ وادی القریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ مدینہ منورہ کے اطراف میں عقیق کبریٰ و صغریٰ کی ندیاں، ینبوع کے متعلق یاقوت نے لکھا ہے کہ اس میں ایک سو ستر چشمے جاری تھے مشہور نومسلم لیوپولڈ، جو اسد اللہ کے نام سے مشہور ہیں اور بخاری کا ترجمہ کر رہے ہیں شکیب ارسلان نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب میں عرب کی سیاحت کر رہا تھا تو حجاز کے جنوبی حصے میں "بیشہ" نامی وادی پر گذر ہوا۔ اس وادی میں اس کی اطراف کی زمینوں میں جو صلاحیت انہوں نے پائی، کہتے تھے کہ مکہ اور اطرافِ مکہ والوں کی خوراک سالانہ کیلئے صرف حجاز کی یہی زمین کافی ہے۔ علاوہ نخلستانوں کے سرزمینِ عرب اپنے اندر معدنیات کی جو دولت چھپائے ہوئے ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سونا، چاندی، تانبہ، قلعی حتیٰ کہ اب تو پٹرول تک کے ذخیروں کا پتہ اس سرزمین میں مل چکا ہے لیکن افسوس ہے، اپنے عہدِ شاداب میں مسلمانوں نے پورے ملک کو لاڈ اور پیار میں بگاڑ دیا۔ کہتے ہیں کہ مصر کی زمین کا پانچواں حصہ حرمین پر وقف ہے، سلطان محمد فاتح نے جس دن قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھا اعلان کیا وقفت مدینۃ قیصر علیٰ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ کمالی عہد سے پہلے تقریباً پانچ کروڑ روپیہ ترک حرمین پر خرچ کرتے تھے۔ دنیا کے سلاطین و امراء جو کچھ بھیجتے تھے اس کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ بہمنی بادشاہ محمد شاہ کی والدہ حج کے ارادے سے گھر جانے گیں تو بادشاہ نے اپنی طرف سے والدہ کی خدمت میں باشندگانِ حرمین میں تقسیم (باقی بر صفحۂ آئندہ)

اسلام اور کیا کرتا۔ اسلام کا رسول (صلوٰۃ اللہ علیہ) اور کیا کہتا۔ جو کچھ کہا جا سکتا تھا اور جو کبھی کسی سے نہیں کہا گیا تھا۔ سب تو کہہ دیا گیا تھا، پھر اگر کسی قوم کو اسی پر اصرار ہو کہ جو کچھ کہا جائے گا ہم نے طے کر لیا ہے کہ وہ نہ سنیں گے تو اس کا علاج کس کے پاس ہے۔ رسول اللہ کو تو رسول اللہ ؐ کے خدا نے بھی کہہ دیا تھا کہ،

| | |
|---|---|
| فذکر انما انت مذکر لست | تم چونکا دو، ان پر تم کو دار وغہ نہیں بنایا |
| علیھم بمسیطر فمن تولی وکفر | گیا ہے۔ پھر جو پیٹھ پھیرے اور انکار کرے گا |
| فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر | تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا! |

**جدید انقلابی صناعات کا انتساب پیغمبروں کی طرف قرآن میں!**

کہتے ہیں کہ سعودی حکومت نے بعض جدید مغربی ایجادات مثلاً ٹیلی فون وغیرہ کو عرب میں جب داخل کیا تو نجد کے سپاہیوں نے ان کو شیطانی اعمال قرار دے کر، اور یہ کہتے ہوئے کہ ان میں شیطان بولتا ہے۔ ان چیزوں کی سخت مخالفت کی۔ ہو سکتا ہے کہ نجدی سپاہیوں کی طرف اس قسم کے واقعات جو عموماً منسوب کئے جاتے ہیں ان میں کچھ حقیقت کا حصہ بھی شریک ہو، لیکن کیا اس کی ذمہ داری ایک لمحہ کیلئے اس دین کی طرف منسوب کرنے کی جراءت کسی کو ہو سکتی ہے۔ جس دین کی سب سے اہم اساسی آسمانی کتاب میں اپنے اپنے عہد کی بعض انکشافات کو خدا کے برگزیدہ اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود حضرت حق تعالیٰ جلّ مجدہٗ نے ان کو اپنی تعلیم اور وحی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آخر قرآن پڑھنے والوں میں کون نہیں جانتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، جس کی خواہ اس زمانہ میں کوئی اہمیت نہ رہی ہو،

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ سے) کرنے کیلئے جو رقم دی تھی، فرشتہ اور خافی خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ وہ چہار صد من طلا و هفت صد من نقرہ تھا۔ چار سو من سونا اور سات سو من چاندی۔ صرف ایک عورت اپنے ہاتھ سے عرب لے جاتی ہے اور سب کو وہیں خرچ کر کے واپس آتی ہے کیا آج بھی اسی دکن سے اس زمانے میں بھی کم از کم دس ہزار ماہوار سے کم رقم تا ئمین حرمین کیلئے سلطنت آصفیہ خلدہا اللہ نہیں بھیجتی، ہاں افسوس کہ یہی خیر ایک گونہ باعث شر ہو گیا۔ جد و اجتہاد اور کمانے کی صلاحیت وہاں کے باشندوں سے جاتی رہی۔ آخر یہی حجاز تھا۔ کوشش کی گئی تو عرفات جیسے میدان میں بھی نہر جاری ہو گئی۔ عبداللہ بن عامر کہا جاتا ہے کہ صحابی تھے یعنی بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش ہوئے تھے۔ بصرہ سے مکہ تک انہوں نے اپنے کو مفلی کے زمانہ میں کنواں اور سرائے بنوائی تھی حتی کہ اتخذ بعرفات حیاضا و نخلا۔ مسلمانوں کا دار الہجرت عرب ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن معاشی ضیق جب تک ہے جانے والے آخر کہاں جائیں ۱۲

لیکن جس عہد میں اس جدید اکتشاف و ایجاد کو حضرت نوح علیہ السلام نے دنیا میں پیش کیا تھا۔ یقیناً اس وقت وہ اسی قسم کی عجیب و غریب چیز تھی، جیسے ہم اس زمانے کی جدید ایجادوں کو حیرت و تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔[1] کیا اس کشتی کی ایجاد کے متعلق قرآن نے دہرا دہرا کر یہ نہیں بیان کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| واوحینا الی نوح ان اصنع | اور ہم نے وحی کی نوح کی طرف اس بات |
| الفلک باعیننا (الاعراف) | کی کہ بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے۔ |

اور جو حال کشتیِ نوحؑ کا ہے ہم قرآن ہی میں پڑھتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل کے دوسرے اولوالعزم نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم | اور سکھایا ہم نے (داؤد) کو تمہارے لئے (انسانوں کے |
| لتحصنکم من باسکم (السباء) | بچاؤ کیلئے) زرہ بنانا تاکہ حفاظت کرے تمہاری لڑائیوں میں |

---

[1] بلکہ اپنے ایک مضمون میں جو رہبر دکن ۱۹۴۹ء کے صنعتی نمبر میں شائع ہوا ہے، خاکسار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن ایجادی اکتشافات کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی انقلابی عہد کا ان سے آغاز ہوا، اگر سوچا جائے تو ان انقلابی ایجادوں کی فہرست میں شاید نوح پیغمبر علیہ السلام کی اس ایجاد کو بھی امتیازی مقام عطا کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو حضرت نوح کی اس صنعتی ایجاد کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ اتنا تو قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوہ آسا موجوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ قرآنی الفاظ ہیں۔ وھی تجری بھم فی موج کالجبال (کشتی بہہ رہی تھی۔ کشتی والوں کو لئے ہوئے ایسے تھپیڑوں میں جو پہاڑ جیسے تھے) اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کشتی جس کا اردو ترجمہ ناؤ کیا جاتا ہے کیا اس قسم کے تھپیڑوں کو وہ برداشت کر سکتی ہے؟ پھر قرآن سے بھی جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے چرند، درند، پرند وغیرہ کے ایک ایک جوڑے اس میں رکھے گئے تھے۔ اس سے اس کی وسعت و گنجائش کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اور "بائیل" میں جو تفصیلات اس کشتی کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ ان کے بعد تو اس کو ناؤ یا کشتی کہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔ توراۃ کتاب "پیدائش" میں ہے: "تو اپنے واسطے گوپھر (ساگوان) کی لکڑی کی ایک کشتی بنا۔ اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کر اور اس کے باہر اندر رال لگا۔ اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ کی ہو۔ اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنانا اوپر سے ہاتھ بھر چھوڑ کر تمام کر، اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا اور نیچے کا طبقہ، اور دوسرا، تیسرا بھی بنا۔" (پیدائش باب ۶-۱۶) کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ جہاز سازی کی صنعت حضرت نوح کے ہزاروں سال بعد ایک بال بھی ترقی نہ کر سکی؟ البتہ اسٹیم اور برق کے عہد میں بلا شبہ ترقی کی دوسری منزلیں اس صنعت نے طے کی ہیں، میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ حضرت نوح کی یہ صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی

(باقی بر صفحہ آئندہ)

آج توپ اور بندوق، بلکہ بم یا اس کی مختلف جہاں گداز، عالم سوز قسموں کے مقابلے میں یقیناً اب اس غریب "زرہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن سوچنا چاہیے۔ اس زمانے کو سوچنا چاہیے، جب اون اور بال سے ننگے جسم رکھنے والے اس نازک اندام انسان پر باڑھ[1] اور دھار والے نوکیلے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا گیا تھا۔ یقیناً اس وقت خدا کی رحمتوں میں سے ایک بڑی رحمت یہ بھی تھی کہ لوہے جیسی کرخت و سخت دھات کا اتنا نرم پڑ جانا کہ تاروں کی شکل میں اس کا کھینچنا آسان ہو گیا پھر ان تاروں سے موٹی چھوٹی کڑیوں کے بنانے پر قادر ہو جانا۔ تا اینکہ انہی کے جوڑنے سے لوہے کے ایسے لباس

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جس کے بعد نسلِ انسانی انقلاب کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی یعنی آج جو دنیا کے مختلف اقالیم اور خطوں میں انسان آباد ہیں۔ اور ہر جگہ تمدن و عمران کا تلاطم برپا ہوا۔ یقیناً اس کا امکان اسی ایجاد کے بعد پیدا ہوا، ورنہ خونخوار سمندروں اور ذخار دریاؤں کو پھاند پھاند کر بنی آدم کے گھرانوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف منتقل ہونے کی اس سے پہلے صورت ہی کیا تھی۔ شناوری کے زور سے کوئی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جانا بھی چاہتا تو ہفتوں بلکہ مہینوں پانی میں تیرتے رہنا کیا آسان تھا۔ اور کسی زمانے میں مان لیا جائے کہ لوگوں میں اتنی قوت بھی ہوگی جب بھی اس ذریعہ سے افراد ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے تھے۔ لیکن اہل و عیال ساز و سامان کے ساتھ خاندانوں کے منتقل ہونے کو سچ پوچھئے تو اسی نوحی ایجاد نے ممکن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں بھی بنی آدم آباد ہیں کسی نہ کسی شکل میں نوح کی اس ایجاد کا تذکرہ ان میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے واقعات کے بعض اجزاء میں ردّ و بدل بھی ہو گیا ہے۔ بلکہ عموماً ہر ملک والوں نے اس واقعہ کا مرکز اسی علاقے کو قرار دے رکھا ہے جس میں وہ آکر مقیم ہوئے۔ ہندوستان والے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی کو "ناؤ بندھن" قرار دیتے ہیں۔ اور بجائے نوح کے، کشتی والے کا نام منو بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ منو کا یہ لفظ "مہا نوح" (بڑے نوح) کا ایک تلفظ ہو، ٹھیک جیسے بعض لوگ کہتے ہیں، کہ ہندوؤں میں شیو حضرت شیث کے نام کا تلفظ ہے۔ کیونکہ ث کا تلفظ اب بھی عربی میں بہت ہی ہلکا ہے۔ اسی طرح وشنو کے متعلق بھی بعض کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے نام کی دوسری ہیئت ہے۔ وش کا لفظ شاید کوئی احترامی لفظ یعنی حضرت یا، رشی وغیرہ کی قسم سے ہو۔ افسوس ہے کہ ہندوستانِ قدیم میں فنِ تاریخ سے بڑی بے اعتنائی برتی گئی، اس لئے عموماً اس ملک کے رجال تھوڑے دن کے بعد یعنی توجی یعنی دیومالا میں جا کر شریک ہو جاتے ہیں مسلمانوں کے ایک بڑے عالم عبدالکریم جیلی کا تو خیال ہے۔ کہ ہندوؤں کا برہما در اصل حضرت ابراہیم ہیں، واللہ اعلم۔

سلہ یا ڈھ دار ہتھیاروں کی ایجاد کا قصہ جو بائیبل سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ عجیب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند ہابیل نامی کو قابیل نے مار ڈالا تو اسی قابیل پر حضرت آدمؑ نے لعنت فرمائی اور قابیل اس علاقے سے جہاں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کے تیار ہو جانے کا امکان پیدا ہوتا تاکہ جس طرح جسدِ انسانی پر سوتی اور اونی کپڑے چست ہو کر لپٹ جاتے ہیں۔ یہی کیفیت اس لباس میں بھی پیدا ہو گئی۔ قرآن میں جن امور کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی

وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ
(سبا ع ۱ پ ۲۲)

اور نرم کر دیا ہم نے (داؤد) کیلئے لوہا تاکہ بنائیں وہ (بدن پر خوب چست ہو کر اتر جانیوالی زرہیں) (اور سکھایا ان کو) کہ ٹھیک اندازہ کے ساتھ جوڑیں کڑیوں کو

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ سے) اس زمانے میں حضرت آدم کی اولاد آباد تھی بھاگ گیا۔ بائبل میں قابیل کا تلفظ قائن لکھا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ قائن اپنی جورو سے ہم بستر ہوا اور وہ حاملہ ہوئی اور حنوک کو جنی۔ پھر حنوک کی اولاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی چند پشتوں کے بعد لمک نامی آدمی اس کے خاندان میں پیدا ہوا۔ لمک کے چند بیٹے ہوئے ان میں سے ایک لڑکا جس کا نام یوبل تھا۔ وہ توبین اور بانسری بجانیوالوں کا باپ تھا اور لمک کا دوسرا بیٹا بلقائن تھا جو تانبے اور لوہے کے سب باڑھ دار ہتھیاروں کا بنانے والا تھا (پیدائش ۴)۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ گانے بجانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار اور ہتھیاروں کی ایجاد کا کام آدم علیہ السلام کے اسی قابیل یا قائن کی نسل والوں نے انجام دیا۔ اگر اس پر غور کیا جائے کہ مشرقی ممالک (وجہ نسلِ انسانی کا پہلا مولد و منشا وہ ہے) ان سے متصل ہو کر براہِ خشکی مغربی ممالک کی طرف جانے کا راستہ جس سرحدی علاقے سے گذرتا ہے اس کا نام اس وقت تک بلقان ہی ہے اور اس کا جائزہ لیا جائے کہ گانے بجانے اور مردم کشی کے آلات و اوزار بنانے کی فطری صلاحیت کن اقوام میں زیادہ پائی جاتی ہے اور اس وقت بھی ان ایجادات کا سہرا کن قوموں کے سر بندھا ہوا ہے۔ تو آسانی سے تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ کہ قائن یا قابیل کی اولاد کون لوگ ہیں مردم کشی کے آلات کا سب سے بڑا مظاہرہ گذشتہ "جنگ عظیم" میں ہوا۔ اس جنگ میں شرقی فوجوں کیلئے کیا انتظام کیا گیا۔ لارڈ کنشنر نے جو خاکہ اس کیلئے پیش کیا تھا۔ اخبار پائنر ۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء میں وہ شائع ہوا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ فوجیوں کیلئے یورپین عورتیں مہیا کی جائیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں فراہم کیا جائے، زیادہ سے زیادہ ان کیلئے غلط اشعار دیکھانے والی رنڈیاں مہیا کی جائیں، جیتے جاگتے جانوروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان تک پہنچائی جائے۔ پھر اس سے اور کچھ اس عجیب و غریب سوال سے یعنی قابیل جب اس علاقہ سے بھاگ ہی گیا جہاں اس وقت نسلِ انسانی آباد تھی۔ تو پھر یہ جو بائبل میں ہے کہ قائن اپنی جورو سے ہم بستر ہوا۔ یہ جورو نسلِ انسانی کی اسے کہاں ملی؟ بعض کا خواب خیال ہے کہ جنگلوں میں بعض ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو شکلاً و صورتاً انسانوں سے بہت مشابہ ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ قابیل کو جورو بنانے کیلئے مادہ اسی قسم کے جانوروں سے مل گئی تھی (واللہ اعلم) پچھلے دنوں انسانی نسل کے رشتے کو بعض صحرائی جانوروں سے ملانے کی کوشش بیالوجی کے بعض مفکرین نے جو کی تھی کون کہہ سکتا ہے کہ جن لوگوں کو دیکھ کر ان کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا ان میں کوئی واقعی جھلک اس خیال کے منتقل کرانے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

**قرآن کے ضمنی اشارے کی قیمت**

جیسا کہ میں بار بار اس پر متنبہ کرتا چلا آرہا ہوں، کہ قرآن نہ براہ راست کوئی معاشی کتاب ہے اور نہ صنعت وحرفت وایجاد واکتشافات پر بحث اس کے حقیقی مقاصد میں داخل ہیں۔ لیکن ضمناً بھی قرآن میں جس چیز کا ذکر آگیا ہے۔ یقیناً وہ قرآن ہی کی چیز ہے ہم مسلمانوں میں اپنی آسمانی کتاب کے متعلق نفاق کا وہ رویّہ بحمد اللہ اب تک نہیں پیدا ہوا ہے جس کا اظہار بعض دفعہ اس زمانے کے دوسرے ارباب مذاہب اپنی ان کتابوں کے متعلق کرتے ہیں، جنہیں کہنے کی حد تک تو وہ بھی آسمانی اور خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں کہتے ہیں، لیکن باوجود اس کے بسا اوقات ان چیزوں کے متعلق جن کا ان کی ان ہی مذہبی کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے ان ہی کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ عوام کا جو خیال اور جو عقیدہ کسی چیز کے متعلق اُس زمانے میں تھا، اس کی رعایت کرتے ہوئے ہماری ان کتابوں میں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ایک لمحہ کیلئے اس عقیدہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ خدا کی طرف غلط بیانی کے انتساب کی بھلا کیسے جراءت ہو سکتی ہے؟ پس خواہ ایسی باتیں ہوں جن کا ذکر قرآن کا اصل مقصود ہے، یا جن چیزوں کا ذکر قرآن میں ذیلاً یا ضمناً آگیا ہے۔ چونکہ بہر حال وہ خدا ہی کا کلام ہم مسلمانوں کے نزدیک ہے، اس کی وقعت اور قیمت کے لحاظ سے ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ آج مسلمانوں کے متعلق کہنے والے خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن جب یہی قرآن شروع شروع میں نازل ہوا تھا تو ہم صحابہ کو دیکھتے ہیں کہ اصلی اور حقیقی مسائل ہی نہیں، بلکہ جن امور کا ضمناً قرآن میں ذکر آگیا تھا، ان کو بھی ایک واقعہ اور حقیقت تسلیم کرکے ان سے استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن طب کی کوئی کتاب نہیں ہے اور نہ اس میں مادی امراض کے علاج ومعالجہ کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ لیکن اللہ کی مختلف نشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) اور اس کی جبلّی خصوصیات کا بھی ذکر آگیا ہے جن میں ایک بات یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

يخرج من بطونها شراب مختلف الوانه — نکلتا ہے شکم سے ان مکھیوں کے ایک شروب جس کے رنگ

فيه شفاء[1] للناس (النحل) — مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے!

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کی نر تھی۔ آدمی جب خچر کو دیکھتا ہے تو معاً اس کا ذہن گھوڑے اور گدھے دونوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور جب وہ مختلف نسلوں میں دادیہال وننیہال ہو تو اس قسم کے انتقال ذہنی پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ۱۲

[1] اس موقع پر مجھے اپنی وہ تقریر یاد آتی ہے جو حیدرآباد کے یونانی طبیہ کالج میں اطباء کی ایک جماعت کے سامنے انکی فرمائش پر کی گئی تھی۔ اسی زمانہ میں یہ تقریر اخبار صدق (لکھنؤ) اور ہمدرد صحت (دلی) وغیرہ میں شائع ہو گئی تھی۔ تقریر کا موضوع قرآن کی یہی آیت تھی۔ خاکسار نے اطباء کو خطاب کرکے آمادہ کیا تھا کہ قرآن کے اس اشارے پر اگر غور کریں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان کے مولیٰ اور تلمیذ رشید نافع راوی ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ان ابن عمر ما کانت تخرج | ابن عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ ان کے جب کوئی پھوڑا یا پھنسی |
| قرحۃ ولا شئی الا لطخ الموضع | یا اور کچھ چیز نکل آتی تو شہد کا اس پر لیپ چڑھاتے |
| بالعسل ویقرء یخرج من بطونہا | اور قرآن کی اس آیت کو تلاوت کرتے (یعنی یخرج |
| شراب مختلف الوانہ فیہ | من بطونہا شرابٌ مختلف الوانہ فیہ شفاء |
| شفاء للناس (جمع الفوائد ص ۱۰) | للناس |

ظاہر ہے کہ شہد میں شفابخشی کی اس خاصیت کا اظہار قرآن میں ضمناً کیا گیا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، ابن عمرؓ نے اس کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا، کیا انہوں نے یہ سمجھ کر اُسے قابلِ لحاظ نہ خیال کیا کہ عربوں یا عربوں کی بڑی بوڑھیوں کا شہد کے متعلق چونکہ یہی خیال تھا، قرآن نے (العیاذ باللہ) اس

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تو ممکن ہے کہ جہاں دنیا میں چند طبی نظامات جاری ہیں ان کے مقابلے میں آپ دنیا میں ایک مستقل جدید طبی نظام اس قرآنی آیت کو بنیاد بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ تقریر تو لمبی تھی۔ حاصل بظاہر یہی تھا کہ یونانی طب جس میں عموماً نباتی دواؤں سے امراض کے ازالے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن نباتاتی دواؤں کے جوہر کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ حالانکہ شفا بخشی کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ اسی لئے عموماً طبی نسخوں میں لکھا جاتا ہے کہ کوفتہ بیختہ در آب تازہ کردہ صباح جوشانیدہ مالیدہ صاف نمودہ بالائش فلاں دوا پاشیدہ پس نبات سفید مصری آمیختہ نوشند کے عمل کیلئے کم از کم آٹھ عملی منزلوں سے عموماً ہر دوا کے استعمال میں لوگوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی دواؤں کی کہنگی و فرسودگی اور دوسرے اسباب کی وجہ سے صحیح شفائی عناصر کا ان سے حاصل کرنا میسر نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے اس کے اگر نباتی ادویہ کی اسی روح یا جوہر کو قرآنی اشارے سے حاصل کریں یعنی قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) کی جو صفت ذلولیت (سدھ جانے کی صلاحیت) بیان کی گئی ہے، تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس پھول کا رس چاہئے، عادی کرنے کے بعد آپ مکھیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کے الفاظ ثم کل الثمرات۔ (پھر کھا ہر قسم کے نباتات کے جوہر یا عطر کو) لغت سے ثابت کیا گیا کہ ثمر کے معنی پھل کے بھی آتے ہیں اور تثمیر مثلاً دودھ سے گھی نکالنے کو بھی کہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ شہد کی مکھی میں قدرت نے اس کی بھی صلاحیت رکھی ہے کہ جس نباتی چیز کا چاہا جائے وہ جوہر کھینچ کر حوالہ کر سکتی ہے۔ پھر جو جوہر حاصل کرکے یہ دیتی ہے، قرآن نے "شراب" کے لفظ سے اشارہ کیا کہ وہ ذائقہ انسانی کیلئے مشروب ہے۔ یعنی ایسی خوش ذائقہ شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ نبات سفید آمیختن" کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب ان امور کو پیش نظر رکھ کر اگر دوائی نباتات کی کاشت الگ الگ قطعات میں کی جائے اور ہر قطعہ کے ساتھ شہد کی مکھیوں کے ایک جھنڈ کو ثمرات کشی کیلئے معین کر دیا جائے۔ اور جو جوہر حاصل کرکے یہ مکھیاں عطا کریں، ان

(باقی بر صفحہ آئندہ)

عامی خیال کو دہرا دیا ہے۔ یقیناً انہوں نے یہ نہیں کیا، بلکہ اسے ایک واقعہ قرار دیا اور اس واقعہ سے استفادے کی وہ کوشش بھی کرتے تھے۔

پھر ایسی ایجادیں، جنہیں انسانی تاریخ میں انقلابی ایجادات کی حیثیت حاصل ہے، کم از کم، یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہزار ہا ہزار سال تک ان ایجادوں نے بنی آدم کی مشکلاتِ زندگی میں آسانیاں پیدا کیں، جب قرآن ان کو اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ تو اس سے اگر یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ ضروریاتِ زندگی میں اختراعات اور ایجادوں سے آسانیاں فراہم ہوتی ہوں، ان سے لوگوں کو روشناس کرنے کی کوشش گویا ایک طرح سے پیغمبروں کا کام ہے۔ تو جو کچھ قرآن میں ہے اور قرآن نے جن الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے اس کے لحاظ سے کیا یہ ایسی بات ہو گی، جسے خواہ مخواہ سمجھا جائے

---

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) کو بوتلوں میں بھر بھر کر بجائے دواؤں کے دواخانے میں رکھ لیا جائے، اور مریضوں کو بجائے دواؤں کے وہی شہد استعمال کرایا جائے۔ یعنی جس مریض کیلئے ایک ہی دوا کافی ہو، اسے بس اسی دوا کا شہد دیا جائے اور جسے دو دواؤں کی ضرورت ہو اس کے نسخے میں دو قسم کے شہد لکھے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس، جیسے مفردات سے آجکل نسخے تیار کئے جاتے ہیں بجائے دوائی مفردات کے، نسخے ان مختلف دواؤں کے شہد سے مرتب کر کے مریضوں کو دیا جائے، یہ نئی بناتی قدرتی دوا مصنوعی ترکیبوں سے تیار کی ہوئی دواؤں سے یقیناً زیادہ مفید اور بہتر ہوں گی اور سہولت یہ ہو گی کہ ہر بوتل سے بقدرِ ضرورت صرف شہد لینے کی ضرورت ہو گی۔ اور چند شہدوں کا آمیزہ مریض کی دوا بن جائے گا، نہ کوٹنے کی ضرورت، نہ چھاننے کی، میں نے علاج کے اس قرآنی نظام نے تبیں تجویز کیا تھا کہ اس کا "عسلی نظام" نام رکھا جائے۔ ہمارا فائدہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ قرآنی الفاظ "فیہ شفاء للناس" ایک کلیہ بن جائے گا۔ اور مطلب یہ ہو گا کہ ہر مرض کیلئے اس مرض کے مناسب شہد کا استعمال باعثِ شفا ہو گا۔ قرآن میں "مختلف الوانہ" کے الفاظ ہیں یعنی شہد کی مختلف ناموں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آج کل علاجِ شمس کا ایک طریقہ جو دنیا میں مروج ہے، جس میں مختلف رنگ کی بوتلوں میں صرف پانی بھر بھر کر دھوپ میں لوگ رکھ دیتے ہیں۔ اور جس مرض کیلئے جس رنگ کی بوتل کا پانی مختص ہے وہی استعمال کراتے ہیں

ہو سکتا ہے کہ قرآن کے ان الفاظ میں رنگ کی اس تاثیری قوت کی طرف اشارہ ہو۔ گویا شہد کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر مختلف امراض کے لئے ان کو مختص کیا جا سکتا ہے۔

شہد میں اشیاء کے مزاج کی حفاظت کا بھی جو قدرتی خاصہ ہے۔ اس سے بھی آپ بے شمار مفید کام لے سکتے ہیں۔ ۱۲

کہ قرآن کی طرف زبردستی منسوب کیا جا رہا ہے۔

**ایجادات کے غلط استعمال کی وجہ سے خود ایجادات کی مخالفت صحیح نہیں ہے**

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور قرآن کو خدا کا کلام تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حضرات محض اس لئے کہ آج یورپ والے اپنی بعض جدید ایجادوں سے غلط استعمال لے رہے ہیں۔ بجائے استعمال کی تصحیح کے سرے سے ایجادات و اختراعات کے رجحان ہی کو دُنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور دینی چیز جسے قرآن میں قرآن نازل کرنے والے خدا نے جلیل القدر پیغمبروں، بلکہ خدا نے اپنی تعلیم و وحی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی کو علانیہ انسانیت کیلئے لعنت قرار دینے سے نہیں جھجکتے۔ اور تماشا یہ ہے کہ ابلہوں کا ایک گروہ ان لوگوں کے ان ارتجاعی خیالات کو مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ خود باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو باور کراتے پھرتے ہیں کہ یہ ساری تنگ خیالیاں، دُنیا میں جو آج پائی جاتی ہیں۔ ان کا ذمہ دار مذہب ہے میں ان حالات کو دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ان لوگوں کی منطق وہی ہے کہ لڑتا تو انسان تھا۔ لیکن اتفاقاً ہی جنگ جب مذہبی طبقات میں چھڑ گئی تو لوگوں نے ان لڑائیوں کی ذمہ داری بجائے انسانوں کے اس مذہب کے سر تھوپ دی۔ جو اتفاقاً ان لڑنے والوں کا مذہب تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایجادات و اختراعات کے خلاف بعض قلوب میں خصوصاً یورپ کے مسلسل غلط استعمال کی وجہ سے جو گرانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان میں اکثر مذہبی ہی لوگ ہیں۔ لیکن ان گرانیوں کے متعلق یہ خیال کہ انہیں مذہب نے پیدا کیا ہے، کم از کم اسلام اور قرآن جس مذہب کو پیش کرتا ہے۔ اس کے لحاظ سے تو قطعاً غلط ہے۔ آخر تاریخ کی ایسی ہمہ گیر ایجادیں، جیسی کہ جہاز رانی اور زرہ بافی کی صنعتیں ہیں، قرآن جب ان کو پیغمبروں کا کام بتاتا ہے تو اب آپ ہی بتائیے کہ ایجادی صناعات اور اکتشافی کوششوں کی بلندی کیلئے اب اس سے بھی زیادہ بلند چیز اور کیا پیش کی جا سکتی ہے۔[1]

---

[1] اس موقعہ پر بے ساختہ حکیم الامت مرحوم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کا وہ لطیفہ یاد آجاتا ہے یعنی دار العلوم دیوبند سے حضرت کے پاس ایک زمانے میں یہ شکایت پہنچی کہ وہاں چوری کے کچھ واقعات پیش آئے ہیں، اور لوگ بعض طلبہ کو اس سے متہم کرتے ہیں۔ حضرت والا نے یہ سُن کر فرمایا کہ بھائی طلبہ اور وہ بھی دینی اسلامی علوم کے طلبہ، یہ تو کبھی چور نہیں ہو سکتے، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض چوروں نے طالب العلمی شروع کی ہو۔ یہ فعل ان ہی لوگوں کا ہو سکتا ہے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

اب میں کہنے والوں کو کیا کہوں، دوسروں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ خود مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونے اور اپنے جس اسوۂ حسنہ کو اس باب میں چھوڑا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ لوگ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

**جدید صنعتوں کے متعلق پیغمبرانہ نمونے**

کون نہیں جانتا کہ جب مدینہ منورہ پر عرب کے جاہلی قبائل ایک کمان بن کر یہودی سرمایہ کے زور سے حملہ آور ہوئے، تاریخ میں جس واقعہ کی تعبیر غزوۃ الاحزاب یا جنگ خندق سے کی گئی ہے، اس موقعہ پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کے اشارے سے مدافعت کے اس جدید طریقے کو بہ کشادہ پیشانی اختیار فرمایا جس سے عرب قطعاً

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بعینہ یہی بات ان معاملات میں صادق آتی ہے۔ یعنی جنگ یا لڑائی مذہبی لوگ نہیں کرتے بلکہ جنگ و جدال کرنے والے کبھی مذہبی بن کر لڑائی کرتے ہیں۔ یا تنگ خیال، رجعت پسند بھی مذہب والے نہیں ہوتے، بلکہ تنگ خیال یا رجعی خیالات رکھنے والے اتفاقاً اگر کسی مذہب کے بھی پابند ہوتے ہیں تو بے وقوفی سے لوگ ان کے خیالات و جذبات کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ پس واقعہ یہی ہے کہ گو قرآن کی بحث کا حقیقی موضوع جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے اور فقیر نے بھی اپنی متعدد کتابوں اور مقالوں میں بیان کیا ہے کہ اس کی بحث کا حقیقی موضوع تو انسان ہے۔ انسان کیسے بنتا اور بگڑتا ہے۔ بنتے ہوئے وہ اتنی بلندی حاصل کر لیتا ہے کہ ملائکہ سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ اور بگڑتے ہوئے وہ اتنا بگڑتا ہے کہ الانعام (چوپایوں) سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اصل مقصود تو قرآن کا اسی مسئلہ کو سلجھانا ہے لیکن ضمناً اس سلسلہ میں وہ دوسری باتوں کا بھی ذکر کرتا ہے خصوصاً جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے اس کی بحث کے حقیقی موضوع سے تعلق ہوتا ہے۔ اب ان ضمنی امور کے متعلق ایک خیال تو ان لوگوں کا ہے کہ عامیانہ خیالات کی رعایت کرتے ہوئے مذہبی کتابوں میں (العیاذ باللہ) خلافِ واقعہ امور کا بھی تذکرہ کر دیا جاتا ہے جو لوگ جنت اور دوزخ کے متعلق اس قسم کے خیالات پھیلاتے ہیں کہ حور و قصور، جنات و انہار کا جو ذکر قرآن میں پایا جاتا ہے یہ محض عوام کی دلچسپی کیلئے ہے۔ ورنہ جنت کو ان امور سے کیا تعلق، وہ پر روحانی وغیرہ الفاظ جن کے معانی کا کوئی معین خیال خود بولنے والوں کے دماغ میں بھی نہیں ہوتا۔ انہی سے جنت و دوزخ کی وہ تشریح کرتے ہیں جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ قرآن نے گویا (العیاذ باللہ) غلط بیانی سے کام لیا ایسی غلط بیانی جس کی وجہ سے لاکھوں لاکھ انسان دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف افراط کا یہ حال ہے دوسری طرف تفریط کی کیفیت یہ ہے کہ بعض لوگ اپنی آسمانی اور مذہبی کتابوں کے مبہم الفاظ کی مدد سے آج یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جدید اختراعات، ایجادات اور ساری نئی چیزیں جنہیں آج یورپ پیش کر رہا ہے۔ ان سب کا تذکرہ ہماری ان کتابوں میں موجود ہے۔ بہترین مثال اس تفریط کی ہمارے زمانے میں دیانند سرسوتی جی نے اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں پیش کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ توپ، بندوق، ہوائی جہاز، ریل، انجن وغیرہ وغیرہ ان ساری چیزوں کا ذکر ہمارے ویدوں میں موجود ہے لیکن صحیح راہ وہی ہے، اور یہ ہے کہ

ناواقف تھا۔ میری مراد خندق سے ہے، جو مدینہ منورہ کے اطراف میں کھودی گئی تھی، جسے دیکھ کر ابو سفیان (سپہ سالارِ قریش) نے کہا تھا۔

| | |
|---|---|
| واللہ ھذہ مکیدۃ ما | قسم خدا کی اس گھات کو اپنی جنگوں میں عرب |
| کانت العرب تکیدھا | نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ |

لیکن یہ جاہلی ذہنیت تھی کہ نئی چیز کو دیکھ کر گو، اس طریقے سے اس پر اعتراض کیا گیا۔ لیکن اسلام نے جس نمونے کو اس سلسلے میں پیش کیا وہ یہی تھا کہ خود اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابیوں کے ساتھ ایک عجمی طریقۂ مدافعت کو اختیار کرنے میں مشغول ہیں۔ سب کے ہاتھ میں پھاوڑے ہیں ۔ اور سب کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق سے مٹی کھود کھود کر باہر پھینک رہے ہیں، بخاری میں براء بن عازب صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے تھے۔

| | |
|---|---|
| رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم | دیکھا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے |
| ینقل معنا التراب | ساتھ مٹی ڈھوتے تھے۔ |

### غیر اقوام کی مفید صنعتوں کے سیکھنے پر پیغمبرؐ اور صحابہؓ کا اجماع

بلاشبہ خندق کے اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر قوم ہی کا کوئی طریقہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں اگر افادے کا کوئی پہلو ہے تو مسلمانوں کو اس کے اختیار کرنے میں قطعاً پس و پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ پیغمبر نے خود اپنے عمل اور اپنے صحابیوں کے اجماع سے اس کی سنت قائم فرمادی ہے۔

آج اپنے عہدِ انحطاط و زوال میں مسلمانوں کے سامنے سے پیغمبر کی یہ سنت تو نکل گئی اور یاد رہی بھی، تو وہ روایت، جس کی صحت میں بھی لوگوں کو کلام ہے۔ یعنی

| | |
|---|---|
| من تشبہ بقوم فھو | اور جو کسی قوم کے جیسا بننے کی کوشش کریگا |
| منھم[۱] | وہ ان ہی میں سے ہے۔ |

---

[۱] روایت چونکہ ابوداؤد کی ہے۔ اس لئے جیسا کہ علقمی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حسن کا پہلو اس کی سند پر غالب ہے ۔ اگرچہ مقاصد حسنہ میں السخاوی نے اس کو بھی جو جگہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخاوی کے خیال میں یہ روایت چنداں قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ بہر حال مان بھی لیا جائے کہ پیغمبری کا قول ہے۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کسی نفع وغیرہ سے بے پروا ہو کر محض اس لئے کہ کسی کی ادا بھا جائے اور زبردستی اس کی نقل میں اسی ادا کو اختیار کرنا تشبہ کا صحیح مطلب عربی زبان کے محاورے کی رو سے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اسی شخص پر طاری ہو سکتی ہے۔ جو اس شخص یا اس قوم سے مرعوب

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

اور اس بنیاد پر مسلمانوں میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو مسلمانوں کو ہر ایسی چیز کے اختیار کرنے سے روکتا ہے جس کا دُنیا کی کسی غیر مسلم قوم سے تعلق ہے۔ مگر ان ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ اس حدیث کا اگر وہی مطلب ہے۔ جو آپ لوگ پھیلا رہے ہیں۔ تو پیغمبرؐ نے عجمیوں کے اس مکیدہ دگھات) کو کیوں اختیار فرمایا۔ اور کیا یہ ایک ہی مثال ہے، پڑھئے' فتح خیبر کے واقعات پڑھئے۔ ان ہی میں ایک واقعہ آپ کو یہ بھی ملے گا، کہ صعب نامی قلعہ پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قلعہ کے تہہ خانوں کی تلاشی کا حکم دیا، تو لکھا ہے۔

**عہدِ نبوّت میں رومی دبّابے**

| | |
|---|---|
| وجد وا فی ھذا الحصن الذی ھو حصن الصعب' آلۃ حرب ودبابات ومنجنیقا (سیرت محمدیہ) | انہوں نے اس قلعہ میں (یعنی) صعب نامی قلعہ میں سنگ کے بعض آلات پائے بلکہ دبابے اور منجنیقیں بھی اسی میں ہاتھ لگیں۔ |

یعنی "دبابات" اور "منجنیق" جو قلعہ کشائی کے رومی آلات تھے' یہودیوں نے رومیوں سے ان کی صنعت سیکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ جدید آلات حرب پیش ہوئے' تو گیا یہ قرار دے کر کہ کافر رومیوں اور یہودیوں کے یہ آلاتِ حرب ہیں۔ آپ نے ان کو پھینک دینے کا حکم دیا؟ فتح خیبر ہی کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ دو قلعے وطیح اور سلالم چودہ دن کے

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مغلوب ہو گیا ہو۔ جس کی بلا وجہ محض اس لئے کہ فلاں آدمی یا فلاں قوم کا یہ طریقہ ہے۔ اس نے دیس کی ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر کا یہ انقلاب باطنی انقلاب کی دلیل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی جب بھی قرآنی آیت ومن یتولھم منکم فانہ منھم (اور یہود و نصاریٰ سے جو دوستی کرتا ہے وہ ان ہی میں سے ہے) کی بنیاد پر اسی نتیجہ تک میں پہنچتا جس نتیجہ تک حدیث کا مفہوم پہنچا رہا ہے۔ لیکن کسی قاعدے کی بنیاد پر کسی طرز یا طریقۂ عمل کو اختیار کرنا یہ بالکل جداگانہ امر ہے۔ اس کو تشبہ سے دُور کا بھی علاقہ نہیں۔ مثلاً ہم اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے گرم ملک کا ایک آدمی اس جوتے کو استعمال کرتا ہے جسے بوٹ کہتے ہیں جس میں تھوڑی دیر کے بعد ہی پاؤں میں بدبو کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب جوتے سے پاؤں نکالا جاتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں مرا ہوا چوہا پڑا ہے۔ بجز اس بات کے کہ جو لوگ یورپ والوں سے مرعوب ہیں اور ان کی ہر ادا انہیں محبوب ہو گئی ہے وہی اس قسم کے احمقانہ فعل کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اور اس کو اگر تشبہ قرار دیا جائے تو یہ صحیح ہو گا۔ لیکن مغربی اقوام کی میکانکی وصنعتی ایجادات واکتشافات کو سیکھنا' ان کے معاشی و عمرانی علوم کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنا اسے جو تشبہ قرار دے گا وہ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ۱۲

محاصرے کے بعد بھی جب فتح نہ ہوئے تو لکھا ہے۔

همّه عليه السلام ان يجعل علی من فيها المنجنيق۔ (کتاب مذکور)

ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو لوگ اس قلعہ میں تھے۔ ان پر منجنیق لگا دی جائے۔

اگرچہ اس کی نوبت نہ آئی اور دونوں قلعے یوں ہی فتح ہو گئے۔ پھر خیبر کے بعد طائف کے محاصرے میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کے ان آلات حرب سے کام لیا، جو عربوں اور مسلمانوں کے لئے ایک جدید چیز تھی۔ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف پر جو دبابہ استعمال کیا گیا تھا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بنوایا تھا۔ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں۔

**رومی دبابہ رسول اللہ صلعم نے خود بنوایا تھا؟**

اول دبابة صنعت فی الاسلام دبابة صنعت علی الطائف حين حاصرها رسول الله صلى الله عليه وسلم (الکتانی ج۱ ص۳۰)

سب سے پہلا دبابہ جو اسلام میں بنایا گیا وہ یہی دبابہ تھا جو طائف پر لگانے کیلئے بنایا تھا۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ فرمایا تھا

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی دبابے تیار کرائے تھے[1]۔ اسی طائف کے محاصرے میں منجنیق کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا تھا۔ الکتانی ہی نے لکھا ہے۔

اول من رمی بالمنجنيق رسول الله صلى الله عليه وسلم اهل الطائف دخل نفر من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم تحت دبابة ثم زحفوا الی جدار الطائف ليحرقوه (الکتانی ص ۳۷۵)

سب سے پہلے منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا۔ طائف والوں پر (قصہ یوں ہوئی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابی دبابے میں داخل ہو کر طائف کی فصیل تک پہنچے، تاکہ اس کے دروازے میں آگ لگا دیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جرش نامی شہر اس زمانے میں دبابات اور منجنیق وعرادات کی صنعت میں مشہور تھا عروہ بن مسعود ثقفی اور محمود بن غیلان جو مشہور صحابیوں میں ہیں۔ ان حضرات نے جرش جا کر ان آلات کے بنانے کا طریقہ سیکھا تھا۔ طبقات ص ۲۲۱ وفد ثقیف ج ۲۔ جرش کہاں ہے؟ بعض اسے یمن کا ایک شہر بتاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ شرق اردن کا کوئی شہر تھا ۱۲

دیکھ رہے ہیں آپ، مجمیوں کی مدافعت کا بھی ایک طریقہ خندق اور رومیوں کے اقدام کے جو مخصوص ذرائع (دبابات (منجنیق وغیرہ تھے) سننے اور دیکھنے کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار فرما لیتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں یورپ نے جو جدید آلاتِ حرب ایجاد کئے مسلمان اور مسلمانوں کی حکومتیں انہیں دیکھتی اور صرف دیکھتی رہیں۔ سیکھنے اور اخذ کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کا خمیازہ دنیا میں جو کچھ بھگتنا پڑا وہ تو خیر ہم بھگت ہی رہے ہیں دیں تو کہتا ہوں کہ آخرت میں بھی اپنے پیغمبر کو ہم مسلمان کیا منہ دکھائیں گے؟ اور لطف یہ ہے کہ نقصان یہ جو ہوا سو ہوا ہی، شماتت کرنے والے شماتت کرتے ہوئے عموماً اس کا الزام مسلمانوں کے مذہب کی طرف عائد کرتے ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا مذہب کی وجہ سے ہوا، یا مذہب سے بُعد ان نتائج کا ذمہ دار ہے؟

**عجمی لباس اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم**

اور کیا اس باب میں نمونے محض حربی مکائد و آلات ہی تک محدود ہیں، شلوار جسے عربی میں سراویل کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق لباس ہی سے ہے اب سنئے محدثین کیا کہتے ہیں۔ پوری تفصیل تو کتابوں میں پڑھئے، خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں عام دستور لنگی (ازار) باندھنے کا تھا۔ لیکن ایرانی شلوار (سراویل) استعمال کرتے تھے۔ اتفاقاً بعض عربی تاجر ایران سے عرب سراویل لائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک جب اس ایرانی لباس پر پڑی تو آپ نے اسے خرید لیا۔

ابوہریرہؓ جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا۔

یارسول اللہ وانک لتلبس السراویل؟ — یارسول اللہ کیا آپ شلوار پہنیں گے؟

جواب میں ارشاد ہوا۔

اجل! فی السفر والحضر واللیل والنہار[1] — ہاں! میں سفر میں، حضر میں، دن میں، رات میں ہر حال میں اس کو پہنوں گا!

اور ایسا کیوں کروں گا؟ اس کی وجہ اسی کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ۔

فانی امرت بالستر فلم اجد شیئا استرمنہ (جمع الفوائد عن اصحاب السنن والموصلی) — کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے ستر پوشی کا، اور میں اس سے زیادہ ستر پوش لباس نہیں پاتا!

یعنی وہی بات کہ نفع کا پہلو کسی چیز میں اگر پایا جا رہا ہو، تو محض اس لئے کہ کسی دوسری قوم کی طرف

---

[1] دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سراویل کو اگرچہ رسول اللہ خرید چکے تھے۔ لیکن پہننے کا موقع نزل ملکا اور رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

منسوب ہے۔ اسے چھوڑ نا تنگ دلی کی بات ہے، نقصان اس میں دوسروں کا نہیں خود اپنا ہے۔

**مسجدوں کے منبر کی تاریخ**

اہل مسلمانوں کو شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ آج مسجدوں میں ہر محراب کے بازو میں جو منبر نظر آتا ہے۔ یہ منبر اُن کی مسجدوں میں کہاں سے آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کے اظہار سے بعض طبقوں میں میری طرف سے کچھ برہمی پیدا ہو۔ لیکن اُن چیزوں کو میں کیسے چھپاؤں جن کے چھپانے کو جُرم قرار دیتے ہوئے خود پیغمبر نے آگ کے لگام کی دھمکی دی ہے[1]۔ اور ان ہی دھمکیوں کا نتیجہ تھا کہ مرتے مرتے بھی صحابہؓ جو کچھ جانتے تھے اس کو پہنچاتے چلے جاتے تھے۔

اتنا تو غالباً سب ہی جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ پہلے اسی تاریخی ستون سے ٹیک لگا کر دیتے تھے جس کا نام استن حنانہ ہے۔ لیکن کھڑے ہو کر خطبہ دینے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ زحمت محسوس فرمانے لگے تو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رض کا بیان ہے۔ یعنی وہ فرماتے ہیں کہ۔

| | |
|---|---|
| کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب یوم الجمعۃ الیٰ جزع فی المسجد قائماً فقال ان القیام قد شق علیّ فقال لہ تمیم الداری الا اعمل لک منبراً کما رأیت بالشام فشاور المصطفیٰ المسلمین فی ذالک فروا ان یتخذ وہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن ایک تھم سے لگ کر جو مسجد میں تھا خطبہ کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہونے میں مجھے گرانی محسوس ہوتی ہے۔ تب تمیم داری نے عرض کیا کہ آپ کیلئے ہم منبر نہ بنائیں؟ جیسا کہ میں نے شام میں دیکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں سے مشورہ کیا۔ رائے یہی طے ہوئی کہ منبر بنایا جائے۔ |
| (الکتانی بحوالہ ابن سعد ص ۷۸) | |

اور اس حدتک تو روایت گونہ ابھی مبہم ہے۔ الکتانی ہی نے قل قشندی کے حوالے سے جو یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| اول من عمل المنبر تمیم الداری عملہ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم | سب سے پہلے منبر جس شخص نے بنایا وہ تمیم داری ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ |

---

[1] مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو علم کو چھپائیگا قیامت کے دن آگ کی لگام اسکے منہ پر چڑھائی جائیگی"

وکان قد رای منابر الکنائس بالشام (الکنانی صفحہ مذکور)

علیہ وسلم کیلئے بنایا تھا اور شام کے گرجوں میں تمیم داری نے منبروں کو دیکھا تھا۔

جس سے معلوم ہوا کہ شامی عیسائیوں کے گرجوں میں تمیم داری نے اس منبر کو دیکھا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، جبکہ ہمیں معلوم ہے۔ کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ پہلے نصرانی تھے۔ ان کا آنا جانا بہ سلسلۂ تجارت عیسائی ممالک میں ہوتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو، مؤرخین کا یہ بیان اگر صحیح ہے، اور نا صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں، تو حاصل اس کا اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مسجد میں آج خلیب جس منبر پر بیٹھ کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے ہیں۔ یہ عیسائیوں کے گرجوں کی چیز ہے۔ جسے حضرت تمیم داری کے مشورے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں داخل کیا اور اس پر بیٹھ کر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا، ظاہر ہے کہ خطبہ بالکلیہ ایک دینی کام ہے۔ لیکن اس دینی کام کے انجام دینے میں منبر سے چونکہ آسانی میسّر آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اختیار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ محسوس نہیں فرمایا۔

**مسجد نبوی میں کرسی** اور گو عہدِ نبوتؐ کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا، لیکن صحیح مسلم اور نسائی میں جو یہ روایت پائی جاتی ہے۔ ابو رفاعہ العدوی صحابیؓ راوی ہیں کہ:

انتھیت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یخطب فقلت یا رسول اللہ رجل غریب یسال عن دینہ لا ادری ما دینہ قال فاقبل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وترک خطبتہ حتی انتھی الی فاتی بکرسی حسبت قواعد لاحدید فقال فقعد علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وجعل یعلمنی مما علمہ اللہ (الحدیث)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اس وقت آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ ایک مسافر، اپنے دین کے متعلق دریافت کرنے کیلئے حاضر ہوا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کا دین کیا ہے۔ ابو رفاعہؓ کہتے ہیں، کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور خطبہ ترک فرما دیا۔ (غالباً جمعہ وغیرہ کا خطبہ نہ تھا) اور میرے پاس تشریف لائے، پھر ایک کرسی لائی گئی — میں خیال کرتا ہوں کہ اس کرسی کے پائے لوہے کے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بیٹھے اور جو باتیں اللہ نے آپ کو بتائی تھیں مجھے سکھانے لگے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ منبر کے ساتھ مسجد نبوی میں کرسی بھی لاکر رکھی جاتی تھی اور خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہو کر تعلیم دیا کرتے تھے[1]

اور اس سلسلے میں نظائر و امثال کی جو کثرت ہے اسے میں کہاں تک بیان کروں، کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تنگ آستینوں کا جبہ جسے رومی جبہ کہتے تھے ہدیۃً پیش ہوا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس لئے کہ وہ رومی (یعنی یورپ) کی طرف منسوب ہے زیب تن فرمانے سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ اس کو پہن کر بسا اوقات آپؐ نمازیں پڑھتے تھے۔ جس کا ذکر صحاح کی کتابوں میں عموماً کیا گیا ہے۔ مقوقس شاہِ مصر نے خدمتِ والا میں ایک بلوری پیالہ بھی تحفۃً ارسال کیا تھا۔ لکھا ہے:۔

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ دین نام اس چیز کا ہے جس کے اجزاء و عناصر کے ساتھ حق تعالیٰ کی رضامندی و نارضامندی کا تعلق ہوا ظاہر ہے کہ کسی قول و فعل یا عقیدہ وغیرہ کے متعلق یہ حکم لگانا کہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا علم خدا ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے ورنہ اپنے جی سے کسی چیز کے متعلق یہ حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش ہوتا ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ خدا پر یہ جھوٹ باندھنا ہے یعنی عربی میں جسے افتراء علی اللہ کہتے ہیں' قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اعلان کیا گیا ہے کہ ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذباً (یعنی اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے) سچ پوچھئے تو بدعت اسی کا نام ہے۔ یعنی اپنے جی سے کسی عمل یا فعل کے متعلق لوگ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس کے کرنے پر ثواب ہوگا نہ کرنے پر گناہ ہوگا جو کھلا ہوا افتراء علی اللہ ہے۔ لیکن کسی نئے یا جدید کام کا اس طور پر اختیار کرنا جس کا تعلق نہ ثواب سے سمجھا جائے نہ عذاب سے۔ محض نئے ہونے کی وجہ سے اس کو بدعت قرار دینا غلط ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دین کا جو دستور سپرد کیا ہے اس کے اندر مستقلاً دو قسم کی چیزیں ہیں یعنی بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے مقاصد و اغراض کی تصریح کے ساتھ ان کی ظاہری شکل و صورت بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ ہر رکعت میں ایک رکوع دو سجدے مقرر کر دیئے گئے ہیں جائز نہ ہوگا کہ کوئی اپنی طرف سے بجائے دو سجدوں کے ایک سجدہ کا رکعت میں اضافہ کر کے اس کو تین سجدے بنا دے۔ لیکن اسی کے مقابلے میں بعض مطالبات شریعت کے ایسے ہیں کہ ان کی کوئی خاص صورت معین نہیں کی گئی ہے بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ جس شکل میں مسلمان چاہیں اس مطالبہ کی تکمیل کریں۔ مثلاً جہاد کا حکم ہے کہ مقصود کلمۃ اللہ کا بلند کرنا اور کفر کی شوکت کا ازالہ ہے۔ کسی زمانہ میں تلوار اور نیزے سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا تھا پھر جب توپ بندوق کا زمانہ آگیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کا فرض ہے کہ اصل مقصد جہاد کی تکمیل اسی شکل میں کریں جو اس زمانہ کا اقتضاء ہے۔ بحمد اللہ مسلمانوں کے فہم عمومی پر یہ نکات ہمیشہ واضح رہے ہیں۔ دوسری قوموں کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں میں اتنا جمود پایا جاتا ہے کہ اپنے مذہب کے ایک ایک نقطہ پر اصرار کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہر زمانہ میں خصوصاً جنگی انتظام کا اثر اس قوم کو لاحق نہ ہوتا تھا بلکہ فیاضی کے ساتھ دنیا کی قوموں کے جو رسوم طریقے کو زندگی کے ہر شعبہ میں اختیار کرتے چلے گئے۔ ان دونوں کو مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظر معلوم نہیں ہے ورنہ ان کے اس متضاد طرز عمل پر تعجب نہ ہوتا۔

فکان یشرب منہ (مواہب لدنیہ) اس پیالے میں رسول اللہ پیا کرتے تھے۔

## انگریزی دوا اور مسلمان

لیکن آج ان بزرگوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ بعض دواؤں کے استعمال سے وہ محض اس لئے گریز کرتے ہیں، کہ لوگ انہیں انگریزی دوا کہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی انگریزی دوا میں اگر کوئی ایسی چیز شریک ہو جس کا استعمال اسلام میں ممنوع[1] ہے، مثلاً شراب وغیرہ تو یہ دوسری بات ہے لیکن محض انگریز کی طرف کسی دوا کا منسوب ہو جانا، میں نہیں جانتا کہ یہ احتراز کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ یقیناً دواؤں کا پیدا کرنے والے خود حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہیں۔ شفا بخشی کی اگر ان میں خاصیت ہے تو یہ خاصیت بھی خدا ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ بجائے کسی مسلمان کے اس دوا کی خاصیت اگر کسی غیر مسلم نے دریافت کی ہے، تو محض دریافت کرنے کی وجہ سے، کیا وہ دوا اس کی ہو جائے گی، خدا کی دوا باقی نہ رہے گی؟

---

ہم تو صحیح بخاری میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ

علیکم بھذا العود الھندی[2] اس ہندی لکڑی کو اختیار کرو!

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں اس دوا کو ہند کی طرف منسوب کر کے الھندی فرمایا کرتے تھے۔ یہ زمانہ ہندوستان کا وہ تھا جس میں کفر و بت پرستی، شرک کی تاریکیوں کے سوا اس ملک میں اور کچھ نہ تھا۔ پھر کسی غیر اسلامی ملک یا قوم کی طرف منسوب ہو جانے ہی کی وجہ سے کسی دوا کا استعمال اگر قابلِ احتراز ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الھندی کی تصریح کے ساتھ اس کے استعمال پر لوگوں کو آمادہ کیوں فرماتے تھے؟

---

[1] بدل جب تک مل سکتا ہو، اس وقت تک حرام چیزوں کا دواءً استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ یہ صرف امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ ہے ورنہ ان کے سوا دوسرے ائمہ حتیٰ کہ خود امام صاحبؒ کے تلامذہ امام محمدؒ وغیرہ کے فتاویٰ میں مرقوم ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے دواءً ہر اس چیز کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ حالتِ صحت میں جس کا استعمال مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے۔ لیکن انگوری شراب کے سوا شراب کی دوسری قسموں کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں جو وسعت پائی جاتی ہے۔ اہلِ علم کے لئے ابتلاء کے موجودہ زمانے میں قابلِ غور ہے۔ ۱۲

[2] عود ہندی ایک قسم کی لکڑی تھی جو ہندوستان سے عرب درآمد ہوتی تھی۔ اس لئے اس کو عودِ ہندی کہتے تھے، نام اس کا قسط بتایا جاتا ہے اطبا بھی مختلف امراض میں اسے مفید بتلاتے ہیں۔ حدیث میں بھی ہے کہ سات بیماریوں میں یہ مفید ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ سات کے لفظ سے سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ بہت سی بیماریوں میں ان کے مفید ہونے کے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو عربی محاورے پر مبنی ہے۔ ۱۲

واقعہ تو یہ ہے کہ الاوائل[1] کے علوم و فنون کو الاواخر تک پہنچائے ہیں، یعنی مسلمانوں سے پہلے دُنیا کی جس قوم اور جس ملک میں بھی علم و دانش کا جو سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ اس سرمایہ کے اکثر و بیشتر حصہ پر قابو حاصل کر کے اور جس حد تک ان سے اپنے عہد میں ممکن تھا، ان میں اضافہ کر کے پچھلی نسلوں تک ان کو پہنچانے میں مسلمانوں نے جو درمیانی واسطہ کا کام انجام دیا ہے خواہ احسان فراموشوں کی جماعتیں اس کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن یقیناً یہ ایک واقعہ ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ اس واقعہ کے وقوع میں اگر یہ سمجھا جائے کہ بہت بڑا دخل ان ہی پیغمبرانہ حوصلہ افزائیوں کو ہے، جن کا اظہار اپنے قول و فعل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہتے تھے، تو اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ الکتانی نے عزبن عبدالسلام الامام کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عرب جس کمان کو استعمال کرتے تھے نسبتاً وہ ہلکی اور ان کی زہ بھی زیادہ کارگر نہیں ہوتی تھی۔ بخلاف اس کے ایرانیوں کی کمان ہر لحاظ سے عربی کمانوں سے بہتر ہوتی تھی۔ لکھا ہے، کہ:-

**عربی کمانوں پر ایرانی کمانوں کو ترجیح دی گئی**

مدن قسی العجم
وقال هما اقوی
منکم رمیه (الکتانی ص ۳۴۰ ج ۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ایرانی کمانوں کی تعریف فرمائی اور فرمایا کہ تیر پھینکنے میں وہ زیادہ زور دار ہیں!

یہی وجہ ہے کہ عربی کمانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں نے ایرانی کمانوں ہی کو اختیار کر لیا۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مصر کی مہم پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمانے لگے تو وداعی خطبہ اُس وقت فوج کے سامنے آپ نے جو دیا تھا۔ اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:-

السهم بالسهم والرمح بالرمح
والسيف بالسيف (الکتانی ص ۳۰۳ ج ۱)

تیر کا مقابلہ تیر سے، نیزے کا نیزے سے، تلوار کا تلوار سے۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہر وقت اور ہر ملک و مقام کے لحاظ سے جو چیزیں

---

[1] اسلامی مصنفین خصوصاً قدماء کی یہ ایک اصطلاح ہے۔ آنحضرت صلعم کے ذریعہ سے علم و عمل کا جو ایک جدید نظام مسلمانوں کو ملا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں یونانیوں، ایرانیوں، ہندیوں وغیرہ کے علوم و فنون کو علوم الاوائل کہتے تھے لیکن زمانے نے رُخ بدل دیا۔ اب اسلامی علوم کو قدیم و پارینہ علوم میں شمار کیا جاتا ہے۔

بھی مسلمانوں کو ان امور میں بہتر نظر آئیں انہیں اختیار کریں۔ یقیناً حضرت ابوبکرؓ کے اس خطبہ کی بنا پر آج مسلمانوں کو یہ خطبہ دینے والا کہ توپ کے مقابلہ میں توپ، ہوائی جہاز کے مقابلہ میں ہوائی جہاز استعمال کرو!" بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی بنیاد پر یہ کہنا بھی اسی سنتِ صدیقیؓ کو زندہ کرنا ہوگا کہ سائنس کے مقابلے میں سائنس، کیمیا کے مقابلے میں کیمیا، ایجادات کے مقابلے میں ایجادات الغرض مقابل کی طرف سے جو چیز بھی سامنے آئے چاہیئے کہ مسلمان بھی اسی طریقے کو سیکھیں اور اسی سے اس کا جواب دیں۔ واللہ اعلم تاریخوں کی یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض فوجیوں نے شکایت کی کہ ریشمیں لباسوں میں دشمنوں کو دیکھ کر ہمارے دل مرعوب ہوتے ہیں، باوجودیکہ عام حالات میں مسلمان مردوں کو ریشمیں لباس کے استعمال کرنیکی ممانعت ہے۔ لیکن لکھا ہے کہ اس شکایت کو سُن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان فوجیوں سے فرمایا

وانتم تلبسوا کما لبسوا (الکتانی) تم بھی وہی پہنا کرو جو وہ پہنتے ہیں۔

فقہ حنفی میں یہ جزئیہ جو پایا جاتا ہے کہ جنگ کے موقعہ پر اگر ضرورت ہو تو فوجیوں کے لئے ریشمی کپڑوں کا استعمال جائز ہے۔ غالباً اس کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی مشورہ ہے۔

الکتانی نے شہاب مرجانی ایک قازانی مؤرخ اور عالم کے حوالے سے یہ بات جو نقل کی ہے

**عہدِ عثمانی میں ہوائی پون چکیاں، مدینہ میں**

ان الرحی الھوائیۃ بالریاح المحدثۃ المترددۃ فی الصنادیق المتعددۃ وکان ذالک فی سنہ ۲۹ بعد الھجرۃ فی خلافۃ عثمانؓ (ص ۶۶ ج ۲)

ہوائی چکیاں جو ان ہواؤں سے چلائی جاتی ہیں جو مختلف صندوقوں میں چکر کھاتی رہتی ہیں۔ سنہ ۲۹ ہجری میں حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کے زمانہ میں مدینہ میں قائم ہو گئی تھیں۔

ممکن ہے کہ بعضوں کو اس میں کچھ شبہ ہو، لیکن "نبوت کبریٰ" نے عرب کی سرزمین میں جو بیداری پیدا کی تھی۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرے نزدیک تو "پن چکی" کا عہدِ عثمانی ہی میں مدینہ منورہ کے اندر مروّج ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔ بلکہ پھر مجھے وہی بات دہرانی پڑتی ہے کہ قرآن اگرچہ ایجادات واکتشافات، صنعت وحرفت کی سکھانے والی یا نوامیس فطرت اور اس کے امکانات پر بحث کرنے والی کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایک معین مقصد "الصراط المستقیم" کی طرف انسانیت کی راہنمائی ہے۔ جس پر چلنے والوں کے ساتھ حق تعالیٰ اپنی انعامی نسبت قائم فرما دیتے ہیں، مسلمانوں سے نمازیں پانچوں وقت اسی ہدایت اور راہنمائی کی دُعا کرائی جاتی ہے۔ اور قرآن کے کسی حصّے کو سنا کر امام اس کا جواب خدا

کی طرف سے لوگوں کو سناتا ہے[1]۔ لیکن ضمناً جن امور کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، چونکہ وہ بھی خدا ہی کا بیان ہے۔ اس لئے یقیناً وہ بھی کوئی واقعہ ہی ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن کا یہ بیان کہ "ہم نے ہوا کو سلیمانؑ کیلئے مسخر کر دیا تھا"۔ اور اس طور پر ہوا اُن کے قابو میں آگئی تھی کہ:۔

تجری بامرہٖ رخاءً حیث اصاب (ص) — چلتی تھی ہوا دھیرے دھیرے حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جدھر وہ چاہتے تھے۔

## ہوائی قوت کی طرف قرآن کا ایک اشارہ

پھر دوسری جگہ سورۃ الانبیاء میں ہے:۔

ولسلیمان الریح عاصفۃ تجری بامرہٖ۔ — اور قابو میں کر دی ہوا سلیمانؑ کے جو تیز و تند ہو کر چلتی تھی سلیمانؑ کے حکم سے!

بظاہر جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زیر اقتدار ہوا کچھ اس قدر آگئی تھی کہ جس رفتار پر چاہتے اسے چلا سکتے تھے۔ تیز کرنے کی ضرورت ہوتی تو تیز بھی کر سکتے تھے۔ عاصفۃ کے لفظ کا یہی تقاضا ہے۔ اسی طرح موقعہ ہوتا تو اس کی رفتار کو دھیمی بھی کر دیتے تھے۔ "رخاء" کے لفظ سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا پر حضرت سلیمان کو یہ اقتدار کسی معجزاتی رنگ میں بخشا گیا ہو۔ عام خیال یہی ہے۔ لیکن معجزاتی رنگ ہو، یا یہ سمجھا جائے کہ ہوا کا کوئی قانون حضرتؑ کی گرفت میں آگیا تھا، بہرحال جب ہوا اُن کے قابو میں آگئی تھی تو اس واقعہ کا وقوع بہرحال کسی شکل ہی میں ہوا ہوگا۔ آپ ذریعۂ علم میں اختلاف کر سکتے ہیں۔ یعنی الہام سے یہ علم انہیں حاصل ہوا تھا، یا عقل و فکر کا یہ نتیجہ تھا لیکن ہوا کے

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیل میری دوسری کتابوں میں پڑھنا چاہئے۔ خلاصہ یہی کہ عمومی اطلاق کے لحاظ سے تو القرآن اس پوری کتاب کا نام ہے جس میں قرآن کی دوسری سورتوں کے ساتھ سورۂ فاتحہ بھی شریک ہے لیکن خود قرآن میں سورۂ فاتحہ کو "السبع المثانی" کے نام سے موسوم کر کے "القرآن العظیم" کا ذکر اس کے مقابلے میں جو کیا گیا ہے۔ گویا اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ اور "القرآن العظیم" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں یعنی ہیں تو دونوں ہی وحی اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کے الفاظ لیکن مقصد سورۂ فاتحہ کا یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی اس درخواست کو خدا کے دربار میں پیش کریں۔ اسی درخواست کا جواب ان کو "القرآن العظیم" کی شکل میں دیا جائے گا۔ نماز در اصل اسی درخواست اور اس درخواست کے جواب کے پڑھنے کی ایک باضابطہ شکل ہے۔ امام عام مقتدیوں کی طرف سے دربارِ الٰہی میں درخواست کو پیش کرتا ہے۔ لوگ آمین کہتے ہوئے گویا اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں، پھر امام اس کے بعد خدا کی نمائندگی کرتے ہوئے قرآن کا کوئی حصہ سناتا ہے۔ یعنی جو درخواست پیش کی گئی اس کا یہ جواب ہے ۱۲

کسی خاص قانون کا علم جس کے بعد اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہو جائے۔ اس کے انکار کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عام طور پر علم کے جس سلسلے کو لوگ عقل و فکر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ علم بھی وہیں سے آتا ہے۔ جو الہامی علوم کا سرچشمہ ہے قرآن تقویٰ کے ساتھ فجور کے متعلق بھی جب خبر دیتا ہے۔ کہ

فالھمھا فجورھا و تقوٰھا! پھر الہام کیا اللہ تعالیٰ نے (نفس انسانی) میں اس کے فجور کو اور اس کے تقویٰ کو!

تو جو چیزیں فجور نہیں ہیں۔ الہام کی طرف منسوب کرنے میں اس کے متعلق آخر کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال بات خواہ مخواہ طویل ہو گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ خواہ کوئی بھی صورت پیش آئی ہو۔ لیکن قرآن کے اس اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح آج دنیا پر اسٹیم اور گیس یا برق وغیرہ کی قوتوں کا راز واضح ہوا ہے۔ اگر توجہ کی جائے۔ تو طاقت کا ایک بڑا ذخیرہ ہوا میں بھی ایسا مل سکتا ہے۔ کہ اس کو قابو میں لانے کے بعد آدمی اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لے سکتا ہے۔ آج نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا پر کل ہوا کے اس قانون کا راز واضح ہو، کیا تعجب ہے کہ اس راز کے طشت از بام ہونے کے بعد وہ ساری قوتیں، جن پر آج دنیا کو ناز ہے وہ ہوا ہو جائیں۔ کیونکہ جتنی آسانی کے ساتھ ہر جگہ ہوا آدمی کو میسر آتی ہے۔ اتنی سہولت کیساتھ نہ پٹرول ہی ہر جگہ مل سکتا ہے اور نہ اسٹیم، اور نہ برقی قوتوں کو اس آسانی کے ساتھ ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تو قرآن کے اس اشارے میں ارباب فکر کیلئے ایک "پیغام" ہے۔ چاہیں تو قوت کے ایک نامعلوم ذخیرے کی سراغ رسانی کا اسے ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کو تو میں تسخر سمجھتا ہوں، جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یورپ و امریکہ سے جہاں کوئی جدید چیز ایجاد ہو کر دنیا کے بازاروں میں پہنچی تو ایک طریقہ جاری ہو گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی پرانی کتابوں کو بغلوں میں لئے یہ کہتے ہوئے دوڑتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پیشتر یہ چیز ہمارے یہاں بھی موجود تھی۔ کچھ لغت کے دور از کار اشاروں، کچھ اپنی ذہنی زور آزمائیوں سے مدد لے کر چاہتے ہیں کہ توڑ مروڑ کر اپنے اس مقصد کو کسی نہ کسی طرح ثابت ہی کر دیں۔ میرے نزدیک "پدرم سلطان بود" کے بے جا اور جھوٹے فخر کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تورات و انجیل کے مغربی مفسرین نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ کہ خدا کی طرف منسوب کرنے کے باوجود، ان کتابوں کے بیانات کی وقعت ان کی نگاہوں میں بوڑھیوں کی کہانیوں سے زیادہ باقی نہیں رہی ہے

عام طور پر "مصلحتِ عام" کی رعایت قرار دے کر ان حقیقتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں جو تورات و انجیل کے صریح الفاظ سے ثابت ہوتے ہیں۔ خدا کا جو وزن اُن کے قلوب سے نکل گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن قرآن کو قرآن کے الفاظ کو، ہم مسلمان خدا کی کتاب، خدا کے الفاظ سمجھتے ہیں۔ خواہ ضمناً ہی کسی چیز کا اس میں ذکر کیوں نہ کیا گیا ہو۔ لیکن جب قرآن میں یہ ذکر آیا ہے تو یقین کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے اندر کوئی خاص معنویت رکھتا ہے۔ آج نہیں تو دنیا پر کل اس کی اصلیت واضح ہوگی۔ میں نے مثالاً آپ کے سامنے چند چیزیں پیش کی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ قرآن پڑھنے والوں کے سامنے قرآنی مضامین کا یہ پہلو بھی رہے تو اچھا ہے۔ خدا اور خدا کا کلام اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کو اسی نظر سے دیکھیں اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔ واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

**خالص دینی امور کے معاشی نتائج**

میں اپنی اصلی بحث سے ایک حد تک کچھ دُور پڑ گیا۔ چند مفید معلومات یہ تھے۔ جی راضی نہ ہوا کہ مسلمانوں تک انہیں نہ پہنچایا جائے۔ بہرحال اب میں پھر اصل گفتگو کی طرف واپس ہوتا ہوں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ عام طور پر جن چیزوں کو لوگ خالص دنیاوی کاروبار اور معاشی جدوجہد کے ذیل میں شمار کرتے ہیں، یعنی استعمار ارض، کھیتی، باغبانی، تعمیر وغیرہ۔ اسلام نے ان امور کو بھی دینی نتائج کے پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ دین کو آباد کرنے کے لئے اسلام دنیا کو آباد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، عرض کر چکا۔ اب اسی کا دُوسرا رُخ یعنی اسلامی تعلیمات کے جن عناصر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے، کہ وہ خالص دینی امور اور مذہبی عناصر ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ اخروی منافع و ثمرات کے ساتھ ساتھ اسلام نے ان کو دنیوی اور معاشی کامیابیوں کا بھی وسیلہ قرار دیا ہے۔

**ایک مغالطہ کا ازالہ!**

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس کی تفصیل سے پہلے کسی کو اس مغالطہ میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ شاید میرا اشارہ اسلام کے خدائی فوجداروں کے ان فیلسوفانہ تاویلوں کی طرف ہے۔ جن کی تعبیر اس زمانہ میں عموماً "فلاسفی"[1] کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر نماز کی فلاسفی، روزے کی فلاسفی، حج کی فلاسفی، اور خدا جانے کن کن چیزوں کی فلاسفیوں پر

---

[1] فلاسفی کے لفظ پر حضرت حکیم الامت کا فقرہ یاد آیا۔ کسی تقریر میں ارشاد ہوا کہ پرانے مدرسوں میں ہم نے فلسفہ کا نام سنا تھا اب زمانہ میں فلاسفی کا چرچا جب سننے میں آیا تو خیال گذرا کہ فلسفا نر کی "فلاسفی" کوئی مادہ کیا پیدا ہوئی ہے ۱۲

پہلے تو کانفرنس کے اسٹیج اور جلسوں کی پنڈال ہی میں دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ لیکن بتدریج اب بڑھتے ہوئے جبّہ و دستار اور منبر و محراب سے بھی یاحسرتا کہ ان ہی فلاسفیوں کی آواز بازگشت آ رہی ہے۔

"الآخرۃ" کا یقین جن سے چھین لیا گیا تھا، اگر "الدین" کو بھی وہ "الدنیا" بنانے پر مجبور رہوں، جن نتائج کا وعدہ "الآخرۃ" میں کیا گیا ہے۔ اگر "الاولیٰ" اور اسی "الحیوٰۃ الدنیا" میں ان کی نگاہیں، آج ان ہی نتائج کو ڈھونڈ رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے "مبلغ علم" کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ ذکر اللہ جو اقامت صلوٰۃ" کا قرآنی مقصد ہے۔ جو اس ذکر اللہ کے فوائد سے اندھا بنایا جا چکا ہے۔ بتایا جائے کہ وہ بے چارہ نماز کے قیام و قعود میں گرانی معدہ کی خفت کو اگر تلاش نہ کرے تو اور کیا کرے جس کے لئے "تقویٰ"، "شکر" کے الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ وہ روزے کو جسمانی صحت کی ایک طبی تدبیر اگر قرار دے رہا ہے۔ تو بتایا جائے کہ آخر اس کے لئے چارۂ کار ہی کیا ہے؛ جس کی تنگ نگاہ میں موجودہ زندگی کی تنگیوں سے زیادہ انسانی حیات کی کوئی اور شکل سما نہیں سکتی۔ وہ مسلمان ہونے کے دعویٰ کو آخر کس طرح نباہے گا۔ جب تک کہ ان ساری چیزوں کو جن کا حوالہ اخروی دور وجود میں دیا گیا ہے انہیں کسی نہ کسی صورت سے اس زندگی میں نہ ڈھونڈھ کر نکالے۔ "الدین" کو بھی "الدنیا" یا "آسمان" کو بھی جو "زمین" اس لئے بنا رہا ہے کہ اس کا دل اسی "الحیوٰۃ الدنیا" سے راضی ہو چکا ہے۔ موت کے بعد اپنے آگے وہ کچھ نہیں پاتا، کچھ نہیں پانا چاہتا۔ اس کوتاہ قسمت حرماں نصیب بے چارے کو تو خیر معذور بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن دین کے منادیوں، الآخرت کے داعیوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ جب وہ بھی عصری ماحول سے متاثر ہو کر اسلام کے خالص لاہوتی عناصر اور دینی ارکان کی فلاسفی بیان کرنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔

## اسلامی عبادات کی فلاسفی

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادتوں کے جو فوائد فلاسفی کے نام سے آج بیان کئے جا رہے ہیں، وہ ان عبادتوں پر مرتب نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ سچ یہ ہے کہ کسی کو ورزش ہی کرنا اگر مقصود ہو، تو نماز کی چند ہلکی پھلکی اٹھک بیٹھک سے غالباً اس کیلئے زیادہ بہتر ہو گا کہ وہ ڈنٹر پیلے، مگدر ہلائے، ڈمبل کا کام کرے، یا طبی اغراض سے جو روزے کو استعمال کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے مناسب ہو گا کہ فاقے کی ان صورتوں کو اختیار کرے جن کے درمیان میں بعض چیزوں کے پیتے اور استعمال کرنے کا مشورہ اطباء دیتے ہیں۔ مثلاً بیچ بیچ میں نمک آلودہ پانی کے چند گھونٹ بھی پیتا چلا جائے۔ پھلوں کا رس بھی کبھی کبھی نوش جاں کرے، اس

کے لئے دینی اوقات کی پابندی فضول ہے۔ سحری وافطار کی قیود سے ممکن ہے کہ ان جسمانی منافع سے محروم رہے جو طبّی مشوروں کے فاقے سے آدمی حاصل کر سکتا ہے۔

مگر بالفرض اگر اسلامی عبادات پر یہ فوائد مرتب بھی ہوتے ہوں۔ جب بھی ان فوائد کو، ان عبادتوں کا ذاتی مقصود قرار دینا، صرف یہی نہیں کہ "توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ" ہے۔ یعنی قائل کے قول کی ایسی توجیہہ ہے جس سے قائل خود راضی نہیں ہے۔ قرآن اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مقاصد اُن کے بیان کئے ہیں، یہ اس کے خلاف ہیں اور اسی لئے میرے نزدیک تو ایک حد تک اس قسم کی توجیہیں افترا علی اللہ وعلی الرسول کے حدود تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خدا پر اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ کے انتساب کی بے جا جسارت ہے۔

**مولینا تھانویؒ کا ایک لطیفہ**

یوں بھی بقول حضرت حکیم الامّت رحمۃ اللہ علیہ ان فلاسفیوں کی ایسی مثال ہے کہ عرقِ گلاب کا استعمال کوئی یہ بتائے کہ اس سے استنجا کیا جا سکتا ہے۔ اپنی مائیت اور سیالیت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ جو عرقِ گلاب سے آبدست کا کام لے گا۔ بلا شبہ اسکی نجاست کا تنقیہ ہو جائے گا، لیکن کیا عرقِ گلاب کا یہ صحیح استعمال اور اس کی یہ صحیح قیمت ہے؟ آم کی گٹھلی بونے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم اسے کیوں بو رہے ہو۔ کیا یہ جواب اس کا صحیح ہوگا کہ پتوں اور لکڑیوں کیلئے بو رہا ہوں، تاکہ ایندھن میں وہ کام آئے، واقعہ یہ ہے کہ جو بھی آم کے درخت لگاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد تو آم کے پھل ہی ہوتے ہیں، ضمناً اور ذیلاً لکڑی، اور پتوں کا نفع بھی خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ مولینا المعنوی فرماتے ہیں ؎

ہر کہ کارد قصد گندم بایدش      کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت کرنے والوں کا اصل مقصود تو گیہوں ہی ہوتا ہے۔ گھاس بھونسہ تو ذیلی نتیجہ ہے جو گیہوں کے طفیل میں حاصل ہی ہو جاتا ہے۔ یوں ہی اسلامی عبادات کی اصلی غرض تو وہی ہے جو قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔ مثلاً نماز کے مقاصد کو ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اقم الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ)      قائم کرو نماز، میری یاد کے لئے!

روزے کو فرض قرار دیتے ہوئے لعلکم تتقون (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو) لعلکم تشکرون (تاکہ تم شکر کرو) ارشاد ہوتا ہے الی الخیط الابیض من الاسود۔ پھر ہو سکتا ہے کہ ان اغراض کے ساتھ ساتھ ذیلی طور پر کسی کو وہ منافع بھی حاصل ہو جائیں۔ جنہیں آج ان عبادات کی توجیہہ میں پیش کیا جا رہا ہے!

بہرحال اسلام کے خالص دینی ومذہبی عناصر مثلاً ایمان ویقین، توبہ واستغفار، صلوٰۃ وزکوٰۃ، حج

دسوم وغیرہ وغیرہ کے متعلق میں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان خالص دینی چیزوں سے بھی دنیوی فوائد اور ان مذہبی ارکان سے بھی معاشی منافع حاصل کرنے کا ایک پہلو اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس سے میری غرض وہ نہیں ہے جسے اپنی طرف سے اسلام کے نادان دوست، چست گواہوں کی شکل میں نمودار ہو ہو کر اپنے نزدیک گویا ایک قسم کے ضعف اور سستی کا ازالہ اسلامی تعلیمات سے کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میرے نزدیک اس سے اسلام کی بنیاد استوار و چست نہیں، بلکہ کمزور اور سست ہوتی جا رہی ہے۔ آخر جب انہی اغراض کو آدمی دوسرے بہتر طریقوں سے زیادہ بہتر شکلوں میں حاصل کر سکتا ہے۔ جب وہ محلّہ کی کمیٹیوں سے نماز کی جماعت کا، اور سالانہ کانفرنسوں سے عید و بقر عید کی نمازوں کا نفع حاصل کر سکتا ہے۔ تو خواہ مخواہ ایک جدید عصری شکل کو چھوڑ کر ان ہی دینی اغراض کے لئے ان فرسودہ پرانی شکلوں کے اختیار کرنے پر کیوں اصرار کرنے لگا۔ جب عالمگیر موتمر کا انعقاد جنیوا اور کشمیر کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں ممکن ہے تو اسی کانفرنس کو وہ حجاز کے تپتے ہوئے ریگستان اور چٹیل میدان میں منعقد کر کے شرکاء کی راہوں میں رکاوٹ، ان کے آرام میں خواہ مخواہ خلل کیوں پیدا کرے گا؟

بہر حال میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ کوئی میری ذاتی رائے یا میرے دماغ کا کوئی خود تراشیدہ نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسی کو اور صرف اسی کو پیش کر دینا چاہتا ہوں جس کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود واضح الفاظ میں تشریح کی ہے۔ اس باب میں قرآنی آیات کا جو ذخیرہ ہے، سب کا نقل کرنا تو مشکل ہے۔ مثلاً چند مشہور آیتوں کا تذکرہ کر کے پوچھنا چاہتا ہوں، کہ جو چیزیں اسلام کی خالص دینی عناصر شمار ہوتی ہیں۔ کیا ان آیتوں میں ان ہی کو معاشی فوائد اور دنیوی منافع کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:...

**آسمان وزمین کی برکتیں اور ایمان وتقوےٰ**

| | |
|---|---|
| ولو ان اهل القرى امنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والارض (الاعراف ۹۶) | اور یقیناً بستیوں والے اگر مان لیں اور پارسائی اختیار کریں، تو ضرور ہم کھول دیں ان پر برکتوں کو آسمان سے اور زمین سے۔ |

جس کا بغیر کسی تاویل و توجیہہ کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان وزمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے، ہم ان کو ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ صاف و پاک، ستھری ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں جس کا نام "حیاتِ طیبہ"

ہے۔ وعدہ کیا جاتا ہے، ہر مرد اور عورت کو مخاطب کر کے کہ

| | |
|---|---|
| من عمل صالحاً من ذکر او | جو کوئی نیک کام کرے، مرد ہو یا عورت |
| انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ | بحالیکہ وہ ایمان والا ہو، تو ضرور ہم اسے |
| طیبۃ (النحل ۹۷) | جیتا رکھیں گے، سُتھری زندگی کیساتھ! |

"فلنحیینہ" کے لفظ میں لام اور مشدد نون سے وعدے میں جتنی وثوقی طاقت بھری گئی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں۔ صاف صاف، کھلے کھلے الفاظ میں اس وثیقہ کا اعلان کیا جاتا ہے کہ۔

**مشکل کشائی تقویٰ سے**

| | |
|---|---|
| من یتق اللہ یجعل | اللہ سے ڈر کر (گناہوں سے) بچے گا، بنائیگا |
| لہ مخرجاً ویرزقہ | اللہ اس کے واسطے نکلنے کی راہ اور روزی پہنچائیگا |
| من حیث لا یحتسب (الطلاق ۲۸) | اُسے ایسی جگہ سے جہاں سے اسے امید نہ ہو! |

کش مکش حیات کی دشواریوں کو "تقویٰ" سے حل کیا جا سکتا ہے اور ایسی روزی یا رزق، جس کے ذرائع کا پہلے سے خیال، وگمان بھی نہ ہو، الغرض قرآن کی ایسی آیتیں مثلاً

| | |
|---|---|
| انا لننصر رسلنا والذین آمنوا | ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان |
| فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد | والوں کی اس حیات دنیا میں اور اس دن بھی |
| (مومن ۵۱) | جب گواہیاں قائم ہوں گی! |

یا،

| | |
|---|---|
| ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم | یقیناً جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے |
| استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ | پھر اس پر ڈٹ گئے، اترتے ہیں ان پر فرشتے |
| ان لا تخافوا ولا تحزنوا نحن | یہ لے کر کہ نہ ڈرو، اور نہ کڑھو، ہم تمہارے یار اور |
| اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا | پشت پناہ ہیں، دنیا کی زندگی میں بھی، اور |
| وفی الآخرۃ (حم سجدہ) | الآخرۃ میں بھی! |

یا پیغمبروں کو جب اہل کفر نے وطن سے باہر کر دینے کی دھمکی دی، تو قرآن میں ہے کہ

**ایمان والوں کو زمین پر کفر والوں کے مقابلے میں بسایا جائے گا!**

| | |
|---|---|
| فاوحی الیھم | پس پیغمبروں پر اُن کے خدا نے وحی کی کہ ہم |
| ربھم لنھلکن الظالمین ولنسکننکم | ظلم کرنے والوں کو قطعاً برباد کر دیں گے اور ضرور |
| | بسائیں گے ہم تمہیں زمین میں ان کے نیست |

الارض من بعدھم ذلک لمن    ونابود ہونے کے بعد یہ (وعدہ) ان کیلئے ہے

خاف مقامی وخاف وعید (ابراہیم)    جو میرے مقام سے ڈرا اور ڈرا میری دھمکی سے!

ظاہر ہے، جس زمین (الارض) کے متعلق پیغمبروں پر خدا نے وحی کی۔ وہ اس دنیا ہی کی زندگی والی زمین تو ہے۔ کہ حق تعالیٰ کے مقام اور خدا کی دھمکیوں سے جو بھی ڈرے گا۔ اسی کو زمین میں بسایا جائے گا۔ مشہور آیت استخلاف میں بھی جنّت ہی نہیں زمین میں بھی تمکن کا وعدہ ایمان والوں سے کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ شرک نہ کریں۔ اور اللہ ہی کو پوجتے چلے جائیں۔ قرآن ہی میں ضمانت دی جاتی ہے کہ تقویٰ سے اس معاشی سہولت کو بھی جو چاہے حاصل کرسکتا ہے۔ بلکہ قرآن کی آیت

الذین آمنوا وکانوا یتقون    جو ایمان لائے اور ڈر کر گناہوں سے بچا کرتے

لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا    ہیں، اُن کے لئے بشارت ہے "الحیٰوۃ الدنیا"

وفی الاٰخرۃ لا تبدیل لکلمات    میں بھی اور "الاٰخرۃ" میں بھی۔ اللہ کی باتوں

اللہ۔ (یونس ۱۱)    میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

میں تو اسی ایمان اور تقویٰ کو اخروی منافع کے ساتھ ساتھ دنیاوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر حق تعالیٰ نے اس کو اپنا ایک ایسا کلمہ، یا ایسی بات یا ایک ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا۔ یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہی ہوا کہ ایمان و تقویٰ کسی میں پایا جائے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم ہو، ایسا نہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اسی مقصد کو اپنے اس مشہور فیصلے کی صورت میں ادا کیا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا    کیا خیال کر لیا ہے ان لوگوں نے جو بدیوں

السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ    کو بٹور رہے ہیں کہ ہم بنا دیں گے ان کو ان

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً    لوگوں کی مانند جو ایمان لائے، اور نیکیاں کیں

مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا    برابر ہو جائے گی ان کی زندگی اور انکی موت

یَحْکُمُوْنَ۔ (جاثیہ ۲۵)    بُرا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

یعنی ممات (موت) ہی کے ساتھ ایمان اور عملِ صالح کے نتائج کو وابستہ نہ خیال کرنا چاہیئے، بلکہ محیا۔ (زندگی)، بھی ان لوگوں کی، جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ جیتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی سے بالکل جدا ہو جاتی ہے۔ جو بجائے صالحات کے "السیّئات" (بدکرداریوں میں مبتلا) ہیں، پانی برسانے اور بادل بنانے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جس کے متعلق سنتے ہیں کہ آج یورپ و امریکہ میں تجربہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ تجربہ

سے بات آگے نہیں بڑھی ہے[1]۔

لیکن اسی توبہ و استغفار کو، جس کے متعلق شاید سمجھا جاتا ہے کہ قبر اور قبر کے بعد ان کے نتائج سامنے آئیں گے، قرآن بارش برسانے، ابر لانے کے آلہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کا اس آیۃ میں صراحۃً حکم دیتا ہے۔ پیغمبرؑ نے اپنی امت سے کہا :۔

**پانی برسانے کا قرآنی طریقہ**

| | |
|---|---|
| یا قوما استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ | اے میرے لوگ آمرزش طلب کرو اپنے مالک سے پھر پلٹو اسی کی طرف بھیجے گا وہ آسمانوں کو تم |
| یرسل السماء علیکم مدرارا | پر موسلا دھار بارش کے ساتھ اور بڑھائے گا |
| ویزدکم قوۃ الی قوتکم (ہود ۵۲) | وہ تمہاری قوت میں قوت کو! |

آج تو کوئی شاید اس تجربے کے ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہو، لیکن ہم کیا کریں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان ہے، جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ :۔

| | |
|---|---|
| بینما رجل فی فلاۃ من الارض | اچانک اس حال میں کہ ایک آدمی جا رہا تھا |
| فسمع صوتا فی سحابۃ اسق حدیقۃ | کسی میدان میں کہ اس نے ابر کے ایک ٹکڑے سے |
| فلان فتنحی ذلک السحاب فافرغ | آواز سنی "سیراب کر دے باغ کو فلاں شخص کے" آواز |
| ماءہ فی حرۃ فاذا شراجۃ من | کے بعد دیکھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا ایک کنارے |
| تلک الشراج وقد استوعبت | کی طرف ہٹ گیا اور برسا دیا اس نے پانی |
| ذلک الماء کلہ فتتبع الماء فاذا | ایک چٹیل میدان میں، پھر چند نالیوں میں سے |
| رجل قائم فی حدیقۃ یحول | ایک نالی میں سارا پانی سمٹ کر آ گیا، اور |
| الماء بمسحاتہ فقال یا عبد اللہ | ایک طرف بہنے لگا۔ آواز سننے والے کا بیان |

---

[1] مگر دجال والی حدیثیں اگر صحیح ہیں تو ہمیں یہ باور کرنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ کسی زمانے میں آدمی اس تجربہ میں بھی کامیابی حاصل کر لے گا۔ آخر دجال بھی تو آدمی ہی ہوگا۔ وہ جہاں چاہے گا بارش برسائے گا۔ صحیح حدیثوں میں جب یہ موجود ہے تو اس کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ کہ سائنس ترقی کے اس نقطہ تک نہ پہنچے گی۔ بلکہ ان حدیثوں میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ مردے کو بھی وہ زندہ کرے گا۔ گویا قوانینِ حیات سے واقف ہو جائے گا۔ مسافت کا مسئلہ جتنا اس زمانے میں غیر اہم ہو رہا ہے اس سے کیا اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ کرۂ زمین کے ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں کا دورہ آدمی چالیس دن میں کر لینے پر اگر قادر ہو جائے۔ جیسا کہ دجال کے متعلق مروی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دجال ہی پر سائنس کے کمالات و انکشافات کا آخری موجِ ختم نہ ہوگا۔

ما اسمك قال فلان للاسم
الذی سمعه من السحابة فقال
یا عبد الله لم سالتنی عن اسمی
قال سمعت صوتا فی السحاب
الذی هذا ماؤه یقول اسق
حدیقة فلان باسمك فما
الذی تصنع فیها قال اما اذا
قلت هذا فانی انظر الی ما
یخرج منها فاتصدق ثلثه
وا' كل انا وعیالی ثلثه وارد فیه
ثلثه ۔

ہے کہ میں اس پانی کی روانی کے پیچھے پیچھے چلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی ایک باغ میں کھڑا اپنی کدالی سے پانی کو الٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ اے اللہ کے بندے تیرا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا کہ فلاں نام ہے۔ یہ وہی نام تھا جسے اس نے لکّہ ابر سے سنا تھا۔ تب باغ والے نے کہا، اللہ کے بندے تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا۔ جواب میں اس نے کہا کہ جس ابر کا یہ پانی ہے اس سے میں نے یہ آواز سنی کہ سیراب کر فلاں کے باغ کو۔ یہ تمہارا ہی نام تھا۔ اب یہ تو بتاؤ کہ اس باغ کے ساتھ تم کرتے کیا ہو۔ تب باغ والے نے کہا کہ خیر جب تم نے یہ بات سنائی تو سنو، میں اس تمام پیداوار کو، جو باغ سے حاصل ہوتی ہے، اس کی نگرانی کرتا ہوں، پھر ایک تہائی پیداوار کا تو صدقہ کرتا ہوں اور تہائی میں میرے اہل وعیال کھاتے ہیں۔ اور ایک تہائی کو پھر اسی باغ میں واپس کر دیتا ہوں (یعنی مصارف باغبانی میں اسے خرچ کرتا ہوں)

گویا آب پاشی کی بے شمار تدابیر و وسائل میں قرآن کی رو سے اس کا ایک اہم ذریعہ توبہ و استغفار بھی ہے اور حدیث کی رو سے اس کی ایک کارگر تدبیر جس کی تصدیق تجربہ سے ہو چکی ہے، صدقہ ہے، اور یہی میری غرض تھی کہ ایمان و تقویٰ، توبہ و استغفار، صدقہ و خیرات وغیرہ جو خالص دینی اشغال و اعمال ہیں۔ اخروی منافع کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے معاشی سود و بہبود، دُنیاوی فلاح و صلاح کے بھی وہ ذرائع اور اہم و مؤثر ذرائع ہیں۔ اور یہ تو چند سرسری مثالیں ہیں، قرآن و حدیث پر جن کی تھوڑی بہت بھی نظر ہے۔ بادنیٰ وہلہ یہ چیزیں ان کے سامنے آسکتی ہیں۔ اگر استیعاب کیا جائے، تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے اور غار میں بند ہو جانے والے تین آدمیوں کا جو طویل قصہ بخاری شریف میں ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ "الآخرۃ" ہی نہیں، بلکہ "الدنیا" ہی میں اعمال صالحہ نے مشکلات سے اُنہیں نجات بخشی، میں نے اشارہ کیا ہے۔ اس پہلو سے روایات و آیات پر غور کیجئے، خود ہی باتیں سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔

**حصولِ معاش کا حکیمانہ طریق** | ان قرآنی حکمات اور نبوی ہدایات کے سوالوں بھی تو یہ سوچنے

کی بات ہے۔ کہ اپنی معاشی ضرورتوں اور سہولتوں کے سلسلے میں ہم جن چیزوں کے محتاج ہیں، جو انہیں پیدا کر رہا ہے، وہ نہیں، بلکہ صرف جن راہوں سے وہ پیدا ہو رہی ہیں، اُن کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچا کر اسی کے مطابق عمل کا صحیح طریقہ اختیار کرنا حصولِ معاش کی اگر یہ حکیمانہ د سائنٹیفک، تدبیر ہے تو غور کرنا چاہئے کہ ان ہی چیزوں سے افادیت کے باب میں قدرتی طور پر اس طریقۂ عمل کا اختیار کرنا ہمارے لئے کس درجہ ناگزیر ہے۔ جو علم دیقین کی اس روشنی کا اقتضا ہے جو خود، ان چیزوں کے خالق اور پیدا کرنے والے کے متعلق ہم اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے باہر پیدا ہو رہا ہے۔ اور جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں، کہ قرآن ان کے متعلق صرف یہی علم نہیں عطا کر رہا ہے۔ کہ اُن سب کی تخلیق اور ان سب کے عمل پیدائش کا تعلق حق تعالیٰ کی تنہا ذاتِ مبارک اور صرف اسی کے ارادۂ قاہرہ سے ہے۔ بلکہ اس نے تو بار بار اس کا بھی اعلان کیا ہے۔ کہ اس تخلیقی توحید کے علم دیقین کا نقش ہر اس فطرت پر کندہ اور کھدا ہوا ملے گا۔ جس سے یہ پوچھا جائے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ قرآن کبھی اسی سوال کو یوں دریافت کرنے کا حکم دیتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ولئن سالتھم من خلق السماوات | اگر ان سے پوچھو گے کس نے پیدا کیا آسمانوں |
| والارض (زمر، زخرف، لقمان) | اور زمین کو! |

یعنی آسمان وزمین کے نظام کے متعلق اگر پوچھو گے کہ اس نے کس کو پیدا کیا، پھر خود خبر دیتا ہے،

لیقولن اللّٰہ (جن سے پوچھا جائے گا، وہ جواب میں) قطعاً کہیں گے، کہ "اللہ"

پھر اسی سوال کو، ذرا وسعت دے کر یوں دریافت کرایا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| ولئن سالتھم من خلق السماوات | اور اگر پوچھو گے ان سے، کس نے پیدا کیا |
| والارض وسخر الشمس والقمر | آسمانوں اور زمین کو، اور مسخر کیا آفتاب |
| (لقمان، زمر، عنکبوت) | وماہتاب کو! |

یعنی اس نظام کی تخلیق ہی نہیں، بلکہ آفتاب اور اس کی روشنی وحرارت سے اسی طرح ماہتاب اور اس کی روشنی سے جو فائدے پہنچائے جا رہے ہیں، یہ کون کر رہا ہے، خبر دیتا ہے کہ جواب میں وہی

لیقولن اللّٰہ قطعاً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ

اسی دائرے کو اور کشادہ کر کے سوال کی صورت یہ قائم کی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| ولئن سالتھم من نزل من السماء | اور اگر پوچھو گے اُن سے، کس نے اتارا آسمان |

ماءً فاحیا بہ الارض بعد — سے پانی، اور جلایا اس سے زمین کو، اس

موتہا (عنکبوت ۶) — کے مرجانے کے بعد!

یعنی صرف علوی اجرام کے منافع ہی نہیں، بلکہ سمندروں سے ابخرے بنا کر پانی کا اڑانا، منجمد کرکے پھر اسی کو بارش کی شکل میں کھیتوں اور باغوں میں پہنچانا، مُردہ زمین کو اس ذریعہ سے ہر سال نئی زندگی بخشنی، یہ سارا معاشی کاروبار کون انجام دے رہا ہے، قرآن یقین دلاتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں بھی وہی

لیقولنّ اللہ — قطعاً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ!

اور آخر میں تو صاف صاف الرزق جو معاشی فوائد کی گویا قرآنی تعبیر ہے۔ اس کو بھی سوال کا جُز بنا کر یوں پوچھوایا جاتا ہے۔

قل من یرزقکم من السماء — پوچھو کہ کون روزی پہنچاتا ہے، تمہیں آسمان

والارض ومن یملک السمع — سے اور زمین سے اور کون مالک ہے شنوائی

والابصار ومن یخرج الحی — اور بینائیوں کا۔ اور کون نکالتا ہے، زندہ

من المیّت ومن یخرج المیّت — کو مردہ سے اور نکالتا ہے زندے کو مرے

من الحی ومن یدبر الامر — سے، اور کون ٹھیک ٹھاک کرتا ہے

(یونس ۳) — کام کو!

یعنی آسمان وزمین کے موجودہ نظام اور اُن کے باہمی تعلقات سے رزق، یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تو باہر کا سوال ہُوا، پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی و شنوائی، دانائی کی اعانت سے آدمی جن چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی ــ جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ اور منشاء ہے۔ دونوں کو ملا کر "من یدبر الامر" کا سوال جس کا ترجمہ ہے کہ "ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کرکے کون درست کرتا ہے" مطلب یہ ہے کہ اندر کی قوتوں سے ہو، یا باہر کی طاقتوں سے، ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کرکے قرآن دریافت کرتا ہے کہ یہ سب کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے۔ جواب کے متعلق پھر وہی ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

لیقولن اللہ (ان سارے سوالات کے جواب میں بھی) وہ قطعاً یہی کہیں گے کہ اللہ۔

یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہے۔ قرآن ہم کو اس ایمان وایقان پر مجبور کرتا ہے، کہ

سب کچھ اللہ کر رہا ہے۔ صرف یہی واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ و سرشتہ ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین و ضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے اسی کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹیفک) طریقۂ عمل قرار دیا گیا ہے۔ تو جو پیدا کر رہا ہے، اسی سے ان پیداواروں کو حاصل کرنے کیلئے اس کی باتوں کا ماننا، تاکہ ہماری مرضی پوری ہو، اسکی خلاف مرضی کی باتوں سے بچنا اپنی اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر چلنا، غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹنا اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے، گڑگڑا کر اس سے مانگنا۔ جس کی دوسری تعبیر ایمان، عملِ صالح، تقویٰ، توبہ و استغفار دعا، لحاح وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصولِ معاش کی یہ تدبیر، صحیح حکیمانہ تدبیر نہیں ہے۔ اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ تحقیق و تجربے کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں تو کیا دوسرے طریقے پر بھی وہی یقین، وہی علم ہمیں نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا، کہ قرآن انسانی جبلّت کا اسے لازوال علم قرار دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| قل اللّٰھم مالک الملک | کہو! — اے اللہ آپ ہی مالک ہیں ملک کے |
| تؤتی الملک من تشاء وتنزع | دیتے ہیں جسے آپ چاہتے ہیں۔ اور چھین لیتے |
| الملک ممن تشاء وتعزّ من | ہیں جس سے آپ چاہتے ہیں، آبرو بخشتے ہیں |
| تشاء وتذلّ من تشاء بیدک | جسے چاہتے ہیں۔ اور رسوا کرتے ہیں جسے چاہتے |
| الخیر انک علیٰ کل شیٔ قدیر | ہیں "الخیر" (ساری بھلائیاں)، آپ ہی کے ہاتھ |
| تولج اللیل فی النھار وتولج | میں ہیں۔ بے شبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں، آپ |
| النھار فی اللیل وتخرج الحیّ | ہی رات کو دن میں گم کرتے ہیں اور دن کو رات |
| من المیت وتخرج المیت من | میں گم کرتے ہیں نکالتے ہیں آپ ہی زندہ کو |
| الحیّ وترزق من تشاء بغیر | مُردے سے اور نکالتے ہیں مُردے کو زندہ سے |
| حساب۔ | اور روزی پہنچاتے ہیں جسے چاہتے ہیں، |
| (آل عمران ۳) | حساب کے بغیر — ! |

بس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کام مثلاً حصولِ سلطنت و حکومت، اور چھوٹے سے چھوٹا کام مثلاً روز کی روزی جس میں چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے بھی ہمارے شریک ہیں کام کے یہ دونوں سلسلے براہِ راست حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور کس طرح بندھے ہوئے ہیں؟

| | |
|---|---|
| مایفتح اللہ للناس من رحمۃ | جو کچھ کھولتا ہے۔ خدا لوگوں کیلئے رحمت |
| فلا ممسک لہا وما یمسک فلا | کے (سرچشمے) تو نہیں ہے کوئی روکنے |
| مرسل لہ من بعدہ۔ | والا اس کا، اور جسے روک دے خدا، تو نہیں |
| (الفاطر ۲۲) | ہے بھیجنے والا اس رحمت کا اس کے بعد کوئی۔ |

یعنی اپنی رحمت کے جس دروازے کو کسی پر کھول دے، آسمان و زمین کی کوئی دوسری قوت پھر اسے بند نہیں کرسکتی۔ اور جسے بند کر دے، کوئی دوسرا پھر اسے کسی طرح کسی حال میں کھول نہیں سکتا۔ جب "الخیر" (ہر وہ چیز جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہو، اور جس سے ہم نفع اٹھاسکتے ہوں) سب کی سب اسی کی مٹھی میں اور ید میں بند ہے، تو بتایا جائے کہ اسی "الخیر" کا طالب اس کی طلب میں قرآن کے حکم

| | |
|---|---|
| فابتغوا عند اللہ الرزق (عنکبوت ۲) | پس ڈھونڈو اللہ کے پاس روزی کو۔ |

اور

| | |
|---|---|
| واسئلوا اللہ من فضلہ (النساء ۳۲) | اور مانگو اللہ سے اس کے فضل کو۔ |

کی تعمیل کرتے ہوئے، جس کے پاس "الخیر" ہے۔ اسی سے اگر "الخیر" کو مانگتا ہے۔ تو بتایا جائے کہ عقل و دانش حکمت و دانائی کا بھی اس کے سوا اور کیا اقتضاء ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک تو معاشی جدوجہد کے سلسلہ میں عمل کا پہلا طریقہ، اگر کوئی عقلی تدبیر ہے تو دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عقلی تدبیر کہلانے کا مستحق ہے

**دعائی تدبیر کی کامیابی و ناکامی**

ناکامیوں کے ہزارہا تجربات کے بعد بھی جب آدمی کے لئے تدبیر کے پہلے شعبہ کا ترک کرنا بدعقلی کی دلیل ہے تو محض اس لئے کہ دعائیں بھی کبھی قبول نہیں ہوتیں تدبیر کے اس طریقہ سے محض اسی لئے بے تعلق ہو جانا آخر نادانی و حماقت کیوں نہ ہو۔ اپنے اختیار پر بھی جنہیں اختیار نہیں ہے۔ اور اپنا اقتدار بھی جن کے اقتدار میں نہیں ہے۔ جب ان ہی میں کسی کے اندر لوگوں کو اختیار و اقتدار کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ مثلاً کسی حکومت کا ہم میں کوئی عہدہ دار یا حاکم ہو جاتا ہے، بلکہ خود بے چارے سلاطین کو بھی کب اپنے نمائشی اختیار پر کامل اختیار ہوتا ہے۔ بہرحال اسی نمائشی اختیار و اقتدار کے مظاہر کو دیکھ کر جب دیکھا جاتا ہے کہ مسلسل نامنظوریوں کے باوجود ان کی

بارگاہوں سے درخواستوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا۔ ہزار دفعہ جس کا معروضہ مسترد ہو چکتا ہے۔ وہ ایک ہزار ایک کے بعد منظوری کی توقع کرتے ہوئے درخواست دینے سے نہیں گھبراتا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جو محکوم نہیں حاکم ہے، تابع نہیں متبوع ہے، جاہل نہیں عالم ہے۔ صاف صاف لفظوں میں کہئے کہ جو بندۂ خدا نہیں، خدا ہے۔ اگر کسی بندے کی کسی درخواست کو کسی وقت نہیں قبول فرماتا۔ جاہل کے جہل کا اپنے علم کو تابع نہیں بناتا تو یہ کیسے باور کر لیا جاتا ہے کہ جس کے اختیار میں سارے جہان کے اختیارات اور جس کے اقتدار کے ساتھ سارے جہان کے اقتدارات اٹکے ہوئے ہیں، بندے کے کسی مطالبہ کا پورا کرنا اس کے اختیار سے العیاذ باللہ خارج ہے۔

کس قدر عجیب ہے کہ اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو جو کافر قرار دیتا ہے، اللہ کے ان بندوں سے 'بندے' نہیں' بلکہ خدا کے بندوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ان سے کون پوچھے کہ آخر کس بنیاد پر تم نے اپنے خالق سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے مایوس بنا لیا۔ خدا نے تو کہا ہے' کہ

| | |
|---|---|
| لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔ | نہیں ناامید ہوتا کوئی اللہ کی رحمت سے مگر جو کفر والے ہیں! |

**کیا دعا صرف طفل تسلی ہے؟**

جس کا یہی مطلب ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی حق تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ لیکن لوگ ہیں، جو ایمان و اسلام کے دعوی کے بعد بھی اس کی رحمتوں سے ناامید ہو کر دعا و استغناء کو مشکلاتِ حیات کے حل کی راہ میں العیاذ باللہ جھوٹی طفل تسلی تک قرار دینے کی جسارت کر جاتے ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں کہ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا زیادہ سے زیادہ اس کا اگر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو یہی کہ اضطراب و بے چینی کی حالت میں آدمی کو اس سے گونہ قوت اور اطمینان کی خنکی مل جاتی ہے۔ اور یہ خیال کس بنیاد پر قائم کر لیا گیا؟ محض اس لئے کہ دعا کی گئی تھی، چونکہ قبول نہیں ہوئی اس لئے حصولِ مقاصد کی اس تدبیر کی تاثیر ہی کا انہوں نے انکار کر دیا۔ جو بات جس وقت کہی جائے، اسی وقت اسی شکل میں پوری ہو جائے۔ دعا کا مطلب جنہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے خدا کو خدا بھی باقی رکھا، اس کو کاربرآری کی کوئی ایسی مشین یا آلہ فرض کر لیا جس کا کھٹکا ان کے دل و دماغ اور زبانوں میں لگا ہوا ہے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ ادھر اس کھٹکے کو دبا دیا جائے اور چاہئے کہ ان کا آلہ ان کے مطلوب کو ان کے سامنے لا کر حاضر کر دے بعضوں کو قرآن کی آیتوں

| | |
|---|---|
| اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرہ) | جواب دیتا ہوں میں پکار کی، پکارنے والا جب پکارتا ہے مجھے! |

یا :-

ادعونی استجب لکم (المومن ۶۰) پکارو مجھے، میں جواب دوں گا تمہیں!

**بعض دعائی آیتوں کے متعلق غلط فہمی!**

وغیرہ سے بھی شاید مغالطہ ہُوا: استجابت و اجابت کا ترجمہ بجائے جواب دینے کے انہوں نے جو مانگا جائے اس کا قبول کرنا خدا جانے کس لغت کی بنیاد پر فرض کر لیا۔ حالانکہ پتھروں اور بتوں کے پُوجنے والوں کے مقابلے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اُن کے بہرے گونگے، مردہ، بے جان معبود جب اپنے پوجنے والوں کی پکار اور دہائی کو سنتے ہی نہیں تو جواب کیا دیں گے۔ لیکن جس کی ذات بینا و شنوا، حی و قیوم، سب کو محیط، سب کے قریب ہے وہ ہر ایک پکارنے والے کو قطعاً جواب دیتا ہے۔ لیکن پکارنے والے جو کچھ مانگتے ہیں اسے دے بھی دیتا ہے۔ یہ مطلب ان آیتوں کا کہاں سے لیا گیا۔

**پیغمبروں کی بھی ہر دعا قبول نہیں ہوتی**

کم از کم میں تو اس سے ناواقف ہوں، آخر جس قرآن میں یہ آیتیں ہیں، اسی میں تو ہے کہ معمولی ہستیاں نہیں، نوحؑ و ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبروں کی بعض درخواستوں کے قبول کرنے سے حق تعالیٰ نے انکار فرما دیا۔ خود سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کو خطاب کر کے قرآن ہی میں فرمایا گیا، کہ منافقین کی مغفرت کی درخواست اگر آپ ستر بار بھی پیش کریں گے تو اسے منظور نہیں کر سکتا۔ حدیثوں میں بھی ہے کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و قتال کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن نامنظور ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، مگر باوجود وعدہ کے محض اس لئے کہ خدا خدا ہے، بندہ نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب سے غنی ہے۔ کیا معلوم کہ ایفاء عہد کب کیا جائے گا، کس حال میں کیا جائے گا۔ خدا کے وعدوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والی ہستی کو میدانِ بدر میں دیکھا گیا تھا کہ سر خاک پر پڑا ہُوا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں کہ

**جنگِ بدر میں آنحضرت صلعم کا دعائی اضطرار**

| | |
|---|---|
| قاتلت یوم بدر شیئاً من | لڑا میں بدر کے دن ایک لڑائی، پھر آیا تو کیا دیکھتا |
| قتال ثم جئت فاذا رسول اللہ | ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سجدے میں |
| صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی سجودہ | اے زندہ، اے تھامنے والے سارے جہان کے |
| یا حی یا قیوم فرجعت فقاتلت ثم | یعنی "یا حی یا قیوم" فرما رہے ہیں۔ پس میں پلٹا |
| جئت فوجدتہ کذلک (فتح الباری) | اور لڑا، پھر آیا تو پاتا ہوں حضور صلعم، کو |
| | اسی حال میں۔ |

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھے ہوئے ہیں، تن بدن کا ہوش باقی نہیں ہے مونڈھے سے چادر مبارک ڈھلک کر گر گئی ہے، لیکن کامل انہماک واستغراق، دل کی ساری قوت و توجہ اصرار والحاح کے ساتھ زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

| | |
|---|---|
| اللهم انی انشدک عهدک | یا اللہ آپ کو یاد دلاتا ہوں اپنا عہد اور |
| ووعدک اللهم ان شئت لم | اپنا وعدہ۔ اے اللہ اگر آپ چاہیں، تو نہ |
| تعبد اللهم ان تهلک هذا | پوجے جائیں آپ، اے اللہ! اگر تباہ ہو |
| العصابة من اهل الاسلام | گئی یہ ٹکڑی اسلام والوں کی، تو نہ پوجے |
| لاتعبد فی الارض | جائیں گے آپ، زمین میں! |

(بخاری ومسلم وصحاح)

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی نصرت کو جس بے کلی اور اضطراب سے آج ڈھونڈھا جارہا ہے کہ بقول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

| | |
|---|---|
| ماسمعنا مناشد اینشد | ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم گشتہ چیز کو کوئی ڈھونڈھ رہا |
| ضالة اشد مناشدة من | ہو اس طرح جس طرح محمدؐ اپنے رب کو ڈھونڈھ رہے |
| محمد لربه۔ (فتح الباری) | تھے (یعنی اس کی نصرت کو تلاش کر رہے تھے |

مالک کے قدموں پر اس لوٹنے والے کو دیکھ دیکھ کر دوسروں سے نہیں رہا جاتا اور جیسا کہ بخاری میں ہے

| | |
|---|---|
| فاخذ ابوبکر بیده وقال | تب ابوبکرؓ نے آپؐ کے دستِ مبارک کو |
| حسبک | پکڑ لیا اور کہا کہ بس ہے آپؐ کے لئے۔ |

اسی کی تفصیل مسلم میں ہے

| | |
|---|---|
| فاتاه ابوبکر فاخذ رداءه | تب آئے ابوبکرؓ اور پکڑ لی چادر آپؐ کی اور |
| فالقاه علی منکبیه ثم التزمه | ڈال دیا اسے حضور صلعم کے مونڈھے پر، پھر لپٹ |
| من ورائه وقال یانبی الله | گئے ابوبکرؓ پیچھے سے اور کہہ رہے تھے، اے |
| فانه سینجزلک وعدک | اللہ کے نبی قریب ہے کہ پورا کیا جائے آپکے ساتھ آپکا وعدہ |

وعدہ جو کیا گیا تھا، اس کو تو بہرحال پورا ہونا ہی تھا اور وہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن حصولِ مقاصد کی اس کی تدبیر کی تعلیم ہمیں جس ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملی ہے۔ اس کے اس نمونہ میں ان لوگوں کے لئے بھی عبرت ہے جو سرے سے دعائی تاثیروں سے مایوس ہو کر ان کے منکر ہو بیٹھے ہیں، اور بصیرت ہے

ان کے لئے بھی۔ جزا استجابت" کا ترجمہ" جو کچھ مانگا جاتا ہے وہ اسی وقت دے دیا جاتا ہے" اپنی طرف سے کر کے اپنی ہر دو رکعت کے بعد کی دعاؤں پر اُمید لگا بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ مانگا گیا ہے کارکنانِ قضا و قدر اسے آسمانوں سے لئے آ رہے ہوں گے۔ اگر یہ معاملہ اتنا آسان تھا تو اس تدبیر کے سب سے بڑے ماہر اور معلّم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار و الحاح اور ان الفاظ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جو اس حدیث میں ہم پڑھتے ہیں۔ ہمیں اپنی معاشی ضرورتوں میں بھی دعائی طریقۂ عمل کو پُوری قوت کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں چونکہ واقعاتِ بدر کے اس حصّہ سے روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے قصداً میں نے اس چیز کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ بدر کی ان دعاؤں میں جو کچھ مانگا جا رہا تھا، اگرچہ اصل مقصود تو دین ہی کا غلبہ اور حق و صداقت کی سربلندی ہی تھی۔ لیکن بعض معاشی دعاء کا ذکر ابتدائی بیان میں آیا تھا۔ یہی مسلمانوں کو پیش کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"پروردگار! یہ بھوکے ہیں، انہیں سیر فرما۔ یہ پیادہ پا ہیں انہیں سواری دے، یہ ننگے ہیں انہیں کپڑے پہنا"

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کا تعلق بھی جنگِ بدر سے ہے۔ یعنی بدر کے میدان میں کفار کے مقابلے میں جب مسلمان صف آرائی کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ دعا فرمائی تھی تو، کیا دین کے ساتھ اس دعا میں دُنیا کا پہلو بھی نہ تھا؟

**دعائی تدبیر کے ساتھ عقلی تدبیر**

اسی جنگ کے موقع پر کامیابی کی اس کلی اور کلیدی تدبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرف اتنا انہماک تھا۔ یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے ہاتھ میں تھا اس سے مانگنے میں ایک طرف اتنا زور صرف ہو رہا تھا، تو جاننے والے جانتے ہیں کہ دوسری طرف جن راہوں سے حق تعالیٰ جنگ میں کامیاب ہونے والوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں۔ جنگ کے ان ضوابط و آئین کے اختیار کرنے میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ میدان جنگ میں بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے۔ پتھروں اور ڈھیلوں سے غنیم پر کس وقت حملہ کیا جائے، ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر فرما دیا گیا تھا۔ دشمنوں کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی، مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک ان کو منقطع کرنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ، اُن میں سے ہر بات کی تعلیم اور ان پر اپنی خاص توجہ، براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قائم کئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ دستِ مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کی ترتیب کو درست فرما رہے تھے[1]۔

---

[1] ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے محض عقلی تدبیروں کو پیش نظر رکھ کر غزوات نبویہ پر ایک مضمون لکھا ہے جس سے ان

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اعتدال کے نظری نقطۂ نظر سے جن طبائع میں انحراف پیدا ہو گیا ہو، اس سلسلہ میں ان کا کچھ بھی مذاق ہو لیکن جن کا مزاج خالص فطری حال پر باقی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کی فطرت حصول مقاصد کی راہ میں تدبیر کی اسی جامعیت کو چاہتی ہے۔ یعنی جو پیدا کر رہا ہے۔ اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، ان میں بھی تلاش کیا جائے۔ تعلیم کی یہی جامعیت اسلام (خدائی تعلیم) کی خصوصیت ہے۔ اسلام کو الدین القیم (لازوال سیدھی راہ) قرار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| فطرۃ اللہ التی فطر الناس | اللہ کی آفرینش جس پر پیدا کیا اس نے آدمی کو: |
| علیہا لا تبدیل لخلق اللہ | اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کا بدلنا نہیں ہے۔ |

اس کا یہی مطلب ہے کہ جن فطری اقتضاآت اور حالات پر قدرت نے انسان کو پیدا کیا ہے، مذہب ان میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا، بلکہ فطرت کے اس نقطہ سے جن کی طبیعتیں ہٹ گئی ہیں۔ وہ ان ہٹی ہوئی طبیعتوں کو پھر فطرت کے اس مقام پر واپس کر دیتا ہے۔ جس کے بعد آدمی کے تمام فطری مطالبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے سلسلے میں تدبیر و طریقۂ عمل کے ان دو شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو چھوڑ کر جو بیٹھ جاتے ہیں۔ بظاہر اس کا سبب ان کے مزاج اور طبیعت کا فطری بگاڑ ہوتا ہے۔

**دونوں شعبوں کی اہمیت میں فرق**

البتہ پیدا کرنے والا چونکہ ایک ہے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں وہ بے شمار ہیں، اور کسی بے شمار کہ ان کی حد ہے نہ حساب، گہر بننے کے لئے ایک ایک قطرے کو بقول غالب مرحوم ع دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ـــــ کے گوناگوں پیچیدہ اور نازک قوانین سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے تدبیر کا پہلا شعبہ دوسرے شعبہ سے نسبتاً آسان ہے۔ ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے، سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا کام ہے کہ جس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی بالآخر اس کام کو کر ہی لیتا ہے۔ اسی لئے اس کا جذبہ تو قدرت نے ہر ایک میں رکھا ہے، اور اسی کا نام اصطلاحاً مذہبی جذبہ ہے۔ لیکن تدبیر کے دوسرے شعبہ میں عمل پیدائش کے ان پیچیدہ قوانین سے سابقہ پڑتا ہے۔ کہ ہاتھ سے چمچہ کو منہ تک پہنچانے میں آدمی کو ہزاروں مرحلوں کا اندیشہ گذرتا ہے، یا جیسے غالب نے محسوس کیا کہ ایک ایک قطرہ کو موتی کی حالت تک

---

بقیہ صفحہ گذشتہ :- کی غرض یہ نہ تھی، جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ان ہی تدبیروں کے ساتھ ان لڑائیوں کی کامیابیوں کو وہ منحصر خیال کرتے ہیں، بلکہ صرف ایک پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے ۱۲

پہنچنے کے لئے دریا کے ہر حلقۂ موج میں نہنگوں کے سینکڑوں منہ جو کھلے پڑے ہیں، سب کو بند کرنا پڑتا ہے۔ بقول کاشتکاروں کے "بگڑی کے ایک پھیرے میں کام بگڑتا ہے۔" گویا

ع رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر

کا خطرہ قدم قدم پر پیش آتا ہے۔ اسی لئے تدبیر کے اس جزئیاتی اور تفصیلاتی شعبہ کا حق ادا کرنا، جیسا کہ چاہیئے، ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر وہی قابو پا سکتا ہے۔ جو پیدائش کے سارے قوانین اور ان کے نازک پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہو اور عمل کی قوتوں سے بھی قدرتاً سرفراز ہو، غالباً یہی وجہ ہے کہ تدبیر کے اس شعبہ کا مکلف ہر شخص اپنی اپنی عقل اور قوتِ عمل ہی کے حساب سے ہے بخلاف پہلے شعبے کے، کہ وہ ایک کلی تدبیر ہے، پیدائش کی راہوں سے نہیں، بلکہ خود پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مانگنا ایک ایسا فعل ہے کہ دنیا میں جو کچھ نہیں کر سکتا، مانگنے پر تو وہ بھی قادر ہوتا ہے اور "مانگ" ہی اس کی آخری پناہ ہے۔ اسی کے ساتھ جب ان امور پر بھی غور کیا جائے، کہ پیدا کرنے والا چونکہ ایک ہے، وہ بدل نہیں سکتا، لیکن جن راہوں سے پیدا کر رہا ہے، اس کو اختیار ہے کہ انہیں بدل دے۔ پھر تدبیر کے پہلے شعبے کا طریقۂ عمل جس عملی اساس پر مبنی ہے (یعنی سب کچھ حق تعالیٰ پیدا فرما رہا ہے) چونکہ وہ ایک یقینی بلکہ جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ فطری وجدان ہے۔ بخلاف دوسرے شعبے کے کہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اولاً ان سب کا احاطہ آسان نہیں اور احاطہ کر بھی لیا جائے تو چونکہ اس سلسلہ کی ساری معلومات عقل و حواس سے حاصل ہوتی ہیں، اس لئے عقل و حواس کے حدود میں اسباب و علل کے جو حلقے داخل ہیں، ان تک تو رسائی ممکن بھی ہے۔ لیکن ان کی سرحدوں سے جو حلقے باہر ہیں۔ ان کے متعلق اقرارِ جہل کے سوا عقل کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں، اسی لئے سمجھنا چاہیئے کہ اس راہ کی عقلی کوشش جس حد تک بھی پہنچی ہو، لیکن جو طریقۂ عمل عقل کے ان معلومات و تجربات پر مبنی ہوگا بہرحال ناقص علم اور ناقص تجربہ ہی پر وہ مبنی ہوگا۔ الحاصل تدبیر کے ان دونوں شعبوں کے یہی نمایاں امتیازات ہیں جس کی بنیاد پر اگر مذہب میں تدبیر کے پہلے شعبے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو یقیناً وہ اس کا مستحق ہے، قرآن مجید میں

| | |
|---|---|
| للہ غیب السمٰوٰت والارض | اللہ ہی کی ہیں، آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ |
| الیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ | باتیں، پلٹتی ہے بات سب کی، سب اسی کی |
| وتوکل علیہ | طرف تو اسی کو پوجے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگاؤ! |

کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ پیدائش کے ان ہی آئین و قوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس و عقل کی رسائی کے حدود میں ہوں۔ لیکن "السمٰوات والارض" کے قوانین کا وہ حصہ، جو حواس و عقل سے غائب ہے۔ یعنی "غیب السمٰوات و الارض" ان کے متعلق تمہارے لئے چارۂ کار یہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ وہی ذات، جس کے ساتھ تمام چیزوں کی پیدائش وابستہ ہے، سارے کاروبار کی جس پر انتہا ہے اسی کو اپنا وکیل بنا کر اسی کو پوجتے اور اسی سے مانگتے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔ گویا عقل و حواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو اقتضاء ہو اس کو پورا کرنے کے بعد واقعہ یہی ہے کہ آخری پناہ آدمی کیلئے پیدا کرنے والے کی پناہ اور اس پر توکل اعتماد کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ جب ساری باتیں اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہیں اور وہی مختار کل ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنے اوپر ٹیک لگانے والوں کو وہ بے ٹیک اور بے سہارا کر دے گا۔

| | |
|---|---|
| من یتوکل علی اللہ فهو حسبه | جس نے ٹیک لگایا اللہ پر، بس وہ بس ہے |
| (الطلاق ۳) | اس کو۔ |

کا یہی مطلب ہے کہ بہر حال ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی مقصد ہے اس کا۔ کہ

| | |
|---|---|
| ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن | اور الطاغوت (یعنی ہر وہ چیز جو خدا سے |
| باللہ فقد استمسک بالعروة | طغیان و سرکشی پیدا کرے) اس کا جس نے |
| الوثقی لا انفصام لها۔ | انکار کر دیا اور اللہ کو مان لیا تو اس نے پکڑ لیا |
| (البقرہ ۲۵۶) | مضبوط ترین کڑے کو، نہیں ہے مسک بھی اسکے لئے |

کیونکہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، اگرچہ وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی راہیں ہیں اور اسی لئے قرآن میں ان کا نام "سنۃ اللہ" (اللہ کی راہ) ہے اور یہ حق تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ بدلنے کی قدرت کے باوجود بندوں کی سہولت کے لئے جس چیز کی پیدائش کا جو طریقہ جاری فرما دیا گیا ہے۔ عموماً اسے بدلا نہیں جاتا۔ سنۃ اللہ کی اسی عدم تبدیلی پر ہمارے تمام عقلی قوانین کی قانونیت اور کلیت مبنی ہے۔ اور ان ہی کلیت پر سارے کاروبار کا دارومدار ہے۔ ورنہ پیدائش کی راہیں اگر روز بروز بدلتی رہتیں تو کسے بھروسہ ہو سکتا تھا کہ جو چیز جس طریقہ اور جس راہ سے آج پیدا ہوئی ہے کل بھی اسی طریقہ سے پیدا ہو گی۔ خدانخواستہ ایسا ہوتا تو زراعت ہو یا تجارت، صنعت ہو یا حرفت دنیا کا کوئی معاشی کام کیا سرانجام پا سکتا تھا؟

مگر ظاہر ہے کہ پیدائش کی عام راہوں کے متعلق ہماری جو معلومات ہیں، سنۃ اللہ کے تمام گوشوں پر ان کے حاوی ہونے کا تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ آگ جلاتی ہے۔ بے شک عام آدمیوں کے لئے یہی اللہ کی سنت ہے۔ جو آگ میں کودے گا جلے گا۔ لیکن کون مدعی ہو سکتا ہے کہ اپنے رسولوں اور برگزیدوں کے ساتھ بھی خدا کی یہی سنت اور اس کا یہی برتاؤ ہے۔ پانی میں آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔ خدا کی یہ سنت ہے۔ لیکن مچھلی اسی پانی میں ڈوب کر زندہ رہتی ہے۔ کیا یہ خدا کی سنت نہیں ہے؟ الغرض سنۃ اللہ کی عدم تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو علم سنت اللہ کے متعلق ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر اسی کے مقابل جو پیدا کر رہا ہے۔ وہ خود بھی غیر متبدل اور اس کے متعلق جو ہمارا علم ہے وہ بھی غیر متبدل ہے۔ پس اسلام گو ان تدبیروں کا بھی احترام کرتا ہے جو تغیر پذیر معلومات پر مبنی ہیں۔ یعنی ہم جنہیں عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ اصرار کیا گیا ہے کہ حتی الوسع ان معلومات کے مطابق طریقۂ عمل اختیار کرنے میں سستی اور غفلت نہ برتی جائے۔

| | |
|---|---|
| ولیاخذوا حذرهم واسلحتهم | اور چاہئے کہ اٹھالیں وے اپنے بچاؤ کے سامان |
| ود الذین کفروا لو تغفلون عن | کو اور اپنے ہتھیاروں کو، چاہتے ہیں وہ لوگ |
| اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون | جنہوں نے کفر کیا کہ اگر تم غافل ہو جاؤ، اپنے |
| علیکم میلة واحدة ولا جناح | ہتھیاروں سے اور اپنے ساز و سامان سے، تو ٹوٹ |
| علیکم ان کان بکم اذی من | پڑیں وہ تم پر ایک دفعہ اچھی طرح سے ٹوٹ کر، اور |
| مطر او کنتم مرضیٰ ان تضعوا | اس میں مضائقہ نہیں، اگر بارش کی وجہ سے کچھ |
| اسلحتکم وخذوا حذرکم! | ناگواری ہو، یا تم بیمار پڑ جاؤ، یہ کہ اتار دو اپنے |
| (النساء، ۵/۱۵) | ہتھیاروں کو اور لئے رہو بچاؤ کے سامان کو۔ |

اسی قسم کی قرآنی ہدایات کو اگر جمع کیا جائے تو ان کا ایک ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں تدبیر کے اسی شعبہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جنہیں ہم عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ بیماری وغیرہ میں ہتھیار اتارنے کی اجازت دے کر پھر

| | |
|---|---|
| خذوا حذرکم (النساء، ۵/۱۵) | اپنے بچاؤ کے سامان کو پکڑے رہو! |

کے حکم کو بحال رکھنا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تدبیر کے اس شعبے کو بھی اسلام میں کتنی اہمیت ہے۔

ابوداؤد و ترمذی کی مشہور حدیث

| | |
|---|---|
| من بات وفی یدہ ریح غمر | جو رات کو اس طرح سو جائے کہ اس کے ہاتھ میں |

| | |
|---|---|
| فاصابه شیئ فلا یلومن الا نفسه | (آلائش کی بو ہو اور اسی وجہ سے کوئی ضرر اسکو پہنچے تو چاہئے کہ ملامت نہ کرے مگر خود اپنے آپکو! |

(بسا اوقات چوہا سانپ یا اسی قسم کے حشرات سے آدمی کو نقصان اسی بے احتیاطی کی وجہ سے پہنچ جاتا ہے) میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرما دی ہے کہ اگر ان تدبیروں کے ترک کرنے سے کسی کو نقصان پہنچے تو اس نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ پھر ناقص معلومات، ناقص تجربات پر تدبیروں کا جو شعبہ مبنی ہے بے شمار پیچیدہ قوانین سے متعلق ہونے کی وجہ سے تغیر و تبدیلی کے احتمالات سے وہ پاک نہیں ہے، خصوصاً جب اس سلسلہ کے غیبی حلقے ہماری نگاہوں سے اوجھل بھی ہیں۔ علاوہ ان کے جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوئی ہیں وہ علم و ادراک وغیرہ کے حیاتی صفات سے بھی عموماً خالی ہوتی ہیں! لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب تدبیر کے اس شعبہ کو ہم ترک نہیں کر سکتے، نہ عقلاً ترک کر سکتے ہیں، نہ ہماری فطرت اس کی اجازت دیتی ہے۔ نہ دین کا یہ حکم ہے، تو تدبیر کا وہ شعبہ جو ناقص معلومات پر نہیں، بلکہ علم کے لازوال، ٹھوس، غیر متبدل اساس پر مبنی ہے، بہتوں سے نہیں، بلکہ اس تدبیر میں صرف ایک ہی سے کہنا ہے، جو کچھ کہنا ہے، ایک ہی سے پانا ہے، اسی کے ساتھ اگر یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ تدبیر کی اس راہ میں ہمارا جس سے تعلق ہے، وہ ایک حیّ و قیوم، زندہ و توانا، دانا و بینا ذات ہے صرف یہ ہی نہیں، بلکہ رحم و کرم سے بھی معمور ہے، ارحم الراحمین ہے، اپنے رسول کے ذریعہ سے اس نے خود اپنی اس خصوصیت کا اعلان کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (ترمذی) | جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔ |
| من لم یسأل اللہ غضب اللہ علیہ (حصن حصین بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ) | اللہ سے جو نہ مانگے، حق تعالیٰ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔ |

جس کا کام ہی دینا ہے، دینے ہی کے لئے بیٹھا ہے۔ اگر اسی کے حکم

| | |
|---|---|
| رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا (المزمل ۹) | پالنے والا پورب اور پچھم کا، نہیں ہے کوئی اللہ اس کے سوا، بس بنا اسی کو اپنا وکیل! |

کی تعمیل کرتے ہوئے مشرق و مغرب کے اسی پالنے والے پر اپنی زندگی کی ضروریات پر ہم بھروسہ اور اعتماد کریں اور اس سے ہم یہ امید رکھیں کہ بہرحال وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا، ہم پر رحم کرے گا، ہماری ضرورتوں کو پورا کرے گا، تو بتایا جائے کہ عقلاً و فطرۃً، دیناً و ایماناً، ہم اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے

ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا یہ قول جو نقل فرمایا ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ماشاء (متفق علیہ)

میں اپنے بندے کے خیال کے پاس رہتا ہوں پس خیال کرے بندہ میرے متعلق جو چاہے۔

حق تعالیٰ سے ہمیں فطرۃً جو توقع رکھنی چاہئے، اس حدیث میں اسی توقع کے قائم کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ عقلی تدبیریں ناگزیر تدبیریں ہیں۔ لیکن جو اصل واقعات کے عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ قطعیت کے لحاظ سے دونوں تدبیروں میں کیا نسبت ہے۔ واقعہ تو یہی ہے جس کا اعتراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کو خطاب کرکے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

رب لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین واصلح لی شانی کلہ فانک ان تکلنی الی نفسی تکلنی الی ضعف وعورۃ وخطیئۃ وذنب وانی لا اثق الا برحمتک۔

اے میرے رب! مجھے میرے حوالے نہ کیجئے (یعنی بجائے اپنے آپ مجھے خود اپنے بھروسہ پر نہ چھوڑیے) پل بھر کیلئے بھی اور سلجھا دیجئے میری باتیں ساری کیونکہ اگر آپ نے مجھے میرے سپرد کردیا تو آپ سونپ دینگے مجھے صرف کمزوری کو اور عورت[1] کو، چوک کو، گناہ کو، اور میں نہیں بھروسہ کرتا مگر صرف آپ کی رحمت اور مہربانی پر!

الی نفسی کے الفاظ سے تدبیر کے ان ہی شعبوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کا تعلق آدمی کے ناقص معلومات تجربات والی ناقص عقل، اور اس کے ناقص اختیار و قویٰ سے ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کرنا، تو سب ہی چاہئے تدبیر کے دونوں شعبوں کے حقوق کو ادا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر بالفرض ان دو میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہی پڑے، تو ظاہر ہے کہ دیوانوں کے سوا اور کون ہوگا جو پہلے شعبہ کو ترک کر کے دوسرے شعبہ کو اختیار کرے گا۔ پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے، اور اسی کے ساتھ لپٹے رہنے میں اگر کچھ نہیں، تو یہی کیا کم ہے کہ غلام کو آقا سے سرگوشی اور مناجات کی سعادت تو حاصل ہو جاتی ہے۔ "وابتغوا عند اللہ الرزق"۔ واسئلوا من فضلہ (مانگو اللہ سے روزی مانگو اللہ سے اس کے فضل کو) اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے

---

[1] عورت ان کمزوریوں کو کہتے ہیں جنہیں آدمی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ بس خود ہی جانتا ہے، یا اس کا خدا، اردو میں اس کیلئے کوئی اچھا لفظ نہیں ہے۔ ناگفتنی چاہا جائے تو ناگفتنی بھی ترجمہ ہوسکتا ہے، مگر عام طور پر سمجھا نہ جائے گا۔

| | |
|---|---|
| من جاء بالحسنة فله عشر امثالها | جو ایک نیکی لے کر حاضر ہوگا اس کو اسی کے برابر دس گنا دیا جائے گا! |

کی بنیاد پر اس ایک نیکی کے صلے میں دس نیکیوں کے ملنے کا استحقاق تو پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| ما من عبد یدعو بدعاء الا اتاہ اللہ ما سأل او کف عنہ من السوء او ادخر لہ فی الآخرۃ خیراً منہ | کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ مانگے وہ کوئی دعا پھر یا اللہ تعالیٰ اس کی اسی دعا کو پوری فرماتے ہیں جو اس نے مانگی تھی، یا کسی برائی (مصیبت بلا) کو روک دیتے ہیں یا ذخیرہ کر دیتے ہیں اس کے لئے |
| (حصن حصین ترمذی ورزین) | الآخرۃ میں کوئی ایسی چیز جو اسکی مانگی ہوئی چیز سے بہتر ہوگی |

جس کا یہی مطلب ہوا کہ حصول مقاصد کی یہ تدبیر کسی حال میں ضائع نہیں ہوتی۔ جس مقصد کیلئے یہ تدبیر اختیار کی گئی ہو، ممکن ہے کسی وجہ سے مانگنے والے کو وہ نہ ملے۔ لیکن کچھ نہ ملے، اس راہ میں یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے بعضوں نے کہا ہے۔ کہ روپیہ مانگنے والوں کو جب روپیہ ہی مل جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہماری دعا قبول ہوئی۔ لیکن بجائے روپیہ کے جب دینے والا اشرفی دیتا ہے۔ تو جو نہیں جانتے ہیں، وہ کہتے ہیں دعا قبول نہیں ہوئی۔ اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی دعا مسترد اور نامنظور نہیں ہوتی۔ ان کے کلام کا ایک مطلب یہ ضرور ہو سکتا ہے۔ شاید اس بنیاد پر اگر "استجابت" و "اجابت" وغیرہ قرآنی الفاظ کا ترجمہ "قبول کرنا" کر لیا جائے۔ تو اس لحاظ سے اس کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ اور فرض بھی کیجئے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، کہ خدا بہرحال خدا ہے، بندہ نہیں ہے، اس کا علم اگر ہمارے جہل کا ساتھ نہ دے، اور ہم جو کچھ مانگ رہے ہوں۔ اس کا دُنیا خود ہمارے لئے یا کسی دوسرے نظم کے اختلال کا باعث ہو، تو پھر بھی تدبیر کا یہ ایسا عمل ہے کہ علاوہ ان مواعید کے جن کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں کیا گیا ہے۔ یوں بھی اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ دینے والے سے ہمارے تعلقات کی ہمیشہ یہی نوعیت رہنی چاہیے۔ یعنی جو مل جائے اس پر شکر کیا جائے۔ شکر کی خاصیت

| | |
|---|---|
| لئن شکرتم لازیدنکم | اگر گن گاؤ گے تم، تو بڑھاتے چلے |
| (ابراہیم) | چلے جائیں گے ہم تمہیں! |

قرآن میں بتائی گئی ہے۔ گویا حاصل شدہ نعمتوں کی ترقی کا شکر ایک قرآنی ذریعہ ہے، اور جو نہ ملا، نہ ملنے

ہے۔ ممکن ہے کچھ ضیق ہو، تکلیف ہو، لیکن اپنی کوشش سے جو اس تکلیف کو ٹال نہیں سکتا۔ اسے صبر کرنا چاہئے، صبر کے متعلق۔

| | |
|---|---|
| اولئک علیھم صلوات من | یہی لوگ ہیں، جن پر صلوات ہیں ان کے |
| ربھم ورحمۃ واولئک | مالک کی طرف سے اور رحمت، اور یہی لوگ |
| ھم المھتدون (البقرہ ۱۵۷) | راہ یافتہ ہیں۔ |

کے وعدوں کے سوا صبر کا ایک بڑا عظیم ثمرہ

| | |
|---|---|
| انما یوفی الصابرون اجرھم | بلاشبہ پورا پورا کر دیا جائے گا، صبر کرنے |
| بغیر حساب (الزمر ۱۰) | والوں کو ان کا اجر بغیر شمار کے۔ |

بھی بتا دیا گیا ہے۔ اور جو حق تعالیٰ کی معیت و رفاقت کے سرور سے آشنا ہیں، ان کو تو

| | |
|---|---|
| واللہ مع الصابرین (البقرہ) | اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں |

کی بشارت ایک سے زیادہ مقامات پر سنائی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تدبیر کی اس راہ میں ملے، جب بھی کامیابی ہے، نہ ملے جب بھی کامیابی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری تمام تدبیروں میں اس عجیب و غریب بے خطا تدبیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اپنی معاشی زندگی میں تدبیر کی اس راہ پر چلنے والوں کا سچ پوچھو تو یہی طرز عمل ان کا وہ سلوک بن جاتا ہے۔ جس کے لئے لوگوں نے خواہ مخواہ دنیا کی لذتوں کو ترک کیا۔ گھر سے چھوٹے، در سے چھوٹے اور پھر جیسا کہ قرآن کے حوالے سے بیان ہو چکا کہ جس مقصد کے لئے سلوک کی یہ راہ وہ اختیار کرتے ہیں، وہ بھی بے چاروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی کی ان ہی معاشی کشمکشوں میں واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کیلئے روحانی اور مادی ترقیوں کی ایک واضح راہ پیدا کر دی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشی مزدوروں کیلئے مذہب کی اس راہ کا استعمال لوگوں نے کیوں ترک کر دیا۔ بدبختوں کا وہ گروہ جس پر رحمت کا دروازہ بند کیا گیا ہے۔ اور اسی لئے دعا کے تاثیری نتائج کے متعلق ان کے دلوں میں انکار پیدا ہو گیا ہے۔ آخر حدیثوں میں جب آیا ہے

| | |
|---|---|
| من فتح لہ فی الدعاء فتحت | جس کے لئے دعا کی راہ کھولی جائے، کھولا |
| لہ باب الرحمۃ | گیا اس کے لئے رحمت کا دروازہ۔ |

تو دعا میں جن کا جی نہیں لگتا۔ ہاں ہر دشواریاں عقلی تدبیروں کی، ہر راہ اُن پر آسان ہے۔ لیکن

حصولِ مقصد کی جو آسان ترین راہ تھی وہی ان کے لئے دُشوار ہو گئی۔ تو اس کا مطلب مذکورہ بالا احادیث کی بنیاد پر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو نصیب پر رحمت کا دروازہ اس کے جرائم کی سزا میں بند کر دیا گیا ہے۔ مگر اُن کو تو خیر دُور رہنے دیجئے، تعجب تو اُن پر ہے کہ جن کی ساری زندگی رحمتِ حق ہی کی تلاش میں بسر ہوتی ہے۔ انہوں نے آخر کس بنیاد پر تمام دعائی وعباداتی، ایمانی و دینی مشاغل کا رُخ صرف "الآخرت" کی طرف پھیر دیا ہے۔ خود بھی اپنی معاشی مشکلات میں ان سے نفع اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی کم ہمتی، کوتاہ نظری کا الزام لگاتے ہیں جو معاد اور الآخرت کے ساتھ ساتھ اپنی دینی اور دعائی زندگی کو معاشی کامیابیوں کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ سن کر مجھے تو حیرت ہوئی۔ جب مجھے یہ سنایا گیا کہ حصولِ صحت کے لئے دعا مانگنے سے بعضوں نے اس لئے انکار کر دیا کہ اتنے بڑے خدا سے اتنی چھوٹی چیز، یعنی دُنیا میں تندرست رہنے کی دعا کیا مانگوں، کیسی عجیب بات ہے۔ پیغمبرؐ سے پیغمبرؐ کے عم محترم حضرت عباس رضؓ نے جب پوچھا، میں خدا سے کیا مانگوں؟ تو جواب میں فرمایا گیا

یا عم سل اللہ العافیۃ — چچا جان! اللہ تعالیٰ سے صحت وتندرستی مانگئے

یہ بھی ارشاد فرمایا گیا،

فان احد الم یعط بعد الیقین خیرا من العافیۃ — ایمان کے بعد دنیا میں صحت سے زیادہ بہتر چیز کسی کو نہیں دی گئی۔

کس قدر تعجب ہے، اسلام میں ایک مستقل نماز استسقاء کی صرف اس لئے رکھی گئی ہے کہ مرنے کے بعد نہیں، بلکہ مرنے سے پہلے اسی "الحیوٰۃ الدنیا" میں آدمی اس نماز کے نتائج سے متمتع و مستفید ہو، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دین کو دنیا کے لئے استعمال کرنا کوتاہ نظری ہے۔

**قرآن کی ایک پوری سورت میں حق تعالیٰ کو الٰہ المعاش بنانے کا مطالبہ**

اب کہنے والوں کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ عموماً نمازوں میں پڑھی جانے والی چھوٹی سورتوں میں مشکل ہی سے ایسا کوئی نمازی مسلمان ہو گا، اور جو مسلمان ہے وہ نمازی نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ بہر حال کون نہیں ہے جو سورۃ القریش یعنی عوام جسے لایلٰف والی سورت کہتے ہیں۔ دن میں متعدد بار فرائض وسنن ونوافل میں اس سورۃ کو نہیں پڑھتا۔ جو معنی نہیں جانتے ہیں، کم از کم مطلب تو اس کا سمجھتے ہیں۔ پھر اس پوری سورت کا کیا مطلب ہے؟ حق تعالیٰ نے اپنی عبادت کا مطالبہ اس سورۃ میں جس بنیاد پر کیا ہے، وہ یہی تو ہے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے اس رب کو پوجو، جو

بھوک میں کھانا کھلاتا، اور خوف سے جس نے امن عطا فرمایا ہے۔ پھر ان دونوں باتوں کا تعلق معاش سے ہے یا معاد سے؟ یہی نہیں، بلکہ سورۃ کا آغاز جس ربانی احسان سے کیا گیا ہے اور اس کو "فلیعبدوا" (پس پوجو رب ہذا البیت کو) اس مطالبہ کی وجہ قرار دیا گیا ہے، وہ رحلۃ الشتاء والصیف "کا ایلاف" ہی تو ہے۔ یعنی تجارتی سفر گرما اور سرما کے موسموں میں قریش جو کیا کرتے تھے اور بیت اللہ کے محافظ پڑوسی ہونے کی وجہ سے بے روک ٹوک اندرونِ عرب اور بیرونِ عرب میں تجارتی سامانوں کو لے کر گھومتے پھرتے تھے۔ رومی اور ایرانی حکومت نے کعبہ ہی کی نسبت کا خیال کر کے آزاد تجارت کا لائسنس ان کو دے رکھا تھا، کیا یہ ساری باتیں معاشی احسانات ہی کے ذیل کی چیزیں نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟ اللہ اللہ کا بل ایک پوری سورت میں حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنانے کا قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے سوا کوئی دوسرا مضمون اس میں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس پر بھی کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنا کر پوجنا دونِ ہمتی ہے "تنگ نظری ہے۔ بہر حال میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ پیغمبروں کی دعوت کا پہلا کلمہ

| | |
|---|---|
| یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من | اے میرے لوگو! پوجو اللہ کو، نہیں |
| الٰہ غیرہ (سورہ) | تمہارا الٰہ سوا اس کے! |

کی آیت کو جو قرار دیا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عملِ پیدائش کا ظہور ہو رہا ہے، وہ تو خیر عقل و حواس کے سپرد ہیں۔ لیکن خود پیدا کرنے والے سے استفادہ جس فطری جذبہ کی رہنمائی میں دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ مختلف اشغال و اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذاتِ مبارک کے سوا، کوئی دوسری طاقت نہیں۔ اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد جو آنے والی زندگی، ہر زندگی کی ضرورتوں سے استفادہ کی اس تدبیر کا تعلق ہے۔ یعنی اللہ ہمارا الٰہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے۔ جن کے ہم اس "الحیوٰۃ الدنیا" میں محتاج ہیں۔ اور ان میں بھی، جو "الحیوٰۃ الاخریٰ" میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اللہ ہی ہمارا "الٰہ الدنیا" بھی ہے اور "الاخرہ" بھی۔ یقیناً پیغمبروں نے حق تعالیٰ کی الوہیت کو "الدنیا یا الآخرہ" کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے، بلکہ عموماً اس دعوت کا خطاب جن لوگوں سے تھا اور جن کی غلطی کی تصحیح مقصود تھی، چونکہ استفادہ کی

اس تدبیر کو عموماً وہ معاشی مشکلات ہی کی راہوں میں استعمال کرتے تھے۔ یعنی غیر اللہ کو الٰہ بناکر جو کچھ مانگا جاتا تھا، وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے، کھیتوں کی پیداواروں میں برکت دی جائے۔ آفتوں سے محفوظ رکھ کر باغوں کو پھلوں سے بھر دیا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریاں اور وباؤں سے ملک کو محفوظ رکھا جائے، اقبال مند اولاد بخشی جائے۔ دشمنوں پر فتح حاصل ہو۔ الیٰ غیر ذالك من الامور المعاشیة، یقیناً غیر اللہ کی پوجا پاٹ، دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، عموماً اسی قسم کی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور غیر اللہ کو الٰہ بناکر جو انہیں پوجتے ہیں، اُن کی غرض بھی یہی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اس مسلک کے جو پابند ہیں اُن کی غرض بھی یہی ہوتی ہے۔

**اصنامی نظام معاشی نظام ہے**

اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ مشرک قوموں کا یہ نظام جس کا دوسرا نام اصنامی نظام ہے، یہ اصنامی نظام بالکلیہ ان قوموں کا ایک مستقل معاشی نظام تھا آج بھی دنیا میں جہاں کہیں یہ نظام موجود ہے، بجز معاشی ضرورتوں کے اُن سے قطعاً کوئی دوسرا کام نہیں لیا جاتا۔ کسی بت پرست کو نہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے آلہہ یا معبودوں اور دیوتاؤں سے یہ مانگتا ہو کہ اُسے عذابِ قبر سے بچایا جائے۔ حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے، جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی عطا کی جائے۔ ان نیک کاموں کی توفیق دی جائے، جن سے مرنے کے بعد سکون حاصل ہو، بلکہ جو کچھ مانگا جاتا ہے۔ وہ اسی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق مانگا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ان سے پیغمبروں کا جو یہ مطالبہ تھا کہ بجائے غیر اللہ کے حق تعالیٰ ہی کو اپنا الٰہ بناؤ۔ مخاطب کے طرزِ عمل کی بنیاد پر اس مطالبہ کی سب سے پہلی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے تم غیر اللہ کو الٰہ بنائے ہوئے ہو، ان ہی حاجتوں، اور ضرورتوں کے لئے بجائے ان کے حق تعالیٰ کو اپنا الٰہ بناؤ، چونکہ وہ اپنی دنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں میں غیر اللہ کو الٰہ بنائے ہوئے تھے۔ اس لئے کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کو الٰہ بنانے کا ان سے جو مطالبہ کیا جاتا تھا، اس مطالبہ میں یہ بات بھی واضح تھی کہ جن اغراض کیلئے تم غیر اللہ کو الٰہ بنائے ہوئے ہو ان کے لئے بھی خالق حق تعالیٰ ہی کو اپنا الٰہ تمہیں بنانا چاہئے اور جب یہی واقعہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسی اللہ کو ان ہی دنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں اور معاشی مشکلات کیلئے الٰہ بنانا یکایک تنگ نظری اور پست ہمتی کیوں ٹھیرادی گئی، حالانکہ جیساکہ

ہم نے عرض کیا۔ دعوتِ انبیاء کے اس کلمہ کا ابتدائی اور اوّلی رُخ دنیاوی زندگی ہی کی پیچیدگیاں ہیں، لوگ کسی غلبۂ حال اور ذوق و سرمستی کے زور میں ایک بات کہہ دیتے ہیں۔ لیکن آئندہ اس کے نتائج پسماں کی نظر نہیں ہوتی۔ پھر جب اس کے بُرے نتائج سامنے آجاتے ہیں تو ایکدوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوگیا۔ یہی مسئلہ ہے۔ ابتدا میں تو بے چاری دنیائے دنی کثیف و ناپاک کی ضرورتوں کو حقیر آنی جانی فانی، ناقابلِ لحاظ، غیر اہم ضرورتیں قرار دے کر خود بخود یہ رائے قائم کر لی گئی کہ حق تعالیٰ کی عظیم و برتر ہستی کے سامنے بھلا ایسی ہلکی چھوٹی موٹی، بلکہ چھچھوری ضرورتیں کیا پیش کی جائیں، اُن کے لئے تو عقلی تدبیریں کافی ہیں، البتہ آئندہ زندگی کے ہولناک مصائب مدہش، جاں گسل خطرات اس قابل ہیں کہ اُن کے واسطے اللہ تعالیٰ سے التجا کی جائے کہ وہی ضرورتیں اس کی شایانِ شان ہیں۔ لیکن معاشی ضرورتوں اور دُنیاوی حاجتوں میں چھپا ہوا انسان بیرونی مؤثرات کے تحت کچھ دن تو ممکن ہے۔ دنیاوی ضرورتوں کے حصول میں استفادہ کے اس طریقہ سے رُک جائے، یعنی دنیاوی ضرورتوں اور معاشی حاجتوں میں اللہ کو اپنا الٰہ نہ بنائے اور ان کے لئے محض عقلی تدبیروں کو کافی سمجھے۔ لیکن آدمی کا "غیب طلب" میلانِ ذہن زیادہ دن تک ناقص عقل کے ناقص معلومات، ناقص تجربات والی تدبیروں پر بھروسہ کر کے ہمیشہ کیلئے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ہر ضرورت کی پیدائش میں محسوس قوانین وضوابط کے پیچھے ان کی فطرت اشارہ کرتی ہے، کہ نامحسوس اسباب کی بھی کڑیاں ہیں، وہ پاتا ہے کہ عقل کی راہ سے قابو میں زیادہ سے زیادہ وہی حلقے آسکتے ہیں، جن تک حواس کی اعانت سے عقل پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس دائرہ سے جو باہر ہیں، ان کے متعلق مطمئن ہونے کی کیا صورت ہے؟

یہی نازک وقت ہوتا ہے۔ کہ معاشی ضرورتوں کے غیبی سوالات کے متعلق اس کی راہنمائی اگر واقعی الٰہ یعنی اُن ضرورتوں کے حقیقی پیدا کرنے والے خالق کی طرف نہیں کی گئی تو احساسِ ضرورت کی شدت سے بے چین ہوکر، گھبرا گیا ان ہی چیزوں کو وہ الٰہ بنا لیتا ہے۔ جن کے متعلق وہ خود ہی جانتا ہے کہ پیدا کرنے کے عمل کا اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر باوجود اس علم کے کہ جو پیدا کر رہا ہے، ہم اس سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزیں نہیں مانگ رہے ہیں۔ پھر بھی مانگتا اسی سے ہے اصنامی نظام والوں کے سامنے اپنے علم اور عمل کے تناقض کا یہ سوال ہمیشہ آتا رہتا ہے۔ مگر چونکہ ایک غلطی دوسری غلطی کو پیدا کرتی ہے۔ کچھ اپنی قومی روایات کی پچ رسم و رواج کا دباؤ بہرحال اُن کو مجبور کرتا ہے کہ علم و عمل کے اس تضاد میں توافق پیدا کیا جائے۔ پھر اس راہ میں تو بھیوری

اور تار دیوں کا جواب کھولا گیا، اس کا قصہ طویل ہے۔ انتہا یہ ہوگئی کہ یونانیوں کے اصنامی نظام کی تصحیح کے لئے جب ارسطو آمادہ ہوا، تو اس کو بالآخر یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ خدا ایک ہے۔ اور ایک ایک چیز کو پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہی اس کی خالص وحدت کا انتہائی کمال ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جب ہر چیز کا وہ خالق ہی نہیں ہے تو ہر چیز اس سے مانگی کیوں جائے۔[۱] مگر اسی کے ساتھ ارسطو کا یہ قول بھی تھا کہ مادہ پر تمام صورتوں کا فیضانِ اول حق ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر چیز کا خالق وہی ہے اور یہ اس فطری علم کا زور تھا۔ جس کی قرآن نے خبر دی ہے۔ آج کون ہے جو ارسطو کے اس دماغی خبط کو سلجھا سکے۔ اور یہ تو فلسفہ کے پُر رعب نام سے خواص کو مطمئن کیا جاتا تھا مشرکین کے عوام کو تمثیل کے مغالطہ میں مبتلا کیا گیا۔ خدا کو انسانی بادشاہ فرض کر کے باور کرایا گیا کہ گو سب حکم و احکام بادشاہ ہی کے چلتے ہیں۔ لیکن بہرحال بادشاہ سے کوئی چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ماتحت حکام کو بھی خوشامدوں سے راضی کیا جائے۔ ان کے پاس کچھ تحفے تحائف کی ڈالیاں پیش کی جائیں۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ بادشاہ تو اہلِ غرض کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ مجبوراً اپنے ماتحت حاکموں سے اسے علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ماتحتوں کو بھی راضی رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بادشاہ کے پاس اہلِ غرض کے حسبِ منشا رپورٹ کریں۔ حامیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا، جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے، وہ کیا کسی چیز سے ناواقف بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی کا فطری علم اس سوال کے جواب میں بجز "استغفر اللہ" کے اور کیا کہہ سکتا ہے۔[۲]

---

[۱] ارسطو نے اس کے بعد عقول عشرہ کے نظریہ کے ساتھ ہر فلک میں ایک مجرد روح اور ایک حیوانی نفس کو ثابت کر کے گویا یونانیوں کے دیوتاؤں اور دیویوں کے وجود کو منوا دیا۔ اللہ میاں کو تو معلول اول بنا کر وحدت کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ مجبوراً آگے آدمی ان ہی زندہ روحوں سے نہ مانگے تو اور کیا کرے۔ اشراقیہ نے رب النوع کے نظریہ سے اصنامی نظام کی تصحیح کی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ الٰہیات کے نام سے تھیوتوجیا کا جو ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں ہوا۔ یہ دراصل وثنیت اور شرک و بت پرستی کا علم کلام تھا۔ جس تھالوجی (خرافیات) میں ان کا مسلک مبتلا تھا، اسی کو تھیولوجی (تھیالوجی) کا نام دے کر انہوں نے فلسفیانہ تعبیروں کے زور سے اُسے فلسفے کی شاخ بنا لیا ۱۲

[۲] وہ شفاعت، جو بادشاہ کے ہاں اور ناواقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس لئے عوام کو سکھایا جاتا ہے کہ شفاعت کے دوسرے پہلو سے فائدہ اٹھائیں، یعنی ہم گنہگار ہیں، حق تعالیٰ ہماری بات سن نہیں سکتے، لیکن ظاہر ہے کہ شفاعت کے اس پہلو میں بھی تو پہلے ضرورت اس کی ہے کہ جس کا آدمی خطا کار ہے اس کی (باقی بر صفحۂ آئندہ)

بہر حال باوجود ان تمام حماقتوں اور بہانتوں کے پھر بھی معاشی ضرورتوں کے لئے غیر اللہ کو لوگ الٰہ بناتے چلے ہی جاتے ہیں۔ اور یہ صرف ایک غلطی کا نتیجہ ہے کہ دنیاوی ضرورتوں کو اللہ کے آگے پیش کرنا اس کی شان سے بلا وجہ گری ہوئی بات قرار دی گئی۔ یہی وہ راز ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ

| | |
|---|---|
| یسأل احدکم ربہ حاجتہ | چاہئے کہ تم میں سے ہر کوئی مانگا کرے خدا سے |
| کلہا حتیٰ یسأل شسع نعلہ | اپنی ہر ہر حاجت یہاں تک کہ مانگے اللہ سے تسمہ |
| اذا انقطع (رواہ الترمذی) | جوتی کا جب وہ ٹوٹ جائے۔ |

ایک دوسری روایت میں ہے کہ

| | |
|---|---|
| حتیٰ ملح عجینہ | حتیٰ کہ اپنے خمیر کا نمک بھی! |

مطلب یہی تھا کہ جب ہر چیز چھوٹی ہو یا بڑی۔ دنیا کی ہو یا آخرت کی۔ سب کی پیدا کرنے والی تنہا حق تعالیٰ کی ذاتِ مبارک ہے۔ تو پیدا کرنے والوں سے ان چیزوں کے حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے اس طریقہ سے بڑی ہی چیزیں، یا آخرت ہی کی چیزیں کیوں مانگی جائیں۔ بلکہ سب کچھ مانگنا چاہئے حتیٰ کہ خمیر میں ڈالنے کے نمک کی کنکریاں وہ بھی!

کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے جو مقصود مبارک تھا وہ سمجھ لیا جاتا تو معاشی ضرورتوں کے لئے اللہ کو الٰہ بنانے کا طریقہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں سے مفقود نہ ہو جاتا۔ اور بالآخر امتِ اسلامیہ کے ایک بڑے طبقہ نے ان ہی معاشی حاجتوں اور ضرورتوں کیلئے مختلف ناموں سے جو الٰہ آج تراش لئے ہیں، اور جسے دیکھ دیکھ کر اہلِ ایمان کا کلیجہ پھٹا چلا جاتا ہے۔ کہ ایک طرف غربت و فلاکت کے ان دنوں میں آج بھی مسلمانوں کی دولت، ان کا وقت، ان کی توانائیوں کی بہت بڑی مقدار ان لاحاصل

---

بقیہ صفحہ گذشتہ نگاہوں میں کم از کم اتنی وقعت تو پیدا کرے کہ خواص کے کہنے سے نہیں تو کسی قابلِ احترام معزز ہستی کے کہنے سے اس پر عمل کیا جائے اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سفارش کرنے والوں کی نہیں بلکہ جس کے پاس سفارش کرانا مقصود ہو اس کی حد تک اس کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی کو شفاعت مأذونہ کہتے ہیں، قرآن میں جہاں والی شفاعت اور شفاعت مأذونہ دونوں کا ذکر کرکے شفاعت کی پہلی قسم کو حق تعالیٰ کی شان سے بعید قرار دے کر دوسری قسم کی تسلیم کی گئی ہے۔ جو حق تعالیٰ کی اجازت اور اذن پر موقوف ہے۔ اور اسی لئے اس شفاعت کے حاصل کرنے کیلئے شفاعت کرنے والوں کی عبادت و خوشامد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسی کی عبادت، اسی کی منت و حاجت کی جس کے اذن و اجازت پر یہ شفاعت موقوف ہے۔"

تدبیروں پر صرف ہو رہی ہے۔ اور یہ تو دنیا میں ہو رہا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلے میں کتنوں کے اعمال و افعال شرک جلی کے ان حدود تک پہنچے ہوئے ہیں۔ جن کے بعد اخروی زندگی کی ان تباہیوں سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جس کی تلافی پھر کسی وقت، کسی صورت سے ممکن نہیں کہ

| | |
|---|---|
| ان اللہ لا یغفر ان یشرک به۔ (النساء ع۱) | قطعاً خدا نہیں بخشتا یہ بات کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ کسی کو! |

قرآن کا اٹل اور قطعی فیصلہ ہے۔

**معذرت** اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک معاشیاتی مقالہ میں شرک و توحید عبادت و دعا کے ان مباحث و مسائل کا ذکر اور وہ بھی اتنی دراز نفسیوں کے ساتھ بظاہر دیکھنے والوں کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں "اسلامی معاشیات" کو بیان کر رہا ہوں۔ نہ کہ عصری معاشیات و اقتصادیات کے مسائل پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ میری یہ علمی خیانت اور بد دیانتی ہوتی کہ معاشیاتی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں اسلام نے جو تدبیریں پیش کی ہیں ان تدبیروں میں سے کسی جز کو اپنا، زمانہ کے تمسخر اور طعنوں کے خوف سے قلم انداز کر دیتا۔ حصولِ رزق کی راہ میں حقی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اللہ کو الٰہ بنانے کی مقدس تدبیر سے آج دلوں میں جو اعراض و انحراف پیدا ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر ہماری باتیں ضرور گراں گذر رہی ہوں گی۔ ان کے قلوب مجھ پر افسوس اور عقل قہقہے لگا رہی ہوں گی۔ ایسوں کے آگے یہ قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| امن ھذا الذی یرزقکم ان امسک رزقہ بل لجوا فی عتو ونفور۔ (الملک ع۲) | کیا جو تمہیں روزی پہنچا رہا ہے، اگر روک لے اپنی روزی کو، بلکہ یہ غوطے کھا رہے ہیں سرکشی اور بدکنے میں۔ |

پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ جن دلوں میں اب تک اس کا یقین باقی ہے کہ جو پڑھا گیا کہ وہ کسی بندے کا نہیں، بلکہ رزاق ذو القوۃ المتین کا کلام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے سننے کے بعد وہ کیوں نہ لرز اٹھیں گے، نہ سوچنے والوں کو کیا کہئے۔ آج حصولِ معاش کی راہ میں تدبیر کے اس شعبہ کو غلط طریقہ سے استعمال کرنے والے دنیا کے بڑے بڑے علاقوں میں لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں اور آج کیا ہمیشہ مختلف اقوام و امم کے قدیم آثار کو جا کر دیکھا جائے۔ اسلامی نظام، جس کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ بالکلیہ وہ ایک معاشی نظام ہے۔[1] اس کی بقا و استحکام، اور اس نظام کے

---

[1] اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والوں کے نہ اخلاقی پہلوؤں پر اس نظام کا کوئی اثر (باقی صفحہ آئندہ پر)

متعلقہ معلومات و اکتشافات کی مہارت کے مدعیوں کی اعانت و امداد میں عوام و خواص، بلکہ ہر ملک کی حکومتوں نے یقیناً اس سے زیادہ اور بہت زیادہ صرف کیا ہے۔ جتنا اس زمانہ میں موجودہ معاشی تدبیروں کی پاسبجائی میں پبلک اور حکومتیں، بنکوں، بیمہ کمپنیوں، اتحادی انجمنوں اور معاشیات کے پروفیسروں، کتابوں وغیرہ پر خرچ کر رہی ہیں۔ دنیا کا ایک ایک مندر موجودہ عہد کے دس دس کالجوں کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ اس زمانے کا ایک ایک پجاری، بڑی بڑی جاگیروں کا مالک تھا اتنی بڑی کہ عصر حاضر کے دس دس ماہرین معاشیات کی تنخواہیں اس سے ادا ہو سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اصنامی نظام حصولِ معاش کی قطعاً بے بنیاد بے حاصل تدبیر تھی۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے سوا آج دنیا میں کسی کے پاس ایسی طاقت ہے کہ جو حصولِ معاش کے اس غلط نظام سے انسانیت کو نجات بخشے، اور بنی آدم کی کمائی ہوئی آمدنیاں و خداداد توانائیاں، اس راہ میں جو بلا وجہ ضائع ہو رہی ہیں، ان کا انسداد کرے؟

یہی غرض تھی جس کی وجہ سے اس باب میں مجھے کافی طوالت سے کام لینا پڑا۔ لیکن جو کچھ کہا گیا ہے، جس طریقہ سے کہا گیا ہے۔ اگر اخلاص و صداقت سے اس کی اشاعت کی گئی تو جو معاشی قدرت کسی سے بن نہیں آئی ہے۔ اسلام کے ذریعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس میں ضرور کامیابی ہوگی۔ واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون

خلاصہ یہ ہے کہ آلہہ باطلہ (غلط معبودوں) سے انسانیت کا معاشی تعلق اس وقت تک ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب تک کہ پیدا کرنے والا خالق (اللہ)، الہ المعاش بھی بن کر اس کے سامنے نہ آجائے ایسا الہ المعاش جو ہر وقت، ہر حال میں، ہر جگہ اس کے ساتھ ہو، اس کے پاس ہو، اس کو محیط ہو، ظاہر و باطن، اول و آخر سب پر وہی حاوی ہو جائے، چھا جائے، آج فکری انقلاب اور اعتقادی ہلچل پیدا کرنے والی کتابوں میں قرآن کے سوا اور کون سی ایسی کتاب نسلِ آدم کے پاس موجود ہے

---

بقیہ صفحہ گذشتہ) مرتب ہوتا ہے۔ اور نہ اخروی زندگی کے عملی ولولوں میں کوئی جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اسکی وجہ ظاہر ہے کہ ان الہہ اور دیوتاؤں کو اپنی معاشی ضرورتوں کیلئے یہ پوجتے ہیں نہ ان کی طرف سے ان کو کوئی آئین حیات اور دستور اخلاق ملتا ہے۔ نہ مرنے کے بعد ان معبودوں اور ان کے پوجنے والوں میں کسی آنے والے تعلق کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اسی شکل خالص مادہ پرست اور دہریت کی زندگی میں ان حیثیتوں سے کوئی فرق نہیں ہوتا اسی لئے میں اصنامی نظام کو بجائے مذہبی نظام قرار دینے کے ایک خالص معاشی نظام سمجھتا ہوں ۲

جس سے بوجہ الاتم اس ناگزیر انسانی ضرورت کے حل کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہی انسان جو زندگی کے تمام شعبوں میں اعانت تو حق تعالیٰ سے حاصل کر رہا تھا۔ لیکن سمجھ دوسروں کے گا رہا تھا۔ یقیناً اسی کتاب نے ایاک نستعین (ہم تجھی سے تیری ہی پیدا کی ہوئی چیزوں سے مدد حاصل کر رہے ہیں) کے اقرار کرنے والی مخلوقوں، جبلتوں کو ایاک نعبد (اسی لئے تجھ ہی کو پوجتے ہیں اور تجھ ہی سے مانگتے ہیں) کے صراطِ مستقیم پر چلا دیا۔ اسی کی بے لاگ خرخشوں، دغدغوں سے بالکل پاک آسمانی آواز کا زور تھا کہ دفعتاً روئے زمین کے بڑے حصوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا جو واقعی مستعان تھا وہی ان کا معبود بھی بن گیا۔ اور خواہ دوسروں کی کچھ ہی رائے ہو۔ لیکن میرے نزدیک تو آدمی جس کا کھا رہا ہے اسی کا گن گائے۔ اس مقصد میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ لہ الآخرۃ (آخرۃ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے) کے ساتھ لہ الاولیٰ (دنیا کے معاملات بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں) کے قرآنی یقین کو بھی دلوں میں پوری طاقت کے ساتھ بیدار نہ کیا جائے اور یہ کہ

| | |
|---|---|
| من كان يريد ثواب الدنيا | جو چاہتا ہے دنیا، تو اللہ کے پاس دنیا کا |
| فعند الله ثواب الدنيا والآخرة | ثواب بھی ہے۔ اور الآخرۃ کا بھی! |

(النساء پ۵)

کے صلائے عام کو دنیا کے آخری کناروں تک پہنچانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے جو واقعہ ہے وہ کہا جائے گا اور کہنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا کہ بلبلاتے بچوں، بے سہارا عورتوں کی گود میں چور، بھوکے پیٹ اور ننگے بدن والے پراگندہ روزی، پراگندہ دل، انسان کی تسلی نہ ان لمبے چوڑے وعدوں، فقط وعدوں سے ہو سکتی ہے۔ جن کی تجارت تعلیمی حلقوں اور اشاعتی اداروں، اقتصادیات و معاشیات، اکانومی وکفایت شعاری وغیرہ، مختلف پُرشوکت ناموں سے اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہی ہے۔ کہ جو کچھ محسوس ہو رہا ہے پیدائش کی ان ہی راہوں اور صرف ان ہی راہوں کو عقل کے قابو میں لانے کے ساتھ ہی وہ سب کچھ مل جائے گا جس کے بغیر آدمی دل کے چین اور جان کے آرام سے محروم ہے اور نہ محض حال کی ان راہبیانہ خیالی اور صرف خیالی بلند پروازیاں اس زمینی انسان کو آسمانی فرشتہ بنا کر اتناد وسیع النظر، رفیع العزم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں کہ اپنی معاشی ضرورتوں کو مذہبی جذبے کی راہنمائی میں غیب سے حاصل کرنے میں وہ شرمانے لگے۔ یقیناً نہ وہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ، پھر دو ہی صورتیں ہیں، کروڑہا کم دو روپوں کی تھیلیاں ہر سال معاشی استفادے کے بے بنیاد وہم کی شکار ہو کر باطل الٰہ وہمی معبودوں، من مانے اختراعی

ڈھکوسلوں کی راہوں میں قومیں، جو دنیا کے اکثر حصوں میں نمازی ہیں بے دریغ، انتہائی بیدردی کے ساتھ لٹا رہی ہیں۔ خدا کے لئے نہ سہی، انسانیت ہی کے تمام فرائض کو بالائے طاق رکھ کر ٹھکرا کر انہیں لٹنے دیا جائے، اقتصادی نظام اور معاشی جسد کے اس ناسور کو چھوڑ دیا جائے۔ انتہائی بے رحمی کے ساتھ بہنے، بہتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ صرف اس قوم کے جاہلانہ اکراہی مغالط کے نیچے دب کر چھوڑ دیا جائے جو کالر کے رنگوں اور نکٹائی کی بندشوں کی غلطیوں کے ٹوکنے کو بھی اپنا دائمی کٹی، یا آدابی فرض یا حق خیال کرتی ہے۔ لیکن مذہب کے نام سے خواہ کتنی ہی خطرناک مہلک ہمالیائی غلطی کا ارتکاب کیا جا رہا ہو۔ انہوں کو باور کرایا گیا ہے کہ اس کے متعلق لب ہلانا بھی جرم اور بدترین روادارانہ جرم ہے۔ پس اس جرم سے بچنے کے لئے خدا کے مجرم اور انسانیت کے مجرم بننے پر صبر کر لیا جائے، یا ہر پیاسے کو پانی دے کر پیشاب پینے سے، بھوکے کو روٹی دے کر کیچڑ کھانے سے روک دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں جو واقعی پیدا کرنے والا ہے، اسی کو آدمیوں کا الہ المعاش بنا کر ان چھوٹے اور جھوٹے معاشی الہوں سے نجات بخشی جائے، اور یوں اخروی خساروں کے ساتھ اس عظیم لاحاصل معاشی تاوان سے انسان کے معاشی نظام کو بچا لیا جائے۔

**اس دشواری کے حل کی سہولت**

یوں کہنے کے لئے آدمی کی زبان جس چیز کو چاہے دشوار یا ناممکن ٹھیرا لے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اللہ ہی کو لوگ اپنا الہ مان لیں، یہ غالباً اتنی آسان بات تھی کہ شاید ہی دنیا کا کوئی لا ہوتی یا معاشی مسئلہ اتنا آسان ہو۔ آخر اللہ کو الہ بنانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ پیدا کرنے والے ہی سے اسکی پیداواروں کو مانگا جائے۔ بتایا جا چکا ہے کہ علمہ دلتین کی جس لازوال اساس پر تدبیر کا یہ شعبہ مبنی ہے یعنی یہ مقدمہ کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے کہ جس پر بھی پیش کیا جاتا ہے وہ قدرت کی طرف سے اس دعوے کے وجدان کو اپنی فطرت کے خمیر میں گندھا ہوا پاتا ہے۔ معمولی تنبیہ سے اس میں یہ شعور چمک اٹھتا ہے کہ خلق و ربوبیت کی توحید کا یہ اقرار اس کی جوہر ذات میں گھلا ہوا ہے۔ قرآن نے اس کی خبر دی ہے۔ تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہی مطلب ہوا کہ قدرت نے خود کافی ہو کر استدلال و احتجاج کے تمام جھنجھٹوں سے اس مسئلہ میں ہمیں بے نیاز کر دیا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے تو پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے کے لئے۔

ان اعبدونی ھذا صراط — یہ کہ پوجتے رہنا مجھ ہی کو، یہی ہے راہ
مستقیم (یٰسین پ۲۳) — سیدھی!

کی تعیین کے سوا آدمی کے یہ چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اور اللہ کو الٰہ مان لینے کے ساتھ ہی الٰہ باطلہ کا نظام درہم برہم ہو کر علاوہ اخروی فوائد کے معاشی خساروں اور تاوانوں کی وہ ساری راہیں دفعتاً خود بخود مسدود ہو جاتی ہیں۔ جن کی بے حاصلی کو دیکھ دیکھ کر بصیرت والوں نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے۔

**الملائکہ، یا زندہ روحوں کے متعلق قرآن کا بیان**

الف، اس سلسلہ میں قرآن اور کیا کرتا، خدا کے سوا کسی دوسرے کے متعلق پیدا کرنے یا خالق ہونے کا شبہ نہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ تھا کہ پیدائش کے محسوس ذرائع کی چونکہ ان غیبی زندہ ذرائع اور قوتوں پر انتہا ہو جاتی تھی۔ جن کا مختلف ممالک میں "الملائکہ" فرشتے، دیوتا، وغیرہ نام تھا۔ زیادہ سے زیادہ اگر الوہیت کا کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا۔ اور اکثروں کو ہوا۔ تو وہ یہی "الملائکہ" ہو سکتے تھے۔ اگرچہ ان کو خالق اور پیدا کرنے والا نہ سمجھنا ان کے الٰہ ہونے کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی تھا، لیکن آدم کو الملائکۃ کلھم اجمعون کا مسجود بنا کر اُن لاحاصل مصارف کے دروازے جو ان کی پوجا پاٹ میں کھلے ہوئے تھے قرآن نے اچانک بند کرا دیئے۔ آخر جب انسان۔ اور انسانیت کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان ہی دیوتاؤں یا "الملائکہ" کو آدم کے سجدے میں گرا لیا تو پھر سلسلۂ کائنات و مخلوقات کی اور کونسی ہستی اس کی مستحق رہ جاتی ہے۔ جس کے آگے آدمی جھکے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے کتنی صحیح بات فرمائی تھی۔ جسے قرآن نے بھی نقل کیا ہے۔

قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھاً — موسیٰ نے کہا، کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے
وھو فضلکم علی العالمین۔ — کوئی اور الٰہ ڈھونڈوں، حالانکہ اسی نے تو
(الاعراف پ۹) — برتری بخشی ہے تمہیں سارے جہان پر!

ترجمان الاسلام مغفور ڈاکٹر اقبال نور اللہ مرقدہٗ نے قرآن کی اسی قسم کی آیتوں کے مفاد کی تعبیر اپنے اس مشہور شعر میں کی تھی ؎

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

انسانیت کے بلند مقام اور اسلامی نظام میں اس کی جو درگت بنی ہے، مولانا روم نے بھی رشد

ضرورتِ خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

ایک معاشی مسائل کی کتاب میں اس خالص مذہبی سوال پر بحث پڑھنے والوں کے لئے خواہ ایک بے محل گفتگو ہی کیوں نظر نہ آئے، لیکن کیا کروں آئندہ پیش آنے والے معادی مصائب و شدائد کے سوا میری آنکھیں جن معاشی تباہیوں کا مشاہدہ اس راہ کی غلطیوں کی وجہ سے کر رہی ہیں، بیدردی کے ساتھ اصنامی نظام کے ٹھیکیداروں نے انسانی توانائیوں کی کمائی ہوئی دولت پر دھاوا بول دیا ہے۔ ضرورتوں اور حاجتوں میں جکڑے ہوئے انسان کی عقلی کمزوریوں، وہمی میلانات سے نفع اٹھا کر ان سے ظلم روا رکھا گیا ہے اور کمال یہ ہے کہ بے دینوں کا طبقہ دین اور دھرم ہی کے نام سے کر رہا ہے، جو کچھ کر رہا ہے، مذہب کا نام سن کر دنیا چپ ہو جاتی ہے۔ سب کچھ جاننے اور سب کچھ سمجھنے کے باوجود چھوڑ دیا گیا ہے کہ انسان نما درندوں کا یہ گروہ جاہل انسانوں کو پھاڑے اور پھاڑ کر کھا جائے۔ مرنے کے بعد جو کچھ سامنے آنے والا ہے۔ اگر دلوں میں اس سے ڈر نہیں پیدا ہوتا تو کم از کم ان معاشی تباہیوں کی روک تھام کے لئے انسانیت کے بہی خواہوں کو اٹھنا چاہیئے۔ بھیڑیوں کے منہ سے آدمی کے بچوں کو چھڑانا چاہیئے۔

علمائے اسلام کا وہ طبقہ جو عام مسلمانوں میں شیخ سدو کے بکروں، خواجہ خضر کے بیڑوں اور از ایں قبیل بیسیوں اوہامی خرافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے۔ اور منبر و محراب کو اپنی ڈانٹوں اور جھڑکیوں سے ہلائے ہوئے ہے۔ اس سے میں پوچھتا ہوں کہ باوجود سب کچھ کہنے، سب کچھ سنانے کے آپ کی تقریروں کا اثر آپ کے مصلوں سے باہر کیوں محسوس نہیں ہوتا؟ آپکی دھمکیاں صرف مسجدوں اور مدرسوں کی دیواروں سے ٹکرا کر آپ ہی کی طرف کیوں واپس ہو رہی ہیں؟ کیا یا تسبیح کہ تاویلوں اور توجیہوں کی آڑ میں کرنے والے وہ سب کچھ کر رہے ہیں، جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو یقیناً غلط ہے کہ مسلمانوں کا یہ عام گروہ جو ان خرافی اوہام اور مشرکانہ افعال میں مبتلا ہے، وہ اللہ کا منکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت میں اس کو شک پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن ان کے نزدیک خدا کی کتاب باقی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کے اس ارتداد کا میں قطعاً قائل نہیں ہوں، مرض کے اسباب کی یہ تشخیص غلط اور قطعاً غلط ہے۔ مشاہدہ اور معاینہ کے خلاف ہے۔ البتہ اگر جان کی امان دی جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے کلام اور رسول کی باتوں کے استعمال کرنے میں ان ہی بزرگوں سے شاید کچھ چوک ہو رہی ہے جنہیں ان چیزوں کے

استعمال کا قدرتی حق حاصل ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ لات ومنات، ہبل وعزیٰ سے عرب کے جاہلوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جب چھڑایا تھا، تو کیا اس حکم اور مشورہ کے ساتھ چھڑایا تھا کہ اپنے فرضی، جھوٹے معبودوں سے وہ اپنی جن ضرورتوں کو مانگا کرتے تھے، چونکہ وہ ادنیٰ درجہ کی دنیاوی ضرورتیں ہیں۔ اسلئے خالق کے آگے اپنی ان ضرورتوں کو نہ پیش کریں، بلاشبہ یہ ایک خلاف واقعہ اور غلط دعویٰ ہوگا۔ بلکہ بات وہی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے معبودوں اور دیوتاؤں سے مانگا کرتے تھے۔ حکم دیا گیا تھا، کہ ان ہی کا مطالبہ خدائے واحد سے کریں۔ جو کچھ مانگا جاتا تھا اس میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ جس سے مانگا جائے، صرف وہ بدل دیا گیا تھا۔ بہرحال مجھے اپنے اس خیال پر اصرار اور شدید اصرار ہے کہ صرف معاشی دشواریوں اور دنیاوی حاجتوں ہی نے عام مسلمانوں کو ان ناگفتہ بہ امور میں مبتلا کر دیا ہے۔ عموماً ساری بدعات اور شرکی کاروبار کے پیچھے غور کیا جائے گا تو معاشی محرکات ہی پوشیدہ نظر آئیں گے۔ یہ خیال کہ ان اعمال واشغال کی تہ میں کوئی دینی یا اعتقادی، اخلاقی یا روحانی محرکات چھپے ہوئے ہیں، صرف ایک بے بنیاد خیال ہے۔ صرف زبانی دعوے ہیں، جن کا صحیح احساس شاید بولنے والوں کو بھی اس وقت نہیں ہوتا جب وہ اپنے ان اعمال وافعال کی توجیہ میں طرح طرح کی خوش اعتقادیوں کو پیش کرتے ہیں۔ یقین مانئے، خدا کو الہ المعاش بنا کر جب تک مسلمانوں کے سامنے آپ نہیں پیش کریں گے۔ اس وقت تک صرف الہ المعاد والے خدا سے ان کا وہ تعلق ان کا قطعاً قائم نہیں ہو سکتا جس کا مطالبہ قرآن میں ہر مسلمان سے کیا گیا ہے۔ معادی خدا، جو صرف الآخرۃ میں سزا وجزا، یا الجنۃ والنار کا مالک ہے۔ ان جھوٹے خداؤں سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے۔ جن کے متعلق باور کرانے والوں نے بار بار کرار رکھا ہے کہ ان میں کوئی نوکری دلاتا ہے، کوئی اولاد تقسیم کرتا ہے، کوئی جنوں کو بھگاتا ہے۔ کوئی دشمنوں کو شکست دیتا ہے۔ ہاں وہی خدا، جو الہ المعاد ہے، وہی الہ المعاش بنا کر بھی مسلمانوں کے سپرد جب کر دیا جائیگا تو اس وقت بلاشبہ انسان کی فطرت ان جھوٹے چھوٹے اور جھوٹے معبودوں کو خود بخود چھوڑ بھاگے گی۔

تا نہ بنید کودکے کو سیب بہت      او پیازِ گندہ راند بہ زدست

لیکن سیب دیئے بغیر آپ اگر چاہتے ہیں کہ بچہ بدبودار پیاز کو چھوڑ دے تو آپ کا یہ ایک غیر فطری مطالبہ ہے۔ گونگے بہرے جمادات تک کے آگے تڑپنے کیلئے یہ مضطر اور مصیبت زدہ

انسان تیار ہو جاتا ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں، اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ تڑپ رہا ہے ان کے قدموں پر، اپنا سب کچھ حتیٰ کہ کبھی کبھی جانِ عزیز کے نثار کرنے تک سے دریغ نہیں کرتا۔ خیال تو کیجیے کہ ان ہی ضرورتوں کے لئے اگر اس کو واقعی مالک الملک، ارحم الراحمین کے قدموں پر لوٹنے کی دعوت دی جائے تو کیا وہ اس سے اعراض کر سکتا ہے۔ لیکن دین کے سارے زندہ تعلقات اس زندگی میں جب خدا سے توڑ لئے گئے ہیں تو بد قسمت، حماقت پسند انسان، آپ ہی بتائیے کہ آخر شدتِ تکلیف میں خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے اگر کھڑا ہو گیا ہے تو اس میں کیا صرف اسی کا قصور ہے؟ لاپروائیوں کی یہ انتہا ہے۔ کہ عوام ہی نہیں، اچھے پڑھے لکھے مولویوں سے بھی جب کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ پوچھا جاتا ہے، تو بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے اور بس یہی اس کا حاصل ہے۔ حالانکہ یہ نہ اس کا لفظی ترجمہ ہے، نہ یہ اس کا منشا ہے۔ آخر اللہ میاں ایک ہیں، یہی اس کا مطلب ہے تو پھر اس میں غریب بندوں کا کیا فائدہ؟ کس قدر عجیب بات ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو اسی لفظ اللہ کے حلقہ سے اپنے بھلائے ہوئے، مالک اور اور رب سے جوڑا گیا تھا۔ بتایا گیا تھا، ہر قوم کو، ہر زمانے میں، ہر ملک میں بتلایا گیا تھا کہ زندگی کی تمام ضرورتوں اور کشمکشِ حیات کی تمام مشکلات اور دشواریوں میں انتہائی عاجزی اور نیازمندی مسکنت وخاکساری، تذلل وابتہال کی انتہائی شکلوں کے ساتھ جان و دل کی پوری قوت سے جس کی طرف تمہیں بھاگنا چاہیے، ہر حال میں بھاگنا چاہیے وہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ لیکن سے

وہی پر کھل پڑا کبوتر کا    جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا!

کلمۂ دعوت کے ہر ہر لفظ کو سمجھا گیا، سمجھایا گیا، صرف ایک لفظ اللہ کی تعبیر واجب الوجود سے کر کے دلائل کا انبار اور دفاتر کا طومار تیار کر دیا گیا۔ جس چیز سے کسی کو انکار نہ تھا، جس اقرار کو شکمِ مادر سے لے کر ہر آدمی پیدا ہوتا ہے۔ ساری طاقت اسی مانے ہوئے اقرار کے منوانے پر خرچ کر دی گئی۔ مگر، دعوت کے اس کلمہ میں اللہ کا لفظ جو اس سارے کلمہ کی جان تھا، جو عبد کو اپنے معبود سے ملاتا تھا اسی کو ہر قسم کی تشریح و توضیح سے بے نیاز ٹھیرا کر چھوڑ دیا گیا۔ اور ساری توجہ ادھر پھیر دی گئی، کہ خالقِ کائنات کو ایک مانا جائے، گویا جس نے یہ مان لیا اس نے اس فرض کو ادا کر دیا جو اس کلمہ کے ذریعہ سے خدا نے اپنے بندوں پر عائد کیا ہے، کیسی عجیب بات ہے۔ اسلامی تعمیر کی جو پہلی اینٹ تھی اسی کے متعلق کتنی سخت غفلت[1] سے کام لیا گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دین کے پہلے کلمہ کے ساتھ، دین کے

---

[1] اللہ کو معاشی الٰہ جاننے سے بے اعتنائی ہی کا شاید ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جن دعاؤں اور قرآنی آیتوں مثلاً لا الٰہ
(باقی بر صفحۂ آئندہ)

سرداروں اور امت کے پیشواؤں کا یہی سلوک اگر باقی رہا تو اصنامی نظام کے متعلق کسی شکل، کسی نام سے

| | |
|---|---|
| رب انهن اضللن كثيرا | اے میرے مالک! ان بتوں نے راہ ماری |
| من الناس. | بہتیرے آدمیوں کی! |

کے ابراہیمی شکوہ کو تاریخ دہراتی رہے گی۔

| | |
|---|---|
| ولقد اضل منكم جبلا | اور بھٹکا دیا اس نے تم میں سے بہتیری |
| كثيرا (یٰسین ۳۶) | طبیعتوں کو! |

کی گرمئ بازار کا موقعہ شیطان کو ملتا رہے گا۔ اس وقت تک ملتا رہے گا۔ قطعاً بے روک ٹوک ملتا رہے گا جب تک کہ

| | |
|---|---|
| الذی هو یطعمنی ویسقین | وہی ہے جو کھلاتا ہے مجھے اور پلاتا ہے مجھے |
| واذا مرضت فهو یشفین ۔ | اور جب بیمار پڑتا ہوں، تو شفا بخشتا ہے |
| (الشعراء ۲۶)۔ | مجھے! |

والے اللہ کو روٹی کا بھوکا اور پانی کا پیاسا، مرض کے بعد صحت کا جویا انسان، الٰہ کی صورت میں نہ پائے گا؛ اور جب اس کو پائے گا تو خود بخود بے کتاب و بے معید و استاد

| | |
|---|---|
| انی لا احب الآفلین : | میں نہیں چاہتا، ڈھل جانے والے کو |
| (الانعام) | (لگا ہوں میں سما وجمل ہو جانے والے کو) |

کی روشنی سے حب وعشق، عبدیت و بندگی کی دنیا جگمگا اٹھے گی۔ جو واقع میں کسی سے کسی وقت،

---

بقیہ صفحہ گذشتہ ۔ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظالمین وغیرہ میں حق تعالیٰ کو اسی دنیا کی مشکلات کا الٰہ بنا کر جو مخاطب کیا گیا ہے، معنی سے بے تعلق، قطعاً بے تعلق کر کے مسلمانوں کا وہ طبقہ بھی حل مشکلات میں انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوا جو اب تک معاشی معاملات میں اللہ سے نفع اٹھانے کو جرم خیال کرتے رہے۔ مجھے افادہ کے اس پہلو سے انکار نہیں، لیکن کہنا یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ مثلاً مذکورہ بالا آیت کے اس مفہوم کو بھی پڑھنے والے اگر پیش نظر رکھیں یعنی "پروردگار! تیرے سوا میرا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ الٰہ ہونے میں آپ کا کوئی شریک اور ساجھی ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، میں خود ہی راہ سے ہٹنے والا تھا کہ کچھ بھونے ہونے دوسروں سے امید باندھیں"، دوسروں سے ذرا ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے اس تعلق کی یافت سے سکون کی جو خنکی دلوں کو مل سکتی ہے، سینہ کا جو بوجھ اس سے گھٹتا ہے کیا منتر یا افسوں کے طور پر ان الفاظ کو صرف دہرانے سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے ۱۲

کسی جگہ اوجھل نہ تھا۔ اس کے بعد انسان کے "وجدانی شعور" کے سامنے بھی بے نقاب ہو جائے گا۔ الغرض جو سامنے تھا، وہی سامنے آجائے گا۔ حصولِ معاش کی راہ کی ایک مستقل تدبیر جس کی طرف اسلام نے خصوصیت کے ساتھ رہنمائی کی تھی۔ چونکہ بتدریج اس سے استفادہ کا رجحان مسلمانوں میں کمزور ہوتے ہوتے قریب قریب اس نقطہ کو پہنچ چکا ہے کہ "معاشیات" کے باب میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ اور صرف یہی ہو کر رہ جاتا تو غنیمت تھا۔ استفادہ کی اس راہ سے بے تعلقی نے بعض مدہش و مہیب روحانی و اخروی خطرات کو مسلمانوں کے سامنے کر دیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ غربت و فلاکت کے ان دنوں میں بھی ان کی کمائی ہوئی آمدنیوں کی ایک بڑی معتدبہ مقدار لاحاصل، بلکہ شدید مضرت رساں راہوں میں برباد ہو رہی ہے۔ دیکھ دیکھ کر ہمیشہ کڑھتا رہتا ہوں۔ قرآن پڑھتا ہوں، اور پھر مسلمانوں کو دیکھتا ہوں، دماغ مختل ہو جاتا ہے، روح کانپتی ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ بیقراری میں قلم چلتا گیا اور بہ مشکل اس بحث کو ختم کر کے ایک دوسرے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہتا جاؤں، اس وقت تک کہتا جاؤں۔ جب تک کہ یہ یقین نہ پیدا ہو لے، کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، مسلمان اس کے ماننے پر مضطر و مجبور ہو گئے۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ط

## حق تعالیٰ کو صرف الٰہ المعاش بنانے کے نتائج!

بہر حال اس مسئلہ کو ختم کر کے اب اس دوسری چیز کو بیان کرتا ہوں جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ان اصراری بیانات سے کہیں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ میں خالق و مخلوق، عابد و معبود کے باہمی تعلقات کی تصحیح کے نتائج کو، یا دوسرے لفظوں میں ایمان و تقویٰ، عملِ صالح، دعا و عبادات، توبہ و استغفار توکل و تسلیم، صبر و شکر وغیرہ مذہبی حقائق اور دینی عناصر کے متعلق اس بات کا خدانخواستہ مدعی ہوں کہ ان کے ثمرات و نتائج صرف اسی زندگی تک محدود ہیں۔ یا مذہب کے ان مہماتِ عالیہ کا آخری مقصد صرف اسی "الحیٰوۃ الدنیا" کی مشکلات کا حل ہے۔ گویا مذہب کا سارا نظام (العیاذ باللہ) صرف معاشی صلاح و فلاح، بقاء و ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ یقیناً یہ غلطی اسی قسم کی غلطی، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت غلطی ہوگی جس میں حق تعالیٰ سے معاشی تعلقات کے توڑ لینے کی وجہ سے آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مبتلا ہو گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا مذہب مذہب ہی کب باقی رہتا ہے جس میں انسان کے لامحدود منازلِ حیات کو صرف بطنِ مادر اور شکمِ قبر کے درمیانی چند گنے گنائے دنوں تک محدود کر دیا جائے۔ یا یوں کہئے کہ یہ دے کر انسانیت کا سارا زور، اور

ان ہی چند اُلجھی ہوئی سانسوں کے سلجھانے پر صرف کر دیا جائے، جو دوسرے سانس پینے والے جانوروں کے ساتھ آدمی کو بھی زمین کے اس محدود کرّہ پر کچھ دن کے لئے عطا ہوئی ہیں۔ اس تنگ خیالی، تنگدلی اور تنگ نظری کی مذہب میں تو کیا گنجائش نکل سکتی ہے، فکر و نظر کے غیر دینی نظاموں میں بھی آدمی کی بلند فطرت، سیّال ذہنیت اس کو برداشت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہے۔ قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| قُل ھل ننبئکم بالاخسرین | کہئے کیا تمہیں بتائیں کہ خسارے میں کاموں |
| اعمالاً الذین ضل سعیھم فی | کے حساب سے کون ہے، وہی لوگ ہیں جن کی |
| الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون | کوشش اسی پست زندگی میں گم ہوگئی بجائیکہ |
| انھم یحسنون صنعا۔ | وہ خیال پکا رہے ہیں۔ کہ اچھا کام کر رہے |
| (الکہف ۱۸/۱۰۴) | ہیں —! |

میں بجا ارشاد ہوا ہے کہ سعی و عمل، جد و جہد میں اس سے زیادہ حرماں نصیب، کوتاہ بخت، نادان زدہ، دیوالیہ اور کون ہو سکتا ہے، جس نے احسن تقویم کے قالب میں بھری ہوئی خلاقی توانائیوں کو

| | |
|---|---|
| لم یرد الا الحیٰوۃ الدنیا | نہ چاہا اس نے، لیکن صرف اسی پست |
| ذالک مبلغھم من العلم | زندگی کو، یہ ہے رسائی ان کے علم |
| (النجم ۵۳/۳۰) | کی! |

کے تنگ دائرہ میں گم کر دیا ہو اور

| | |
|---|---|
| رضوا بالحیٰوۃ الدنیا و | خوش ہو گئے اسی پست زندگی کے ساتھ |
| اطمئنوا بھا (یونس) | اور اسی کے ساتھ مطمئن ہیں! |

کے شکنجوں میں دب کر اپنی روحانی موت کو طمانیت و سکینت یقین کر بیٹھا ہو۔ دوسرے جو چاہیں جو کہیں۔ جس مسلک کو چاہیں اختیار کریں لیکن "مقامِ محمود" کی بلندیوں پر قدم جمانے والے النبی الخاتم محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت حاصل کر کے جنہوں نے قرآنی علم کو اپنا علم بنا لیا ہے اور علمِ محیط کی اسی لازوال سرمدی روشنی میں انسانی عروج و ارتقاء کی آخری منزل ان الیٰ ربک المنتھیٰ کا نقطۂ ادج رضوان من اللہ اکبر کی لاہوتی شکل میں جن کے سامنے جلوہ افروز ہو چکا ہے، فرشتہ صید دل، پیمبر شکار دوں، یزداں گیروں کا یہ ایوانی گروہ قطعاً اپنے کو، اپنے سرمایہ کو اتنے ارزاں و سستے داموں بیچنے پر لمحہ کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتا قرآن

کے حرف حرف، لفظ لفظ سے جب ح

مغرورش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے پیغام کی مسلسل صدائیں اس کے کانوں میں گونج رہی ہیں، بلاشبہ ہم جب اسی معاشی دنیا میں ہیں اور ہمیں یہاں بھیج ہی دیا گیا ہے۔ تو یقیناً اس کی بھی ضرورت ہے کہ اللہ کو ہم اپنا الہ المعاش بھی بنائیں۔ لیکن اس کے معنی یہ کب ہیں کہ معاد (آئندہ زندگی کی مشکلات) کے لئے اللہ کو الہ بنانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ کتنی بڑی کور بختی ہوگی کہ جس کے پاس "الاولیٰ" اور "ثواب الدنیا" کے ساتھ "الآخرۃ" اور "ثواب الآخرۃ" بھی ہے، اپنی اخروی زندگی میں باوجود ضرورت، شدید ضرورت کے، اتنی شدید ضرورت کہ اس کے مقابلہ میں تو شاید معاشی ضرورت، کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کہ یہاں کا کام تو پیدائش کی راہوں کو عقلی قابو میں لانے سے بھی بہرحال کچھ چل ہی جاتا ہے[1] لیکن الامر یومئذ للہ کی گھڑیوں میں تو پیدا کرنے والے سے مانگنے کے سوا اس کی پیداواروں کو اور کسی ذریعہ سے حاصل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ایسا دیوانہ کون ہوگا، جو معاشی ضرورتوں میں تو اللہ کو الہ بنانے سے نہ شرمائے لیکن معادی حاجتوں کے لئے اسی اللہ کو الہ بنانے اور اس کے آگے گڑگڑانے، التجا و زاری کرنے

---

[1] بلکہ سورۂ "زخرف" کی وہ آیتیں جن میں ہے کہ اگر ساری دنیا ایک ہی نقطہ پر جمع نہ ہو جاتی تو الرحمٰن کے منکروں کو ایسے مکانات دے دیئے جاتے، جن کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی ہوتیں۔ اور ہر طرح کی زیب و زینت کے سامان سے ان کو لاد دیا جاتا" جیسا کہ قرآنی آیت کا حاصل ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافروں میں بھی جو لوگ غریب و مفلس نظر آتے ہیں وہ محض اس وجہ سے ہے کہ اللہ کی رحمت نے نہیں چاہا کہ آدم کی اولاد محض اس مغالطے میں مبتلا ہو کر بے دین ہو جائے۔ اب تو کفر کے ساتھ بھی چونکہ غربت پائی جاتی ہے۔ اس لئے دولت مند ہونے کے لئے کافر ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اللہ اکبر! قرآن نے جو کچھ کہا ہے۔ اگر وہ صورت واقعی کفر کی ہوتی تو سبک عقلوں کا کیا حال ہوتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ "جمعہ" میں جمعہ نماز کی بابت یہ حکم دیتے ہوئے کہ جب اس کے لئے پکارا جائے تو اس وقت بیع (یعنی تجارتی کاروبار) کو چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ تجارت یا لہوی مشاغل کو دیکھ کر لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جس کا دوسرا مطلب یہی ہوا کہ معادی مسائل کے مقابلہ میں معاشی مسائل کو لوگ زیادہ اہمیت جو دے دیتے ہیں۔ یہ طرز عمل ان کا قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ مقابلہ کے وقت ظاہر ہے کہ معاد کی ابدی زندگی کے سامنے معاشی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسی کی طرف وما عند اللہ خیر من اللھو و التجارۃ (اور جو اللہ کے پاس ہے وہ تجارت اور لہو سے بہتر ہے)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

میں اپنی ہتک محسوس کرے ۔ جو بدنصیب ایسا کرے گا، قرآن نے اُس کے متعلق یہ فرما کر کہ

| | |
|---|---|
| فمنھم من یقول ربنا اتنا | تو ان میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے |
| فی الدنیا (البقرة ۲/۱) | مالک دے ہمیں الدنیا میں ! |
| ماله فی الاٰخرة من | نہیں ہے " الآخرة " میں اس کا |
| خلاق (البقرة ۲/۱) | حصّہ ! |
| ماله فی الاٰخرة من نصیب | نہیں ہے " الآخرة " میں اس کا حصّہ |
| (الشوریٰ ۹/۴) | |

کی دھمکی کا اعلان کیا ہے ۔ تو سوچا جائے کہ ظرف کا یہ چھوٹا تنکہ ، یہ شخص اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے ۔ صرف یہی نہیں کہ ان تنگ بینوں ، کوتاہ دیدوں کے لئے آخرت میں " کچھ نہیں " ہے ، بلکہ قرآن کی آیت

| | |
|---|---|
| من کان یرید العاجلة عجلنا | جو چاہتا ہے (اسی جلدی والی دنیا کو) تو |
| له فیھا ما نشاء لمن نرید، ثمّ | جلدی کر دیتے ہیں ہم اسی دنیا میں جتنا ہم |
| جعلنا له جھنّم یصلاھا مذموما | چاہیں اور جس کیلئے ہم چاہیں ' پھر بناتے ہیں |
| مدحورا | اس کے واسطے جہنّم ۔ پھاندے گا اس میں |
| (اسرائیل ۱۵/۲) | دُر درایا ہوا ، دھتکارا ہُوا ! |

---

بقیہ صفحہ گذشتہ ۔ میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ سورۃ کے آغاز میں یہود اور ان کے طرزِ عمل کا ذکر بھی اسی لئے کیا گیا ہے ، کہ دینداری کے دعوے کے باوجود اس قوم پر سب سے بڑی لعنت جو مسلّط ہوئی ' وہ یہی تھی کہ معادی مسائل کے مقابلہ میں یہودیوں کے یہاں معاشی مسائل مثلاً تجارت ، کھیل ، تماشوں نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی ۔ انتہا اس لعنت کی یہ ہوئی کہ انہوں نے توراۃ سے آخرت کی زندگی ۔ یعنی معاد کے تذکرے ہی کو نکال دیا ۔ اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ توراۃ کے اٹھانے کے بعد انہوں نے پھر اسے نہ اٹھایا اور اسی چیز نے موت کا خوف ان میں پیدا کر دیا ۔ مسلمانوں کو چونکا دیا گیا ہے ۔ کہ معاد کے مقابلے میں اگر ان میں بھی معاشی مسائل زیادہ اہمیت حاصل کر لیں گے تو موت کا خوف ان پر بھی مسلّط ہو جائے گا ۔ ——

لله ـــ شاید وہ ہو گیا ہے ۔ حالانکہ معاش یعنی الرزق کی ذمہ داری اس سورۃ کے آخر میں بھی واللہ خیر الرّازقین کے الفاظ میں لی گئی ہے ۔ ۱۲

ہیں تو ان ناشکروں کے متعلق جنہوں نے انسانیت کے لامحدود فکری سرمایہ کو اس بیدردی سے ضائع کیا۔ جس کے گلشنِ سدا بہار میں ہر قسم کی تنگ دامانیوں کا فیاضانہ علاج ہر اس پیمانے پر میسّر آسکتا تھا جو سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن چند کلیوں پر قناعت کرنے والے تنگ ظرفوں نے اپنے اسی حیلتی کل مشیٔ قدیر مالک کی جو "رحمٰن الدنیا" کے ساتھ "رحیم الآخرۃ" بھی ہے۔ جب ناقدری کی جو اس کا واقعی وزن اور حقیقی وقار تھا، اپنی چھچھوری ذہنیتوں میں اگر اس وزن اور وقار کے احساس کی وہ گنجائش نہیں پاتے تو بخت کے ان چھوٹوں کو دُردُراتے، دُھتکارتے ہوئے لعنت کے تاریک گڑھوں میں اگر دھکیل دیا جائے تاکہ اسی میں وہ گڑھیں اور ابد تک کڑھتے رہیں۔ پچھتائیں، اور ابد تک پچھتاتے رہیں۔ دانت پیسیں اور ابد تک پیستے رہیں، اور یوں کیے کا خمیازہ بھگتیں اور بھگتتے رہیں۔ تو اس کے سوا وہ کس سلوک کے مستحق ہو سکتے ہیں!

## حق تعالیٰ کو صرف الٰہ المعاش بنانے کا مہلک خطرہ

جزاء و وفاقا کے ان آثار کا ظہور تو "الدنیا" کے بعد "الآخرۃ" کی آنے والی زندگی میں ہوگا۔ لیکن ان لوگوں کیلئے جو حق تعالیٰ کی الٰہ المعادی شان سے بے پروا ہو کر محض الٰہ المعاش ہی بنانے کا رشتہ ان کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان دو تعلّقوں سے صرف ایک، یعنی معاشی تعلق کو تھام کر دوسرے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔ اور یوں ایک ہی کنارہ پر بیٹھ کر صرف اسی الحیٰوۃ الدنیا کی کامیابیوں کے لئے اس کو پوجتے ہیں۔ نمازیں بھی اسی لئے پڑھتے ہیں، تلاوت بھی اسی لئے کرتے ہیں، خیر و خیرات کے مدوں میں بھی اسی لئے دیتے ہیں، تاکہ مثلاً ان کی نوکری برقرار رہے۔ ترقیوں کی راہیں ان پر کھلیں تجارت میں فروغ ہو، فصل پوری ہاتھ لگے، بال بچوں سے گود بھری رہے۔ گھر کا اقبال اونچا ہو، اعزاز بڑھے۔ "علی حرف" یعنی کنارے بیٹھ کر اس طریقہ سے اللہ کو پوجنے والوں کو قرآن میں اس سے بھی ڈرایا گیا ہے۔ کہ کہیں "الدین" کے ساتھ وہ اپنی "الدنیا" بھی نہ ڈھا بیٹھیں۔ ارشاد ہے

| | |
|---|---|
| ومنھم من یعبد اللّٰہ علیٰ | ان میں بعض ایسے ہیں، جو پوجتے ہیں خدا |
| حرف فان اصابہ خیر اطمان | کو کنارے پر بیٹھ کر، پھر اگر پہنچی اسے کوئی |
| بہ و ان اصابتہ فتنۃ انقلب | بھلائی تو مطمئن ہو گیا اس کے ساتھ، اور |
| علیٰ وجھہ خسر الدنیا والآخرۃ | اگر پہنچی کوئی آزمائش تو پلٹ پڑا اپنے |
| ذالک ھو الخسران المبین! | رُخ پر، برباد کر بیٹھا دنیا بھی اور آخرۃ |
| | بھی ــ یہی ہے کھلا ہوا خسارہ! |

مطلب یہی ہے کہ معادی معاملات میں تو خدا سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے ہوئے تھا۔
لے دے کر ایک معاشی رُخ حق تعالیٰ کی طرف اس کا باقی تھا، اس رُخ سے جب تک پاتا رہے گا
اس وقت تک تو خیر، لیکن عالم کا علم اگر اس کے جہل کا ساتھ خود اسی کے فائدہ کے لئے کسی وقت
نہ دے اور اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہے کہ نہ دے، تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ الہ المعاش
ہونے کی حیثیت سے اس وقت خدا کو الٰہ بنانا اس کے لئے برابر ہو جائے گا، کتنا نازک وقت
اور کٹھن گھڑی اس کے لئے یہ صورت ہوگی۔ خدا کا یہ یک رُخا پجاری جب معاشی فلاح و بہبودی
کے لئے خدا کو پوج رہا تھا۔ اتفاقاً اس راہ کی کامیابیوں کے دروازے جب اپنے اوپر بند پائیگا،
تو کب تک وہ اس "خرچی" عبادت اور دعا پر صبر کئے بیٹھا رہے گا! معادی منافع تو اس کے
سامنے ہی نہیں، رہ گئے تھے معاشی فوائد، جب ان میں بھی ناکامیوں کے سوا اپنے سامنے کچھ نہیں دیکھتا
تو خطرہ، اور بہت زیادہ خطرہ ہے کہ اُکتا کر وہ خدا کے سامنے سے ہٹ جائے۔ معادی رشتہ تو پہلے
ہی سے ٹوٹا تھا، رہ گیا تھا معاشی ربط، سو وہ بھی (العیاذ باللہ) جب اس کا ختم ہو گیا، تو اب بارگاہِ
حق میں حضوری کی کیا صورت اس کے لئے باقی رہ جاتی ہے؟ محرومی اور کیسی سخت محرومی ہوگی جس
کا ایسی حالت میں وہ محض اسی لئے شکار ہوا کہ جو ہم انسانوں کا الٰہ المعاش ہونے کے ساتھ الٰہ المعاد
بھی تھا۔ اسی ذاتِ پاک کو یہ نادان صرف الٰہ المعاش بنا کر پوجتا رہا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یاس کی
تلخ کامیاں اس قسم کے یک رُخی عبادت والوں کی نیانوں سے ان حالتوں میں اوّل فول کی جو گندگیاں
اگلواتی ہیں۔ وہ تو شاید ان مسکینوں کے لئے بھی قابلِ برداشت نہ ہوں، جو اپنے مالک سے نہ معاشی
ہی تعلق رکھنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ معادی کی۔ بلکہ صرف عقلی سہاروں کے بل بوتے پر زندگی
گذارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت بھی نمک حرامی اور بغاوت و سرکشی کی ایک بدترین شکل ہے۔
جس کی تھوڑی بہت تفصیل شاید آئندہ کی جائے۔ لیکن جن بدبختوں کا انجام ان سے بھی بدتر ہو، اُن
سے زیادہ کھلے ہوئے خسارے اور گھاٹے میں کون رہ سکتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یک رُخوں کا
یہ گروہ جاتا تو ہے خدا سے معاش مانگنے، لیکن کبھی کبھی اس کی واپسی (العیاذ باللہ) ایسی شکلوں میں
ہوتی ہے کہ معاش کے ساتھ اپنی معاد کو بھی اپنے ہاتھوں یہ برباد کر بیٹھتا ہے۔ درپے دُنیا دیں ہم رفت؛
آلہم رفت ایں ہم رفت کی نامرادیاں اس قسم کے لوگوں کے لئے ہیں۔ برخلاف اس کے، جو حق کو معاشی
و معادی دونوں کناروں سے پکڑتے ہیں، معاش میں بھی اُن کا حقیقی رُخ حق ہی کی طرف رہتا ہے اور
معاد میں بھی ان کی تکتکی فضلِ حق ہی کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ اُن کے لئے کس بات کا خطرہ ہے؟ معاشی

جہات میں بالفرض اگر ان کو ناکامی بھی محسوس ہو، اگرچہ واقع میں وہ بھی کامیابی ہوتی ہے جس پر بظاہر ناکامی کا غلاف چڑھا رہتا ہے، لیکن یہ ظاہری ناکامی بھی اُن کو خدا سے اس لئے جوڑے رکھتی ہے۔ کہ ان کا دُوسرا رُخ یعنی معادی رشتہ تو خدا سے بہرحال باقی رہتا ہے۔ بڑی سے بڑی معاشی محرومیاں بھی اُن کو خدا کے قدموں سے دُور نہیں کر سکتیں۔ بلکہ جیسا کہ گذر چکا، وہ اپنی ہر معاشی ناکامی کو معادی کامیابیوں کا ذریعہ، صبر و رضا، تسلیم و تفویض وغیرہ مختلف قرآنی تدبیروں سے بناتے چلے جاتے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ معادی امور سے بے پروا ہو کر حق تعالیٰ سے صرف یک رُخی معاشی نسبت اگرچہ بہتوں کے لئے آج مذہبی امتیاز اور دینی برتری کی سند بنی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن نے جن عواقب اور خمیازوں پر متنبہ کیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی ان کی غلط مذہبی زندگی، مذہبی زندگی قرار پانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟

پس صحیح بات یہی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو، جو خدا اور جو معبود اللہ کے نام سے عطا کیا ہے، وہ مسلمانوں کا الہ المعاش بھی ہے اور الہ المعاد بھی۔ اسی لئے ایک مسلمان کا صحیح دینی مقام یہی ہو سکتا ہے کہ "الہ المعاش" ہونے کے ساتھ جو رب بندوں کا "الہ المعاد" بھی ہے، اسی کے قدموں پر سر ڈالے۔

| | |
|---|---|
| ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃً | اے ہمارے مالک! دیجئے ہمیں دنیا میں بھی |
| وفی الآخرۃ حسنۃً وقنا | بھلائی اور آخرۃ میں بھی بھلائی، اور بچا |
| عذاب النار (البقرۃ ۲۵) | لیجئے ہمیں عذاب کی آگ سے۔ |

کے ساتھ گڑگڑاتا رہے۔

**معاشی ضرورتوں کو خدا سے مانگنا کیا آدمی کو نکما اور ناکارہ کر دیتا ہے**

"الہ المعاد" کو "الہ المعاش" بنانا پست ہمتی اور تنگ نظری ہے۔ اس مغالطے کا اثر زیادہ تر قدیم مشرقی ذہنیتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس مغالطہ کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا اور جن دینی و دنیوی، روحانی و مادی مفاسد کے دروازے اس غیر قرآنی ذہنیت کی بدولت کھلے۔ ان سب پر بہ تفصیل گفتگو ہو چکی لیکن ذہنیتوں کا جو سانچہ مغرب کی مختلف آنچوں سے پگھل پگھل کر اس زمانہ میں تیار ہو رہا ہے، میں جان رہا ہوں، کہ میری گفتگو کا ایک بڑا حصہ ان مسکینوں کو اس فکر میں گھلا رہا ہوگا، کہ معاشی ضرورتوں کے متعلق بھی مسلمانوں کو اگر یہ تعلیم دی جائے گی کہ اپنے خدا سے ان کو مانگ لیا کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سعی و عمل کا جو بھی بچا کھچا ذوق مسلمانوں میں باقی رہ گیا ہے وہ بھی ان سے نکل جائیگا یوں ہی

مسلمانوں کی بے کاری و بے عملی، کاہلی، نکماپن کا دنیا میں شہرہ ہے۔ لیکن جب ان کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ تقویٰ کی راہ سے بھی آدمی اپنی روزی حاصل کرسکتا ہے۔ معاشی فارغ البالی، ایمان و عمل صالح سے بھی پیدا ہوسکتی ہے، تو ایک لوٹا پانی اور چند سجدوں سے جو چیز مل سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لئے لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ عقلی تدبیروں کے جھنجھٹوں میں پھنس کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملائیں۔ کانپ اٹھتا ہے۔ نسلِ آدم کا یہ عجیب و غریب طبقہ، کانپ اٹھتا ہے، جب سنتا ہے، کہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی واعظ اسلام کو دینی اور دنیوی ہر قسم کی کامیابیوں، خوش حالیوں کا ضامن قرار دے رہا ہے۔ خدانخواستہ باور کرانے میں اگر واعظ کامیاب ہوگیا۔ قومی درد کے مریضوں کا یہ گروہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ مسلمانوں کی موت کا وہی دن ہوگا۔ ان کی امت نہیں بلکہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی یہی فکر، جیسا کہ ان کا بیان ہے، صبح و شام انہیں گھلا گھلا کر دبلا بناتی چلی جا رہی ہے مذہبی دیوانوں پر عموماً ان کی تیوریاں اسی لئے چڑھی رہتی ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اب تک اس سلسلہ میں میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، مختلف پیرایوں میں ضمناً ان خود تراشیدہ بے جا وسوسوں کا ازالہ کرتا ہوا بھی چلا آیا ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک صاف صاف کھلے لفظوں میں مستقلاً اس بحث کو بھی طے نہ کرلیا جائے گا۔ ان وسوسوں کا استیصال جیسا کہ چاہیے، شاید نہ ہوسکے گا۔ گو بلا وجہ طوالت ہوگی۔ لیکن جن کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ اگر ان ہی کو مطمئن کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر بجائے خود جو مطمئن ہیں محض ان ہی کو خوش کرنے سے کیا حاصل؟ مسلسل کہتا چلا آیا ہوں، کہ اپنی معاشی زندگی میں جن چیزوں سے ہم استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق دو مستقل سوالات ہیں ۔ یعنی انہیں کون پیدا کر رہا ہے؟ یہ پہلا سوال ہے۔ کن راہوں اور کن طریقوں سے پیدا کر رہا ہے؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ فرض کیجئے کہ مٹی کے برتن بن بن کر کسی چاک سے اتر رہے ہیں۔ کون بنا رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کمہار بنا رہا ہے! کن طریقوں سے بنا رہا ہے؟ اس کے جواب میں کمہار کے ہاتھ کی لکڑی، چاک، چاک کی گردش، ہاتھ کے کام، ان سب کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ یا ریل چل رہی ہے۔ کس طاقت سے چل رہی ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوئلہ، پانی، انجن کے تمام پرزوں، انجن کا بوگیوں سے جو تعلق ہے۔ ہر ہر بوگی کے تمام اجزاء پہیئے، پٹری وغیرہ ان تمام امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں جو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو کون پیدا کر رہا ہے؟ اسی کا جواب ہے کہ اللہ پیدا کر رہا ہے! گذر چکا کہ اس جواب کے علم و یقین کو قدرت نے انسانی فطرت میں اس طریقہ سے رچا دیا ہے کہ کون پیدا کر رہا ہے؟ جس سے بھی یہ سوال کیا جائے گا۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ سوال کی

چوٹ سے بیدار ہو کر جواب دینے والا اپنے شعور میں اللہ کے سوا اور کسی کو پا نہیں سکتا۔ مجبوراً زبان سے اس کو وہی کہنا پڑتا ہے جسے اپنی شعوری یافت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکال سکتا۔ اشیاء کی پیدائش کے متعلق یہ پہلے سوال کا جواب ہے۔ رہا دوسرا سوال، یعنی کن راہوں سے، کس طریقہ سے یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں؟ اسی کا جواب ہے کہ جو ہماری عقل و حواس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اشیاء کی پیدائش کے متعلق انسانیت کی تحقیقی و تفتیشی، ادراکی قوتیں جس جواب کو پاتی ہیں، وہی اس سوال کا حقیقی جواب ہے میں نے عرض کیا تھا کہ ان معاشی پیداواروں کو خود پیدا کرنے والے سے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنی معاشی ضرورتوں میں الٰہ بنایا گیا ہے۔ اور جن راہوں سے یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان راہوں کا علم حاصل کر کے اپنے قابو میں لا کر ان سے مستفید ہونا، اسی کا دوسرا نام عقلی و دستی تدبیر، جسمانی و مادی مشقت و محنت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ اللہ یا خالقِ عالم کو الٰہ بنا کر ان پیداواروں سے استفادہ کے متعلق جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔ اس تدبیر کی بنیاد علم کے ایک قطعی اور فطری اساس پر مبنی ہے۔ اور گو تدبیر کے دوسرے شعبہ کی بھی عقل و حواس کے تجربی معلومات ہی پر بنیاد قائم ہے۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہونے کے باوجود بتایا گیا تھا کہ قطعیت و یقین آفرینی کی وہ کیفیت اس میں نہیں پائی جاتی۔ جس قسم کی قطعیت اس علم میں پائی جاتی ہے۔ جس پر تدبیر کا پہلا شعبہ مبنی ہے مگر قطعیت کے اس فقدان کے باوجود اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ پیش کیا گیا تھا کہ اپنی اپنی یافت اور علم کی حد تک آدمی اسی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے کہ فطرت کے ان قوانین سے بے اعتنائی نہ برتے جن کی راہوں سے دُنیا میں خیر و شر کا ظہور ہو رہا ہے۔ کہا گیا تھا کہ جو ان سے لاپروائی اختیار کر کے کسی مصیبت کا شکار ہو جائے تو

فلا یلومن الا نفسہ — ندامت کرے گا مگر اپنے آپ کو!

کے بغیر اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اس بارے میں قرآنی اشارے جو پائے جاتے ہیں ان کے نمونے بھی پیش کئے گئے تھے۔ بتایا جائے کہ اس کے بعد اسلام اور کیا کرتا۔ کھیت جوتنے پر اگر کسان سے اصرار کیا جائے تو محض اس لئے کہ جوتنے کی تاکید جس کسان کو کی جائے گی۔ کسی کو اس کا خفقان پیدا ہو کہ تخم ریزی کو وہ چھوڑ بیٹھے گا یا کھانا چھوڑ دے گا، پانی سے بیزار ہو جائیگا۔ اگر یہ صرف خفقان ہے تو پھر خواہ مخواہ یہ اندیشہ جن لوگوں کو اندر ہی اندر ستا رہا ہے کہ معاشی ضرورتوں میں مسلمان اگر خدا سے یا ان ضرورتوں کے پیدا کرنے والے سے مانگنے کے عادی ہو جائیں گے، تو جن

راہوں سے یہ ضرورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان میں غور و فکر اور ان پر قابو پانے کی تدبیریں چھوڑ بیٹھیں گے۔ ایک قسم کا غیر منطقی جذباتی اندیشہ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کسی کو پائجامہ پہننے کا اگر مشورہ دیا جائے تو اس کا یہ مطلب کیسے لے لیا جائے گا کہ کرتہ پہننے سے اُسے روکا جا رہا ہے۔ یا پائجامہ پہننے والا کرتہ پہننا چھوڑ دے گا۔ کسی طالب العلم کو استاد اگر لکھنے کی تاکید کرے تو اس کے کیا یہ معنی ہیں کہ وہ پڑھنے سے اس کو منع کر رہا ہے؟ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں میں خالق تعالیٰ کو الٰہ بنانا اور اس کی طرف رجوع کرنا، اس کی بنیاد خواہ جتنے بھی قطعی اور فطری علم پر قائم ہو لیکن بہر حال تعلق تو اس تدبیر کا ایک غیبی قوت سے ہے۔ اس لئے اگر لوگوں کو اس تدبیر کے اختیار کرنے پر توجہ دلائی جائے۔ تنبیہہ و تاکید کی جائے تو اپنی غیبی خصوصیت کی بنیاد پر وہ اس کی مستحق ہے۔ بخلاف تدبیر کے دوسرے شعبہ کے، کہ اس کا تعلق غیب سے نہیں بلکہ مشاہدات و محسوسات سے ہے۔ اور آدمی کا قاعدہ ہے کہ وہ غیب سے تو غافل ہو سکتا ہے لیکن مجنونوں اور دیوانوں کے سوا عام حالات میں حسی قوانین، اور مشاہداتی امور سے اعراض تقریباً ناممکن ہے۔ ان قوانین کو چھوڑنے پر کسی کو بالفرض اگر آمادہ بھی کیا جائے تو مشکل ہی سے کوئی اس کی تعمیل پر تیار ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں تدبیر کے اس شعبہ کو ترک کرانے کے کیا معنی! اس کے متعلق تو خاموشی سے بھی کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ گذر چکا کہ تدبیر سے پہلے شعبہ (یعنی پیدا کرنے والے سے مانگنے) کے ساتھ دُوسرے شعبہ یعنی (جن راہوں سے وہ پیدا کر رہا ہے) ان کے اقتضاءات کی تکمیل کو اسلام میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ ان سے اعراض وانحراف، چونکہ پیدا کرنے والے کی مقررہ سنتوں سے انحراف و بغاوت ہے اس لئے ان سے لاپروائی، اگر سوچا جائے تو یہ خدا سے جنگ ہے۔ غالباً یہی مطلب ہے ابوداؤد، الحاکم وغیرہ کی اس حدیث کا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع دی ہے کہ

| | |
|---|---|
| سیکون فی ھذہ الامۃ قوم | اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو حد سے تجاوز |
| یعتدون فی الاعتداء والدعا | کریں گے، تجاوز کرنے میں اور دعا میں! |

اور امام بخاری نے قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| انہ لا یحب المعتدین! | خدا کے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو اللہ نہیں چاہتا! |

کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| الا فی الدعاء وغیرہ | یعنی دعا اور دعا کے سوا باتوں میں! |

اسی بنیاد پر علماء امت کا یہ اجتماعی و اتفاقی فیصلہ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے۔ مولینا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم رقمطراز ہے:۔

| | |
|---|---|
| اجمع العلماء انہ لا یجوز ان | علماء کا اتفاق ہے کہ آدمی کیلئے جائز نہیں |
| یدعو الانسان ان یطلع السماء | ہے کہ وہ ایسی دعا، مانگے کہ آسمان پر چڑھیں |
| او تحول بجبل الفلانی ذھبا | گے' یا فلاں پہاڑ کو سونا بنا دیا جائے' یا |
| او یحیی له الموتی' وغیرہ | مردہ کو زندہ کر دیا جائے۔ |

(الحرز الثمین برحاشیہ حصن حصین ص۴)

پیدائش کے مقررہ قوانین کے بدل دینے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی گناہ ہیگا جب جائز نہیں ہے' تو پیدائش کے ان معیّنہ طریقوں کا چھوڑنا ان لوگوں کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے جنہیں ان ہی قوانین کا پابند بنا کر حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

## سُلطانی وغیر سُلطانی قوانین کا فرق!

البتہ ایک چیز، جس کا ذکر یہاں ضروری ہے' وہ یہ ہے کہ پیدائش کی جن راہوں کے متعلق باور کرانے والے' یہ جو باور کراتے رہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے جانا ہے وہی واقع میں بھی خدا کی بنائی ہوئی قطعی راہیں ہیں' یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ باور کرانے والے اپنے نزدیک اسے خیال کئے ہوئے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا تھا کہ واقعی جو خدا کی بنائی ہوئی مقررہ راہ ہے اس سے اعراض' یا اسکی خلاف ورزی' تو خدا کی' خدا کی مرضی کی' خدا کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ایک ایسی چیز کو توڑنے کی یہ کوشش ہے' جس کے توڑنے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ لیکن عام طور پر جن نظریات و مسلمات کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قوانین اور قدرت کے آئین ہیں' ظلم ہوگا اگر ہر شخص کو اس کا حق نہ دیا جائے کہ بجائے خود وہ بھی اس کی تحقیق کرے کہ واقع میں وہ خدا کی مقرر کردہ راہیں ہیں بھی یا نہیں۔ بعض دوسروں کے قول پر بھروسہ کر کے ان کی ناقص معلومات کے متعلق یہ اصرار کرنا کہ انہیں خدائی قانون یقین کر لیا جائے ظاہر ہے کہ نہ یہ عقلاً درست ہو سکتا ہے اور نہ مذہباً۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات اُن ہی کے نظریات کے متعلق

| | |
|---|---|
| ما انزل الله بها من سلطان | نہیں اتارا خدا نے اسکیلئے سُلطان! |

کا اعلان یا

فاتوا بسلطان مبین — لاؤ کوئی کھلا ہوا سلطان!

وغیرہ کے مطالبات جو پائے جاتے ہیں، ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں اور ہم اپنے معلومات و تجربات کی بنیاد پر ان کے متعلق جو نظریات و قوانین بناتے رہتے ہیں قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا "غیر سلطانی قوانین" نام رکھا جا سکتا ہے!

## لفظِ سلطانؔ اور نزول کی تحقیق

"سلطانی قوانین" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اور سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے موسوم کر رہا ہوں ـــ اردو میں سلطان کے معنی چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں، اس لئے قدرتاً لوگوں کا ذہن شاید اسی طرف منتقل ہو جائے، ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی، جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے شرح کر لی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنی "غلبہ" اور "تسلط" کے ہیں چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ مگر ان آیتوں میں "سلطان" کا لفظ دراصل غلبہ اور استیلاء، تسلط ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، یہ تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی۔ دوسرا لفظ جو یہاں قابلِ غور ہے، وہ ما انزل اللہ میں "انزل" کا لفظ ہے۔ انزل کا مادہ نزول ہے۔ نزول کے معنی اُترنا، اور انزال کے معنی اتارنا ہے۔ عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ منسوب کئے گئے ہیں۔ اس لئے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے تو پہلا خیال اسی تنزیل اور انزال کے معنی کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں، مثلاً

ما انزل اللہ بھا سلطان — نہ اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان!

کے متعلق عموماً ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی یا پیغمبروں کو کوئی علم اس کے متعلق عطا نہیں ہوا۔ اگر اس آیت میں بھی "انزل" کے یہی معنی لئے جائینگے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے۔ جن کے قانونِ الٰہی ہونے

کی تصریح قرآن ہیں، یا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کی گئی ہو۔ اور غیر سلطانی قوانین سے مراد وہ باتیں ہوں گی، جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ محض انزل ، کے لفظ کی بنیاد پر، اگر ایسا سمجھا جاتا ہے، تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن میں "الحدید" لوہے کے متعلق بھی یہ آیت پائی جاتی ہے۔

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید۔ — اتارا ہم نے لوہے کو، جس میں بہت زیادہ زور بھرا ہوا ہے!

ظاہر ہے کہ "الحدید" یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی، نہ عقلاً صحیح ہے، نہ نقلاً۔ بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلف، یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا"۔ جس سے معلوم ہوا کہ "انزل" کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب ان لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقعیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے۔ سنکھیا قاتل ہے۔ آفتاب روشن ہے، گرم ہے۔ قدرت کے ان ہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں "سلطانی قوانین" قرار دیتا ہوں۔ اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں، جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے۔ وہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب بآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانیت اور تسلط کی یہ کیفیت ہوگی۔ خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنتہ اللہ ہونا یقینی ہے۔ اسی لئے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے، مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈنے والے، جوتے بوئے بغیر لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے، سنکھیا کھا کر زندگی کی امید رکھنے والے، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل اختیار کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں!

لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبیعات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذہنی علوم

ان کے تمام نظریات و مسلّمات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مسلّمہ کی خلاف ورزی خدا کی سنّت یا سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے جزئیات تو خیر جزئیات ہیں، ان عقلی علوم و فنون کے کلّیات بلکہ اساسی مقدمات تک بھی ابھی مشتبہ اور محلِ بحث و نظر ہیں۔ طبیّات ہی کو لیجئے۔ جن پر ہزار ہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کا سارا معالجاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے۔ دوسرے میں بالکل اس کے خلاف علاج بالمثل کے نظریہ پر اصرار کیا جاتا ہے۔ علاج کے ان دونوں متصادم و متخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایلو پیتھک طریقۂ علاج کو ترک کر کے کوئی ہومیو پیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو کیا اس پر یہ الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبّی تجربات، اور علاجی نظریات اُس وقت اپنے تاثیری نتائج کے لحاظ سے عموماً ایسے حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی، یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج و معالجہ کی نفع بخشی کا بھی منکر ہو جائے تو جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ ایسے آدمی پر بھی سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرینِ انصاف نہ ہوگا۔

ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور و فکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوسِ گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری، یا اولاد کبیر کی توریث، الغرض گنج سے گنج کھینچتے ہیں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا۔ کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پھر پانا چاہتا ہے، تو ان تمام راہوں کو بند کرے، جن سے ملک و قوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹی ہو، حکم دیا جاتا ہے کہ جو عوام میں غریب ہیں، وہ تو خیر غریب ہی ہیں۔ لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے، بجبر و بشمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات میں معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا

جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم و فنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا، خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا، اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بد قسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو، ان پر سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ بلکہ حکیمانہ تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کا اقتضاء تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں افسانوی مغالطوں، شاعرانہ پینتیروں سے دماغ کو بالکلیہ آزاد کرکے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ جن چیزوں میں سلطانیت کا رنگ تیز نظر آتا۔ اسی حد تک اعتماد و وثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی اور جس میں جس حد تک سلطانیت کا رنگ دھیما محسوس ہوتا۔ اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی دا شگافی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہو سکتی تھی، جس کے پیدا کرنے کے لئے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً

| | |
|---|---|
| ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم | نہیں ہے وہ (یعنی جن چیزوں کو کفار پیدائش |
| و اباءکم ما انزل اللہ بھا من | وتخلیق کا وسیلہ و ذریعہ خیال کرتے تھے) لیکن |
| سلطان ان یتبعون الا الظن | چند نام (یا الفاظ) جسے رکھ لیا ہے تم نے اور |
| وما تھوی الانفس ! | تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے |

ان کے لئے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف ظن کی اور ان باتوں کی جنہیں ان کا جی چاہتا ہے

| | |
|---|---|
| ما لھم بہ من علم ان یتبعون | نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی |
| الا الظن و ان الظن لا یغنی من | کر رہے ہیں وہ لیکن اٹکل کی، اور اٹکل واقعہ |
| الحق شیئاً ! | سے آدمی کو بے نیاز نہیں کر سکتا ! |

بار بار اعادہ مختلف پیرایہ بیان سے کیا گیا ہے۔ ورنہ صرف اس لئے کہ جو روٹی اچھی پکاتا ہے، وہ خیاطی میں بھی ضرور ماہر ہوگا، یا صنعتی دستکاریوں، میکانیکی اولوالعزمیوں میں۔ جس نے حذاقت کا ثبوت دیا ہے، کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اجتماعی مسائل اور معاشی نظریات میں اس کی عقل غلطی کرے گویا جس کے شعر اچھے ہوتے ہیں اس کے دماغ کے ریاضیاتی نتائج کو بھی یقیناً صحیح ہونا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں کی دبا پھیلی ہے۔ یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کو پوجا گیا ہے۔ بڑائی کے ساتھ جس

کا چرچا کیا گیا ہے اس کی ہر بات بڑی سمجھی گئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ قوموں کے اس طرزِ عمل نے لوگوں کو کن کن چیزوں کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں بے احتیاطیوں کی بدولت قوموں اور اُمتوں کو قرن ہا قرن تک غیر سلطانی کیا،[1] افترائی قوانین تک کی جکڑ بندیوں میں پھڑ پھڑانا پڑا ہے۔ اور کتنے ہیں جو انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں بدھ کے دن میں مصائب کا طوفان نظر آیا۔ غریب تیرہ کے عدد میں اتنی قوت محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو واقع کر دینے کے لئے وہ کافی ہے۔ فاتحانہ اقدام کو بدبختانہ انجام سے بدلتے ہوئے کتنوں نے راہ کاٹنے والی غریب کالی بلی کو دیکھا۔ الی غیر ذالک من الخرافات والاوہام[2] حالانکہ سلطانی معیار سے جانچنے کا اصول اگر اختیار کیا جاتا تو ایک اَن دیکھے فرضی دن

---

[1] جس طرح سلطانی کی اصطلاح قرآن سے حاصل کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے جو سلطانی قوانین کے بالکل مفہوم مخالف کی تعبیر ہے یعنی ایسی باتیں جنہیں خدا نے چیزوں کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا ہے ان کے متعلق یہ باور کرلینا کہ اس سے فلاں چیز پیدا ہوتی ہے، فلاں نتیجہ اس پر مرتب ہوتا ہے مثلاً بدھ کے دن کے متعلق یہ یقین کرنا کہ ہر قسم کے فوائد کو چھین کر ہر قسم کے نقصانات اس شخص کو پہنچا دیتا ہے جو سفر کے لئے اس دن اپنے گھر سے نکلے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نقصانات کا ذریعہ خدا نے تو بدھ کو بنایا نہیں۔ اب جو غریب بدھ کے سر ان آثار و نتائج کو تھوپتے ہیں، دراصل خدا پر افترا اور جھوٹ باندھ رہے ہیں۔ حام، وصیلہ، سائبہ، وغیرہ جانوروں کی طرف عربوں نے جن آثار کو منسوب کر رکھا تھا قرآن میں اس کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ بل الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب و اکثرہم لا یعقلون ۱۲

[2] ان غیر سلطانی افترائی قوانین نے بربادیوں کے جس سیلاب کو پیدا کیا ہے۔ آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ زراعت ہو یا تجارت، معاشرتی تقریب ہو یا کوئی انفرادی کام، صرف ہندوستان محض ان ہی افترائی قوانین کی بدولت ہر سال کروڑ ہا کروڑ روپے کا نقصان اٹھاتا ہے۔ اور کوئی نہیں جو مصائب کے اس طوفان سے اس ملک کو نجات دلائے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مدتوں لال رنگ کے گنوں کی کاشت سے کسانوں نے اس لئے نفع نہ اٹھایا کہ ان کو باور کرا دیا گیا تھا کہ اس گنے کو جو بوئے گا، مر جائیگا۔ جس سال میرے عزیز بھائی سید مکارم احسن گیلانی نے اپنے گاؤں گیلان میں اس گنے کی کاشت کی ابتدا کی علاقہ میں شور برپا ہو گیا۔ کسانوں نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے کہ خدارا اس کی کاشت نہ کیجئے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی سال میرے والد حافظ ابوالخیر انتقال کرگئے یہ کیا تھا۔ آگ کی طرح اطراف کے دیہاتوں میں یہ خبر پھیلا دی گئی کہ سرخ گنوں نے آخر مولوی صاحب کے والد ہی کو ختم کر دیا۔ میں جب گھر پہنچا اور بدتمیزی کے اس طوفان میں مکارم سلمہ کو گھرا پایا۔ تو ان کسانوں کو بہت سمجھایا۔ کئی مرنے والوں کی موت کا سبب پوچھا، مگر وہ نہ مانے اور حافظ صاحبؒ کی موت کا سبب سرخ گنوں کی کاشت ہی کو کہتے رہے ۱۲

یا تیرہ اکائیوں کے مجموعہ میں کیا واقعی یہ کرامتیں باقی رہ سکتی تھیں، راہ کاٹ کر گذر جانے والی بلی کی مجال تھی کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ قوم کو حرماں نصیبی کے خندقوں میں ہمیشہ کے لئے جھونک دے؛ لیکن کیا تماشا ہے کہ سلطانی راہوں میں معاشی پیداواروں کو ڈھونڈتے ہوئے جو ایمان و تقویٰ، دعا، و استغفار صبر و شکر، توکل و تسلیم کے مختلف ناموں سے ان تدبیروں کو بھی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ جن سے خود پیدا کرنے والے کی رضامندی حاصل ہوتی ہے حصول معاش کی راہ میں اس طرز عمل کے نتیجہ خیز ہونے پر جو بھروسہ کرتے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر یہ طبقہ گھبرا جاتا ہے، بلکہ کبھی کبھی سر پیٹ لیتا ہے جس نے خدا جانے کتنی غیر سلطانی راہوں کو پیدائش کی سلطانی راہ محض اس لئے باور کر لیا ہے کہ انجن بنانے والے، ہوائی جہاز اڑانے والے، ریڈیو بجانے والے یورپ کا یہی عقیدہ ہے!

گو جی تو نہیں چاہتا کہ کہہ دوں، لیکن آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، یہی بیان چونکہ اس کی تمہید بن جائے گا۔ اس لئے کہہ ہی دیتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ آج معاشی جد و جہد کے سلسلے میں دعا، و استغفار، توکل و تسلیم وغیرہ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ پیدا کرنے والے سے اس کی پیداواروں کے مانگنے کی جو اہمیت گھٹائی جارہی ہے تو گو اسٹیج پر قومی شبونوں میں تو یہی کہا جاتا ہے، کہ خدا سے مانگنے کا ہمیں انکار نہیں ہے۔ خدا کی بات تو اپنی جگہ پر درست ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ ان رجحانات کو اگر زیادہ تیز کر دیا گیا تو حصولِ معاش کے جو واقعی اسباب ہیں، مسلمان ان کے اختیار کرنے میں سست پڑ جائیں گے۔ مسلمانوں کے جن طبقات میں اس قسم کے خیالات واضح یا ناواضح، شعوری یا غیر شعوری شکلوں میں نشوونما پا رہے ہیں۔ چونکہ ان خیالات کی پیدائش میں ان ہی حالات کو دخل ہے۔ جن میں آج یورپ مبتلا ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے، ان مغربی مؤثرات پر بھی بحث کی جائے۔ آئندہ آپ کے سامنے جو چیزیں پیش کی جارہی ہیں، غور سے ان کو پڑھئے۔ دلوں کا پھیرنے والا تو وہی ہے جس کی دونوں انگلیوں میں بندوں کے قلوب ہیں، اپنا جو فرض ہے اسے ادا کرتا ہوں دما توفیق الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب!

گذشتہ بالا مباحث میں آخری بات جو میں نے "قرآنی بینات" کے حوالوں سے پیش کی تھی یعنی "حیاتِ طیبہ" اور صاف ستھری معاشی زندگی کی ضمانت قرآن کی رو سے اسی میں ہے، کہ خالق کائنات کو "الہ المعاد" بناتے ہوئے اسی کو اپنا "الہ المعاش" بھی تسلیم کر لیا جائے۔ جن واضح اور کھلے کھلے نصوص سے یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے، آپ انہیں پڑھ چکے۔ ایک مسلمان کیلئے تو یہی کافی

ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں ہیں اور یہ اس کے عطا فرمودہ ہدایات ہیں جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں ناقص مقدمات سے پیدا کئے ہوئے ناقص نتائج کی کوئی قیمت نہیں، خواہ بظاہر ان میں جتنی بھی معقولیت نظر آتی ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مان کر جو طے کر چکا ہے کہ اسی ایمان پر زندہ رہوں گا اور اسی پر مروں گا۔ ایسا آدمی تو یقیناً شک و شبہ سے بلند و برتر ہو چکا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والوں کو بسا اوقات وساوس ستاتے ہیں، قرآن میں چوں کہ ان وساوس کے ازالے کا بھی کافی سامان کیا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اس مقدمے کو اسی بحث پر ختم کیا جائے۔

**غیر مسلم اقوام کی دنیاوی کامیابیوں کا دھوکہ!**

بات یہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں، قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیغمبروں کی تعلیم کو مسترد کرنے والوں میں خود بینوں اور خود راؤں کا ایک طبقہ عموماً ایسا بھی پایا گیا ہے، جو اپنی معاشی کامیابیوں یہ ظاہر کامیابیوں اور فراغ بالیوں کو دکھا دکھا کر اس دعوے کے پیش کرنے کا عادی تھا۔ قرآن میں بایں الفاظ یعنی

| | |
|---|---|
| لو کان خیرا ما سبقونا | اگر پیغمبروں کی بات بہتر ہوتی تو اس کی طرف |
| الیہ | سبقت ذلوگ کرتے جو پیغمبروں کے ماننے والے ہیں |

جس کا ذکر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہتے تھے کہ زندگی کے کسی اصول یا طریقہ حیات کے خیر اور بہتر ہونے کا معیار بس یہ ہے کہ ہم اور ہمارے دماغ نے اس کے پانے میں سبقت کی ہو، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی، یا جس کے سمجھنے میں ان کے دماغ نے پیش قدمی نہ کی، یہی چیز اس کے غلط اور بے معنی ہونے کے لئے وہ کہتے تھے کہ کافی ہے۔ استدلال کرتے ہوئے ان کا بیان یہ بھی تھا جسے قرآن ہی نے نقل کیا ہے۔ یعنی کہتے

| | |
|---|---|
| نحن اکثر اموالا و اولادا | اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں |
| وما نحن بمعذبین! | اور ہم عذاب چاہنے والوں میں نہیں ہو سکتے! |

درحقیقت یہ اسی لب و لہجہ میں گفتگو ہے جسے آج ان قوموں نے اختیار کر رکھا ہے، جو خود بھی اپنے آپ کو متمدن اقوام اور اپنے ممالک کو شائستہ و مہذب ممالک کے نام سے مشہور کئے ہوئے ہیں۔ اور جو اُن کے نام لیوا یا دعا گو ہیں، وہ بھی ان ہی شاندار جباری القاب و خطاب سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ قرآن ہی میں ہے کہ جب پیغمبر اُن کو خدا کی آیتیں سناتے تو پیغمبروں کے منکر کہتے

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا (نقرہ)

یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بتاؤ کہ مرتبہ میں کون بہتر ہے اور کس کے جلسے زیادہ شاندار ہیں!

**امریکہ و یورپ کی کامیابیاں**

سادہ الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ کے باشندے "جزء العاش" تو خیر دور کی بات ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ کو "الٰہ الحاد" بنا کر بھی پوجنے پر آج آمادہ نہیں، بلکہ اپنی تمدنی بلندیوں، توسعی کی بے پناہ قوتوں کو دکھا دکھا کر دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں۔ کہ معادی نہ سہی لیکن معاشی جد و جہد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے خدا کو "الٰہ" بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں، اگر دنیا میں خدا کو خوش و ناخوش رکھنے ہی پر معاشی ترقیوں کا دار و مدار ہوتا، تو یورپ اور امریکہ کے باشندوں کو چاہئے تھا کہ دنیا کے غریب ترین لوگ ہوتے لیکن معاملہ بالعکس، دن کی روشنی میں ہر شخص کو نظر آ رہا ہے، تجدد کی کوئی شکل، فسق کا کوئی طریقہ الحاد کی کوئی صورت، زندقہ و بے دینی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں یورپ کا یا پی ملک اور امریکہ کے ناستک ادھرم لوگ مبتلا نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے کہ معاشی عروج کا بھی کوئی زینہ ایسا نہیں ہے جس پر پہنچنے سے یہ محروم رہ گئے ہوں۔ قال سے نہ سہی، لیکن زبانِ حال سے وہی

نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا — اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں

وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ — اور ہم عذاب پانے والوں میں نہیں ہو سکتے!

کی آواز آج بھی بنی آدم کی بستیوں میں گونج رہی ہے اور یہ گونج کانوں سے گزر کر دلوں کی گہرائیوں میں اس حد تک جگہ پکڑ چکی اور تدریجاً پکڑتی چلی جا رہی ہے۔ کہ کچھ مجھ ہی سا کوئی دیوانہ ہو تو ہو کہ اپنے عہد کی ذہنیتوں سے بے پروا ہو کر یہ جانتے ہوئے کہ میری ہر بات میری ہی طرف واپس ہو رہی ہے۔ لیکن باوجود اس کے انتہائی سادگی کی راہ اختیار کر کے وہی کہتا چلا جائے، جس کے کہنے اور پہنچانے ہی کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنائے ہوئے ہو۔ لیکن بایں ہمہ جنون و وارفتگی۔ یہ واقعہ ہے کہ پیش کرنے کی حد تک تو جو کچھ میری سمجھ میں آتا گیا پیش کرتا چلا گیا، مگر جو واقعہ ہے اسے کیسے چھپاؤں کہ یہ احساس بھی ساتھ ساتھ دل میں مسلسل چٹکیاں لیتا چلا جاتا تھا کہ جس موسم میں تو یہ چیزیں پیش کر رہا ہے۔ یہ ایسا موسم ہے، جس میں تیری بات نہ صرف بہتوں پر گراں ہی گزر رہی ہو گی۔ بلکہ ایک نما گروہ۔ ان کا بھی ہوگا۔ جن کے بیڑوں سے باہر نکلنے کے لئے بے ساختہ تھینچے ہے مجبور ہوں گے۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں کے اندر سے نکل بھی پڑے ہوں اگرچہ سرگرانیں

کے اس احساس اور تہتھوں کے ان خطرات کے مقابلے میں میرا دل بھی مسلسل قرآن ہی کی ان آیتوں کی تلاوت و ورد میں مشغول ہو جاتا تھا یعنی اس قسم کے لوگوں کو خطاب کر کے مختلف الفاظ میں قرآن میں ڈانٹتے ہوئے جو ارشاد فرمایا گیا ہے

| | |
|---|---|
| کلوا و تمتعوا قلیلاً انکم | کھا لو مزے اڑا لو! تھوڑے دن کیلئے |
| مجرمون (والمرسلات) | فقط تم لوگ مجرم ہو! |

یا خبر دی گئی ہے، کہ

| | |
|---|---|
| الذین کفروا یتمتعون و | جنہوں نے کفر کیا اور مزے اڑا رہے اور کھا |
| یاکلون کما تاکل الانعام والنار | رہے ہیں اسی طرح، کھا رہے ہیں جیسے چوپائے |
| مثوی لھم (سورۂ محمدؐ) | کھاتے ہیں، آگ ٹھکانا ہے ان کا! |

ان لوگوں کو جنہیں آج اپنے العزیز الکریم (آنریبل، اسکوئر) ہونے پر ناز ہے، انہیں جتلا دیا گیا ہے کہ آج کچھ بھی نظر آ رہا ہو۔ لیکن بہرحال زندگی کے ایک ایسے دور سے انہیں دوچار ہونا ہی پڑے گا جہاں

| | |
|---|---|
| ذق انک انت العزیز الکریم | اب چکھ تو بڑی عزت، آبرو والا |
| (الدخان) | تھا! |

کے کچوکوں سے ان کی مہمان نوازی کی جائے گی۔ بہرحال اسی قرآن میں بکثرت آپ کو ایسی آیتیں ملیں گی جن میں لا محدتی استغفار کے ساتھ

| | |
|---|---|
| وکم اھلکنا قبلھم من قرن | اور ہلاک کر دیا ہم نے کتنے قرن کو، جو پکڑ میں |
| ھم اشد منھم بطشا فنقبوا | ان سے سخت تھے، وہ بلادوں میں گھس پڑے |
| فی البلاد ھل من محیص! | تھے، پھر ہے کیا کوئی جائے خلاص! |

ان لوگوں کو چونکا یا گیا ہے۔ جنہیں اپنی گرفت و بطش کی شدت اور بلاد اللہ میں سحیری قوتوں کے ساتھ گھس پڑنے، چھا جانے، نے یہ باور کرا دیا ہے کہ ہلاکت و زوال کی راہوں کو اپنے اوپر، اور اپنی قوم و ملک پر وہ بند کر چکے ہیں، وہی، جو قسمیں کھا کھا کر "ما لنا من زوال" (ہمارے لئے زوال نہیں ہے) کے دعووں سے آسمان کو سر پہ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان ہی کو خطاب کر کے اعلان کر دیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہٖ | ہرگز خیال نہ کرنا کہ اپنے رسولوں سے خدا نے |
| رسلہ ان اللہ عزیز | جو وعدے کئے ہیں، ان کا خلاف کرے گا قطعاً |
| ذو انتقام! | اللہ تعالیٰ غالب اور انتقام والا ہے! |

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نوحی، عادی، ثمودی، بابلی، مصری، اور یمنی وغیرہ تمدنوں اور ان کے زوال و سقوط کے جو نقشے قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں صرف ناموں کی خصوصیت سے قطع نظر کر لینے کے بعد جس کا جی چاہے ان تمام قرآنی قصص کو موجودہ عمرانی بغاوتوں اور تمدنی طغیانیوں پر منطبق کر کے اپنی تسلی حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ان ایمانی آیات اور قرآنی مسکنات کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے۔ قرآن ہی میں ڈھونڈنے والوں کو ایسی چیزیں بھی مل سکتی ہیں۔ جن میں غور کرنے والے اگر غور کریں گے تو اس پرانے دقیانوسی وسوسہ کا، خواہ باور کرانے والے اسے جتنا بھی جدید اور جدید روشن خیالی کی پیداوار قرار دیتے ہوں۔ بہر حال اسی پیش پا افتادہ عام مغالطہ کا جواب قرآن ہی میں ایسے سلجھے ہوئے الفاظ میں مل سکتا ہے، جن سے ایمان ہی نہیں، بلکہ آدمی کی عقل بھی چاہے تو خنکی حاصل کر سکتی ہے۔ اور اب میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ان ہی قرآنی آیات کو اپنی سمجھ کے مطابق پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یوں بھی اس کی ضرورت اس لئے زیادہ محسوس ہو رہی ہے کہ قرآن کی مذکورہ بالا دھمکیوں کا ایک جواب بھی عام طور پر دنیا میں پھیلا دیا گیا ہے۔ باور یہ کرایا جا رہا ہے۔ دیکھی جن کے سامنے بتدریج ان کے کرتوتوں کے مہیب نتائج دانت دکھا رہے ہیں ان ہی کی طرف سے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ جیسے انسانی افراد کا بچپن، جوانی کے عہد سے گذر کر بالآخر پیرانہ سالی کے پنجہ میں گرفتار ہونا ایک قدرتی واقعہ ہے اور بڑھاپے کے بعد موت کے آغوش میں چلا جانا ہر جینے والے کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی طرح قومیں بھی چونکہ اسی قانون کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر بوڑھی ہو کر اپنی طبعی موت کے ساتھ مر جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن پیش آنیوالے عواقب و نتائج کے متعلق قرآن الارم دے رہا ہے ان نتائج کو بجائے خدائی انتقام اور ناراضگی کے، چاہتے ہیں کہ فطرت اور نیچر کی طرف منسوب کر دینے کا یہ عام جواب پیش آنے سے پہلے ہی تیار کر کے اس جواب کا ڈھنڈورا اتنی شدت سے پیٹا گیا ہے کہ خدا کا عذاب حالانکہ ان اقوام کے سامنے گویا بے نقاب ہو چکا ہے، لیکن توجیہ اور تاویل کا یہی پتھر ہے جو صداقت کی سمت کی انسانی فطرت کے منہ میں اس لئے ٹھونسا جا رہا ہے، تاکہ تلاش و جستجو کے جن جذبات میں حالات ابھی پیدا کر رہے ہیں، جذبات کے اس تلاطم کو ساکن اور ٹھنڈا کر دیا جائے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی پتھر سے عبرت و بصیرت کی آنکھیں بھی کچل کچل کر اندھی بنائی جا رہی ہیں۔ خیر تو خیر، ہماری ذاتی اور اخلاقی مکافات کی شکل میں ان واقعات کی تفسیر و توجیہہ کی سعادت، خود مسلمانوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ بتدریج دھیمی

بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور روشن خیالی، بالغ نظری وغیرہ الفاظ کے خول میں وہی پرانی جاہلی منطق دہرائی جا رہی ہے۔ قرآن میں جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یعنی

| | |
|---|---|
| وان یروا کسفا من السماء | اور دیکھیں اگر وہ آسمان کے کسی ٹکڑے کو گرتا |
| ساقطا یقولوا سحاب مرکوم | ہوا تو کہنے لگیں، یہ تو کوئی تہ بہ تہ جما ہوا بادل ہے |

ٹوٹے ہوئے ہار کی مانند ایک انتقام کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، مختلف شکلوں میں سامنے آتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھینسوں کے سامنے کوئی بین بجا رہا ہے، یا ان کا حال ان بکریوں کا سا ہے۔ جن کے سامنے ان ہی کے ریوڑ سے نکال نکال کر قصاب ان ہی کے بھائی بندوں کے گلوں پر چھری پھیرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے خون سے سارا میدان لالہ زار بنا رہتا ہے۔ لاشیں تڑپتی رہتی ہیں، لیکن بے حس بکریوں میں اس کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ اندھی بنی ہوئی، گونگی اور بہری بنی ہوئی۔ جو کچھ ہوتا رہتا ہے اسے اطمینان سے دیکھتی رہتی ہیں۔ گویا یہ طے کئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ بھی، کسی طرح سے بھی سمجھایا جائے گا۔ لیکن ہم نہ سمجھیں گے۔

خیر، یہ تو جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے اس وقت میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن قوموں کی فردوسی زندگی کو دیکھ دیکھ کر ہر چیز اور بھلائی کے پرکھنے، جانچنے کا آج ان ہی کو جو معیار بنا لیا گیا ہے۔ کیا ان کی موجودہ زندگی درحقیقت واقعی فردوسی زندگی ہے؟ ایسی زندگی جس سے محروم رہ جانے والوں کو رشک اور ریس کے بھوبھل میں جلتے رہنا چاہئے۔ کیا ان کے باہر جو کچھ نظر آ رہا ہے، ان کا اندر بھی درحقیقت وہی ہے جو سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں حل کر حقیقت تک جو پہنچنا چاہتے ہیں، چاہئے کہ ذرا صبر اور معقول فکر و تامل کے ساتھ ان آیتوں پر غور کریں جو آپ کے سامنے اب لائی جا رہی ہیں۔

اصل آیات سے پہلے چند تمہیدی کلمات سُن لیجئے۔

**علم معاشیات کے متعلق ایک سرسری تاریخی تبصرہ**

بات یہ ہے کہ اکانومی، جو قدیم یونانی زبان کی ایک پرانی اصطلاح ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ "تدبیر المنزل" کیا گیا تھا۔ یونانی فلسفہ کو حکمت نظری (تھیوریٹیکل) اور حکمت عملی (پریکٹیکل) کے دو حصوں میں تقسیم کر کے ثانی الذکر یعنی حکمت عملیہ کی ایک شاخ اسی تدبیر المنزل کے لفظ سے موسوم تھی۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ گھریلو زندگی کے تعلقات سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔ عربی میں چونکہ گھر کو "منزل"

کہتے ہیں اسی لئے تدبیر المنزل اس فن کا نام رکھا گیا تھا۔ گھریلو زندگی کے تعلقات سے مراد لی جاتی تھی کہ میاں، بیوی، ماں باپ، نوکر چاکر وغیرہ کے متعلقہ مسائل و ضوابط اس فن میں بتائے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں "مال اور متمول" بھی فنِ تدبیر المنزل کا ایک جزء ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ محقق طوسی نے اپنی کتاب "اخلاقِ ناصری" میں فنِ تدبیر المنزل اور جن امور سے اس میں بحث کی جاتی ہے انہی کو بتاتے ہوئے لکھا ہے:۔

| | |
|---|---|
| "بباید دانست کہ مراد از منزل دریں | جاننا چاہئے کہ منزل کے لفظ سے یہاں مراد |
| موضع نہ خانہ ایست کہ از خشت و گل و | اینٹ اور چونے، پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا گھر |
| سنگ و چوب کنند بل از تالیفے مخصوص | نہیں ہے، بلکہ اس ترکیبی ہیئت کی یہ تعبیر ہے |
| است کہ میان زن و شو، و والد و مولود | جو بیوی، میاں، ماں باپ، لڑکے، غلام نوکر |
| و خادم و مخدوم و متمول و مال افتد!" | چاکر، مال اور مال والے سے مرکب ہوتی ہے! |

گویا فنِ تدبیر المنزل کے چار عنوانوں یا چار اجزاء میں سے ایک عنوانِ بحث یا ایک جزء "متمول اور مال" کا بھی ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ اسی لئے سمجھا جاتا تھا کہ منجملہ دیگر مقاصد اور اغراض کے اس فن کی بڑی غرض و غایت یہ بھی ہے کہ تیسیرِ اسبابِ معاش و توسل بہ کمالے کہ حسبِ اشتراک مطلوب باشد (یعنی معاش کے اسباب میں سہولت بہم پہنچانا) اور اس کمال تک رسائی حاصل کرنا جو باہم کسی گھر کے رہنے والوں کے اشتراکی بنیاد پر فراہم ہوسکتا ہو) لیکن یونانی زبان کی جو کتابیں اس فن میں لکھی گئی ہیں، ان کا حال تو معلوم نہیں، جس کی بڑی وجہ وہی ہے، جیساکہ یہ خبر دینے کے بعد کہ حکمار قدما را دریں نوع اقوال بسیار ست: محقق ہی نے یہ لکھا ہے:۔

| | |
|---|---|
| "نقل کتاب ایشاں دریں فن از | ان حکماء کی کتابیں، یونانی زبان |
| لغتِ یونانی بلغتِ عربی اتفاق نیفتادہ | سے عربی زبان میں منتقل نہیں ہوئی |
| است!" | ہیں! |

عام طور پر اسلامی فلسفہ کی کتابوں میں جہاں حکمتِ عملیہ کی بحث آتی ہے، مصنفین اس مشہور فقرہ کے استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں، یعنی

| | |
|---|---|
| قد نحت الشریعۃ المصطفویۃ | محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت |
| الغراء الوطر عنہا! | اس حاجت کی تکمیل کرچکی ہے! |

البتہ طوسی نے صرف اتنا پتہ دیا ہے کہ

"مختصریہ از سخن ابروس کہ درو دست ساخوان سحر است" (اخلاقِ ناصری ص...)

فن تدبیر المنزل کی ایک مختصر کتاب بروسن حکیم کی پچھلے لوگوں کے پاس پائی جاتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب یہ ابروسن نامی حکیم کون شخص ہے۔ کیا نیو فیثا غورثی اسکول کا مشہور معاشی ماہر و مصنف بروسن کے نام کی یہ تصحیف ہے! جس کی کتاب کا عربی ترجمہ حال ہی یعنی ۱۹۲۸ء میں ہائیڈل برگ جرمنی سے شائع ہوا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں اس فن کے متعلق جو مباحث پائے جاتے ہیں، وہ بروسن ہی کی کتاب "اوعیکونومی کوس" سے ماخذ ہیں۔ جس کا عربی میں ترجمہ ہو گیا تھا، اور اب یورپ والوں نے تلاش کر کے اسی عربی ترجمہ کو شائع کیا ہے!

کچھ بھی ہو، مجھے کہنا یہ ہے کہ "مال اور تمول" یعنی فن تدبیر المنزل کی اس شاخ کے مسائل اگرچہ نئے نہیں ہیں، نہ اکانومی کا یہ لفظ ہی نیا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت سے ہر زمانے میں ارباب نظر و فکر کا ایک طبقہ اس کے متعلقہ مسائل پر بحث و تحقیق کرتا رہا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یوں تو دنیا کے اکثر علوم و فنون کے بڑھانے اور پھیلانے میں یورپ والوں نے جو کام کیا ہے، یہ تو ایک عام بات ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ اس "مال و تمول" کی چھوٹی سی ... اکانمی کی شاخ میں مغربی فضلاء اور ارباب تدقیق نے جتنی وسعت پیدا کی ہے۔ اگر عمق سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس فن کے طول و عرض کو آج جتنا بڑھا دیا گیا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ "مال و تمول" کے پرانے گنے چنے چند کلیات کے مقابلے میں یہ دعوے بے جا نہیں ہے کہ اس عہد کا فن "معاشیات" ایک نو ایجاد اور بالکل تر و تازہ فن ہے۔ گذشتہ دو ڈھائی صدیوں میں اس فن نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی کتابوں سے چاہا جائے تو ایک بڑی لائبریری قائم کرنے والے قائم کر سکتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو گا جو یورپ کی بیسیوں زبانوں میں اس فن کی متعدد کتابیں نہ شائع ہوتی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت تک دنیا کا یہ علم ایک ایسے سیال رواں دواں حال میں ہے کہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصری علوم میں مشکل ہی سے اس سرعت نمو میں اس فن کے ساتھ موجودہ علوم میں کوئی علم اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ حال یہ ہے کہ کتابیں ادھر لکھی جاتی ہیں ــــ لکھنے والے محنت اور کوشش کر کے بالکلیہ تازہ بتازہ نو بہ نو نظریات کو اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ لیکن ان پر سال بھی گذرنے نہیں پاتا کہ "کالعدم" ہونے کی رسوائی کے ساتھ علمی دائروں میں اپنی وقعت و قیمت وہ کھو بیٹھتے ہیں۔ معاشیاتی پیشہ وروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا۔ شب و روز جب وہ

اسی دھندے میں ڈوبے رہتے ہیں تو ان پر بھی یہ حالت طاری رہتی ہے یا نہیں ؛ لیکن جن بیچارے علما کا معاشیات مخصوص مطالعاتی مضمون نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ کسی وجہ سے اگر ان کو اس فن کے متعلق یا اس کے کسی نظریہ یا مسئلہ کے متعلق کچھ بھی لکھنا پڑتا ہے تو ماہرین اور فن کے ابناء الاوقات کی تہذیبی قہقہوں کے خوف سے ان کا قلم کانپتا جاتا ہے. ڈر تے رہتے ہیں کہ استشہاد واستدلال میں جن کتابوں کے اقتباسات یا جن نظریات کو وہ پیش کر رہے ہیں ان کا معاشیاتی دنیا سے "دیس نکالا" تو نہیں ہو چکا ہے. پھر اسی کے ساتھ "متمول ممالک" پر بحث کرنے والوں نے اس قلیل عرصہ میں باہم خود ایسے اساسی اختلافات پیدا کر لئے ہیں کہ بجائے خود ہر اختلاف ایک مستقل مکتب خیال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے. فن سے جس کا پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے اس بے چارے کو سخت دشواری پیش آتی ہے کہ جس کتاب سے وہ کام لے رہا ہے یا جس مسئلہ کو وہ دلیل و شہادت میں پیش کر رہا ہے اس کا تعلق ان بھانت بھانت کی معاشی بولیاں بولنے والوں میں سے کس ٹولی سے ہے. معیاری معاشیات والوں سے ؛ یا ترتیبی والوں سے ؛ یا انتہائی والوں سے ؛ پھر مصنف اس کا بوستانی معاشیات کا حامی ہے یا بوڑھوا والوں سے اس کا رشتہ ہے ؛ وہ لبرل ہے یا اشتراکی ؛ کریسٹی معاشیات کے زیر اثر اپنے نظریات اس نے بنائے ہیں یا مرکنٹائل اسکول والوں سے ساز باز کر رکھا ہے ؛

گر جے ہر لحظہ بہ شکل دگراں یار بر آمد کے کیمیائی بہروپ بھرنے کے باوجود جس کی وجہ سے جیسا کہ میں نے عرض کیا اس فن کے نظریات و مسائل پر بحث کرنے والے عموماً دغدغوں اور ذبذبوں میں غلطان و پیچاں رہتے ہیں. یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کا وہ منطقہ بارہ جہاں عروج و اقبال کی بلندیوں پر اس فن کو پہنچا دیا گیا ہے. یعنی سرزمین مغرب اس علاقے کے باشندوں میں ایک خاص احساس کا اثر اتنا مستحکم اور پائیدار ہے کہ جدت طرازیوں کے اس طوفان میں بھی ان کا یہ احساس جوں کا توں اسی حال پر "جہاں ہست کہ بود" کی چٹان پر قدم جمائے ہوئے ہے.

**سرزمین مغرب اور اس کے باشندوں کی ایک نرالی خصوصیت**

مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسانیات کے متعلق جب اور جس زمانے میں کچھ سوچنے سمجھنے یا رائے قائم کرنے یا اصول و ضوابط بنانے کا ارادہ اس ملک میں کیا گیا ہے، تو پہلے بھی دیکھا گیا اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بیٹھتے تو ہیں وہ یہ ارادہ کر کے کہ ہمیں جو کچھ سوچنا اور طے کرنا ہے اس کا تعلق انسان اور آدم کی اولاد سے ہے. لیکن خدا ہی جانتا ہے اسباب اس کے کیا ہیں کہ بحث جب شروع ہوتی ہے تو وہی "انسان" جو بحث و تحقیق کا موضوع بنا کر بنایا گیا تھا اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

انسان ہونے کا خیال حافظوں سے چل کر باہر ہو گیا۔ پھر اس کے بعد یہ جو کچھ سمجھتے ہیں — جو کچھ سمجھاتے ہیں، ہر ایک سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا موضوع آدمی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ آج تو عذر ممکن ہے۔ کہ عین وقت پر حافظہ کی اس عجیب و غریب مسکوتیت کی توجیہ کر لی جائے، کہ کچھ دنوں سے انسانی نسل کے شجرۂ نسب کو اسی ملک کے بعض منکرین نے غیر انسانی خانوادوں سے جوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کا شعوری یا غیر شعوری عکس سوچنے والوں کے دماغوں پر پڑتا ہو، مگر میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آج ہی نہیں، بلکہ اس وقت بھی، جب ڈارون کی کتاب، اصل الانواع سے زیادہ ان کے قلب میں مسیح علیہ السلام کی انجیل، اور موسیٰ علیہ السلام کی تورات کا وزن تھا ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کی، اس ملک کے رہنے والے نہ کچھ سننا ہی چاہتے تھے اور نہ ماننا ہی چاہتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں بھی جب اس غریب انسان کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا کہ آدمی کی اصل حقیقت کیا ہے، تو اس وقت بھی بجائے آدمی ہونے کے یہی طے کیا گیا تھا، کہ باہر سے وہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اپنی اصل حقیقت کی رو سے وہ بشر نہیں ملک ہے۔ یعنی آدمی نہیں، فرشتہ ہے۔ اسی فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی کا آخری مقصد یہ قرار دیا گیا کہ آدمی فرشتہ بن جائے یعنی جو نہیں ہے، پھر وہی ہو جائے۔ اسی محدودی عقیدے کا اثر آج تک یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اٹھنے اور اخروی سزا و جزا کے یقین کو حالانکہ ان ممالک کی عمومیت کھو چکی ہے لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں آنے والی زندگی کے متعلق اس خیال کا تذکرہ آ جاتا ہے۔ یعنی اس نئی آنے والی نشأت میں آدمی کو اپنے فطری احساسات اور مطالبات کے مطابق زندگی ملے گی، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے، کہ انہار و جنات و حور و قصور والی قرآنی جنت کا ذکر ان کے سامنے اگر کبھی کیا جاتا ہے۔ تو سنتے ہی ہر یورپ زدہ فطرت تلملا اٹھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھینچ کر اس کی فطرت پر کسی نے کوئی پتھر دے مارا ہے۔ قرآنی جنت کے متعلق عصری ذہنیتوں کی اس عجیب و غریب بھڑک کی اصلی وجہ لے دے کر یہی ہے۔ چونکہ عوام کو وجہ معلوم نہیں، اس لئے سادگی کے ساتھ سمجھنے والے بے چارے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شاید یہ بھی سائنس ہی کے کسی نظریہ یا کیمیا کے کسی اکتشاف کا نتیجہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے یورپ کے باشندوں نے آئندہ زندگی میں انسانی فطرت کے ان مطالبات کی تکمیل کا انکار کر دیا ہے جن کا قرآن میں مسلسل وعدوں کی شکل میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کی تہہ میں بھی درحقیقت مغربی ذہنیت کی دینی خصوصیت پوشیدہ ہے — یعنی آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے، بندر ہو سکتا ہے، منگور ہو سکتا ہے، فرشتہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بھوت

اور شیطان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان جو چیز نہیں ہو سکتا ہے' وہ صرف یہی ہے کہ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔

مذہبیت کے دور میں اس ملک کے باشندوں کا عام رجحان جیسا کہ کہا جاتا ہے رہبانیت کی طرف عموماً جو پایا جاتا تھا۔ لذائذ جیات اور انسان کے فطری احساسات کے تقاضوں کو غلط یا صحیح طریقہ سے دبانے کی کوشش جو اُن میں جاری تھی تو اس میں بھی در اصل آدمی کے فرشتہ ہونے کی اسی خوش اعتقادی ہی کو زیادہ دخل تھا۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ بہیمی اور حیوانی کثافتوں کی چادر اس غریب فرشتہ کو اوپر سے لپٹ گئی ہے۔ اس چادر کو چاک کرنے اپنی ملکوتیت کے چمکانے میں جو زیادہ کامیاب ہو گا وہی اپنی اصل حقیقت سے زیادہ قریب ہوتا جائے گا۔ رہی یورپ جس کا آسمان بھی آج معاش ہے اور زمین بھی اس کی معاش ہی ہے۔ آج جو مجسّم معاشیت یا کہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ صرف شکم ہی شکم بن کر رہ گیا ہے' اسی یورپ کا حال اپنے ملکوتی عہد میں اسی معاشیات کے متعلق یہ تھا جیسا کہ اسی ملک کے ایک معاشی مورخ نے لکھا ہے۔

> معیشت ان کے (یعنی ان ہی قدیم ملکوتی عیسائیوں کے) کے نزدیک کبھی فی نفسہ قابل توجہ نہ بنی۔ مقاصد معینہ (یعنی فرشتہ بننے کی مہم اور اس کے مقاصد) کے لئے ذریعہ کی حیثیت سے قدروں کی ہمہ گیر نظام میں اس معیشت غریب کی جگہ کہیں حاشیہ پر تھی!"

انتہا یہ ہے کہ جدید معاشی دور کا آغاز جن بزرگوں کی اصلاحی آواز کی بدولت جیسا کہ اسی ملک کے لوگوں کا بیان ہے' ظہور پذیر ہوا ہے' میری مراد پروٹسٹنٹ فرقہ اور ان کی اصلاحی اقدامات سے ہے' دوسرے نہیں' اسی اصلاحی پیغام کے سرخیل اعظم یعنی جناب لوتھر تک کے مواعظ' اور خطبات میں اُس وقت تک اس قسم کے فقرے بے جھجک استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً لوتھر کا مشہور مقولہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا

> "دولت ان ہی تھنڈ گدھوں کو اللہ میاں عطا دیتے ہیں جنہیں وہ کچھ اقدائی نہیں فرماتے۔"

---

لہ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں' بندر اور لنگور رہنے کا مغربی نظریہ تو نسل انسانی کے متعلق عام ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بیکوں کے متعلق جیسے یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد فرشتے بن کر اڑائے جائیں گے۔ اسی طرح بدکاروں اور شریروں کے متعلق ان ہی عیسائیوں کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ شیطان اور بھوت مرنے کے بعد بن جاتے ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ کلیسا کے مذہب سے لوتھر جتنا بھی بیزار ہو، لیکن اس مذہب کا تو وہ بہر حال معتقد بلکہ سرگرم مبلغ اور حامی تھا۔ جس کا نصب العین آدمی کو فرشتہ بنانا قرار دیا گیا تھا، ایسی صورت میں اگر دولت مندوں کو لوتھر صاحب گدھا یا شیطہ گدھے کے نام سے موسوم کرتے تھے، تو جس کا نصب العین "ملک" ہونا ہو، اس بلند نصب العین کو چھوڑ کر جس نے اپنی ساری توانائی دولت مند بننے پر خرچ کر دی ہو اپنی اس حماقت کی وجہ سے اگر سمجھنے والے اسے گدھا سمجھتے تھے۔ تو غلط کیا سمجھتے تھے؛

لیکن خیر، یہ تو پرانی بات ہے صدیوں کی کشمکش کے بعد فرشتہ بنانے والے مذہب کے جوئے سے اس ملک والوں نے اپنے آپ کو آزاد کر لینے میں جب کامیابی حاصل کی تو مبیا کر ثانئی نے لکھا ہے کہ

> "مذہب نے انسانی نفع پر بہت سے قیود عائد کر رکھے تھے۔ سولہویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر مذہب کے اقتدار کا مقابلہ کیا گیا۔ اور سترھویں صدی کے آخر تک مذہب آئندہ معاشیات پر حکمران نہ رہ سکا۔ تاہم اس کے اقتدار کی دھجیاں باقی رہ گئیں۔ . . . لیکن اٹھارویں صدی کے پُرزور مقابلہ میں طلب و رسد کے قانون اور نفع و راحت کے نام پر معاشیات اور مذہب کے درمیان طلاق واقع ہو گئی" (داستانِ دہقان صفحہ ۳۴)

یعنی وہی تاریخی اعلان، جو حضرت شعیب علیہ السلام کے مقابلہ میں ان کی معاشی قوم نے

ان نفعل فی اموالنا ما نشاء — ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں

کے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے کیا تھا یعنی انہوں نے شعیب علیہ السلام سے پوچھا کہ

> "تمہاری یہ پوجا پاٹ (صلوات) کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیات کے متعلق جو چاہیں کریں؟"

گویا ان کا یہی خیال تھا کہ صلوات (مذہبی کاروبار، دعا، پوجا وغیرہ) کو انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق ہے؟ شاید وہ بھی یہی کہتے ہوں کہ مذہب محض ایک پرسنل اور شخصی شغل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی اس حیثیت سے جینا چاہے تو جی سکتا ہے لیکن زندگی کے عمومی اور اجتماعی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کلیسا (صلوات) کو وہ اموال یا دنیاوی کاروبار سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔

بہرحال مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مذہبی خوش اعتقادیوں کی پٹی اتر جانے کے بعد اور کچھ کم نہیں تو کم از کم اس کی اُمید بے جا نہ تھی کہ شاید غریب آدمی اب یورپ والوں کو آدمی نظر آنے لگے مگر اب سے کیا کہئے کہ یوں سوچنے کی حد تک تو ان کو دور کی کوڑی ڈھونڈ کی سوجھی۔ انتی ڈھونڈ کی کہ وہاں تک جیسا کہ ان ہی کا دعویٰ ہے۔ ان سے پہلے کسی کی نگاہ نہیں پہنچی تھی۔ لیکن ٹھیک جس وقت یہ آسمان کے ان دیکھے تاروں کو گن رہے تھے پاتال کے جگر کو بھی چاک کر کر کے ان کی نظر آگے جا رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی دیکھا گیا کہ جو سب سے قریب تھا۔ یعنی خود اپنی حقیقت ان کی نگاہوں سے اس بد اعتقادی کے عہد میں بھی اسی طرح اوجھل رہی جیسے خوش اعتقادی کے قرن میں اس پر پردہ پڑا ہوا تھا غریب انسان بجلی کی روشنی میں بھی ان کو انسان نظر نہ آیا سے دے کر انقلاب اور تجدد کا اثر اس مسئلہ پر اگر کچھ پڑا تو وہ صرف یہ پڑا کہ آدمی فرشتہ باقی نہ رہا۔ لیکن یہ بات کہ آدم زاد آدم زاد نہیں ہے اس پر ان کا اصرار پھر بھی باقی ہی رہا۔ یعنی ملکوتیت کا انکار کر کے اعلان کر دیا گیا۔ کہ آدمی آدمی زادہ نہیں ہے حیوان زادہ ہے۔ اور اسی کو ایک فیصلہ کی صورت میں قبول کر کے جو معاشی ضابطہ انسانوں کے لئے بنایا گیا اس کی بنیاد بھی اس پر رکھی گئی کہ باہم انسانوں کا دوسرے انسانوں سے وہی تعلق رہیگا اور اسی کو رہنا چاہیئے۔ جو دریا کی رہنے والی مچھلیوں اور جنگل باسی درندوں چرندوں وغیرہ حیوانات کے درمیان ہے۔ اسی قانون کا نام تنازع للبقاء کا قانون رکھا گیا۔ طے کر دیا گیا کہ جیسے چھوٹی مچھلیوں کو نگل ہر بڑی مچھلی کا، یا کمزوروں کو فنا کرنا اور اپنی بقاء کا انتظام کرنا جنگل کے ہر زور آور جانور کا قدرتی حق ہے۔ اسی طرح آدمی بھی جب آدمی نہیں۔ بلکہ اسی قسم کے دریائی یا صحرائی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے تو تنازع للبقاء کی جد و جہد میں اس کو بھی آزاد ہونا چاہیئے معاشی دائروں میں دریا اور جنگل کے اسی قانون کی تعبیر سرمایہ داری کے نظام سے کی گئی۔ اور ہر قسم کی انسانی پابندیوں سے آزاد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ہر اس شخص کو جو کسی نہ کسی طرح ............

سرمایہ کی قوت پر قابض ہو تا کہ جو اس قوت سے محروم ہیں، اپنی بقاء و ارتقاء کی راہوں میں جس طرح چاہے ان سے کام لے۔ جو سرمایہ نہیں رکھتے وہ خود ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی محنت، ان کی مشقت، ان کا خون ان کا پسینہ بلکہ ان کی زندگی، ان کی موت سب کا مقصد یہ ٹھیرایا گیا کہ سرمایہ داروں کی سرمایہ داریت یا گنج والوں کے گنج کے استحکام و مزید ترقی میں جذب ہوتا رہے۔ الغرض امیروں کے لئے اگر غریبوں کو مر جانا پڑے تو یہ فیصلہ کیا گیا، اور بے رحم و ترس کھائے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ ان کا یہی قدرتی فریضہ ہے۔ ان کی موت سے اپنی زندگی پیدا کرنا یہ سرمایہ داروں کا فطری حق ہے

حسنِ اتفاق پر سو اتفاق دیکھئے کہ ان ہی دنوں میں جب انسانی آبادیوں پر جنگل کے قانون کو منطبق کرنے کے لئے یا سرمایہ داری کے نظام کو فروغ دینے کے لئے جہاں حکومت اور سلطنت کی قوتوں سے لوگ امداد حاصل کر رہے تھے، وہیں بیالوجی کے ایک اسکول کی طرف سے نسلِ انسانی کا وہی منحوس شجرۂ نسب بھی مرتب کر کے پیش کر دیا گیا، تھا جس میں آدم کی اولاد کا رشتہ جنگلی جانوروں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ مسئلہ سائنس کا تھا، یا فلسفہ کا، صرف دوسروں کا ایک تماشہ تھا۔ اس کو تو جوڑنے اور منحر والوں کو کھیلنے کا یہ اچھا بہانہ ہاتھ آیا، یہی کبھی ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے ایک ڈھلی ڈھلائی یہ منطقی دلیل بھی ہاتھ آگئی کہ آخر جھاڑیوں اور غاروں کی زندگی میں باپ داداؤں نے جس کام کو قدرتی حق کی حیثیت سے انجام دیا تھا، جنگل زمین یا اینٹ پتھر کے احاطوں میں رہنے کے بعد انہی کے پوتوں اور پرپوتوں کے لئے وہی حق غیر قدرتی کیوں ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تجدد و انقلاب تحقیق و اکتشاف کے اس عہد میں اگرچہ سب کچھ بدل گیا۔ لیکن انسان کے متعلق یہ بات، کہ وہ انسان نہیں ہے اپنے حال پر باقی رہا۔ نقطۂ نظر میں تغیر کچھ ہوا بھی تو یہی ہوا کہ مذہبی عہد میں جسے فرشتہ قرار دیا گیا تھا، لامذہبی کے اس دور میں وہی جانور ٹھیرایا گیا اور اس پر اصرار کیا گیا۔ اس حد تک اصرار کہ سرمایہ داری کے نظام کے بڑے بڑے حمات بھی چیخ اٹھے۔ کتابوں میں اب تک آدم اسمتھ (AADAM SMAYH) کا جو یہ مقولہ نقل کیا جاتا ہے

• اپنے اپنے طور پر اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے میں گو ہر شخص کو آزاد ہونا چاہئے۔ لیکن (اگر مذہب نہیں)، تو قوانین عدل میں انصاف میں ردّ و بدل نہ کرنا چاہئے؛

(داستانِ دہقان صفحہ ۳۲۶)

لیکن اس وعظ کا اثر جو کچھ ہوا وہ یہ تھا جیسا کہ مشہور معاشی مؤرخ ٹاؤنی نے لکھا ہے کہ

• اٹھارہویں صدی کے بہ مقابلہ میں اس کی (یعنی آدم اسمتھ کی) تعلیم کا بنیادی اصول بھی فراموش کر دیا گیا؛

اور کل تک جن کی فطرت کی ملکوتی لطافتوں پر قرآنی جنت کے تصور حور کا تصور بھی کثافت کا داغ بن جاتا تھا ان ہی کے جانشینوں کو دیکھا گیا کہ جنگلی درندوں، ٹھیک درندوں کی طرح ان کے بڑے چھوٹوں کے ننگے میں بغیر کسی شرم و حیا کے بے جھجک منہمک ہیں۔ ڈارلنگ نے اس گھناؤنے نظارہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے

طاقت ور کمزوروں کی کمزوریوں سے، اور ہوشیار جاہلوں کی نادانی سے فائدہ

اٹھاتے پھرتے رہے ہیں۔ (داستانِ دہقان صہ ۲۲۴)

مگر ظاہر ہے کہ آدمی اگر فرشتہ نہ تھا تو واقع میں وہ جانور بھی تو نہ تھا۔ جانور ہونے کے اس خبط کا دورہ آخر کب تک ٹھہرا رہتا۔ ناداروں کا لاوارث طبقہ سرمایہ داروں، صرف سرمایہ داروں کیلئے ہے اور اس طور پر ہے کہ ناداروں کا کوئی حق سرمایہ داروں پر نہیں ہے۔ ان پر صرف فرائض عائد ہوتے ہیں۔ لیکن حقوق کے خانے میں ان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ حقوق کے حقدار صرف سرمایہ دار ہیں۔ انسانی فطرت جس درجہ بھی مسخ ہو گئی ہو لیکن ظلم کے اس پہاڑ کو وہ کب تک سنبھالے رکھ سکتی تھی۔ بالآخر اس یکطرفہ بار کے اٹھانے والوں کی گردنوں میں جنبش شروع ہوئی۔ کروٹیاں بدلنے لگیں، جن کی آنکھیں تھیں انہیں سوجھنے لگا، انہیں دیکھنے والوں میں سے ایک نے لکھا ہے۔

"سرمایہ داری کے طوفانِ بے پناہ نے ہر طرف وہ سراسیمگی پیدا کر دی تھی کہ اچھے اچھوں کے قدم اکھڑے جاتے تھے۔ دولت و افلاس، ثروت و فلاکت، ترقی اور تباہی، آبادی و بربادی کے غیر معقول تضاد نے بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ جن کا حل کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔"

اسی غیر معقول تضاد کی نہ سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے جو لوگ جب اٹھیں گے خیال یہ پیدا ہونے لگا کہ تب جنہیں تو شاید اب جس "انسانیت" کے چہرے پر اس ملک میں نقاب پڑا ہوا ہے وہ اٹھ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی جس ملک میں ایک آدمی نہیں سمجھا گیا ہے۔ ان کو واقعی نظر آجائے کہ وہ آدمی ہی ہے۔ آدمی ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن قسمت کی خوبی ملاحظہ فرمائیے۔ پتھر پتھر ہی باقی رہا، پانی پانی ہی سمجھا گیا۔ ہوا ہوا ہی باقی رہی۔ درختوں کے متعلق یقین کیا گیا وہ درخت ہی ہیں۔ الغرض جو چیز واقع میں جو کچھ تھی وہ وہی سمجھی گئی۔ اور یہ نہ سمجھا جاتا تو اور کیا سمجھا جاتا۔ کسی چیز کے لئے کسی دوسری چیز کا ثبوت تو دلیل کا خواہاں ہوتا ہے۔ حرکت کو زمین کے لئے ثابت کرنے کے لئے استدلال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن زمین زمین ہی ہے یعنی شئے کا ثبوت خود اپنی ذات کے لئے، دوسرے اصطلاحی الفاظ میں "ثبوت الشئی لنفسہ" یہ تو منطق کے ان مسلمات میں ہے جس سے واضح، جلی اور بدیہی مقدمہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چار چار ہی ہے بھلا اس میں کوئی شک کر سکتا ہے۔ مگر کیا کیجئے، سب کچھ سمجھا گیا۔ دنیا کا ہر دعویٰ پرکھا گیا۔ ہر رسم، ہر رواج پر تنقید کی گئی۔ لیکن مرتی کے متعلق ایک ناٹک کا دعویٰ کسی طرح سے، کسی زمانہ میں، کسی کے منہ سے جو نکل گیا تھا۔ یعنی یہی بات کہ انسان انسان نہیں ہے، یہ دعویٰ

اس محیر العقول تضاد کے حل کے زمانہ میں بھی من و عن اپنے اسی پختہ رنگ پر قائم رہا۔ جا بتدا میں کسی نہ کسی طریقہ سے اس ملک کے باشندوں کی ذہنیتوں پر چڑھ گیا تھا۔ یا چڑھا دیا گیا تھا۔ البتہ نظام سرمایہ داری کے مقابلہ میں بجائے ان جانوروں کے جن میں بے زوروں کو زور والے اپنی خوراک بنا رہے تھے، یا اب تک بنا رہے ہیں، یہ طے کیا گیا کہ آدمی کا شمار ان جانوروں میں ہونا چاہیے جن کے ہر فرد کو وہی گھاس چارہ، وہی دانہ پانی ملتا ہے جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مارٹن لوتھر نے تو صرف دولت مندوں کو انسانی قطار سے نکال کر گدھوں کے طویلہ میں دھکیل دیا تھا لیکن فکری انقلاب کے اس دورے میں دولت مندوں کے ساتھ نادولتوں کو بھی اسی معاشی قانون کا پابند بنا دیا گیا۔ جس کے بے چارے لدے پابند ہیں۔ یعنی ایک گدھے کو جیسے گھاس چارے کی اسی مقدار کے لینے کا حق چراگاہ سے ہے۔ جتنی مقدار دوسرے گدھوں کو میسر آتی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو بھی کوئی حق نہیں ہے کہ دوسروں کو جو کچھ ملتا ہے یا مل رہا ہے اس سے زیادہ لینے کا مطالبہ کرے، یا زیادہ مقدار کو اپنے اقتدار میں لائے۔ یوں ہی چرنے چگنے کے بعد کسی گدھے کے لئے جیسے یہ جائز نہیں ہے کہ گھاس کے کسی گٹھے کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر طویلہ میں محفوظ کرائے یا اپنے بیٹوں اور پوتوں تک ان کو پہنچائے۔ مطالبہ کیا گیا کہ مساوات اور عدل کے اسی قانون کی تعمیل آدم زادوں کو بھی کرنی پڑے گی۔

اسی مضمون کو کبھی فلسفہ کی زبان میں ذرا مشکل اور پیچیدہ بنا کر اور کبھی افسانوی پیرایوں میں آسان بنا بنا کر مختلف طریقوں اور بھانت بھانت کے لہجوں میں لوگوں نے پھیلانا شروع کیا زبانوں سے اپنی گویائی کی قوتوں کا مظاہرہ کیا گیا۔ قلم، انشاء اور تحریر کا زور جتنا دکھا سکتا تھا، پوری طاقت سے اُس نے دکھایا۔ فصاحت کے دریا بہا دیئے گئے، بلاغت کے سمندروں کو انڈیلنے والوں نے انڈیل دیا۔ اتنا جھنکار کیا گیا کہ لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ خود کہنے والوں کی اکثریت کو اب بھی اس کی خبر نہیں کہ وہ غریب کہنا کیا چاہتے ہیں؟

•

مگر اب کسی کو برا معلوم ہو یا بھلا، میرے نزدیک تو سارے مباحث کا خلاصہ لے دے کر وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اگرچہ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں یا ان کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ معاشیات کا یہ مساواتی نظریہ عہدِ حاضر کی کوئی نئی اپج ہے۔ جس کے پانے میں انسان کا دماغی ارتقاء اب کامیاب ہوا ہے حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سطحی حد تک تو پچھلوں نے وہی دہرایا ہے جو پہلوں نے کہا تھا

یعنی "آدمی آدمی نہیں ہے"۔ یہی پہلوں نے بھی کہا تھا، اور یہی پچھلے بھی کہہ رہے ہیں۔ البتہ اسی مقصد کا ایجابی پہلو، یعنی پھر آدمی ہے کیا؟ ردوبدل اگر کچھ ہوا ہے تو اسی سوال کے جواب میں ہوا ہے۔ یعنی پہلوں نے تو کہا تھا کہ آدمی فرشتہ ہے، ملک ہے۔ اس کے بعد والوں نے فرشتہ ہونے کی نفی کر کے جانور ہونے کا فتویٰ لگایا۔ پھر ان سے اختلاف کرنے والے جو آج اختلاف کر رہے ہیں، ان کا اختلاف تو بالکل معمولی ہے یعنی جانور نہ ہونے پر اتفاق کر لینے کے بعد صرف اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا جانور ہے؟ آیا اس قسم کا جانور ہے جن کے بڑے چھوٹوں کو نگلتے ہیں یا ان مویشیوں میں اس کو شمار کرنا چاہئے۔ جن کے افراد میں ضروریاتِ حیات کے استعمال کے اعتبار سے تفوق اور برتری نہیں پائی جاتی۔ وہی بات، جو گدھوں، گھوڑوں، بکریوں، گوؤں اور چیلوں کی معاشی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ گویا ان دونوں مسلکوں میں وہی فرق ہے جو کسی ظریف نے کہا تھا کہ سرمایہ داری کے نظام کی جس قانون پر بنیاد قائم تھی اگر اس کا نام مچھلی ازم یا بھیڑیا ازم رکھا جائے تو سرمایہ دشمنی کے اساسی قانون کی تعبیر، بکری ازم، بھیڑ ازم، زاغ ازم، زغن ازم سے کی جا سکتی ہے۔ خیر، میں اس وقت اس کے لئے تیار بھی نہیں ہوں کہ ان مختلف مشارب و مسالک کی تحقیق کروں، اور ان میں باہمی جو امتیازات ہیں، ان پر بحث کروں، بلکہ مقصود صرف اس ذہنیت کا دکھانا تھا، جو خصوصیت کے ساتھ بنی نوع انسانی کے متعلق کرۂ زمین کے اس خاص حصہ میں ابتدا سے پائی جاتی ہے۔ غرض اس تذکرہ سے یہ تھی کہ اس کے مقابلے میں قرآن کا جو بنیادی نظریہ ہے وہ ذرا واضح اور روشن شکلوں میں لوگوں کے سامنے آجائے، کیونکہ بات مقابلہ ہی سے زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ متنبی کا مشہور مصرعہ ہے ط

وبضدها تتبین الاشیاء

## آدمی بہرحال آدمی ہے

مطلب یہ ہے کہ کسی حیثیت سے ہو، معاشی حیثیت سے ہو معادی نقطۂ نظر سے، ہر حال میں قرآن کا اس پر اور صرف اسی پر اصرار ہے کہ "آدمی بہرحال آدمی ہے"۔ وہ جب دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ انسان اور آدمی ہی بن کر پیدا ہوتا ہے جب تک زمین کے اس کرہ پر جیتا ہے، تو آدمی ہی بن کر جیتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسری زندگی کر کے میدانِ قیامت میں جب وہ آئے گا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہے گا۔ بعد جزا و سزا کے فیصلوں کے بعد جنت میں جو جائیں گے، وہ بھی آدمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے۔ اور یہی حال ان کا بھی ہوگا جو (عیاذاً باللہ) مستحق جہنم قرار پائیں گے۔ اسی لئے ایسے تمام خیالات جن میں انسانیت

کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ انسانیت کے سوا وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اسلام نے سب کو مسترد کر دیا ہے۔ مثلاً بعض مذاہب کے متعلق مشہور ہے کہ ان میں فنائی الاصل کا عقیدہ پایا جاتا ہے یعنی مرنے کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا۔ خدا، جو اصل کائنات ہے وہی وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان، خدا بن جاتا ہے۔ یہ تو نیکوکاروں کا انجام بتایا جاتا ہے۔ اور بدکاروں کو سمجھایا گیا ہے کہ دوسری زندگی میں بجائے آدمی رہنے کے وہ ہاتھی بن جاتے ہیں۔ یا گھوڑوں یا چوہوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا جیسا کہ ابھی یہودی عیسائیوں کے متعلق بیان کیا گیا کہ مرنے کے بعد ان کے یہاں بھی دوسری زندگی میں انسان سے انسانی احساسات و جذبات چھین لئے جاتے ہیں، پھر جو نیک ہیں، وہ تو فرشتے، اور جو بد ہیں، وہ شیطان اور بھوت بن جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کی انسانی جنت کے ذکر سے دلوں میں آجکل جو گرانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس گرانی کی تہ میں درحقیقت انسان کے متعلق انسان نہ ہونے کا یہی مغالطہ پوشیدہ ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کی خلافت کے تذکرے کے سلسلے میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ سجدے کے مطالبے پر ملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کیا، لیکن شیطان نے انکار کر دیا۔ اور انکار کی توجیہ کرتے ہوئے یہ جو اس نے کہا کہ میں آتش زادہ اس لئے اس خاک زادہ سے بہتر ہوں۔ میرے نزدیک یہ قصہ جن عمیق اسرار و حقائق پر مشتمل ہے ان میں ایک اشارہ اسی مغالطہ کے ازالہ کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی شیطانی بصیرت رکھنے والوں کے سامنے سے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی حقیقت اسی طرح کہیں اوجھل نہ ہو جائے، جیسے ابلیس، آدم کو نہ پہچان سکا۔ اور ظاہری حالت سے دھوکہ کھا کر خاک زادہ قرار دیتے ہوئے آدم کا جو صحیح مقام تھا اس سے ان کو گرا دینا چاہا۔ دوسرے الفاظ میں گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق مختلف اقوام کو جو مغالطہ لگنے والا تھا، ابتدا ہی میں اس طریقہ سے اس مغالطہ کے ازالہ کا سامان کر دیا گیا تھا۔ آخر آپ ہی بتائیے کہ جن لوگوں نے بجائے آدم زادہ ہونے کے یہ وسوسہ دنیا میں پھیلایا ہے کہ آدمی حیوان زادہ ہے۔ ان کے اس قول میں اور شیطان کے اس دعویٰ میں کہ "وہ کیا ہے؟ صرف خاک زادہ ہے" اس لحاظ سے کہ انسان کو انسانیت کے صحیح مقام اور اس کے قدرتی مرتبہ سے دونوں نے گرا دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں نظریات (طینی و بوزینی) میں کیا فرق ہے[1]۔ بہرحال انسان انسان ہی ہے۔ غیر انسان نہیں ہے۔

---

[1] میرا ہی ایک پرانا شعر ہے ؎ اس نے طینی کہہ دیا اور اس نے بوزینی کہا سچ تو یہ ہے ڈارون بھی کچھ کم نہ تھا
دیاتی ہو تو آمنہ؟)

معاشی مسائل ہوں یا معادی عقائد، اسلام نے سب کی بنیاد منطق کے اسی بدیہی مقدمہ پر رکھی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنیاد اگر اس پر نہ رکھی جاتی تو آخر کیا کیا جاتا۔ شکر کے اوصاف، اس کے حالات، آثار و خواص پر جو بحث کرنا چاہے گا، ظاہر ہے کہ وہ یہی سوچ کر تو بحث کریگا کہ شکر شکر ہے، دیوانہ ہی ہو گا جو ایسی صورت میں شکر کو بجائے شکر کے خواہ مخواہ یہ مان لے کہ وہ نمک ہے۔ اور جو ایسا کرے گا، اگر اس کی بیان کی ہوئی باتیں شکر پر منطبق نہ ہوں تو اس میں بحث کرنے والوں کا قصور ہو گا یا بے چاری شکر مستحق ملامت ہو گی کہ اپنے اوپر نمک کے حالات، کیفیات، آثار و خواص کے بیان کو کیوں منطبق ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ بارہا عرض کر چکا ہوں، اپنے اس مقالے کو میں نے معاشیات کے صرف اسلامی مسائل و نظریات کی حد تک قصداً جوں کر محدود کر رکھا ہے اس لئے ان تفصیلات میں جانے کا میرے لئے قطعاً موقع نہیں ہے کہ انسان کے معاشی مسائل کی تدوین و ترتیب کا کام جن لوگوں نے یہ فرض کر کے انجام دیا ہے، کہ وہ انسان نہیں، بلکہ جنگل کا بھیڑیا یا دریا کی مچھلی ہے، یا جن حضرات نے بجائے بھیڑیے یا مچھلی کے انسان کی انسانیت کا انکار کر کے چاہا ہے کہ بکریوں اور مینڈھوں، بیلوں اور گھوڑوں کوؤں اور کبوتروں وغیرہ کے معاشی قوانین کو انسان کے معاشی قوانین پر منطبق کریں، عقل کے ان ناخن تراشوں کو اپنی اس عجیب و غریب کوشش میں کن بوالعجبیوں اور طرفگیوں سے دوچار ہونا پڑا، بجائے سلجھانے کے اپنی خود ساختہ گتھیوں میں یہ کس طرح الجھ گئے، کیونکہ اس کے لئے تو ایک مستقل کتاب کی حاجت ہے، بلکہ اپنے بیان کو صرف اسلامی مسائل تک محدود رکھتے ہوئے اب صرف بتانا چاہتا ہوں کہ

"آدمی آدمی ہی ہے اور کچھ نہیں ہے!"

اس اساسی بنیاد کو پیش نظر رکھ کر قرآن میں جو چند ایسے کلیات پائے جاتے ہیں جنہیں مسلمانوں کو خدا نے اس لئے عطا فرمایا ہے کہ اپنی معاشی دشواریوں کو ان کی راہ نمائی میں حل کریں، بس اسی کو پیش کر دوں، لیکن ان کلیات سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ "الانسان" یا "البشر" یا "بنی آدم" یا "الناس" وغیرہ الفاظ سے جس جیتی جاگتی ہستی کی تعبیر قرآن کرتا ہے۔

---

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ "طین" کے معنی عربی میں مٹی کے ہیں۔ قرآن میں شیطان کا قول جو نقل کیا گیا ہے اس میں طین ہی کا لفظ ہے۔ اسی کی طرف طینی سے اشارہ کیا گیا۔ اور لفظ "بدنہ" بدن کے لئے فارسی لفظ ہے۔ اش۔ مسٹر ڈارون کے مشہور نظریہ ارتقائی طرف ہے۔ ۱۲

قرآن کی نظر میں اس کے ایسے مخصوص امتیازی صفات و خصوصیات کیا ہیں، جن کا اس کی معاشی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے۔ اور جن سے اس کی زندگی کے معاشی قوانین متاثر ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ قرآن کے معاشی انسان کے نمایاں خد و خال کیا ہیں۔ تمہیدی طور پر ذہن نشین کرنے کی یہ تو پہلی بات ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری بات، جس کا اس موقعہ پر جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اپنی معاشی زندگی میں (یعنی از شکم مادر تا بہ شکم قبر) جن قدرتی پیداوار سے آدمی مستفید ہو رہا ہے اور جس سے استفادہ کا یہاں اُسے موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ انکی نوعیت اور خصوصیت قرآن نے کیا بیان کی ہے۔ آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ شاید میں انہیں کہہ بھی نہیں سکتا۔ جب تک کہ ان دو باتوں کو پہلے طے نہ کر لوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن کے پیش کردہ "معاشی نظام" کی بنیاد ان ہی دو باتوں پر مبنی ہے!

## انسانی فطرت کی خصوصیات

بات یہ ہے کہ انسانی فطرت یوں تو قدرت کے رازہائے گراں مایہ کا ایک لامحدود گنجینہ ہے۔ اور قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ، مختلف پیرایۂ بیان میں ان کی طرف اشارے بھی کئے ہیں۔ لیکن اس وقت میری گفتگو انسانی فطرت کی صرف ان خصوصیات تک محدود ہو گی جن کا معاشی مسائل سے تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے جو چیز آتی ہے وہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا کی مشہور آیت کا مفادہے مطلب یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جان رکھنے والی ہستیاں، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو، اس مدت کو گذارنے کے لئے جن ضرورتوں کی وہ محتاج ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا حصول زیادہ تر جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھئے کہ جسمانی توانائیوں میں اس غریب انسان کا اسی جیسی زندگی رکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں کیا حال ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے، بے سروسامانی اور بے نوائی کے جس حال میں آدمی اس دنیا میں قدم رکھتا ہے، مشکل ہی سے دوسرے زندہ وجودوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے، آخر جو اون بال، کُھر، پَر، بازو، سینگ، چنگل اور ازیں قبیل بیسیوں قدرتی ساز و سامان کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں، گویا اُن میں ہر ایک اپنی چادر، اپنا اوڑھنا بچھونا، اپنا لباس، اپنی کھڑاؤں کہئے یا بوٹ، اپنی سواری وغیرہ وغیرہ لے کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ بھلا اس کا مقابلہ وہ غریب کیا کر سکتا ہے، جو ایک زندہ لوتھڑے کے سوا ابتدا میں گویا کچھ نہیں ہوتا اور ننگا، ہر قسم کے سامانوں سے خالی، جسد بھی جو اس کو ملتا ہے سو، اتنا نازک و ناتواں، حساس، انتہائی حد تک بودا ہوتا ہے

کہ اپنے طبعی مسکن (کرۂ ہوا) کے موسموں کی معمولی شدت کا مقابلہ بھی باآسانی نہیں کر سکتا گرمی ہو یا سردی، ان موسمی تغیرات کی ہلکی سی شدت آدمی کو بوکھلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ حالانکہ زمین کے کرہ پر اسی انسان کے ساتھ کتنے آنے والے آئے اور رہے اور آباد ہوئے۔ ان کا مسکن بھی وہی ہے جو انسان کا مسکن ہے۔ لیکن موسمی تکلیفوں سے نپٹنے کے لئے ان کو ان دردسریوں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ جن میں غریب آدمی مبتلا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً جتنی بھی جان رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں بھی وہ ساری قوتیں اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتیں جن سے آئندہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں وہ کام لیتی ہیں۔ بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کے لئے گذارنے ہی پڑتے ہیں۔ اسی لئے ابتدا میں قدرت کی طرف سے ان کے ماں باپ میں اس کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ اپنے اپنے طریقہ سے اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش و نگرانی کریں۔ مگر اس لحاظ سے بھی جب آدم زادوں کا مقابلہ دوسرے حیوان زادوں سے کیا جاتا ہے تو آسمان و زمین کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک مرغی کے ہی بچوں کو دیکھئے، کوئی شبہ نہیں کہ مہینے دو مہینوں تک ان کو اپنی ماں کی نگرانی کی حاجت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس نگرانی میں، جو آدم زاد کو اپنی ماں کے اعتبار سے ہوتی ہے، اور اس نگرانی میں، جو مرغی کے بچوں کو اپنی ماں کی ہوتی ہے کوئی نسبت بھی ہے؟ انڈا کھٹکنے کے ساتھ ہی مرغی کے بچے دانہ چگنے لگتے ہیں۔ ان کی ماں کا کام صرف تلاش کرنا اور بلا کر ان کو خوراک کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے سلیقے سے دو دن کے بچے ان دانوں کو چگتے ہیں۔ مرغی کے ان سعید و باتمیز بچوں کو خیال تو کیجئے گوشت کے اس لوتھڑے سے کیا تعلق، جس کا نام آدمی کا بچہ ہے اور فرق اسی نقطہ پر ختم کب ہوتا ہے؟ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں، جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مدت کو اس طویل زمانہ سے کیا سروکار جو آدمی کے بچوں کو اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن مدارج کو دوسرے، دنوں میں طے کرتے ہیں، آدم زاد مہینوں میں ہی نہیں بلکہ برسوں میں طے کرتا ہے۔ ماں باپ کی اعانت و امداد سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کے متکفل ہونے کے لئے آدمی کو عام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت تو چاہئے۔ لیکن اس سولہ سال کی مدت میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے سوا تقریباً جتنے بھی ہیں، خود وہی نہیں، بلکہ ان کی چند پشتیں ضعف کے مدارج کو طے کر کے قوت کے اسی مقام پر ہوتی ہیں، جہاں ہانپتے کانپتے، گرتے پڑتے بہزار

ابی آدمی کا بچہ پہنچتا ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے ازالہ کے بعد دوسروں
ں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں بروئے کار آتی ہیں عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔
ں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد یہی وجہ ہے کہ زندگی گذارنے کے لئے ان میں سے کسی کو کسی
سرے کی قطعاً حاجت نہیں ہوتی، ہر ایک اپنی خود مکتفی زندگی گذارتا ہے۔ اپنی قوت بازو سے
ر وقت تک خود کما کما کر اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔

لیکن بنی آدم کا کیا حال ہے۔ ایک تو خدا خدا کر کے ان کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں کے بعد
تا ہے۔ اس کے بعد حصولِ معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں، زیادہ زمانہ
زرنے نہیں پاتا کہ بتدریج دبے پاؤں پھر وہی پیدائشی ضعف، مختلف راستوں سے، مختلف بھیس
س میں نکلنا شروع کرتا ہے اور بالآخر ایک ایسے نقطہ پر پہنچ کر رہتا ہے، کہ تقریباً وہی حال، جس
ل میں آدمی پیدا ہوا تھا، دیکھا جاتا ہے کہ پھر اسی کی طرف پلٹ گیا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا
ں باپ کی شکل میں محتاج تھا آخر میں وہی آدمی ان ہی نگرانوں کا بیٹے اور بیٹیوں پوتے اور
تیوں کا دستِ نگر نظر آتا ہے۔ پیدائشی ضعف کی طرف جسے قرآن میں خلق الانسان
ضعیفا " کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، اسی طرح ظہور قوت کے بعد دوسرا ضعف جو اس پر
ری ہوتا ہے مندرجہ ذیل آیۃ کریمہ

| | |
|---|---|
| خلقکم من ضعف ثم من | پیدا کیا خدا نے تمہیں ضعف سے، پھر ضعف |
| بعد ضعف قوۃ ثم من بعد | کے بعد قوت (نمایاں ہوتی ہے) اور قوت |
| قوۃ ضعفا و شیبۃ ! | کے بعد پھر ضعف اور پیرانہ سری (مع بڑھاپے) |

ں ذکر فرمانے کے بعد قوت کے بعد والے طاری ہونے والے ضعف کے ان آثار کا تذکرہ ۔۔ جو
می کے ظاہر جسد میں نمایاں ہوتے ہیں، بایں الفاظ فرمایا گیا کہ

| | |
|---|---|
| ومن نعمرہ ننکسہ | اور جسے ہم معمر کرتے ہیں، پلٹاتے ہیں ہم |
| فی الخلق ! | اسے اس کی خلقت میں ! |

نو باہر میں ہوتا ہے۔ کہ لمبے لمبے ہاتھ، پھولی پھولی گردنیں، مچھلیاں نکلے ہوئے بازو، قوت اور
ر سے بھری ہوئی بیٹھیں، پٹھوں سے جکڑی ہوئی ٹانگیں، بتدریج گھٹتے گھٹاتے، گھلتے گھلاتے ایک
ں ہوئی گٹھڑی کی شکل میں بدل جاتی ہیں۔ گویا وہی گوشت کا ایک زندہ لوتھڑا جیسے آدمی شروع
ں معلوم ہوتا ہے، آخر میں بھی وہ ہی کیفیت بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس لوتھڑے پر

جو ابتدا ایں پیدا ہوتا ہے، لوگوں کو پیار آتا ہے۔ اور اس جھری پڑے ہوئے کانپنے والے اور تھرتھرانے والے منتغز گوشت کے دیکھنے سے تو نگاہ کو دکھ پہنچتا ہے۔ طبیعت بگڑنے لگتی ہے، بسا اوقات دیکھنے والوں میں گھن پیدا ہوتی ہے، تنکیس اور پلٹاؤ کی یہ کیفیت تو باہر ہی میں طاری ہوتی ہے اور اندر میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے، باطنی قوتوں کی ساری آبادیاں جس طرح اُجڑ کر برباد ہوتی ہیں قرآن ہی نے

| | |
|---|---|
| ثم نردہ الی ارذل العمر | پھر پلٹا دیتے ہیں ہم اس کو بدترین سن کی |
| لکیلا یعلم من بعد علم | طرف دیہ اس لئے ہم کرتے ہیں کہ) نہ جانے |
| شیئا۔ | جاننے کے بعد کسی چیز کو! |

کے الفاظ میں اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ دراصل اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام ایسے ہوتے ہیں جسے وہ اپنے سامنے مکمل کر کے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں وہی ہے کہ ؎

کار دنیا کسے تمام نہ کرد!

اور اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرّہ پر آدم کی نسل زندگی کے جن جن شعبوں کے متعلق بہتری کے پیدا کرنے کی دُھن میں مشغول ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار جتنی بھی سست ہو لیکن عموماً پچھلی نسلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگلی نسلوں کے حساب سے بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی چلی ہی آ رہی ہے۔ لیکن جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں، اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں مصروف ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس راہ میں اس نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے، خصوصاً جب سے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے آدمی قابو یافتہ ہو گیا ہے کہ پہاڑوں دریاؤں، ندی، نالوں اور نشیب و فراز کے جھگڑوں سے گویا آزادی مل گئی ہے۔ بکوں شکروں بندوں کے جھنجھٹوں کی ضرورت مسافت کے طے کرنے میں باقی نہیں رہی۔ بلا شبہ یہ ہوا ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے، مقابلہ کر کے جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ان چڑیوں، طوطوں، بینوں، گِدھوں، چیلوں اور کوّوں کے برابر بھی تو نسل انسانی زندگی کے اس انتہائی ترقی یافتہ شعبہ میں نہیں پہنچی ہے۔ اسی نقل مکانی کے مسئلہ میں — یا بالفاظ دیگر مواصلات کے ذرائع میں وہ نہ لوہے کے محتاج ہیں، نہ لکڑیوں کے، نہ پٹرول کے، اور

نہ ان دوسری گیسوں کے، جن کے بل بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے
اب بھی ان اجزا میں سے کوئی چیز اگر غائب ہو جائے جو ہوائی جہازوں کو اڑانے کیلئے ضروری
ہیں تو آدمی بانو ڈال دے گا، مگر اسی کے مقابلے میں ایک معمولی مکھی، لنگڑا مچھر، جب اس کا جی
چاہتا ہے، صرف پروں کے کھولنے کی دیر ہے، یہ گیا وہ گیا۔ فضاء آسمانی میں گم ہو گیا۔ اُخلق
الانسان ضعیفا کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی جو معذور ہو
اور ان عقلوں اور ترقیوں کے دعووں کے بعد بھی معذور ہو، اس کی ناتوانیوں اور زبوں حالیوں کا
کوئی ٹھکانہ ہے؟ اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس سے بن آیا وہ تنہا نہیں، بلکہ ایک ایک
کام کے لئے ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول شخصے کہ آدمی کے منہ میں
روٹی کا ایک لقمہ بھی جو جاتا ہے تو بیسیوں ہاتھوں سے گذرنے کے بعد جاتا ہے۔ گیہوں کے
بونے والے، جوتنے والے، پانی دینے والے، کاٹنے والے، بھوسی صاف کرنے والے، تولنے والے
بیچنے والے، بازار میں لانے والے، دکان میں رکھنے والے، خریدنے والے، پیسنے والے، آٹا گوندھ کر
لانے والے، پکنے کے برتن کو بنانے والے، ایندھن کی لکڑیوں کو لانے والے، دسترخوان پر چننے والے
جب ان سب ہاتھوں کے کام ختم ہو جاتے ہیں، تب لقمہ توڑ کر اٹھانے والے کا ہاتھ اس لقمہ کو
منہ تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ تو ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ہر سلسلہ کے ساتھ جو دوسرے سلسلے ہیں مثلاً
ہل کی لکڑیوں کو کاٹنے والے، ہل میں لوہے کو ٹھونکنے والے، لوہے کو کان سے کھود کر بازار میں
لانے والے، اگر یوں سوچا جائے تو ملے گی کہ اس ایک لقمے میں کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد
خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اسی بے نوا دبے سروسامان غریب انسان کے
مقابلہ میں دیکھئے، ان کو دیکھئے جو اسی قسم کی جان رکھتے ہیں جیسی یہ رکھتا ہے۔ انہیں بھی چوبیس
گھنٹوں میں تحلیل یافتہ اجزاء کی جگہ بدن میں بدل پہنچانے، یا تلافی مافات کی مسلسل ضرورت رہتی
ہے، بلکہ ان میں کتنے ہیں، جو دن بھر میں سیروں نہیں، منوں خوراک کے محتاج ہیں۔ آخر ان ہی
میں ہاتھی بھی تو ہے، دہیل مچھلی بھی، اژدہے اور گینڈے بھی، اور کیا کیا بتایا جائے کہ کیا کیا ہیں!
لیکن ان میں جو کچھ ہیں، اپنی ساری ضرورتوں کو صرف اپنی قوتِ بازو سے مہیا کرتے ہیں، حاتم طائیوں
کی منت سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں بعضوں کو اس مدت کی دگنی اور چوگنی مدت
اسی زمین میں گذارنی پڑتی ہے، جتنی انسان گذارتا ہے۔ بلکہ اگر کرگس (گدھ) وغیرہ کی طول عمری
کا افسانہ صرف افسانہ نہیں ہے، تو ان کی معاشی زندگی کی مدت کی طوالت کا مقابلہ انسانی افراد کیا،

ان کی نسلیں اور پشتیں بھی تو نہیں کر سکتیں، مگر باوجود اس کے ان میں ہر ایک کی زندگی خود مکتفی زندگی ہے۔ وہی خود مکتفی زندگی جس کے لئے آدم کی اولاد تڑپ رہی ہے، لاکھوں برس سے تڑپ رہی ہے۔ انفرادی طور پر جب اس کا حصول ناممکن نظر آتا ہے تو کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں وہمی اور فرضی حدود پیدا کر کے ان فرضی حدود کے باشندوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ممکن نہ ہو تو کئی ایک جو ان فرضی حدود میں رہتے ہیں وہ تو اپنی زندگی کو خود مکتفی زندگی بنا لیں یعنی ان فرضی حدود میں رہنے والوں کی امداد سے تو مستغنی ہو جائیں، حیوانوں کے ہر ہر فرد کو خود اکتفائیت کا جو مقامِ عالی حاصل ہے، اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمیوں کی ٹولیوں کو تو خود مکتفی ہونے میں کامیاب بنا لیا جائے۔ لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت و طاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی نہیں حاصل ہو رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے سوا ان جیتے جاگتوں میں جتنے ہیں، سب ہی کامیاب ہیں۔ اور کیوں کامیاب نہ ہوں، آدم کے بچوں کا ضعف اور ان کی ناتوانی، خواہ سابق ہو یا لاحق، یعنی پیدائش کے بعد والی کمزوری ہو، یا ظہورِ قوت کے بعد جو ضعف لاحق ہوتا ہے، وہ جو کہ وہ تو خیر ضعف ہی ہے۔ لیکن زندگی کا عہد، آدمیوں میں قوت اور زور کا عہد سمجھا جاتا ہے، ایک تو یوں ہی دو ضعفوں میں گھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ دو نیستیوں کے بیچ والی ہستی بھی ایک قسم کی نیستی ہی ہوتی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے

| | |
|---|---|
| الوجود بین العدمین | دو نیستیوں کے درمیان والی ہستی |
| عدم | بھی نیستی ہی ہوتی ہے! |

لیکن اسے صوفیانہ غلو بھی اگر قرار دیا جائے، جب بھی ہم دیکھتے ہیں، کہ قوت و طاقت، توانائی اور زور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں خم ٹھوکنے والے مونچھوں پر تاؤ دینے والے، اپنے متعلق اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر جتنی تعلّیاں اور لن ترانیوں سے بھی کام لیتے ہوں، مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلہ سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں، صرف غریب چیونٹیوں کو بھی لا کر مقابلہ کے اس میدان میں کھڑا کر دیجیے اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھئے کہ قوت و طاقت کے اس عہد میں، زور و قوت کا جو حصّہ آدمی میں پایا جاتا ہے۔ اس کو ان غریب چیونٹیوں کی قوت سے کیا نسبت ہے۔ جواب میں اربابِ تجربہ و مشاہدہ کا یہ بیان سنئے۔

"چیونٹی اپنے وزن سے تیرہ سو گنا بوجھ کھینچ سکتی ہے[1]"

---

[1] مقصود کا بیان ہے کہ چیونٹی اپنے دانت سے اس چیز کو کھینچ لیتی ہے جو اس کے وزن سے تین ہزار گنا زیادہ وزنی ہو (رسالہ سائنس اگست ۱۹۳۲ء)

کیا معنی کہ چیونٹی کے مختصر قد میں قدرت جتنی قوت بھرتی ہے۔ اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا، تو کہتے ہیں کہ

• اس قوت سے سات ہزار سات سو من وزنی چیز پکڑ کر اٹھا سکتا تھا"

یعنی کچھ نہیں، صرف ایک چیونٹی کو قوت کا جو حصہ ملا ہے، اگر آدمی کو ملتا، تو سوا ایکڑ زمین کی پیداوار کو (ایک ایک آدمی) ایک ہی دفعہ میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جس مال کو منتقل کرنے کے لئے پوری ایک مال گاڑی کی ضرورت ہوتی ہے، ایک سود اگر خود ہی تنہا اسے کھینچ کر لا سکتا تھا۔ اور یہ اس زور بازو کا حال ہے، جسے اپنے اندر محسوس کر کر کے یہ آدم زاد کیا کیا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن مقابلہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آدم کے بچوں کو اتنا بھی تو نہیں ملا ہے جس کی غریب "مورِ ضعیف حصہ دار ہے ــــ ایک چیونٹی ہی کیا ہے لکھنے والوں نے تو اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ

• ٹڈیوں اور پروانوں میں اچھلنے کودنے کی جتنی قوت ہوتی ہے
اگر آدمی میں بھی قوت اسی نوعیت کی ہوتی تو تین سوفٹ بلندی
تک ایک چھلانگ میں یہ پہنچ سکتا تھا"

بہر حال کتابوں میں پڑھئے، زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد میں قوت و طاقت کا وہی معیار آپ کو نظر آئے گا جس کے سامنے غریب انسان کی اٹھی ہوئی گردن انتہائی شرمندگی سے جھک جاتی ہے۔ اور خدا کی بات خلق الانسان ضعیفا کے ماننے پر اپنے آپ کو وہ مجبور پاتا ہے۔

اور یہ تھی بنی نوع انسان کی وہ پہلی خصوصیت، جس کا قرآن کے حوالے سے میں یہاں ذکر کرنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک انسان کے جس معاشی نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے فطرتِ انسانی کی اس خصوصیت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

**دوسری خصوصیت**

(۲) دوسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف قرآن ہی میں بایں الفاظ تنبیہ کی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| انظر کیف فضلنا بعضھم علیٰ بعض (بنی اسرائیل) | دیکھ تو! کس طرح ان میں بعض کو بعض پر ہم نے برتری عطا کی ہے! |

اسی حقیقت، کی دوسری قرآنی تعبیر یں ہے۔

| | |
|---|---|
| و رفع بعضکم فوق بعض درجات (الانعام) | اور برتری بخشی خدا نے تم میں بعض کو بعض پر! |

یا :

| | |
|---|---|
| رفعنا بعضکم فوق بعض درجات (زخرف) | اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر مدارج کے لحاظ سے! |

کے الفاظ میں آپ کو ملیں گی۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تماشہ گاہِ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے اور صفات و کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتیں؟

تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ بایں ہمہ یک رنگی ایک پنکھڑی کچھ نہ کچھ خصوصیت اپنے اندر ایسی ضرور رکھتی ہے۔ جو دوسری پنکھڑی میں نہیں پائی جاتی۔

"تجلیات میں تکرار نہیں ہے" —— تفاوت و صفات ہی کے مسئلہ کی یہ صوفیانہ تعبیر ہے۔ غالب مرحوم نے ع

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں!

کے مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے، بلکہ اس واقعہ کی واقعیت پر اتنا بھروسہ کیا گیا ہے کہ اسی پر اعتماد کر کے حکومت والوں نے ہر شخص کے ابہام (ہاتھ کے انگوٹھے) کے نشان کو دستخط کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسرے شخص کے انگوٹھو کی لکیروں سے کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھتی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے، اگر صفات کے تفاوت کا اگر یہ تماشہ دنیا میں نہ پیش ہوتا تو ان گنت، بے شمار، طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا نظر آ رہا ہے، کثرتوں کا یہ مجموعہ ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا ایک چیز کا دوسری چیز سے امتیاز کی صورت ہی اس کے سوا کیا ہے، کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے، لیکن بایں ہمہ اختلافات و امتیازات یہ بھی ایک کھلی ہوئی

حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں جو صنف بندی کی گئی ہے کسی سلسلہ کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان جو ہم کہتے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر ایتلاف و مجانست و مشابہت بھی یقیناً پائی جاتی ہے۔ اور اتنی زیادہ مجانست و مشابہت کہ اسی بنیاد پر ان کو کسی نہ کسی ایک نوع یا صنف کے نیچے ہم داخل کرتے ہیں، ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات کے وحدت کے مشترک جہات بلاشبہ اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بجائے دو کے ان کو ایک جنس یا ایک نوع کے نیچے اگر مندرج کیا گیا ہے تو قطعاً یہ غلط اندراج یا غلط صف بندی نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں گدھوں بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان تمام انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی دوسری قسمیں ہیں مثلاً گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ، گو ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد نہیں، تو ایک نوع کے جو مختلف اصناف ہیں، مثلاً بکروں کی ایک ایک صنف کے افراد پر اگر غور کیجئے۔ تو باوجود صفاتی تفاوت کے اس صنفِ خاص کے افراد میں اتنی یک جہتی پائی جاتی ہے، کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں، وہی کمالات اس صنف کے قریب قریب دوسرے فرد میں بھی آپ پائیں گے۔ مثلاً مرغیوں کی سینکڑوں نسلیں ہیں، ہر نسل چند خاص خصوصیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے کہ ان نسلی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس نسل کے افراد میں بھی گو کچھ نہ کچھ تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اتنا کم کہ اس کا ہونا، نہ ہونا، دونوں گویا کچھ برابر ہی برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جانوروں کی ہر نسل کے افراد کی معاشی ضرورتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں۔ کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے کی عادتوں میں، سب کی معاشی سطح قریب قریب برابر ہی ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے مقابلے میں آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے، جس کا نام "الانسان" ہے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں، اور مختلف نسلوں میں آدمی بھی بٹا ہوا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں اور دو قسموں کو تو جانے دیجئے، ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں، لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے اور روز دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے اگر ایک کو انسان کہا جا سکتا ہے، تو دوسرے پر شاید حیوان کے لفظ کا اطلاق بھی مشکل ہی سے صحیح ہو سکتا ہے۔ بظاہر

دونوں ہی پر انسانوں ہی کی کھال چڑھی رہتی ہے۔ دونوں پر انسانی ہی چہرے مُہرے ہوتے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے اعتبار سے آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دُوسرا ٹھیک اس کے بالمقابل تحت الثریٰ، یا پاتال میں ہے۔ ایک خوبصورت ہے، اتنا خوبصورت کہ دیکھنے والوں کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ دُوسرا اتنا زشت رو، کریہہ المنظر، بھدّی شکل کا پیدا ہوتا ہے کہ دیکھ کر جی متلانے لگے۔ ایک غبی ہے۔ دُوسرا ذہین۔ ایک چست و چالاک ہے، دُوسرا پیدائشی کاہل و سُست، ایک فرشتہ خصلت ہے، دوسرا شیطان سیرت، کسی کو شاعری سے لگاؤ ہے، تو دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کرنا چاہتا ہے، تو دُوسرا کتابوں کا کیڑا نظر آتا ہے۔ اور ٹھیک جیسے حیوانی اصناف میں سے ہر صنف اور ہر ہر قسم کے افراد میں صفاتی تفاوت کی کمی نے ان کی زندگیوں کی سطح میں ایسا تفاوت محسوس پیدا ہونے نہیں دیا۔ جسے قابلِ لحاظ سمجھا جائے، جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی معاشی ضرورتوں کی نوعیت کمّاً و کیفیتاً تقریباً ایک ہی طرز کی ہوتی ہے۔ اسی کے مقابلہ میں افرادِ انسانی میں اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات اور ان کی قدر و قیمت[1] میں جو تفاوت پایا جاتا ہے، اسی نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے اندر مدارج کا اتنا اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر مشکل ہی سے کسی دوسری حیوانی نوع یا صنف یا نسل میں مل سکتی ہے۔ چونکہ مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افرادِ انسانی میں ان کمالات و صفات ہی کے تفاوت کا نتیجہ ہے، جو اکتسابی نہیں، بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسب و اکتساب سے بھی کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات اور ان ہی مناسبتوں اور صلاحیتوں کے تابع ہوتی ہے جنہیں ہر شخص اپنی ماں کے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ افرادِ انسانی میں کمالات و صفات ہی کا صرف تفاوت نہیں پایا جاتا، بلکہ نتائج کے لحاظ سے مختلف انسانی صفات و کمالات میں قدر و قیمت کا بھی تفاوت قدرتی ہے، آخر بتایا جائے کہ کسی قوم میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے اور بہت [illegible] جانے کے بعد یہ کام کرتا ہے کہ لکڑی کو میز، پلنگ بنا کر دیتا ہے یعنی بڑھئی یا نجار ہے۔ اسی قوم میں ایک دوسرا فرد پیدا ہوتا ہے [illegible] کھول [illegible] کر [illegible] انسانوں کا اپنی قوم کو مالک بنا دیتا ہے یا اپنی قوم کو دوسری غاصب قوموں سے نجات عطا کرتا ہے۔ کیا ثانی الذکر کی صلاحیت جو زینت رکھتی ہے اوّل الذکر کا کمال بھی کیا اسی قدر و قیمت کا مستحق ہو سکتا ہے کمالات و صفات میں بھی قدر و قیمت کا تفاوت ہوتا ہے، اس کا یہی مطلب ہے ۱۲

پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو محنت و کوشش، تعلیم و تربیت، اصلاح و نگرانی سے آدمی ترقی دے سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ شاعری سے جسے قدرتی مناسبت فطرتاً نہ ہو، زور و ظلم سے کوئی اسے شاعر بنا دے۔ حالانکہ اس کا دوسرا نتیجہ ابجائی بے سیکھے سکھائے قصیدوں پر قصیدے، غزلوں پر غزلیں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ آج تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچوں کی طبعی مناسبتوں اور نفسیاتی رجحانات کو سب سے زیادہ اہمیت جو دی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اکتسابی نشو و نما، ترقی و بالیدگی کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جا سکتی ہے، جنہیں شکم مادر سے اپنے ساتھ لایا ہو، اور یوں بھی تو سوچئے، ایک ہی استاد سے ایک ہی کمرے میں، ایک ہی نصاب کی تعلیم ہر جماعت کے طلبہ کو دی جاتی ہے۔ لیکن سب پر اس تعلیم کا نتیجہ ایک ہی کیوں مرتب نہیں ہوتا، بہر حال صفات و کمالات کے اسی تفاوت اور اس تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف، نسلِ انسانی کے افراد میں جو پیدا ہو گیا ہے، قرآن نے مذکورہ بالا آیتوں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی وہ دوسری خصوصیت نوعِ انسانی کی ہے جس سے انسانی زندگی کا نظام متاثر ہوا ہے معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گدھوں، کتوں، بلیوں اور چوہوں یا ان جیسے مختلف حیوانی انواع اور نسلوں میں پائی جاتی ہے۔ بنی آدم کی زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ اور اسی اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے کوئی اونچا نظر آتا ہے اور کوئی نیچا۔ اس فقرہ کے ختم کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت کوئی تبدیلی پیدا کی جائے جب رحمِ مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو وہ فراہم کرتے ہیں، اوروں کا تو میں نہیں کہتا۔ لیکن قرآن ہر کائناتی حوادث کے اساسی کلیات میں جن چند چیزوں کو داخل کیا گیا ہے، ان میں

ویعلم ما فی الارحام — اور جانتا ہے (خدا) ان چیزوں کو، جو رحموں میں ہوتی ہے۔

بھی ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماؤں نے کن صلاحیتوں کے بچوں کو اپنے ارحام میں محفوظ کیا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد آئندہ وہ کیا ہونے والے ہیں۔ سکندر، و تیمور، افلاطون و ارسطو، یا ہبنقا[1] عرب، فسانۂ عجائب

---

[1] عرب کی ایک شمالی بستی کا نام کہا جاتا ہے کہ ہبنقا تھا۔ اتنا احمق اور خالی دماغ آدمی تھا کہ گلے میں ٹوٹے جوتوں کا ہار لٹکائے رہتا تھا پوچھا جاتا تھا کہ یہ کیا ہے تو کہتا کہ اسی علامت سے میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں کہ میں ہی ہوں۔ اردو میں بُدّھو اسی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے ۱۲

کا نتیجہ ہی؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی جان سکتا ہے جو "ماء مہین" کہئے یا "نطفہ" میں انسانی کمالات بھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن میں فضلنا بعضھم علیٰ بعض کے ذریعہ سے اس کا اعلان فرما دیا گیا کہ افرادِ انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں بلکہ براہ راست قدرت کا کام ہے اور جس طرح یہ قدرت کا کارنامہ ہے، اسی طرح تفاوتِ صفات کی وجہ سے افرادِ انسانی میں مدارج ومراتب کا جو فرق پیدا ہو گیا ہے، یہ بھی کسی دوسرے کا نہیں، بلکہ صاف لفظوں میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ

| | |
|---|---|
| رفعنا بعضھم فوق | اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض |
| بعض درجات | کو بعض مدارج کے اعتبار سے! |

یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا گیا ہے جو اپنے ثمرات و آثار کے لحاظ سے انمول و قیمتی ہے۔ اور اسی لئے دونوں کو اپنی اپنی صفات کی قیمت برابر نہ ملی۔ ایک کا درجہ دوسرے سے بلند ہو گیا تو یہ بھی قدرتی دین ہی کا نتیجہ ہے۔

اپنے کمالات و اوصاف کی زیادہ قیمت پانے والا اگر معاشی لحاظ سے اپنے آپ کو بسط اور کشادگی کی حالت میں پاتا ہے اور جن کے کمالات و صفات اتنی قیمت نہ پا سکے اور اس کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی میں بجائے فراخی و کشادگی کے ضیق و تنگی پائی جاتی ہے تو لازماً یہ دونوں حالتیں بھی اسی قدرت کی طرف منسوب ہوں گی، جس نے انسانوں کے سوا دوسرے حیوانات، پرندوں، چرندوں درندوں، دوپندوں کے افراد میں کمالاتی و صفاتی تقارب و تساوی پیدا کر کے ایک طرف اگر ان میں سے ہر صنف کے افراد کی معاشی سطح کو قریب قریب برابر کر دیا ہے، تو دوسری طرف انسانی افراد کو صفاتی تفاوت کے قانون کے تحت پیدا کر کے باہم معاشی اعتبار سے انہیں مختلف کر دیا ہے، ایک جگہ نہیں، بیسیوں جگہ اسی حقیقت اور اسی واقعہ کا اعلان

| | |
|---|---|
| واللہ یبسط الرزق لمن یشاء | خدا ہی جو کشادگی عطا کرتا ہے روزی میں کسی |
| ویقدر | کو اور وہی تنگی کر دیتا ہے کسی کی روزی کو) |

کے الفاظ میں قرآن مسلسل کرتا چلا گیا ہے۔ بلکہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کا جو قانون انسانی افراد کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کو تو قرآن نے صرف

| | |
|---|---|
| فضلنا بعضھم علیٰ بعض | اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر) |

کے اطلاقی پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ یعنی صرف یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ بعض افراد کو بعض پر ہم ہی نے

برتری اور فضیلت بخشی ہے۔ لیکن یہ بات، کہ کن باتوں میں فضیلت بخشی ہے۔ اسے ابہام و اطلاق ہی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اور یہ بھی یہی بات، کہ وہ اتنے مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی۔ صرف تفاوتِ صفات کے اس قانون پر تنبیہ کرنے کے لئے اتنے الفاظ کافی ہیں۔ آدمی اس کے بعد ان کی تفصیلات کو مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ مگر صفاتی و کمالاتی تفاوت کے اس قدرتی قانون کے زیر اثر انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر نتیجۃً جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو گئی ہے، اور ہو جاتی ہی بجائے اطلاق و ابہام کے

| | |
|---|---|
| واللہ فضل بعضکم علی | اور خدا ہی نے برتری عطا کی ہے، تم میں |
| بعض فی الرزق ! | بعض کو بعض پر "الرزق" یعنی روزی میں ! |

کی آیت میں "فی الرزق" کی جو تصریح کر دی گئی ہے۔ بظاہر اسے اگر اس کا اشارہ سمجھا جائے کہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون سے ایک بڑی غرض قدرت کی یہ ہے کہ "الرزق" یا معاشی لحاظ سے انسانی افراد میں مدارج کا فرق پیدا ہو جائے[1] یعنی قصداً و ارادۃً اسی رزقی فرقِ مراتب کو پیدا کرنے کے

---

[1] بلکہ آیت کے ان ہی الفاظ کے بعد یہ جو فرمایا گیا ہے کہ فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ماملکت ایمانھم (یعنی جنہیں رزق میں برتری بخشی گئی ہے، وہ اپنے رزق کو نہیں واپس کرنے والے ہیں، ان لوگوں پر جو ان کے زیردست ہیں) لوگ اس کا مطلب جو بھی لیتے ہوں لیکن ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ رزقی برتری چونکہ صفاتی و کمالاتی برتری کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے اپنے کمالات ہی کی بنیاد پر رزق کا زیادہ حصہ جن لوگوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے وہ اس حصہ کو اپنے کمالات کی قدرتی قیمت سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے آپ کو جائز حقدار یقین کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جسے اپنے کمالات کی قیمت کی صورت میں رزق کا زائد حصہ زیردستوں کے اعتبار سے اگر ملا ہو تو یہ خیال کر کے کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے، میرا نہیں ہے اپنے زیردستوں کو واپس کر دے یعنی اس حصہ کا اپنے آپ کو حقدار نہ ان کے لوٹا دیں تو کوئی نہیں کرتا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق قرار دے کر دوسروں کو وہ عطا کرے، دیدے لوگ ردّ اور عطا میں فرق نہیں کرتے، اس لئے طرح طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اس پر غور کریں کہ ردّ کے معنی واپس کرنے کے ہیں، پس ردّ اور واپسی تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کا آدمی مالک ہی نہیں ہوا اور عطا یعنی دینے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو میری ہے، میں اسے تمہیں ہبہ کر رہا ہوں۔ قرآن میں نفی ردّ کی گئی ہے نہ کہ ہبہ اور عطا کی۔ اور ہبہ اور عطا کی نفی کیسے صحیح ہوگی جبکہ رات دن مالداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال دوسروں کو عطا کرتے ہیں۔ البتہ یہ کوئی نہیں کرتا کہ جو قیمت اپنے کمال یا مہارت کی کسی کو ملی ہو اسے یہ کہہ کر واپس کر دے کہ اس کا حقدار (میں) نہیں ہوں۔ پھر لوں کیسے؟ ۱۲

لئے نوعِ انسانی کے افراد میں صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون کو قدرت نے نافذ کیا ہے، ورنہ انسانی افراد کی معاشی سطح کو ہم سطح اور برابر رکھنے کا ارادہ اگر کیا جاتا تو جس قدرت نے ہزارہا ہزار جانوروں کی معاشی سطح کو تفاوت کے اس قانون سے علیحدہ رکھ کر برابر کر دیا ہے، وہی قدرت صرف نوعِ انسان ہی کے افراد میں اس مساوات کے پیدا کرنے سے کیا مجبور تھی!

بہرحال اب جو کچھ بھی ہو، نوعِ انسان کی دوسری قرآنی خصوصیت، جس کا انسان کے "معاشی مسئلہ" سے گہرا تعلق، اور بہت زیادہ گہرا تعلق ہے، وہ صفات و کمالات کے تفاوت کا یہی قدرتی قانون ہے۔ قرآن بھی بنی نوعِ انسانی کے افراد کا اسے قدرتی قانون قرار دیتا ہے اور مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے!

(۳) تیسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف میرے خیال میں آیتِ قرآنی

ان الانسان خلق ھلوعا۔ — قطعاً آدمی لالچی اور بے صبر بنا کر پیدا کیا گیا

میں اشارہ کیا گیا ہے۔ "ھلوع" عربی زبان کا ایک لفظ ہے، انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ای شدید الحرص قلیل الصبر — یعنی سخت لالچی اور بہت کم صبر رکھنے والا

غالباً صحاح کی مشہور روایت

لو کان لابن آدم وادیان من — اگر آدم کے بچے کو دو وادی بھر مال دیا جائے

مال لابتغی وادیا ثالثا! — تو چاہے گا وہ تیسری وادی کو!

قرآن کے اسی لفظ ھلوع کی یہ توضیح و تفسیر ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسی بنیاد پر یعنی ھلوع کے لفظ کا چونکہ یہی حاصل ہے۔ اسی لئے اس حدیث کو انہوں نے قرآن کی ہی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بجنسہٖ حدیث کے یہ الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مقصد یہی ہے کہ قرآن کے لفظ ھلوع کا یہ مفاد ہے۔ اسی طرح سورۂ "والعادیات" میں یہ فرمانے کے بعد کہ

ان الانسان لربہ لکنود — قطعاً آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے!

یعنی آدمی کی یہ عام عادت ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں کی قدر و قیمت سے تو غافل ہو جاتا ہے، ان کے متعلق کسی قسم کے احساسِ شکر کو اپنے اندر بیدار نہیں کرتا، نعمتیں زائل ہو کر اپنی قیمت جب تک آدمی پر ثابت نہیں کرتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ اسے ملا ہی نہیں۔ اور ان "یافتہ" سہولتوں

سے بے پروا ہو کر دیکھا جاتا ہے کہ ہمیشہ نایافتہ تمناؤں اور آرزوؤں میں الجھا رہتا ہے۔ صرف بینائی ہی کی ایک نعمت ہے۔ روپیہ دیکھتے ہوئے مشکل ہی سے ایسا کوئی آدمی ہوگا جو سب کچھ دے کر اسی بینائی کو خریدنے پر اُس وقت آمادہ نہ ہو جاتا ہو، جب خدانخواستہ اس کے ضائع ہونے کا خطرہ دھمکی دینے لگے۔ اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کرنا چاہئے، مگر جب تک یہ نعمتیں اس سے چھنتی نہیں ہیں انہیں گویا وہ آنکھ بھی نہیں لگاتا، اور ان سب کے ہوتے ہوئے ان چیزوں کی فکریں، جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں، مگر چاہتا ہے کہ وہ حاصل ہوں، پریشان اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ چہرے پر ایسی حالت طاری کرتا ہے کہ گویا اس وقت تک قدرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس محروم نصیب کو کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ امیر ہوں یا غریب، اس باب میں سب کا عام حال یہی ہے۔ بہرحال فطرت انسانی کی اسی عام کنودیت (ناشکری) کا ذکر کرنے کے بعد اسی موقعہ پر قرآن میں

انہ لحب الخیر لشدید — اور آدمی الخیر کی محبت میں انتہا پسند واقع ہوا ہے

جو فرمایا گیا ہے۔ یہ بھی اگر غور کیا جائے تو اسی لفظ ھلوع ہی کے مفاد کی دوسری وسیع تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ھلوع کے لفظ سے تو صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی حد سے زیادہ لالچی ہے اور کسی نقطہ پر اس کے دل کو قرار نہیں ہوتا، جو کچھ مل جاتا ہے، اسے تو ملا ہی ہوا سمجھ کر ان چیزوں کی فکروں میں ڈوب جاتا ہے جو ابھی نہیں ملی ہیں۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں کھودنے والے نے کوئی ایسی عمیق اندھی کھائی کھود دی ہے جو کسی طرح بھرنے کو آتی ہی نہیں۔ اور کے بعد اور کا مطالبہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پوری شدت کے ساتھ زندگی بھر اس پر مسلط رہتا ہے۔ پھر اس مطالبہ کا رُخ، اگر ایک ہی قسم کی کسی چیز کی طرف ہوتا تو غنیمت تھا۔ اس دوسری آیت میں یہ فرما کر کہ ایک دو چیزوں ہی کی حد تک اس کا یہ مطالبہ محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ چیز جس پر انسانی فطرت کے لحاظ سے الخیر کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو بھلی معلوم ہو" الخیر" کی ان تمام قسموں کے ساتھ آدمی کی فطرت کا ھلوعی تعلق ہے اور ان کی چاہ میں وہ شدید یعنی انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ الخیر کے چند امتیازی افراد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ قرآن ہی میں دوسری جگہ بایں الفاظ کیا گیا ہے۔ جس کا کسی دوسری جگہ بھی ذکر آچکا ہے۔ یعنی

زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر — آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کیلئے خواہشیں عورتوں کی ذریعہ اولاد (یعنی) بیٹوں کی۔ اور سونے چاندی

المقنطرة من الذهب و — کے ڈھیر کے ڈھیر، اور گھوڑے، نشان
الفضة والخیل المسومة و — زدہ، خوبصورت اور مویشیاں اور
الانعام والحرث۔[1] — کھیتی۔

چھوٹے ہوں یا بڑے، مشرقی ہوں یا مغربی، عہدِ قدیم کے تاریک قرون والے ہوں یا بجلی کے روشن دنوں میں زندگی گذارنے والے، ان تمام چیزوں کی ھلوعیت اور حبِّ شدید ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔

اور یہی اسلام کے معاشی نظام کی میرے خیال میں پہلی بنیاد۔ لیکن یہ تو معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی نوعِ انسانی کی فطری خصوصیات کے متعلق قرآن کے اشارے تھے، جن سے آدمی کی اس جدوجہد کا متأثر ہونا ناگزیر ہے۔ جسے حصولِ رزق اور کسبِ معیشت کی راہوں میں وہ اختیار کرتا ہے۔

**معاشی ذخیرے کی نوعیت** — مگر اب سوال استفادہ کرنے والے سے نہیں، بلکہ جن پیداواروں سے اپنی اس جدوجہد میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہم یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں، کہ

---

[1] جیسا کہ عرض کیا گیا، آدمی الخیر کا والہ و دیوانہ ہے۔ اسی الخیر کی چند اساسی افراد کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے بھی یہی تھا، اب بھی یہی ہے۔ تبدیلیاں اگر ہوتی چلی آئی ہیں تو ان چیزوں کے قالبوں میں، مثلاً پہلے آدمی اگر اچھے اچھے خوبصورت، اصیل ہنہنانے والے گھوڑوں کا شیدائی تھا تو اب ان کی جگہ حسین و دیدہ زیب موٹروں، سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کا دیوانہ ہے۔ نہ ہونے کی اور بات ہے، ورنہ آج بھی مقدرت والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ موٹروں پر موٹریں خریدتے چلے جاتے ہیں بلکہ کارخانے والے ہر سال موٹروں کی تقطیع اور ہیئت، رنگ وغیرہ کو جو بدلتے ہیں، ان کا بھروسہ در حقیقت ہوتا تو ہے آدمی کی اسی فطری ھلوعیت ہی پر، لیکن عقل شاید یہ مشورہ دے کہ جب موٹر موجود ہی ہے تو دوسری موٹر کے خریدنے کی کیا حاجت ہے۔ اسی عقلی مطالبہ کو رد کرنے کیلئے شکل وصورت کی جدت کو جواب کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں ھلوعیت کیلئے اتنی بات، جو خریداری کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ سواری کے سوا اور جن ھلوعی تعلقات کا قرآن میں ذکر ہے۔ ان میں تو شاید قالب کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو پرانے بادشاہوں کے ان واقعات پر تعجب ہوتا ہے، کہ ایک ایک آدمی اپنے محل میں چار چار سو پانچ پانچ سو عورتیں رکھتا تھا۔ لیکن جب سے قاعدہ تمدن نے جمہوری حکومتوں کے ہر باشندے کو مشرقی بادشاہوں کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ اس وقت سے مغرب کے ان جدید بادشاہوں نے نسائی ھلوعیت کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کے سامنے تو ان پرانے شخصی بادشاہوں کے کارنامے بھی گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ان پیداواروں کی واقعی نوعیت کیا ہے، قرآن میں اس کے متعلق جو علم عطا کیا گیا ہے۔ اسی کو اب پیش کروں گا اور یہی وہ دوسری بنیاد ہے جس پر اسلام کا معاشی نظام میرے خیال میں مبنی ہے۔

کچھ دیر پہلے قرآن ہی کے حوالے سے بھی یہ بات گذر چکی ہے۔ اور یہی مشاہدہ بھی ہے، کہ قدرتی پیداواروں پر قبضہ کر کر کے بعض لوگ۔ تو ہم میں مادی حیثیت سے بسطی حالت میں ہیں اور بعض قدری زندگی میں مبتلا ہیں۔ لیکن بسط و قدر کی یہ حالت تو افراد کے حساب سے ہے مگر اسی سوال کو اگر اس طریقہ سے اٹھایا جائے۔ یعنی پوچھا جائے کہ ان قدرتی پیداواروں کی نوعیت افراد انسانی کی مجموعی حیثیت کی نسبت سے کیا ہے؟ تو قرآن کی مشہور آیت

| | |
|---|---|
| او بسط اللہ الرزق لعبادہٖ | اگر کھول دے اللہ روزی کو اپنے بندوں |
| لبغوا فی الارض | کیلئے تو بغاوت اختیار کرلیں گے زمین پر! |

کا جو مفہوم ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان پیداواروں کو جس پیمانہ پر قدرت پیدا کر رہی ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ ایسا پیمانہ ہے جس سے بحیثیت مجموعی العباد (یعنی خدا کے بندے) بسط کی حالت میں نہیں آسکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں، کہ ہم میں ہر ایک شخص اگر یہ چاہے کہ موجودہ زندگی میں ایسی آمدنی پر اسے اقتدار حاصل ہو کہ خرچ کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے پاس کچھ پس ماندہ بھی رہ جائے؟ تو مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کم از کم حیات کے جس دور سے آدمی اس وقت گذر رہا ہے۔ اس میں تو اس کا امکان نہیں ہے۔ معاشی پیداواروں کو جو پیدا کر رہا ہے۔ قصداً وارادۃً اس نے یہی چاہا کہ اس قسم کا بسط نہ پیدا ہو۔ ایسا کیوں چاہا گیا۔ گو اس کا مطلب اسی آیت میں مذکور ہے۔ لیکن اس وقت میری بحث کے دائرے سے یہ مسئلہ خارج ہے کہ اس وقت تو صرف مجموعی حیثیت سے معاشی پیداواروں کے متعلق اس پیمانہ کو صرف دریافت کرنا ہے۔ جس پیمانہ پر یہ چیزیں اس دُنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیت سے اس پیمانے کی یہ تو سلبی صفت معلوم ہوئی۔ یعنی مجموعی طور پر بسط کی حالت ان سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

| | |
|---|---|
| ولکن ینزل بقدر | لیکن نازل کرتے ہیں ہم اس رزق کو، |
| ما یشاء! | اس پیمانے پر جس پر چاہتے ہیں! |

گو سلبی صفت کے بعد پیدائش کے اسی پیمانہ کی یہ ایک ایجابی و اثباتی صفت کی طرف اشارہ

ہے یعنی قدرت کے نزدیک کوئی خاص پیمانہ مقرر ہے۔ اسی مقررہ پیمانہ کے مطابق پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ الرزق یعنی معاشی پیداواروں کے متعلق بظاہر کبھی، جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب پیدا ہوئیں، اور کسی سال محسوس ہوتا ہے کہ پیدائش میں کمی ہوئی اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی پیدائش کا کوئی قانون نہیں ہے، گویا "الل ٹپ" طور پر کام چل رہا ہے۔ یہ نتیجہ قطعاً غلط ہے، بلکہ پیدا کرنے والے کے سامنے کوئی خاص پیمانہ ہے۔ اور تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے وہ اسی مقررہ پیمانے پر ان کو پیدا کرتے ہوئے چلا آرہا ہے۔ باقی یہ سوال، کہ قدرت کے اس مقررہ چاہے ہوئے پیمانے کی نوعیت کیا ہے؟ اس منفی صفت کے سوا۔ یعنی مجموعی حیثیت سے بسط کی حالت کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی۔ سورۂ الحجر میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

| | |
|---|---|
| وان من شیئ الا عندنا | نہیں ہے کوئی چیز، مگر اس کے خزانے ہمارے |
| خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر | پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے ہیں ہم |
| معلوم! | ان کو لیکن ایک مقررہ معلوم پیمانے پر |

جس میں گویا اسی مضمون کا اعادہ فرمایا گیا ہے، جو

| | |
|---|---|
| ولکن ننزلہ بقدر | مگر ہم نازل کرتے رہتے ہیں اس کو اسی |
| ما یشاء | پیمانے پر، جس پر ہم چاہتے ہیں! |

کا مفاد ہے۔ یعنی وہی بات کہ پیدائش کا پیمانہ جانا بوجھا۔ مقرر کیا ہوا ہے بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ جو الفاظ ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وجعلنا لکم فیہا معائش | اور زمین میں ہم نے تمہارے جینے کا سامان |
| ومن لستم لہ برازقین! | کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں کے جینے کا بھی، |
| | جن کو روزی پہنچانے والے تم نہیں ہو! |

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اسی "مقررہ" اور "معلومہ پیمانے" کی ایک مزید ایجابی صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "معائش" کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ ان ہی ذرائع اور وسائل کی تعبیر ہے۔ جن کے بل بوتے پر موجودہ زندگی گذر رہی ہے۔ گویا معائش "الرزق" ہی کی دوسری قرآنی تعبیر ہے۔ حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ صرف جاندار چیزوں کے لئے یعنی بنی نوع انسان ہی کے لئے، بلکہ ان کے لئے بھی جن کی روزی کا متکفل انسان نہیں ہے

سب ہی کے لئے ہے، ایسے پیمانے پر یہاں چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جن سے آدمی کی بھی زندگی گذر رہی ہے اور جو آدمی کے زیرِ پرورش نہیں ہیں اُن کی بھی! اور یہی معاشی پیداواروں کے معلوم و مقررہ پیمانے کی میرے نزدیک دوسری ایجابی صفت ہے جس کا سراغ قرآن سے ملتا ہے۔

اب خلاصہ یہ نکلا کہ جن معاشی پیداواروں سے آدمی استفادہ کر رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان میں بسط کی کیفیت کو قصداً و عمداً قدرت چاہتی ہے کہ نہ پیدا ہو، لیکن بایں ہمہ ایک ایسے مقررہ و معلوم پیمانہ پر ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے کہ آدمی اور جو آدمی کے زیرِ پرورش نہیں ہیں، ہر ایک کے لئے معائش (یعنی وہ وسائل جن پر زندگی موقوف ہے) مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اس پیمانے کی ایجابی صفت ہے، ایسی صفت کہ خشکی و تری، بحر و بر جہاں کہیں بھی جو جی رہا ہے۔ اس کے لئے اسی کے مطابق روزی یا معائش مہیا ہو رہے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے جب تک "معائش" اور "رزق" کے یہ ذرائع اُس کے لئے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال جن معاشی ذخیروں اور پیداواروں پر اس خاکدانِ ارضی کی زندگی گذر رہی ہے، قرآن سے ان کے سلبی و ایجابی صفات جو معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تو یہی ہیں۔ باقی عہدِ حاضر کی عدو بافیوں، عقل لافیوں کے بھروسہ پر جو نتائج پیدا کئے جا رہے ہیں۔ شہروں شہروں، دیہاتوں دیہاتوں کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت، ایک ایک بچّہ کی خوراک، ان کے لباس — ان کی دیگر ضروریاتِ حیات کے تختے بنا بنا کر روئے زمین کے کھیتوں، کارخانوں، فیکٹریوں کی پیداواروں سے مقابلہ کر کر کے کبھی رجائی، اور کبھی قنوطی خیالات کو اپنے اوپر لوگ جو مسلط کر رہے ہیں۔ پھر کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ اپنے ان استخراجی نتائج پر اتنا بھروسہ لوگوں کو کیسے پیدا ہو جاتا ہے کہ ان ہی نتائج سے متاثر ہو ہو کر مصنوعی طور پر نہیں، بلکہ واقع میں یہ رو بھی دیتے ہیں اور ہنس بھی سکتے ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ وثوق و اعتماد میں نتائج ہمیشہ ان مقدمات کے تابع ہوتے ہیں، جن کو مرتب کر کے نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ دقیقہ سنجیوں کی انتہائی کوششوں سے کامل احتیاط کو کام میں لاتے ہوئے بھی آدمی جن مقدمات سے اس مہم میں نتیجے حاصل کر رہا ہے، یا کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسی عالمِ محسوس یا عالمِ شہادت ہی کے معلومات ہو سکتے ہیں، لیکن قرآن میں "الغیب" کی پانچ کنجیوں (مفاتیح) کا ذکر ان الفاظ میں جو کیا گیا ہے۔

**غیب کی پانچ کنجیاں**

وعندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم مافی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت!

اور خدا ہی کے سامنے ہیں، الساعت (آخری گھڑی) کا علم، اور وہی برساتا ہے بارش کو، اور جانتا ہے جو کچھ ہوتا ہے ارحام (ماؤں کی بچہ دانیوں میں) اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ کس سرزمین میں مرے گا!

ان پانچ کنجیوں میں سے اوروں کو جانے دیجئے۔ صرف ایک بات جس کا ہمارے "معائش" یا "الرزق" سے بہت زیادہ قریب کا تعلق ہے۔ یعنی "الغیث" (بارش) جو ہر سال تقریباً دُنیا کے عام حصّوں میں برستی رہتی ہے۔ اور مہینوں برستی ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے اس کے برسنے کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن گذرنے والے سال کے بعد آنے والے سال کے متعلق یہ بات کہ کب کب، کہاں کہاں، کتنی کتنی مقدار میں برسے گی؟ کیا غریب انسان ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب اپنے پاس رکھتا ہے؟ حالانکہ ہمارے "رزقی نظام" کا زیادہ تر دار ومدار اسی "بارش" کے مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی کے علم سے آدمی جب جاہل ہے تو جہل سے جو علمی نتائج پیدا کئے گئے ہیں، کیا واقعی وہ علمی نتائج کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں، خیر ہمیں دوسروں سے کیا بحث، کیا کروں لاکھ چاہتا ہوں کہ صرف اپنی ہی کہوں۔ قرآن میں جو کچھ ہے، پیغمبر اسلام کے اقوال میں جو کچھ پایا جاتا ہے۔ اسی کو پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلوں، لیکن درمیان میں بعض باتوں کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ اسی لئے آجاتا ہے کہ قرآن ہی میں ان خیالات کے متعلق کچھ اشارے ملتے ہیں جی نہیں مانتا کہ اسے یوں ہی چھوڑ دوں۔

**ضمانتِ رزق کا مطلب**

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ جن معاشی پیداواروں پر آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی گذار رہا ہے۔ قرآن سے ان کی سلبی صفت تو یہ معلوم ہوتی ہے، کہ مجموعی حیثیت سے بسط کی کیفیت ان سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ پیدا کرنے والے کی یہی مشیت اور یہی اس کا طے شدہ ارادہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ باوجود اس طے شدہ ارادے کے، یہ بھی قطعی ہے کہ اتنا بہر حال پیدا ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا جس سے آدمیوں اور آدمی کے سوا دوسرے زندگی گذارنے والوں کو "معائش" فراہم ہوتے رہیں گے اور اس وقت تک فراہم ہوتے رہیں گے۔ جب تک قدرت انہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے یہی

مطلب ہے ضمانتِ رزق کی ان مشہور آیتوں کا یعنی

| | |
|---|---|
| ومامن دابۃ الا علی اللہ رزقھا یعلم مستقرھا و مستودعھا! | اور نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر مگر اسکی معاش کی ذمہ داری خدا پر ہے، جانتا ہے اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سونپا جائے گا اس کو بھی! |

یا دوسری جگہ ارشاد ہے :-

| | |
|---|---|
| وکا ئن من دابۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقکم وایاکم وھو السمیع العلیم۔ | اور کتنے چلنے پھرنے والے ہیں کہ نہیں لادتے پھرتے ہیں اپنی روزی کو، اللہ ہی معاش پہنچاتا ہے، ان کو بھی اور تم کو بھی، وہی سننے والا ہے اور وہی جاننے والا! |

آل اولاد کے بارے اپنے آپ کو ہلکا رکھنے کے لئے جاہلیت میں "عزل" (یعنی ضبطِ تولید) بلکہ قتلِ اولاد بھی ایک بڑا معاشی حل باور کیا جاتا تھا۔ قرآن نے قتلِ اولاد کے اس سفاکانہ فعل سے روکتے ہوئے اسی کا اعلان کیا تھا۔ یعنی

| | |
|---|---|
| ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقکم وایاھم | اور نہ مار کرو اپنی اولاد کو محتاجی کے ڈر سے، ہم ہی تمہیں روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔ |

بکثرت حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قرآنی حقیقت کا اظہار مختلف الفاظ میں فرمایا ہے حدیث کی کتابوں میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ حاصل سب کا وہی ہے کہ خزائن اللہ یا چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی موازنہ (بجٹ) میں اتنی گنجائش قطعاً رکھی جاتی ہے۔ جس کی بدولت جینے کی مقررہ مدت ہر جینے والے کی پوری ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ خدا کے انکار سے جن کے دماغ ماؤف ہیں، ان عقلی سودائیوں سے تو بحث نہیں، لیکن واقع میں عالم کے اس جیتے جاگتے نظام کو لامحدود قدرت والی قدرت جو چلا رہی ہے۔ سوچنے والے اس کے متعلق اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں۔ باوجود عدم گنجائش کے لوگروں تک کا تقرر ظاہر ہے کہ دیوانوں کے سوا جب معمولی ہوش وحواس رکھنے والا آدمی بھی نہیں کر سکتا تو اسی فعل کے انتساب کی جرات العیاذ باللہ خدائے حی وقیوم، دانا وبینا، توانا کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔

بہرحال اپنی موجودہ زندگی میں آدمی جن معاشی پیداواروں سے مستفید ہو رہا ہے، ان

پیداواروں کی پیدائش کا صحیح اور قدرتی پیمانہ کیا ہے۔ ایک تو یہ بات، اور خود استفادہ کرنے والے یعنی بنی آدم کے وہ فطری خصوصیات جن سے ان کی معاشی جدوجہد، یا حصولِ رزق اور کسب معیشت کی کوششیں مستفید ہو رہی ہیں۔ میرے نزدیک "انسانی معاشیات" کی یہی وہ اساسی بنیادیں ہیں، جن کا قرآن میں سراغ ملتا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آدمی اپنی معاشی زندگی میں جن حالات سے زمین کے اس کرہ پر دوچار ہے، اگر غور کیا جائے تو تحلیل و تجزیہ کے بعد ہر سوچنے والے کو نظر آئے گا کہ ان ہی دو بنیادی حقائق کے یہ قدرتی نتائج ہیں۔ بات اگرچہ طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اختصار سے اگر کام لیتا ہوں، تو جو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں، اندیشہ ہے اکثر کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ استفادہ کرنے والے، یعنی انسان اور جس سے استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے، یعنی کائنات کی قدرتی پیداواریں، ان کے جن خصوصیات و صفات کو قرآن سے انتخاب کر کے آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع نظر کر لیا جائے اس کے بعد سوچا جائے کہ صورتِ حال کیا وہی رہتی، جو اس وقت ہے؟ بآسانی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حصولِ رزق یا فراہمیٔ معاش کے وہی ذرائع اگر آدمی کو بھی میسر آ جاتے جو اس کے سوا زندگی گذارنے والی دوسری ہستیوں کو زمین کے اسی کرہ پر قدرتی طور پر حاصل ہیں۔ یعنی اسباب و ذرائع جن کے بل بوتے پر ان میں سے تقریباً ہر ایک، ایک قسم کی خود اکتفائی زندگی سے بہرہ یاب ہے۔ اگر آدمی میں بھی یہی باتیں پائی جاتیں، تو یہ بے چارا ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ابنائے جنس کی بے شمار افراد کی رعایتوں کا جو آج دست نگر ہے۔ کیا یہ حال اس کا اس وقت بھی باقی رہ سکتا تھا؟ یا ان ذرائع سے محروم ہونے کے باوجود بھی اگر یہی ہوتا کہ جیسے سب اپنی اپنی ضرورتوں کی ایک خاص مقدار کے حاصل ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سیری کی اس کیفیت سے انسان کی فطرت بھی سرفراز ہوتی۔ لیکن ایک طرف تو بے سروسامانی و بے نوائی کے ان حالات میں وہ پیدا کیا جاتا ہے، جن کی طرف میرے خیال میں قرآن نے مطلوق ضعف ضعف سابق و لاحق کے ذریعہ اشارہ کیا ہے۔ اور دوسری طرف ماں کے پیٹ سے ہر وہ شخص جو آدمی بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ الخیر کے حب شدید، اور ہلوعیت کے اس اندھے کنوئیں ۔ ۔ ۔ کو اپنے ساتھ لاتا ہے جسے جتنا زیادہ بھرا جاتا ہے، اسی قدر وہ اور خالی ہو جاتا ہے پھر یہی عارضہ جب آدمی کی فطرت کو لگا ہی دیا گیا تھا، تو ھل من مزید کے اس جہنم

مطالبہ کی تکمیل ہی کا کوئی سامان یہاں کیا جاتا، لیکن قرآن نے یہ اعلان کرکے، کہ جس پیمانہ پر قدرت یہاں "معائش" کے ذخیروں کو پیدا کر رہی ہے، "قصداً و ارادۃً" ان کو ایسے حال میں رکھا گیا ہے اور ہمیشہ رکھا جائے گا۔ جس پر فراخی اور بسط کا نتیجہ مجموعی حیثیت سے کبھی مرتب نہیں ہو سکتا۔ جس کے یہی معنی ہیں کہ موجودہ زندگی کے متعلق یہ امکان بھی ختم ہو گیا، کہ آج نہیں تو شاید کل کسی زمانے میں ہی پیاسے کو اپنی پیاس کے مطابق یہاں پانی میسر آجائے گا۔ حالانکہ بالفرض "کل" اگر اس کا کوئی "حل" ہماری آئندہ نسلوں کے سامنے آ بھی جائے تو اس سے ہم آج کے گذرنے والوں کی مشکلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟

اور خیر، یہ سب کچھ اگر ہوا تھا تو کم از کم اس کے ساتھ یہی کر دیا جاتا کہ جیسے آدمی کے سوا تمام دوسرے حیوانی انواع و اصناف کے افراد میں مدارج و مراتب کا فرق نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ نوعِ انسانی کے افراد بھی ایک ہی حال پر پیدا کئے جاتے۔ لیکن رجحانات و میلانات یا قدرتی صلاحیتوں و مناسبتوں کے شدید اختلاف کی بدولت کمالات و صفات کے اعتبار سے انسانی افراد میں جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے۔ اور کمالاتی و صفاتی تفاوت کا یہی اٹل قدرتی قانون مدارج و مراتب کے نشیب و فراز کے تماشے کو بسا اوقات ایک ہی ماں باپ کے دو بچوں میں ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں، بلکہ ہر خاندان میں جو پیش کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشی پیچیدگیوں کے درد و کرب کے سمند کے لئے مستقل تازیانہ کی شکل تماشے کی یہ نوعیت بھی اختیار کئے ہوئے ہے، یہی آدمی ہے۔ سینکڑوں کمالات و صفات ایسے ہیں، جن سے یہ محروم ہے۔ مثلاً اڑنے ہی کے ایک کمال کو لیجئے۔ مچھر اور مکھیاں بھی اس کمال سے سرفراز ہیں۔ لیکن چونکہ یہ دوسری نسلوں یا انواع کے افراد کا کمال ہے۔ اس کمال سے محرومی کا گلہ کسی آدمی میں نہیں پایا جاتا لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ باوجود انسان ہونے کے اپنے ایک بھائی کو آدمی جب بلندیوں پر پاتا ہے تو قدرتی طور پر اپنی پستیوں کا احساس کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھنے لگتا ہے، بلکہ عموماً جس سے جتنا زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے، اسی کی بلندی، پستی میں رہنے والوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ بنی ہوئی ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان اور انسانی افراد کو جس نے پیدا کیا ہے، ان ہی حالات میں پیدا کیا ہے، اور بہرحال آدمی ان ہی حالات میں پیدا ہو چکا ہے۔ بس اب سوال یہ ہے کہ مشکلات کے ان شکنجوں سے جو خود نکلنا چاہتے ہیں یا دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے صحیح راہِ عمل کیا ہو سکتی ہے؟ کیا قدرت کے ان قوانین سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے؟ کہتے تو سب یہی ہیں کہ قدرتی

قوانین سے جنگ کا انجام شکست و ہزیمت کے سوا پہلے کچھ نکلا ہے، نہ آئندہ نکل سکتا ہے۔ زندگی کا ہر تجربہ اسی کی تعلیم دیتا ہے، قدم قدم پر اسی کی شہادت آئے دن آدمی کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے تو سر دست مجھے بحث نہیں، پر معاشی مشکلات سے نجات کی راہوں میں یہ عجیب بات ہے کہ کہنے کی حد تک تو کہنے والے جو کچھ بھی کہتے ہوں، لیکن کرنے والوں نے جب کبھی کچھ کرنا چاہا ہے، تو کہا جا سکتا ہے کہ قدرت کے ان قوانین سے وہ جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ تفصیل کا موقع تو نہیں ہے، اور جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آ رہا ہوں دوسروں کے عمل سے اپنے اس مضمون میں مجھے بحث بھی نہیں!

**بعض مذاہب کے معاشی نظریئے**

لیکن مثالاً چند چیزوں کے ذکر سے رُکا بھی نہیں جاتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ مذہب یا فلسفہ کے نام سے مختلف قرون وادوار میں بعضوں کی طرف سے جو اس قسم کی مہمیں جاری ہوئیں، جن کا حاصل یہ تھا کہ آرزوؤں اور تمناؤں سے اپنے قلب کو خالی کر لینا انسانیت کی سب سے بڑی سعادت ہے۔

مہاتما بدھ کی جانب منسوب کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کو مدعاؤں سے خالی کر لینا یہی نروان کا سب سے بڑا مقدس نصب العین ہے۔ یا یونان کے کلبی اسکول کے فلاسفہ

آں چہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

کا پرچار علمی و عملی مثالوں سے جو کرتے پھرتے تھے، اس عہد کے سب سے بڑے بادشاہ کے آگے اسی مکتبِ خیال کے امام الائمہ دیوجانس نے "مانگ کیا مانگتا ہے؟" کے شاہی فرمان کے جواب میں "دھوپ چھوڑ دیجئے، اس کے سوا ہمارا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں ہے"۔ اسی کے متعلق اسی قسم کے اور لطائف، جو تاریخوں میں ملتے ہیں، یا ان ہی کی دوسری تعبیروں کا نام رہبانیت یا جوگیت وغیرہ مختلف زبانوں میں جو رکھا گیا، تو ان ساری باتوں کی تہ میں کیا تھا؟ یقیناً ہلوعیت کے اسی اندھے کنوئیں کے مطالبوں سے پریشان ہو کر سوچنے والوں نے یہ تدبیریں سوچی تھیں، کہ جو کنواں بھر نہیں سکتا، پھر اس کے منہ ہی کو کیوں نہ بند کر دیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، لامدعائیت کا یہ سارا فلسفہ گویا ایک ڈاٹ تھی، جسے انسانی فطرت کے اس دہانے پر چاہا گیا تھا کہ کسی ترکیب سے کس دیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ قدرت ہی سے مقابلہ کی ایک شکل تھی، جبراً قہراً غیر فطری دباؤ سے کام لے کر اس ڈاٹ کو دبانے میں ممکن ہے کچھ لوگ، کچھ دن کے لئے بظاہر کامیاب ہوئے ہوں، لیکن واقعات شاہد ہیں کہ معمولی سی غفلت کے بعد ہی، جیسے

بوتل سے کاگ اڑ جاتی ہے۔ ہمیشہ یہ ڈاٹ بھی انسان کی فطرت سے نکل کر دور جا پڑی، اوروں کو جانے دیجئے، کلیسا کے زیرِ اثر خود یورپ کے باشندوں کو بھی تو چاہا گیا تھا کہ رہبانیت ہی کے دباؤ کے نیچے دکھا جائے۔ لیکن اسی ملک میں ردِ عمل کا جب دور شروع ہوا تو لا یچی انسان، جرم و آز کے جن شرمناک حالات کے ساتھ اس ملک میں نمایاں ہوا۔ "اِسْن دیدہ" کے لئے تو شنیدہ کی بھی ضرورت نہیں۔ کلیسا کے باغیوں نے کلیسا پر الزام لگایا اور یقیناً یہ الزام بیجا نہ تھا کہ اس نے آدمی کو آدمی نہیں، پتھر فرض کر لیا تھا، کہ آرزوؤں اور تمناؤں سے دست برداری کی توقع پتھروں ہی سے کی جا سکتی ہے۔ ان ہی کے سینے ارمانوں اور خواہشوں سے خالی ہو سکتے ہیں!

### معاشیات انسانی کے بعض تحقیقی نظریے!

لیکن معاشی مشکلات سے نجات کی پھر راہ کیا ہے؟ شاید اسی کا جواب ہے جو رہبانی رجحانات کے مقابلہ میں جیسا کہ سنا جاتا ہے کہ ماجرتن لیکنا، یا حکیم ڈیکارٹ وغیرہ وغیرہ جیسے فلاسفہ نے نظریۂ قوت و افادہ کا علم بلند کیا، قوت والوں کو اپنی اپنی قوتوں میں بے روک ٹوک اضافہ پر اضافہ کرتے چلا جانا چاہیئے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، انسانیت کے قدرتی ضعف کے مقابلے ہی میں کوشش کی یہ تدبیر تجویز کی گئی تھی۔ اسی طرح معاشی پیداواروں کے افادی پہلوؤں پر افادے کے غیر مختتم اضافہ کا مطالبہ شاید ان پیداواروں کی اس محدودیت کا توڑ تھا۔ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کے نتائج جن پر مرتب نہیں ہو رہے ہیں، "گویا" معائش کے جس نظام کو قدرت غیر مبسوط حال میں قصداً و ارادتاً رکھنا چاہتی ہے، چاہا گیا کہ ان کو اس ترکیب سے مبسوط بنا کر چھوڑا جائے؛ لیکن انسانی اجتماعیت کے سامنے ان کے بعد سرمایہ داری کا نظام جس ہیبت اور گھناؤنی شکل میں نمایاں ہوا، قدرتی قوانین سے اسی جنگ کا نتیجہ اسے ٹھیرایا جائے تو واقعات سے اس کی کیا تائید نہیں ہو رہی ہے؟

نظریۂ قوت اور افادہ کے علمبرداروں نے کیا کیا؟ سرمایہ کی قوت رکھنے والوں نے انفرادی محنتوں کو توسیع افادہ کے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجتماعی محنتوں کی شکل میں بدل دیا لیکن اس طور پر بدلا کہ اجتماعی محنتوں کے ان منافع کے واحد اجارہ دار سرمایہ داروں کی انفرادی شخصیتیں باقی رہیں[1]۔ اپنے منافع میں زور کا اضافہ کرنے کے لئے کمزوروں کو زور والوں نے نگلنا

---

[1] اشتراکی معاشیوں نے سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد اسی واقعہ کو بتلایا ہے۔ فریڈرک اینگلز کا قول ہے پیدائش ایک اجتماعی فعل ہو چکا، لیکن مبادلہ اور استعمال بدستور انفرادی ہے (سوشلزم، ترجمہ باری ص ۹۳) اجتماعی پیدائش کے سالمے (باقی بر صفحہ آئندہ)

شروع کیا۔ اور اس بُری طرح نکلنا شروع کیا، کہ وہی آدمی، جسے کلیسا والوں نے پتھر بنانا چاہا تھا، یا تمناؤں سے دستبرداری کے سلسلہ میں جنہیں تلقین کی گئی تھی، کہ کُرتا مانگنے والوں کو پائجامے بھی حوالے کر دو۔ ایک گال کے تھپیڑ کا جو مطالبہ کرے، اُس کے آگے دُوسرا گال بھی بخوشی پیش کر دو، کرائسٹ کی یہی بھیڑیں، بھیڑیے جنگل کے بھیڑیے بن کر رہ گئے۔ جہاں آدمی بستا تھا، وہیں جنگل کا قانون نافذ ہو گیا، اور جو آدم زادہ تھا، طے کر دیا گیا کہ وہ آدم زاد نہیں ہے۔ مگر سچ پر جھوٹ کا لبادہ کب تک پڑا رہتا؟

**اشتراکی نظریہ** آخر انسانیت کے فہم عمومی نے جنگل کے اس قانون کا انکار کیا۔ لیکن قدرتی قانون سے جنگ کا جو ارادہ تھا، وہ اپنے حال پر باقی رہا۔ اس جنگ میں فتح کی تجویزیں پھر سوچی جانے لگیں۔ پہلوں نے انسانی کے قدرتی ضعف، اور معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کے قدرتی قانون سے ٹکر لی تھی۔ پچھلوں نے اس نقطہ سے ہٹ کر مدارج و مراتب کے اس اختلاف کو اپنی حربی کارروائیوں کا نشانہ بنا لیا، جو بنی نوع انسانی کے مختلف افراد کے صفاتی و کمالاتی تفاوت اور ان کی قیمتوں کی باہمی تفاوت کا ناگزیر لازمی نتیجہ تھا۔ قدرتی کمالات و صفات کی قیمتوں کے اس تفاوت کا انکار کیا گیا۔ طے کیا گیا، کہ جن

---

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ منافع انفرادی سرمایہ دار لے رہا ہے۔ بنیادی اختلاف یہی ہے مثلاً۔ لیکن ایسا کیوں ہوا، پیدائش کو کبیر پیمانہ پر اجتماعی محنتوں سے لانے کیلئے سرمایہ دار کی جس کثیر مقدار کی ضرورت تھی۔ نادار بے سرمایہ مزدور اس مقدار کو مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی ساکھ پر سودی قرضہ دینے والے ادارے اس کو سرمایہ دے سکتے ہوں۔ انفرادی طور پر انفرادی محنت سے جو چیزیں پہلے وہ بناتا تھا، کبیر پیمانہ پر پیدا ہونے والی چیزوں کے مقابلہ میں ان کا دام اتنا زیادہ پڑتا تھا کہ بازار میں اس کے انفرادی مصنوعات بک نہیں سکتے تھے۔ ہاتھ سے بُن کر کپڑے بنانے والے اسی بنا پر اپنے کپڑوں کو نہیں بیچ سکتے تھے، جس ارزاں قیمت پر پیمانۂ کبیر کے بنے ہوئے کپڑے بک رہے تھے۔ اور بک رہے ہیں لازماً اس کو سرمایہ دار کا مزدور ہی بن کر روزی حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مزدور مجبور اور سرمایہ دار، جو اپنے سرمایہ کی ساکھ پر سودی قرض کے اداروں سے پیاپے سرمایہ حاصل کر کے پیدائش کے پیمانہ کو جتنا چاہے بڑا بناتا چلا جا سکتا تھا۔ سرمایہ دار تھا اور مزدور مجبور۔ دونوں کی اسی حیثیت نے بالآخر اس نظام کو پیدا کر دیا، جس نے عدم عدالت کے عارضہ میں کرۂ زمین کے ہر معاشرہ کو مبتلا کر دیا۔ حاصل یہی نکلا کہ بالآخر تحلیل اور تجزیہ کے بعد سرمایہ داری کی اس بھیانک بے ہنگم شکل کی انتہا سود خواری کے رواج پر ہوتی ہے۔ اس کو ختم کر دو، معاشرہ اپنی طبعی صحت کی حالت میں معاشی حیثیت سے واپس آ جائے گا۔ ۱۲

جُوتیوں سے بمشکل چند مہینے، ایک اور صرف ایک ہی شخص نفع اٹھا سکتا ہے۔ ان کے بنانے والوں کی محنت کی اُجرت اور ایسی کتابوں کے لکھنے والوں کا معاوضہ، جن سے صدیوں، نسلوں کی نسلیں نفع اٹھاتی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ دونوں میں کوئی فرق کیا جائے۔ آج دانتوں کو کھینچ کھینچ کر باتوں کو بنانے والے خواہ کچھ ہی کہیں، لیکن جنگ کرنے والوں نے جب جنگ کا پروگرام بنایا تھا، تو یقیناً طے کرنے والوں نے یہی طے کیا تھا، کہ

"دماغی اور جسمانی محنت کی اُجرت یکساں ہونی چاہیئے" اصولِ معاشیات ص ۲۲۷

قانون نافذ کیا گیا کہ

"عمالِ حکومت کی اُجرت ایک کاریگر سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے" اصولِ معاشیات ص ۲۲۹

قدرت اور قدرت کے قوانین سے چوٹ کھا کھا کر چوٹ کھانے والے اب کیا کہہ رہے ہیں، یا آئندہ کیا کہیں گے۔ اس وقت مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں ہے۔ لیکن اترنے والے اس جنگ کے لئے جب میدان میں اترے تھے تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ وہ یہی کہتے تھے اور یہی کہلواتے تھے کہ ایک جوڑی جوتی بنانے والا موچی جو کچھ پائے گا، وہی فردوسی کتاب لکھنے والے مصنف کو بھی دی جائے گی۔ لکڑی کے ایک میز بنانے والے بڑھئی کو جو صلہ اس میز بنانے کی محنت کا ملے گا، لکڑی کی وہی میز، جس سے ایک یا بمشکل دو آدمی مستفید ہو سکتے ہیں، یہی صلہ حکومت کے اس وزیرِ اعظم کو بھی دیا جائے گا۔ جس کی ایک ایک سوجھ اور ایک ایک تدبیر سے صدیوں کے لئے حکومت دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

**اشتراکیت اور رہبانیت**

حقیقت تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک ہر وہ شخص جو مُنہ میں زبان رکھتا ہے، اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہے، جو کچھ چاہے کہہ سکتا ہے، جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر فکرِ معقول سے کام لیا جائے تو سمجھا جا سکتا ہے، کہ انہوں نے بالآخر قدرتی قوانین سے جنگ کی اس مہم میں وہی کہا ہے، اور وہی کیا ہے، جو پُرانوں نے کہا اور کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اگلوں نے جیسا چاہا تھا، کہ الخیر کے حُبِّ شدید کا جو جذبہ آدمی میں پایا جاتا ہے۔ یعنی وہی ہلوعیت یا عدمِ سیری کا جو اندھا کنواں انسان کی فطرت میں کھدا ہوا ہے، کوشش کی گئی تھی کہ جب اندر سے وہ بھر نہیں سکتا، تو باہر سے اس میں لامذھائیت اور آنندوں سے دست برداری کی ڈاٹ ٹھونس دی جائے۔ سچ پوچھئے تو پھر پھر کر پچھلوں کی ساری ہنگامہ آرائیوں کی آخری تان اسی پرانی تھیوری پر آکر ٹوٹتی ہے۔ آخر کیا مطلب ہے اس بات کا، کہ جیسے بکریاں، بھیڑے،

چوہے، کوّے اور چیلیں وغیرہ ضروریاتِ زندگی کی ایک خاص مقدار کے مہیا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتی ہیں، اسی طرح جو یہ چاہا جاتا ہے کہ نسلِ انسانی کے ہر فرد کو بھی وہی دیا جائے، جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ ان میں بھی ہر ایک کو ضروریاتِ حیات کی اسی مقدار سے مطمئن ہونے پر بزورِ شمشیر جو مجبور کیا جا رہا ہے، تو دوسرے الفاظ میں اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ جسے دیا جائے، اسی مقدار پر صبر کر کے وہ اپنی ان آرزوؤں سے دست بردار ہو جائے جن کا طوفان ہر اس شخص میں ابلتا اور قطعاً ابلتا رہتا ہے جو انسان بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے، کیا انسانی فطرت کے ساتھ وہی بالجبر تشدد، جسے اگلوں نے روا رکھا تھا، دوسرے الفاظ میں اسی تشدد کو پچھلے بھی نہیں دہرا رہے ہیں۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگلوں کا بالجبر تشدد، جسے اگلوں نے روا رکھا تھا، صرف زبان اور قلم ہی کے تشدد تک محدود تھا۔ لیکن پچھلوں نے تو چھاتیوں پر چڑھ چڑھ کر تلواروں کی دھار سے اپنے اسی غیر فطری فعل میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ صحیح سمجھا جائے یا غلط۔ لیکن دنیا میں آرزوؤں سے دستبرداری کی دعوت دیتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں آئندہ زندگی ہی میں سہی اگلوں نے ان آرزوؤں کی تکمیل کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر دستبرداری کی اس پچھلی کوشش میں تو کوشش کرنے والوں نے اس وعدہ کی مسرت کو بھی، خواہ وہ خیالی ہی مسرت کیوں نہ ہو، اس سے بھی محروم کر دیا۔

اور میری سمجھ میں تو اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ قدرتی قوانین کی جس جنگ نے بالآخر سرمایہ داری کے جہنم میں نسلِ انسانی کو دھکیل دیا تھا، اس میں، اور یہ جنگ، جو اب صفاتی و کمالاتی تفاوت سے پیدا ہونے والے مراتب و مدارج کے اختلاف سے لڑی جا رہی ہے، ان دونوں میں نتیجے کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟

سرمایہ داروں کا تو صرف یہی ظلم تھا کہ سب کو نہیں، بلکہ اولادِ آدم کے صرف ایک حصہ کو غربت کی زندگی گذارنے پر انہوں نے مجبور کر دیا تھا، لیکن جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ سب چونکہ امیر نہیں بن سکتے، اس لئے سب کو غریب بن جانا چاہیے۔ اس اصول کو طے کر کے انہوں نے تو بجائے بعض کے بزورِ شمشیر، سب ہی کو غریب بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں غریب بن کر جینے کا موقعہ آدم کے جن بچوں کو حاصل تھا سرمایہ دشمنی کے اس نظام میں تو ان بدنصیبوں کو جینے کے اس حق سے بھی محروم کر دینے کی آج دھمکیاں جاری

ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ کہیں محروم کرنے کا یہ منحوس کاروبار شروع بھی ہو گیا ہو، اور میدانِ جنگ کا جو نقشہ بنایا گیا ہے اس کا تو یہ لازمی نتیجہ ہے[1]۔

خلاصہ یہ ہے کہ بنانے والے نے برابر برابر کر کے جن انگلیوں کو نہیں بنایا تھا۔ ان ہی غیر یکساں انگشت کو یکساں بنانے کی جبری کوشش جب ان لوگوں کی طرف سے ہو گی جو اُن کے بنانے والے نہیں ہیں۔ تو اس کا قدرتی انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ توڑ مروڑ کر، کھینچ کھانچ کر یکسانی پیدا کرنے میں جس وقت کامیابی ہو گی۔ ٹھیک اسی وقت یہ دیکھا جائے گا، کہ برابر، برابر ہونے کی حد تک تو انگلیاں برابر ہو گئیں۔ لیکن برابر ہونے کے بعد یہ وہ انگلیاں باقی نہ رہیں۔ یعنی وہی انگلیاں، جن کے چھوٹے بڑے ہونے ہی پر ہاتھ کا سارا کام مبنی تھا!

آپ دیکھ رہے ہیں، قدرتی قوانین سے جنگ کی ان تمام کوششوں میں کیسی عجیب بات ہے کہ جس کے لئے یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ یعنی انسانی نسل، وہ انسان ہی باقی نہیں رہتی۔ معاشی مشکلات کے حل کی ان ساری تدبیروں میں یہی جوہری نقص ہے جو ہر حال میں جنگ کے ہر نقشہ کی صورت میں باقی رہتا ہے۔ اور یوں ہی باقی رہے گا۔ جو پھندا بھی کھولا جائیگا

---

[1] مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی احتیاج کے مطابق ہی دینا چاہئے اور ہر شخص سے بقدر استطاعت کام لینا چاہئے (اصول معاشیات ٹاسگ ص ۳۳) یعنی خدمت اور کام کی نوعیت پر نہیں، بلکہ معاوضہ یا اجرت کی بنیاد جب ہر شخص کے ذاتی احتیاج پر رکھی جائے گی۔ اور جس سے جو کام ممکن ہو بقدر استطاعت وہی کام اس سے لینا چاہئے، گویا گھوڑوں سے گھوڑوں کا کام، بیلوں سے بیلوں کا کام لیا جائے اور ہر ایک کو ان کی ضرورت کے مطابق وقت پر دانہ چارہ کے تقسیم کر دینے کا نظم کر دیا جائے۔ قائم کرنے والوں نے اس اصول کو جب قائم کیا تو معاشرہ کے نکمّا افراد کا سوال جب ان کے سامنے پیش ہوا کہ جو بے کئے دھرے کھانا چاہتے ہیں، اور کسی زمانے میں ایسوں کی کمی نہیں رہی ہے، سرمایہ داری کے نظام میں تو ان کو غربت کی قدرتی سزا بھگتنی پڑتی تھی لیکن سرمایہ دشمنی کے عہد میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ جب یہ پوچھا گیا تو اسی اصولِ معاشیات میں اس کا حل یہ لکھا ہے، کہ لا ابالی، اپاہج کاہل الوجود افراد کے متعلق پہلے تو اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ کام کو ممکنہ حد تک خوشگوار، لذیذ بنا کر انہیں سپرد کیا جائے گا۔ اگر اس کا اثر بھی ان پر مرتب نہ ہو تو لکھا ہے کہ ان کو نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ نسل بڑھانے سے ان کو روکا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تدبیروں کے بعد بھی اگر وہ ناقابلِ اصلاح ثابت ہوں تو انہیں چپکے سے بلا تکلیف ختم کر دیا جا سکتا ہے۔ (اصولِ معاشیات ص ۳۹۶ ج ۲، از ڈاکٹر ڈبلیو ٹاسگ پی ایچ ڈی لٹ، پروفیسر ہارورڈ یونیورسٹی، دفتر دار الترجمہ سرکارِ دکن) ۱۲

انسانیت کے حلقوم کے لئے وہی دوسرے نئے پھندوں کی شکل اختیار کرتا چلا جائے گا۔ سلجھانے والے یوں ہی مسلسل نت نئی گتھیوں میں الجھتے چلے جائیں گے، جو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے پیدا کرنے والے سے الجھ کر، قسم ہے اُسی پیدا کرنے والے کی، کہ قطعاً سلجھ نہیں سکتا۔ صدیوں کی تاریخ اسی کی شہادت پیش کر رہی ہے۔ اور اس جنگ کو بدلنے والے جب تک صلح سے نہ بدلیں گے، شہادتوں اور تجربوں کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

| | |
|---|---|
| اعلموا انکم غیر معجزی اللہ | اور جان لو کہ تم خدا کو ہرا نہیں سکتے، نا شکروں |
| وان اللہ مخزی الکافرین! | کو اللہ قطعاً رسوا کرنے والا ہے! |

## صلح کا مطلب

میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ دیکھنے والوں، اور تجربہ کرنیوالوں نے لڑکر جنگ کی تمام شکلوں اور تمام نقشوں، اور ان کے مہیب نتائج، لاینحل عواقب کو جب دیکھ لیا، تجربہ کرلیا، تو کیوں نہیں تصادم اور مقابلہ کی اِس پُرخار وادی کو چھوڑ کر صلح کی اس راہ پر غور کرتے ہیں، جسے اسلام نے زندگی کے کسی خاص شعبہ ہی میں نہیں، بلکہ میرا جہاں تک خیال ہے، ہر اس شعبہ میں اختیار کیا ہے، جس میں قدرتی قوانین سے لڑ لڑ کر دنیا کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ "اسلامی نوامیس" کا ایک یہ بڑا اہم گر ہے جس سے مسلمانوں نے عملاً یوں تو ہمیشہ نفع اٹھایا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس کے سمجھنے کی توفیق شاید چند خاص نفوس ہی کو میسّر آئی ہے۔ مسئلہ کی اہمیت ذرا تفصیل چاہتی ہے۔

## ازالہ یا امالہ

مطلب یہ ہے کہ جن قوانین پر دُنیا اور دُنیا میں رہنے والوں کا نظام قائم ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد، کہ ان کا پیدا کرنے والا، اور ان کو نافذ کرنے والا علم و حکمت کے ساتھ رحم و کرم کا بھی لامحدود سرچشمہ ہے۔ ایک ایسے علام الغیوب ارحم الراحمین کے متعلق کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، کہ اس نے کوئی غلط قانون بنایا۔ ایسا غلط قانون، جس کی وجہ سے اس کے بندے دُکھ درد، رنج وکلفت میں مبتلا ہو گئے؟

مسلمان ہو، یا غیر مسلمان، ہر وہ شخص، جو خدا کو مانتا ہے، یقیناً اس تصور کی ہمت نہیں کر سکتا۔ پھر انسان کے اندر ہو، یا انسان سے باہر، اصطلاحی الفاظ میں چاہیے تو کہیے کہ انفس میں ہو یا آفاق میں، ان چیزوں کا مشاہدہ کیوں ہو رہا ہے؟ جو بری ہیں اور نتائج کے لحاظ سے جن کے مضر ہونے کا فیصلہ عقل نے بھی کیا ہے اور مذہب نے بھی۔ آخر آدمی کے اندر ہی لیجئے۔ بہیمانہ صفات

خود اسی کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں اور ان ہی صفات کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے، جن سے دنیا بھی بیزار ہے اور مذہب نے بھی جن پر لعنتیں کی ہیں، یہ حسد، یہ بغض، یہ بخل، یہ خود غرضی اور اس قسم کے سارے رذائل جو عموماً فطری طور پر لوگوں میں پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہیں، جس نے انسان اور انسان کی فطرت کو پیدا کیا ہے اور یہی حال آفاقی کائنات یا ماوراء انسانی موجودات کے ان پہلوؤں کا ہے جن سے آدمی کو دکھ پہنچ رہا ہے۔

انسانی مجاہدات اور اس کے مساعی پر اگر غور کیا جائے تو ایک بڑے حصہ کا تعلق معلوم ہوگا کہ اندر اور باہر کے ان ہی شرور اور ان ہی بُرائیوں سے ہے جن کی بدولت آدمی کی موجودہ زندگی انتہائی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ان ہی پیچیدگیوں کی حل کی راہوں میں کش مکش کا ایک لامحدود سلسلہ جاری ہے۔ ہمارے علوم و فنون کا ایک بڑا دفتر ان ہی کے مباحث سے مملو اور معمور ہے۔

بات طویل ہو جائے گی، قصہ مختصر یہ ہے کہ عموماً کش مکش کی ان راہوں میں ایک گروہ تو اُن کا ہے جنہوں نے ان شرور اور بُرائیوں کے ازالہ و استیصال کو اپنا نصب العین بنا کر چاہا ہے کہ اسی سے زندگی کی پیچیدگیوں کا حل پیدا کیا جائے، اسی راہ کے وہ مشورے ہیں، جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مثلاً

حسد نہ کرو! بغض نہ کرو۔ خود غرضی سے باز آجاؤ!

اور معاشی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں گذشتہ تدبیروں کا جو ذکر کیا گیا تھا، دراصل اسی کلیہ کا وہ بھی ایک جزئیہ ہے۔ یعنی معاشی پیداواریں، جس پیمانے پر پیدا ہو رہی ہیں۔ اس پیمانہ کی قدرتی خصوصیت (یعنی مجموعی حیثیت سے ان کا غیر مبسوط ہونا) کبھی تو اس خصوصیت کے متعلق ارادہ کیا گیا کہ اس کو ختم کر دیا جائے، یا ان معاشی پیداواروں سے جو مستفید ہو رہا ہے یعنی انسانی فطرت کی ان خصوصیات کا ازالہ کر دیا جائے، جن سے قدرتی جد وجہد کی الجھنوں کا تعلق ہے، بتفصیل عرض کر چکا ہوں کہ تمناؤں سے دستبرداری کا مشورہ، یا صفاتی و کمالاتی تفاوت کی وجہ سے افرادِ انسانی اور ان کی قسمتوں میں مراتب و مدارج کا جو قدرتی اختلاف ہے، چاہا جا رہا ہے کہ اس اختلاف کو مٹا دیا جائے، حاصل دونوں کا وہی ازالہ ہے۔ اخلاقیات (ایتھکس) کی ضخیم ضخیم کتابوں کا دُنیا کی زبانوں میں جو انبار لگا ہوا ہے، خلاصہ سب کا یہی نکلے گا۔ کہ جن

صفات وغرائز کو لے کر آدمی شکم مادر سے پیدا ہوتا ہے، ان میں رذائل کے نام سے جو موسوم کئے گئے ہیں۔ یعنی دہی بخل، حسد، کینہ وغیرہ، ان سب کے ازالہ کی کوشش، یہی انسانی سعادت کی راہ ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور سماج کی الجھنوں کا واحد علاج ازالہ کی ان ہی تدبیروں کو قرار دیا گیا ہے۔ تدبیروں کے طریقے، یہ ممکن ہے کہ مختلف ہوں، لیکن آخری خاتمہ سب کا اسی "قانونِ ازالہ" کے مشورہ پر منتہی ہوتا ہے۔

**اسلام کی راہ** میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دُنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان میں یہ چیز پائی جاتی ہے، یا نہیں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علاج کے جس اصُول کو اب میں پیش کر رہا ہوں، ذاتی حد تک یہ چیز مجھے اسلام ہی میں ملی۔ اسلام کی آسمانی کتاب اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات ہی سے یہ روشنی میں نے حاصل کی ہے۔

اسی مسئلہ پر، کہ آدمی کے باہر ہو یا اندر، یہاں جو کچھ ہے، سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، غلطی ہو یا ظلم، جس کی ذات اس کے شائبہ سے بھی برتر و پاک ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیز قطعاً غلط نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اسی دینی و عقلی مسئلہ کی بنیاد پر آفاق و انفس کی ہر قدرتی صفت کو قدرت کی پیدا کی ہوئی ایک چیز کی حیثیت سے اسلام خیر اور قطعاً صحیح و درست بھی قرار دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ مسلمان جو اسلام کو خدا کا پیغام یقین کرتے ہیں، وہ بھی یہی قرار دادیں اور یہی باور کریں، اور اس لحاظ سے آدمی کے اندر ہو یا باہر، قدرتی کارفرمائیوں کے کسی اثر کے ازالہ کا سوال ہی اسلام میں پیدا نہیں ہوتا خواہ دُنیا نے اس کا کچھ ہی نام رکھا ہو، اور جن الفاظ سے چاہے اسے بدنام کیا ہو۔ رہے وہ نتائج جو ان قدرتی آثار و قوانین سے پیدا ہو ہو کر انسانیت کے لئے تکلیف دہ اور زندگی کو تلخ بناتے ہیں، بجائے ازالہ کے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان آثار و قوانین کے صحیح استعمال کی راہیں پیدا کی جائیں۔ ازالہ کے مقابلہ میں استعمال کی صحیح راہوں کا دریافت کرنا اور ان ہی کے مطابق عمل کرنا اسی کا نام قانونِ امالہ[1] رکھا گیا ہے اور اسی کو میں اسلامی تعلیمات کی ایک بڑی اہم خصوصیت خیال کرتا ہوں۔

---

[1] جیسے ازالہ کے معنی ہیں کسی چیز کو زائل کر دینا۔ اسی طرح امالہ کے معنی ہیں کسی چیز کے رُخ کو پھیر دینا۔ طب میں یہ اصطلاح مروج ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ نزلہ جو آنکھ پر گرنے والا تھا، اس کا امالہ یا ملوں یا دانتوں کی طرف کر دیا گیا۔

یوں کہنے کو تو مسلمانوں نے بھی "اخلاقیات" پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں، اور ان میں
سانی غرائزو صفات کو فضائل و رذائل، اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط وغیرہ اقسام و مدارج میں تقسیم
رکر کے نکتہ نوازیوں کے دریا بہا دیئے گئے ہیں، لیکن اسے جرأت بے جا اگر نہ قرار دیا جائے
رکہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ تر غیر اسلامی مکاتب کے افکار کی بلا وجہ تقلید
رنے اور بزور و جبر اسلامی وثائق و شواہد پر ان کو منطبق کرنے کی لاحاصل، بلکہ ناکام کوشش
کی گئی ہے۔ اخلاقی مسائل جن کا بالکلیہ عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا، انہیں فلسفہ کی بھول بھلیوں
یں کچھ اس طرح گم کر دیا گیا ہے۔ کہ عمل کے لئے مشکل ہی سے ایک عامی آدمی ان کتابوں کی روشنی
یں کسی لائحہ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے ذاتی حد تک میں ان ہی اسلامی مصنفین کا
ہمنوا ہوں، جنہوں نے اخلاقی و منزلی یا (معاشی)، و سیاسی مسائل کے متعلق بغیر کسی جھجک کے
پنے اس فیصلہ کا اعلان فرما دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ان الشریعۃ المصطفویۃ | محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت اور |
| الغراء والملۃ المحمدیۃ | ان کی تابناک ملت نے ان مزدوروں کی تکمیل |
| البیضاء قد قضت الوطر عنہا | کر دی ہے۔ (اسلام کے سوا کسی دوسرے |

فکری مکتب خیال سے ان امور میں مشورہ لینے کی مسلمانوں کو حاجت نہیں)

ان مصنفینِ اسلام کا یہ استغنائی تغافل اگرچہ بہتوں پر گراں گذرا ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال
ہے، یہ قومی یا علمی استکبار نہیں، بلکہ درحقیقت ایک واقعہ ہے۔ آخر استکبار ہی اگر اس کی
بنیاد ہوتی، تو علم ہی کے دوسرے شعبوں میں ان ہی مصنفین نے غیر اسلامی دوائر کی چیزوں کو کیوں
قبول کیا۔ علم کی دنیا میں پچھلوں کے پاس آج اگلوں کا جو موروثی ترکہ ہے، سب جانتے ہیں کہ
ان ہی مصنفینِ اسلام کا وہ صدقہ ہے۔ خیر میں کیا کہنے لگا، بات یہ ہو رہی تھی کہ بجائے ازالہ کے
اس قسم کے تمام مسائل میں اسلام نے امالہ کے قانون پر اپنی بنیاد رکھی ہے، اور یہ اتنی مختصر سیدھی
صاف راہ ہے کہ ازالہ والوں نے جن مسائل کو مجلدات میں بیان کیا ہے۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں
کہ اسلام نے ایک ایک فقرہ میں ان کو ختم کیا ہے۔ یہی اخلاق انسانی کے رذائل کا مسئلہ ہے
صحابہؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے

**تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ**

| | |
|---|---|
| اشداء علی الکفار | کافروں پر وہ سخت ہیں، اور باہم |
| رحماء بینھم | ایک دوسرے پر مہربان! |

چند لفظوں کا ایک مختصر سا جملہ قرآن میں ہے۔ مگر فطرتِ انسانی کی وہ ساری صفات جن کی شدت صلابت سے دنیا چیخ اٹھی ہے۔ غصہ، بغض و عداوت، حسد، الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو دکھ پہنچتا ہے۔ بجائے اس بات کے کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے نفس سے ان رذائل کو مٹانے کی کوشش کریں، یعنی ان کے ازالہ کا حکم دیا جاتا، آپ دیکھ رہے ہیں، کفر کی طرف ان کے رُخ کو پھیر کر شدت کے ان ہی صفات کو اسلام نے کتنا کار آمد اور قیمتی بنا دیا۔ کفر کس چیز کا نام ہے، ان ہی چیزوں کا تو، جنہیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو، اپنی توانائیوں کو، خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات! جن صفات کی سختیوں سے انسانیت جاں بلب تھی، صرف ایک اشارے میں قرآن نے ان ہی کو ذریعہ بنا دیا۔ خس و خاشاک کے اس انبار کی صفائی کا جس قرآن کی اصطلاح میں کفر نام ہے۔ جن سے زحمت ہو رہی تھی، وہی بنی آدم کی خدمت کے وسائل بن گئے، اسی طرح

| | |
|---|---|
| ان الشیطان لکم عدو | قطعاً شیطان تمہارا دشمن ہے، تو تم |
| فاتخذوہ عدوّا | بھی اس کو دشمن بناؤ! |

اللہ اکبر! ایک مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی کتاب میں "عداوت" جیسے رذیلہ کے اقتضار کی تکمیل کا مطالبہ امر کے الفاظ میں کیا جا رہا ہے، "دشمنی کرو" نیکی کے مبلغ مذہب کے منہ پر یہ بات کیسی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرف عداوت اور دشمنی کے رُخ کو پھیر کر یہ حکم دیا گیا ہے جب آدمی اس پر غور کرتا ہے تو نظر آتا ہے کہ بلا شبہ اس مصیبت سے جس کا نام "الشیطان" ہے، انسانیت نجات پا نہیں سکتی تھی۔ اگر عداوت کے اس جذبہ کا تخم آدمی کی فطرت میں نہ بو دیا جاتا۔ بلکہ ایک طرف اگر عداوت کے اس جذبہ کی قیمت اس کے صحیح استعمال سے واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف تمام برائیوں کے آخری سرچشمہ یعنی وہی "الشیطان" کے وجود کی قیمت بھی اسی سے خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے قدرت نے آدم کی اولاد کو درحقیقت "الشیطان" کی شکل میں ارتقار کا ایک زینہ عطا فرمایا ہے کہ اسی کی ٹکر آدمی کو ہر تحتانی درجہ سے اٹھا کر فوقانی مراتب پر پہنچاتی چلی جا رہی ہے۔ آپ دیوار سے ٹکراتے ہیں، تو زمین پر گرتے ہیں، لیکن "الشیطان" سے جو ٹکراتا ہے، کون نہیں جانتا کہ براہ راست وہ رحمتِ حق کی آغوش میں گرتا ہے۔ اور یہی "الشیطان" کا اسلام میں صحیح استعمال ہے اب بجائے ٹکرانے کے جو "الشیطان" سے بغل گیری میں مشغول ہو جائے۔ اور اس کی یہی مشغولیت اس

کے لئے وبالِ جان بنتی چلی جائے، تو آپ ہی بتایئے کہ "الشیطان" کو غلط طور پر استعمال کرنے والوں کا یہ قصور ہے یا الشیطان کے پیدا کرنے والے پر اس کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اسلام کے مشہور شیرازی حکیم نے اماکہ کی اسی عجیب و غریب اسلامی قانون کی تلخیص اپنے ان دو مصرعوں میں کتنی بلاغت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن　　نہ گفتم کہ دیوار مسجد بہ کن

سعدیؒ

دینے والے نے بے شک آپ کو تیشہ دیا تھا اور اس لئے دیا تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے اس سے لکڑی پھاڑتا۔ لیکن بجائے لکڑی کے مسجد کی دیوار جو اس تیشہ سے آپ کھودنے لگے۔ تو اس الزام کا ملزم کیا تیشہ دینے والے کو ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ کسی طوفانی سیلاب کے مقابلہ میں اس قسم کی تدبیریں کہ آبادی کو چاروں طرف سے سنگ بست کر دیا جائے، یا یہ نہیں بلکہ تلاش کر کر کے ان سرچشموں ہی میں ڈاٹیں لگانے کی کوشش کی جائے جن سے ابل ابل کر پانی آرہا ہے اور تباہی و بربادی کی دھمکیاں آبادیوں کو دے رہا ہے، کہنے کی حد تک تو یہ بھی تدبیریں ہیں اور بڑی محنت طلب، مشقت خواہ، پُر مصارف تدبیریں ہیں۔

لیکن ان دونوں گردہوں سے ہٹ کر جو آگے بڑھ گیا۔ اور کسی بلندی پر چڑھ کر کوئی بنجر میدان جو اسے نظر آیا، پھاوڑا لے کر ہلکی سی ایک راہ پانی کے لئے اسی خشک، غیر آباد بنجر میدان کی طرف اس نے پھیر دی، جس کے بعد راہ پاکر خود بخود سیلاب کا یہ پانی غراتے بھرّاتا ہوا اسی میدان کی طرف چل پڑا۔ خود ہی انصاف کیجئے۔ کہ سیلابی طوفان سے مقابلہ کرنے والوں کے ان تینوں طبقوں میں نتیجہ کے لحاظ سے کس کی کامیابی کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والوں نے سنگین سے سنگین دیواروں کو سیلاب کے تھپیڑوں سے پاش پاش ہوتے ہوئے جب دیکھا ہے اور آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، یا اُبلنے والے پانی کے دہانوں پر جو ڈاٹیں کسی گئی ہیں، پانی کے زور سے ان کے اڑنے اور الگ ہو جانے کا جب روزمرہ تماشا دیکھا جاتا ہے تو اسی سے پہلے دو طبقوں کی کامیابی و ناکامی کے یقین کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اُجڑے بنجر میدانوں کے جگر کو پانی سے سیراب ہونے کا موقعہ جس نے دیا ہے، جو پانی غلط راہ پر جا رہا تھا۔ اس کی روانی کو غیر فطری طور پر روکنے کی جگہ صحیح راہ پر جس نے اس پانی کو لگا دیا ہے، یقیناً یہی وہ آدمی ہے، جس نے ضائع ہو جانے والے پانی کو بھی بربادی سے بچا لیا۔ اور یہی نہیں، بلکہ پانی کے بغیر زمین کا جو حصہ

ریگستان ریٹر میدان بنا ہوا تھا۔ اس کو بھی باغ و بہار اسی طوفانی پانی کے صحیح استعمال سے اس نے بنا دیا۔ اسی کی کامیابی یقینی ہے، اور اسی کی تدبیر وہ تدبیر ہے جس میں نہ ناکامی کا احتمال ہو اور نہ نقصان کا خطرہ۔ امالہ کے قانون اسی قانون کا نام ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر اس شعبہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ امالہ کے اسی قانون کو اختیار کیا ہے۔ جہاں قدرت کے کسی قانون کے غلط استعمال سے غلط نتائج پیدا ہو رہے تھے۔ اور لوگ استعمال کی تصحیح سے غافل ہو کر بجائے امالہ کے قدرت کے اس قانون ہی کی ازالہ کی فکروں میں اُلجھ گئے، جو درحقیقت قدرت کے قانون سے نہیں، بلکہ خود قدرت ہی سے جنگ کی ایک بے نتیجہ بلکہ خطرناک گستاخانہ شکل تھی اور اب بھی ہے۔

**معاشی راہ میں امالہ کی اسلامی تدبیر**

خیر ازالہ اور امالہ کے قانون کی یہ تو عام تشریح تھی میرا خیال ہے کہ جیسے دُوسرے شعبوں میں اسلام نے ایسے مواقع پر بجائے ازالہ کے امالہ کے قانون سے الجھنوں کو سلجھایا ہے، اسی طرح معاشی راہوں کی ان مشکلات کو، جو قدرتی قوانین ہی کے نتائج ہیں۔ ان کو بھی امالہ ہی کی کارگر تدبیر سے اس نے حاصل کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ جب تک انسان ان ناگزیر حالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور بقول ایک مشہور معاشی فاضل کے

"انسان کو اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لئے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں۔ اور اس کی آرزوؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ قدرت نے اس کی فطرت میں سیری نہیں دی، اس کا ذہن، اس کا دل ہمیشہ، ہر وقت، نئے نئے مقاصد، نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے۔

دمادم آرزوہا آفرینی  نگہ کا رے نہ داری اے دل اے دل

(ص ۵۰، مقصد و منہاج ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ الملیہ)

یعنی مطلب وہی ہے کہ مجموعی حیثیت سے غیر مبسوط کہئے یا محدود پیمانے پر معاشی پیداواروں کے پیدا ہونے کا جو سلسلہ جاری ہے اور قرآن کے حوالہ سے گذر چکا کہ "الحیٰوۃ الدنیا" کی موجودگی میں رہتی دنیا تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ اور جب تک آدم کی اولاد ان فطری خصوصیتوں کو لے کر پیدا ہوتی رہے گی۔ جن کا تفصیل سے قرآن کی روشنی میں ذکر ہو چکا۔ اس وقت تک ہمیں جو کچھ سوچنا ہے ان ہی حالات میں رہ کر سوچنا ہے اور یہ طے کر کے سوچنا ہے کہ جن حالات و کیفیات، عوامل و مؤثرات کی زنجیروں میں ہماری موجودہ زندگی جکڑی ہوئی ہے، ان زنجیروں کی

کسی کڑی کے ازالہ اور جدا کرنے سے ہم قطعاً عاجز و مجبور ہیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مشہور قول میں، یعنی

| | |
|---|---|
| اذا سمعتم بجبل زال عن | جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا |
| مکانه فصدقوه واذا سمعتم | تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو، لیکن جب سنو |
| برجل تغیر عن خلقه فلا | کہ کسی شخص کی جو پیدائشی خصلت ہے، وہ |
| تصدقوا به فانه یصیر الیٰ | بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کیجیو، کیونکہ |
| ما جبل علیه | بالآخر اس کا انجام اسی پر ہوگا جس پر اسکی |
| (رواه احمدؒ) | جبلت پیدا ہوئی ہے۔ |

فرماکر اسی حقیقت کی توثیق فرمائی ہے[1]، اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر امالہ کی جو تدبیریں اس راہ میں میری سمجھ میں آئی ہیں، آپ کے آگے پیش کرتا ہوں۔

گذر چکا کہ معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے، یعنی الانسان کی بعض فطری خصوصیات اور خود ان معاشی پیداواروں کی پیدائش کا وہ محدود پیمانہ یعنی اس کا مجموعی حیثیت سے ہمیشہ غیر مبسوط اور محدود ہونا، ان ہی دونوں باتوں کی باہمی آویزش سے وہ پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں، جن کا نام معاشی پیچیدگیاں ہیں۔ ہم پہلے ذرا ترتیب کے ساتھ معاشی پیچیدگیوں کے ان اسباب کو پھر درج کر دیتے ہیں، جو یہ ہیں

(۱) جسدی طور پر آدمیوں کا دوسروں کے لحاظ سے ضعیف ہونا (خواہ ضعفِ سابق ہو یا لاحق)

(۲) الخیر (یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہے) اس کے حُبّ اور

---

[1] اس قسم کی ایک اور حدیث بھی، ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد سب ہی کے حوالے سے مشکوٰۃ میں یہ روایت منقول ہے جس کا ترجمہ ہے، "کہ آدمی کی پیدائش اس مشتِ خاک سے ہوئی ہے۔ جسے خدا نے ساری زمین سے اٹھایا تھا۔ اسی لئے زمین کی مناسبت سے سُرخ، سپید، کالا اور ان کے درمیان والے رنگ مختلف افراد میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے بعض گرم، بعض سخت، بعض پاکیزہ فطرت اور بعض خبیث نظر آتے ہیں۔" آدمی کی فطرت پر اس سرزمین کی خصوصیتوں کا اثر بھی پڑتا ہے، جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ ایک تجربی شدہ ہے، پہاڑوں میں پیدا ہونے والے پٹھانوں کی سختیاں اور کیچڑ پانی کے درمیان پیدا ہونے والے بنگالیوں کی نرم مزاجیاں اس کی مثالیں ہیں

جاہ میں انسان کا شدید انتہا پسند ہونا، جس کی دُوسری تعبیر قرآن ہی نے ہلوعیت سے بھی کی ہے ایک طرف آدمی کی فطرت میں اس کا ارتکاز اور دُوسری طرف معاشی پیداواروں کی مجموعی حیثیت سے عدم مبسوطیت یا محدودیت۔

(۳) صفاتی اور کمالاتی تفاوت کی وجہ سے افرادِ انسانی کا مدارج ومراتب کے اعتبار سے باہم مختلف ہوجانا۔

بہ تفصیل اس پر بحث ہو چکی ہے کہ معاشی مشکلات کے کلی اسباب یہی ہیں۔ اگر ان حالات سے آدمی دوچار نہ ہوتا تو جیسے زمین پر دُوسرے جینے والوں کے گروہ در گروہ جی رہے ہیں، کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، تناسل وتوالد کے فرائض انجام دے رہے ہیں، ہر قسم کے جھنجھٹوں اور کھٹکوں سے آزاد ہو کر مزے کے ساتھ با امن واطمینان انجام دے رہے ہیں۔ راحت وسرور کی یہی قابلِ رشک زندگی انسان کو بھی میسّر ہوتی۔

پھر ان ہی اُلجھنوں کے سُلجھانے کے لئے ازالہ کی کوششیں مختلف قرون وادوار میں جو کی گئیں، یا اب بھی کرنے والے جو کچھ اس سلسلہ میں کر رہے ہیں، ان کا جو کچھ انجام ہُوا، یا ہو سکتا ہے، اس کی داستان بھی آپ سُن چکے۔

لیکن بجائے ازالہ کے اِمالہ کی جن تدبیروں کا قرآنی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی روشنی میں جو پتہ چلتا ہے۔ اب آیئے اور انہیں بھی دیکھئے۔ بات چونکہ نئی ہے، اس لئے پڑھنے والوں سے فکر وصبر کی اگر میں توقع کروں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔

(۱)

پہلا سبب اس سلسلہ میں ہمارا فطری ضعف (سابق ولاحق) تھا۔ پہلے اسی پر غور کیجئے:۔

آدمی کا جسدی حیثیت سے، جیسا کہ گذر چکا، ضعیف وکمزور ہونا، ایک بدیہی مشاہداتی حقیقت ہے۔ کہنے والے انسان کو جو ضعیف البنیان کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر تو کہتے ہیں۔ بنیانی طور پر کوئی شبہ نہیں کہ خاکدانِ ارضی کی زندگی اور زندگی کی ضروریات رکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ بظاہر ہماری یہی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مقابلہ کر کے اس مفصّل قصّہ سنایا جا چکا ہے۔

لیکن یہ حال تو ہمارے بُنیان (جسمانی بناوٹ) اور ظاہری وجود کا ہے، مگر باہر سے ہٹ

کہ اسی آدمی کی ذرا اندرونی صلاحیتوں پر غور کیجئے، جو باہر سے اتنا ناتوان، بے نوا، بے سر و سامان معلوم ہوتا ہے، کیا اندر سے وہی ہے، جیسا کہ باہر سے سمجھا جاتا ہے؟ جو واقعہ ہے۔ اگرچہ کم و بیش ہر جاننے والا اسے جانتا ہے، لیکن میرے سامنے اس وقت صرف قرآنی اشارات ہیں اس سوال کا جواب بھی قرآن ہی کی راہنمائی میں دینا چاہتا ہوں۔

عجیب بات ہے اسلام کی آسمانی کتاب کا سب سے پہلا حصہ جو دنیا میں نازل ہوا اس حصہ میں بھی اگر غور کیا جائے، تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

غارِ حرا کی پہلی وحی کے اس آخری فقرے، یعنی

علّم الانسان مالم یعلم

(اور سکھائیں خدا نے انسان کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا)

کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی بلا محدود نعمتوں میں سے ان الفاظ کے ذریعہ سے ایک خاص نعمت (علم) کو یاد دلا کر حق تعالیٰ نے بندوں پر اپنا احسان جتلایا ہے۔ ہاں یہ بھی بڑا احسان ہے اور مستحق ہے، کہ محسن اپنے اس احسان کو جتلائے۔ لیکن یہ تو ایک عام بات ہوئی۔ غور کرنے کی چیز تو محل اور مقام کی خصوصیت، نیز وہ الفاظ ہیں، جن سے اس نعمت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔ طول کلامی کے الزام سے پھر ڈر رہا ہوں لیکن جو کہنا چاہتا ہوں، اگر الزام کے ڈر سے اسی کو چھوڑتا چلا جاؤں، تو پھر لکھنے کی اس دردِ سری کے خریدنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ قرآن میں تو سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے، خواہ اسے سمجھا اور سمجھایا جائے یا نہ سمجھا، نہ سمجھایا جائے۔

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ قرآن کا نزول عربی زبان میں شروع ہوا تھا۔ تاکہ عربی جن کی مادری زبان ہے اُن کے لئے بھی، اور جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے، اُن کے لئے بھی، الغرض بنی آدم کے تمام گھرانوں، ہر ملک، ہر قوم کے ہر ہر فرد کے لئے رہتی دنیا تک اس کو آخری پیغام بنایا جائے۔

اس پر کھلا ہوا سوال ہو سکتا تھا اور اسے ہونا ہی چاہئے، کہ عربی جن کی زبان ہے ان کے لئے تو عربی میں اترنے والا یہ پیغام، پیغام بن سکتا ہے۔ لیکن جن بے چاروں کی زبان عربی نہیں ہے، ان کو عربی زبان کا مخاطب بنانا کیا قرینِ انصاف ہو سکتا ہے؟ اسلام کے عمومی پیغام ہونے پر پہلا اعتراض یہی ہو سکتا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اعتراض سے پہلے اسی

کا جواب پہلی وحی کے اس فقرے میں دے دیا گیا ہے۔ توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان، اور غیر انسانی انواع میں یہی تو فرق ہے کہ آدمی کے سوا جاننے والی علم و احساس رکھنے والی جتنی ہستیاں ہیں ان کی یہ خصوصیت ہے کہ سیکھنے سکھانے یا اکتساب و تعلیم کے بغیر شکم مادری سے چند خاص جبلی الہامات کہئے، یا احساسات، یا معلومات، اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ ان میں جو جب تک جیتا ہے، اپنی پوری زندگی ان ہی چند گنے چنے مقررہ الہامات و فطری احساسات ہی کے تحت گذارتا ہے۔ بطے کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے۔ سکھانے والوں سے قطعاً کچھ سیکھے بغیر دیکھا جاتا ہے کہ پانی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تیرنے لگتا ہے۔ شناوری یقیناً ایک علمی کمال ہے۔ جو بط کے بچوں کو بخشنے والے کی طرف سے بخشا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ بط کی ابتدا بھی اسی کمال سے ہوتی ہے۔ اور بوڑھی ہو کر جب کوئی بط مرتی ہے، تو اس وہبی کمال کے سوا اس کی پوری زندگی میں کسی اکتسابی کمال کا قطعاً بال برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور بط تو ایک مثال ہے، ماوراء انسانی جانداروں اور علم و احساس رکھنے والے حیوانوں میں سب کا، ہر ایک کا یہی حال اور قطعاً یہی حال ہے۔ ان کے لئے قدرت کا یہی قانون ہے۔ جس چیز کے عالم بنا کر وہ پیدا کئے جاتے ہیں، خواہ وہ علم جتنا بھی دقیق، جتنا بھی پیچیدہ ہو، ان مہندسانہ چابکدستیوں ہی کا علم کیوں نہ ہو، شہد کی مکھیاں، جس کی مدد سے ان چھتوں اور محالوں کو بناتی ہیں، جن کی اقلیدسی نادرہ کاریوں کو دیکھ دیکھ کر ریاضیاتی عقول والے بھی چکرا رہے ہیں۔ بیا جیسی چڑیا یا جونک جیسے کیڑوں کے وہ فطری احساسات ہی کیوں نہ ہوں، جن کی بدولت پیش آنے سے پہلے طوفانی ہواؤں، یا سیلابوں کی نوعیت اور ان کے بہاؤ کی سمت کا ان پر انکشاف ہو جاتا ہے۔

مگر باایں ہمہ ان میں ہر ایک کا علم ان ہی معلومات اور ان ہی احساسات تک محدود رہتا ہے، قطعاً ان ہی تک محدود رہتا ہے جنہیں بھرنے والا، پیدا ہونے سے پیشتر ہی انکی جبلتوں میں بھر دیتا ہے۔ اسی لئے جس وقت پیدا ہوتے ہیں، اس وقت بھی ان کا سرمایہ یہی ہوتا ہے اور جس دن مرتے ہیں، کسی قسم کا کوئی اضافہ اس سرمایہ میں نہیں ہوتا۔

لیکن اسی کے مقابلے میں بنی آدم یا الانسان کو دیکھئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، پیدا تو ہوتا ہے بے سروسامانی، جہل و نادانی کی انتہائی نقائص و عیوب میں لتھڑا ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی اس عجیب و غریب، حیرت انگیز صلاحیت و قابلیت کا کون انکار کر سکتا ہے، جو

نہ جانی ہوئی چیزوں کے جان لینے، اور سیکھ لینے کی، اس میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے بلا شبہ وہ جس وقت شکم مادر سے نکلتا ہے، اس وقت کچھ نہیں جانتا، یا جو کچھ جانتا ہے، وہ نہ جاننے کے برابر ہوتا ہے، مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے، جانتا چلا جاتا ہے۔ سیکھتا چلا جاتا ہے۔ ان ہی باتوں کو جانتا چلا جاتا ہے، سیکھتا چلا جاتا ہے، جنہیں وہ نہیں جانتا تھا قطعاً نہیں جانتا تھا: مالم یعلم "(جسے انسان نہیں جانتا) ان ہی کے متعلق علّمہ (سکھایا ہے اس کو) کے عمل کے قبول کرنے کی جو فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے، قرآنی آیت علمہ الانسان مالم یعلم میں جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، اور یہی جواب ہے اس سوال کا، کہ جو عربی نہیں جانتے ہیں، وہ بھی عربی زبان میں اترنے والے پیغام کے صحیح مخاطب اور اس کے سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے مکلف کیسے بنائے جا سکتے ہیں۔ نہ جانی ہوئی چیزوں کے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ہی جس کی فطرت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، کیا اپنی اس عجیب و غریب تعلیمی قابلیت پر متنبہ ہونے کے بعد اس بے جا سوال کی جرأت وہ کر سکتا ہے؟

خیر، یہ تو ایک ذیلی بحث تھی۔ اس مسئلہ کے خصوصی تفصیلات کا مقام دوسری جگہ ہے یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ باہر سے جو ضعف اور کمزوریوں، انتہائی کمزوریوں کے حال میں پیدا ہوتا ہے، تعلّم و اکتساب "علّم" یا نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت ہی کی بدولت دیکھا جا رہا ہے، کہ سارے زور آوروں کو اپنے آگے بے زور بنائے ہوئے ہے۔۔ ہاتھیوں کو جھکائے ہوئے ہے۔ اونٹوں کو دبائے ہوئے ہے۔ سانڈھوں کو سدھائے ہوئے ہے، شیروں کو پھنسائے ہوئے ہے۔ وہیلوں کا شکار کر رہا ہے، گینڈوں کو للکار رہا ہے اور یہاں کون ہے جو اس کی دہائی نہیں پکار رہا ہے!

پس کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کی حد تک تو آدمی زادہ عقل و خرد ہوش و تمیز سے بیگانہ ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت یقیناً گوشت کے ایک زندہ مضغہ اور ناتراشیدہ کندے ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن جب مرتا ہے، تو آن ہونے والوں میں کب نہیں دیکھا گیا۔ اور کیا اب نہیں دیکھا جا رہا ہے، روزمرّہ آئے دن دیکھا جا رہا ہے۔ ہر جگہ دیکھا جا رہا ہے، کہ ان میں کتنے علامہ و حکیم، ڈاکٹر و طبیب، بحر و نحریر ہو ہو کر مر رہے ہیں!

سچ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری تسخیری کرشمہ سازیاں، کائنات کے گوشہ گوشہ میں خاک و آب، آتش و باد کے ہر طبقہ میں جو نظر آ رہی ہیں، یہ سارا تماشا یا ساری تفسیر قرآن کی آیت

علم الانسان مالم یعلم — سکھائیں انسان کو وہ باتیں، جنہیں وہ نہیں جانتا!

ہی کے چند لفظی فقرے کی ہی "نادانستہ" کو "دانستہ" بنانے کا یہی باطنی سلیقہ ہی تو آدمی کا ہے جس میں اس کی ساری اختراعی کارفرمائیوں اور ایجادی نادرہ نمائیوں کی ضمانت پوشیدہ ہے!

علم آدم الاسماء کلھا! — سکھایا آدم کو اللہ تعالیٰ ساری چیزوں کے نام

کے تعلیمی عمل کے بعد "الاسماء" کے بتانے کا مطالبہ کر کے اور آدم سے جواب سنوا کر فرشتوں کو جو ملزم ٹھہرایا گیا تھا، تو دلوں میں یہ وسوسہ ہوا کہ جتانے کے بعد امتحان، امتحان کب باقی رہا، حالانکہ یہی تو سیکھنے کی بات تھی۔ آدم یا الانسان میں تعلیم قبول کرنے، نہ جانی ہوئی باتوں کو سکھانے کے بعد سیکھ لینے کی جو صلاحیت ہے۔ اس کی تو نمائش مقصود تھی، وہ سکھایا گیا اور اس نے سیکھ لیا۔ سیکھنے کے بعد سیکھی ہوئی بات کو اس نے بتا دیا۔ یہی تو آدمی کا کمال ہے۔ ایسا کمال ہے جو صرف اسی کا کمال ہے، آدمی کے سوا اخفش ہی کا بچہ کیوں نہ ہو، چونکہ وہ بچہ ہے آدمی نہیں، اس لئے اخفش جیسے معلم کی تعلیم بھی اس میں "علم" منتقل نہ کر سکی۔

اس قرآنی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب غور کیجئے، اس پر غور کیجئے کہ بنیادی ضعف اور جسدی بے نوائیوں کے جس حال میں آدمی پیدا کیا جا رہا ہے اگر اس حال میں وہ نہ پیدا ہوتا، بلکہ بجائے اس کے آدم زاد بھی دنیا میں اس شان کے ساتھ داخل ہوتا، جس کی ایک مشہور معاشی فاضل نے ان الفاظ میں تمنا کی ہے:-

○ اگر آج دنیا میں ہر شخص کو بازی گر کا وہ لٹکا ہاتھ آجائے
جس سے وہ اپنے مٹکے کے اندر، یا ٹوکرے کے نیچے سے جو چاہتا
ہے، نکال لیتا ہے" (ص ۹۹ مقصد و منہاج، از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

یعنی خواہش، مجرد خواہش کے ساتھ جو چاہا جاتا وہی پورا ہوتا رہتا۔ انسان ایسی قوت لیکر اگر دنیا میں قدم رکھتا، تو اس میں شک نہیں کہ دنیا بجائے دنیا ہونے کے بنی بنائی گویا جنت ہی ہو جاتی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن انسانی کمالات کی تماشا گاہ آج یہ غیر بہشتی دنیا بنی ہوئی ہے، کیا بن سکتی تھی؟ واقعہ تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک تو اس کا نام بھی شاید دنیا ہی ہوتا اور مذاہب میں بیان بھی کیا گیا ہے کہ انسان ہی کے آگے زندگی کے کسی آئندہ دور میں ایک ایسا عالم بھی پیش ہو گا، جہاں وہی ہو گا، جو چاہا جائے گا، وہی ملے گا، جو مانگا جائیگا۔ لیکن کھلی ہوئی

بات ہے کہ یہ انسان اور انسانی کمالات کی نمائش نہیں، بلکہ دینے والے کی قدرتوں، اور قوتوں کا ظہور ہوگا۔ پر ایسی دنیا جہاں سے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　　(اقبالؒ)

کے دو متقابل کمالات کا مظاہرہ مسلسل ہو رہا ہو۔ ہوتا چلا جا رہا ہو، اس کا تماشا تو اسی دنیا میں ہو سکتا تھا۔ جہاں بے چارگیوں میں چارہ سازیوں، مجبوریوں میں مختاریوں کی نمائش کا موقع انسان کو مل رہا ہے۔

اگرچہ سچ تو یہی ہے کہ خدا کی کسی مخلوق کے کمالات کا ظہور بالآخر خدا ہی کے کمالات کا ظہور بن جاتا ہے، انسانی کمالات بھی خدائی کمالات ہی کی آئینہ برداری کا کام انجام دے رہے ہیں مگر اس طور پر کہ آیت قرآنی

لقد کرمنا بنی آدم وحملناھم　　　ہم نے عزت عطا کی، آدم کے بچوں کو، اور

فی البر والبحر　　　سوار کیا ہم نے ان کو خشکی اور تری میں!

کی تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان ہی کمالات کے ساتھ ساتھ انسان کے تکریمی مقامات کا راز بھی مسلسل بے نقاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اور یہ ہے آدمی کے بنیادی ضعف اور جسدی بے سرو سامانی کے عیب و نقص کی تکمیل کی وہ قدرتی شکل کہ اس کی بدولت انسان کا یہی نقص، اس کی یہی کوتاہیاں، بشری کمالات کے ظہور و بروز کے ذرائع بنی ہوئی ہیں۔ پس، کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے اور رہنے کی حد تک تو یہاں سب ہی پیدا ہو رہے ہیں، سب ہی رہ رہے ہیں، قوی ہیکل، بڑے بڑے تن و توش والے، چنگلوں والے، کھروں والے، پروں والے، اور کیا کیا والے، لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ جو جس حال میں کیا پیدا ہو رہا ہے، اسی حال میں مر رہا ہے، جس حال میں آ رہا ہے اسی حال میں جا رہا ہے، لیکن ایک، صرف ایک آدم زاد ہے کہ جاہل پیدا ہوتا ہے، ناقص پیدا ہوتا ہے۔ بے زور بے نوا پیدا ہوتا ہے، لیکن جب مرتا ہے تو عالم ہو کر مرتا ہے، کامل ہو کر مرتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، تو یہ انسان کی اسی تعلیمی صلاحیت کا نتیجہ، جس میں کوئی دوسرا اس کا ساجھی، شریک

وسہیم نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بنیانی ضعف کا احساس، اپنی بے سرو سامانی و بے نوائی کی کیفیتوں کا تاثر آدمی میں جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، تجربہ شاہد ہے، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اسی نسبت سے اس کی تعلیمی صلاحیتوں کا پہلو بھی زیادہ بیدار، زیادہ اُجاگر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور یہی ہے انسان کے جسدی ضعف اور بنیانی کمزوریوں، ناتوانیوں کے استعمال کی صحیح راہ، یا ان کے امالہ کی صحیح تدبیر، جس سے بجائے نقصان کے نت نئے منافع کے دروازے اس پر کھل سکتے ہیں۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ جن قوموں میں اپنے اس ضعف کا احساس، جس حد تک شدت پذیر ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک اس قدرتی ضعف کی تلافی میں ان کی تعلیمی صلاحیتوں یا انجانی باتوں کے جاننے کا شوق تیز سے تیز تر ہوتا رہا ہے[1]۔ اور یوں ہمارا یہ ضعف دوسروں کی قوت و طاقت سے قیمتی، کتنا زیادہ قیمتی بن جاتا ہے۔ یقیناً وہ بڑائیاں جو نسلِ انسانی کو آج حاصل ہیں، تعلیمی صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی شاید ہی عرصۂ ظہور پر جلوہ گر ہوتیں، اگر ہم بجائے ضعف کے اسی طرح قوت لے کر پیدا ہوتے، جیسے انسان کے سوا دوسرے لے کر پیدا ہو رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے امالہ کی اس ترکیب کی نادرہ نمائی کہ انسانی فطرت کی ساری کوتاہیاں اس کی حیرت انگیز اولوالعزمیوں کی گویا مقدمہ بن جاتی ہیں۔

(۲)

دوسری چیز اس سلسلہ کی رزقی سرمایہ کی محدودیت و عدم مبسوطیت کے ساتھ ہماری فطرت کی ہوسیت یا التخیر کے حُبّ کی شدت و انتہا پسندی تھی۔

عرض کر چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کی کلفتوں میں بڑا ہاتھ عدم انطباق کی اسی کیفیت کا ہے۔ انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم بنا کر پیدا کی گئی ہے اور معاشی سرمایہ جس پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آئے، لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کی کیفیت اس سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورتِ حال سے ہے جس

---

[1] جنگلی قبائل اور پسماندہ اقوام کی پسماندگیوں کی بڑی وجہ اسی احساس کی کمی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کی تعلیمی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ ۱۲

یکھئے، جہاں دیکھئے، جس طرف دیکھئے، یہی آواز آرہی ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

سی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنادیا ہے۔ ایسا طوفان، کہ ہر جینے والا یہی کہتے ہوئے ر رہا ہے ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے، ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے۔ حیات کی یہ قید ان کو کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے۔ اسی لئے ؎

"قیدِ حیات" و "بندِ غم" اصل میں دونوں ایک ہیں!

کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کبھی یہی غالبؔ "زندگی" کو "سوز" اور "سوز" کو "زندگی" بتاتے ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ "زندگی" کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو۔ غالب کی نگاہوں میں "جلتی ہوئی ایک شمع" ہے۔ کسی رنگ کی چمنی اس پر چڑھائی جائے، سبز ہو یا سرخ، لیکن جب تک روشن ہے جلے گی۔ اور جب تک جلتی رہے گی، اسی وقت تک وہ روشن ہے۔ شیراز کے عارف کو تو کھل کر یہ کہنا پڑا کہ ؎

نہ گل از داغِ غمت رست نہ بلبل در باغ
ہمہ را نعرہ زناں جامہ دراں می داری (حافظ)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب و تکلیف کی اس کیفیت کا احساس موجودہ زندگی میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثنا بھی ہو، جیسے ہر کلیہ میں استثنا بھی ایک کلیہ ہے۔ لیکن اضطراب و بے چینی، کرب و تکلیف کے عام ہنگاموں میں ٹٹولنے والوں کو عموماً یہی کانٹا چبھا، یا چبھا ہوا نظر آیا ہے، کہ سب، سب کچھ چاہتے ہیں۔ لیکن چاہنے والوں کی چاہ کو پورا کرنے کے لئے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے۔ وہ ایک ایسے مقررہ محدود پیمانہ پر پیدا ہو رہا ہے، جس سے سب کی یہ چاہ پوری نہیں ہو سکتی۔ اکبر مرحوم نے فرمایا تھا ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سُن لے، کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا
حدودِ فطرت کے ہیں مقرر، جو یہ گھٹے گا، تو وہ بڑھے گا

لامحدود خواہشوں والی فطرت کا رُخ ایسے محدود سرمائے کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔ جیسے دُنیا کی کوئی طاقت لامحدود نہیں بنا سکتی، محدود پر لامحدود کا انطباق، چونکہ نہیں ہو رہا ہے، اور نہیں ہو سکتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خواہشوں کے جس محدود حصّے کو تکمیل کا موقع مل جاتا ہے، اُس وقت تو آدمی مسرور ہوتا ہے۔ لیکن نہ پُورے ہونے والے ارمانوں کا جو قافلہ عدم کی راہ لے رہا ہے اسی کا ماتم ہے جس کے غم میں اولادِ آدم سوگوار ہے۔ مسکین شاعر نے کتنے دردناک پیرایہ میں کہا تھا کہ ؎

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سینکڑوں ارماں
عدم کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا (مست بہاری)

پھر کیا کیا جائے؟ کیا چھوڑ دیا جائے اسی حال میں آدمی کو تڑپتا، پھڑکتا چھوڑ دیا جائے؟ یہ سمجھاتے ہوئے چھوڑ دیا جائے کہ ؎

جنّت بنا سکے گا، ہرگز نہ کوئی اس کو
اکبر یونہی چلی ہے، دُنیا یوں ہی چلے گی

کہتے ہیں کہ "الیاس احدی الراحتین" (قنوط و مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے) اسی قسم کی راحت، جو ارمانوں اور اُمیدوں کے پورا ہونے سے ہوتی ہے۔ شعر کی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ مُن بھی لیا جائے، لیکن کامیابی کی مسرّت اور ناکامی کی خاموش کھسیاہٹ، حقیقت بینوں کی نگاہ میں ایک نہیں ہو سکتی۔ اگر راحت کی یہ دونوں شکلیں ایک ہی ہیں تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے ایک کو دوسرے سے بدلنے کے لئے کیا کوئی تیار ہو سکتا ہے؟

یہ نہیں تو طفلِ تسلّی کی وہ جھوٹی شکل انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے؟

میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سُلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کرّہ پر "آج" نہیں تو "کل" ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسّر آنے والی ہے۔ جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے، وہی پائیں گے؟ ایسے میکانیکی آلات نئے نئے ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے، کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا؟

ایسا ہوگا بھی یا نہیں، اسے تو جانے دیجئے کم از کم جو قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہیں یا ان کے لئے تو، اس امکان کے تصور کی، جیسا کہ گذر چکا، یہاں قطعاً گنجائش نہیں۔ الرزق کی جن پیداواروں کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام بسط کی حالت جس سے پیدا ہو، اس پیمانے پر ان کی پیدائش یہاں نہ ہوگی۔ پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنہوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے، نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے، اور بالفرض مان بھی لیا جائے، کہ آج نہیں تو "کل" ایسا ہو کر بھی رہے گا۔ تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یافتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جا سکتا ہے۔ زید کے تندرست ہو جانے سے غریب عمرو کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی۔ مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتائیے کہ حال والوں یا ان کے لئے جو کڑھتے اور جھینکتے، چلاتے اور کراہتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے۔ مر رہے ہیں، مرتے چلے جائیں گے۔ ان سکینوں کا تسکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے؟

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے رہنے والوں کی مشکلات کا صحیح حل، اگر یہ واقعہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ یا ارجنٹائن، برازیل یا ٹمبکٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوش حالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی، تو ایک عہد کی نسلوں کی تلخیوں کا علاج آپ آنے والے دوسرے عہد کی

---

لہ سورۃ البلد کی مشہور آیت ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد (قطعاً ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو درد جگر میں) پھر اس سے پہلے مکہ معظمہ کی اور مکہ معظمہ کے بھی اس زمانہ کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں زندگی گذار رہے تھے قسم کھائی گئی ہے اس کے بعد دوسری قسم ہے۔ ووالدٍ وّما ولد (یعنی اور قسم ہے والد کی اور جو پیدا ہوا) قرآن کی قسمیں اس دعویٰ کی جس کا ذکر قسموں کے بعد ہوتا ہے شواہد و دلیلیں ہوتی ہیں، آدمی کی موجودہ زندگی جگر خراشی کی زندگی ہے۔ اس کیلئے یقیناً وادی غیر ذی زرع شہر مکہ کی زندگی ایک بہترین مثال ہے، پھر انسان کی فطرت کا یہ تجربہ کہ رسول اللہؐ جیسے بھی خود پر اسی کے میں زندگی دوبھر کر دی گئی، اس سے بھی موجودہ زندگی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے خصوصاً اپنے سب سے بڑے محبوب شہر اور محبوب پیغمبر کو بھی جب اس قسم کی زندگی دی گئی تو اس سے دوسرے سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی کیا حقیقت ہے، پھر یہ آدمی کا پیدا ہونا گھر سے نکل کر نطفہ و علقہ مضغہ کے مدارج سے گذرنا اور پھر یہ تجربات ختم بھی نہیں ہو پاتے کہ صاحبزادے پھر گھر بسانے کیلئے فطرت کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، باپ بیٹے کی فطری محبت زندگی کو پھر تلخ بناتی چلی جاتی ہے یہ سلسلہ لا متناہی ہے ۱۲

نسلوں کی شیریں کامیوں یا شیریں کامیوں کے وعدوں، صرف وعدوں سے کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ جہنم میں رہنے والوں کو یہ سنا سنا کر کیا خوش کرتے ہیں کہ ان کے پوتے "جنت" میں پیدا ہوں گے اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو مستقبل کے مشکوک، بے بنیاد او ہامی وعدوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے۔ بتا چکا ہوں کہ انسان سکینت و طمانیت کی جس کیفیت کے لئے تڑپ رہا ہے۔ یہ مرہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت، بغیر کسی کدو کاوش، دردِ سری اور محنت کے حاصل ہے۔ جو انسان بن کر دُنیا میں نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ دُوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کر سکتا ہے تو شاخساروں پر چہچہانے والی چڑیوں، جو بُہاروں میں تیرنے والی مچھلیوں، اور مُرغ آبیوں، مرغزاروں میں کلیلیں بھرنے والے ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے اُدھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے۔ مستقبل کے "شنیدہ" مواعید سے آپ کی فطرت اگر خنکی حاصل کر سکتی ہے، تو انسان کے سوا ہر دُوسری زندہ ہستی "دیدہ" کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت، اسی کیفیت کو تقسیم کر رہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے، تو پھر دُوسروں میں خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنی؟

خیر، کہاں تک کہتا چلا جاؤں، اور جنھوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گذارنے کا عہد نہیں کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اُن سے خطاب بھی نہیں ہے۔ فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سیدھے سادے مسلمان کے لئے یہی کافی ہے کہ الرزق یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رُو سے اس دنیا میں غیر مبسوط، یا غیر محدود شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کی عدم مبسوطیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے وہی کل بھی رہے گا۔ اور جب تک یہ حال ہے، الخیر کی حُبِّ شدید کے روگی اور ہلوعیت وعدم سیری و بے صبری کے عارضہ میں اس مبتلاء انسان کی بے چین فطرت، اپنی لامحدود خواہشوں کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پا کر ہمیشہ بے کلی اور بے چینی کے اسی حال میں تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانونِ ازالہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے، آپ دیکھ چکے، کہ معاشی زندگی کی

اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے۔ زود ساز مائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے اور جو باقی ہیں اُنہیں بھی ختم کر رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے بجائے ازالہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے وہ کتنی سادہ، کتنی آسان، کتنی سہل الوصول ہے۔ ایسی راہ، کہ سُننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کہہ اُٹھیں، کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ ایسی بات، جس سے کون ناواقف ہے اور یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں، کہ آسانیوں کو غلط کاروں، اور غلط فہموں نے کیوں دُشوار بنا لیا۔ قدرت ظالم نہیں ہے۔ اپنے بندوں کے لئے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے۔ کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے۔ تمام تقویموں میں سب سے احسن، سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا۔ امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا، ایک لمحہ کیلئے کوئی باور کر سکتا ہے کہ قصداً و ارادتاً ایک ایسی زندگی اس کے گلے میں لٹکا دی گئی جو جہنم بن کر اسے لپٹ گئی۔ ایسی جہنم جس میں وہ جھلس رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھُن رہا ہے، اور اس طور پر جل بھُن رہا ہے، کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکالنے میں بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔ ذہنی ارتقار اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لئے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی وعدوں کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی دُوسری تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی اُمید ہے۔

بہر حال بجائے ازالہ کے امالہ کی جس عجیب و غریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف منسوب کر رہا ہوں آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کیا کہنا چاہتا ہوں؟؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں "الدین" یا مذہب کے نظام ہی کو اسی امالہ کی واحد بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں، خود ہی سوچ لیجئے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی نا! کہ زندگی کے موجودہ دَور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں الحیٰوۃ الدُّنیا ہے۔ اسی الحیٰوۃ الدنیا کو لامحدود قدرت و قوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اسی لئے گذارنا تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ یعنی وہی

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

(راضی ہو گیا اللہ اُن سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے)

جس کا قرآنی خلاصہ ہے۔ جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا

یعنی حضراتِ رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے پیش ہوتی رہی ہے، کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل یہی ہے۔ مذہب جس چیز کا نام ہے۔ یہ تو اس کا حاصل ہوا۔ لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لبریز فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مسئولیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جو انگارے دہک رہے تھے۔ مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رُخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا۔ انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونیوالی تمناؤں کی شکل اختیار کر کے آدمی کو جو تڑپا رہے تھے۔ شاداب، بڑھتی ہوئی امیدوں ـــ اور ارمانوں کے پھول بن بن کر، دہی، جہاں آگ صرف آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تر و تازہ تختوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا، جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے کانوں پر بھی نہیں۔ ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسل اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں، چین کی، اور ساری پریشانیاں سکون و عافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کی صحیح قدرتی راہ یہی ہے، ان مطالبوں کو ہمارے اندر بھرنے والے نے اسی استعمال کے لئے بھرا تھا۔ پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا، اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دُکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے۔ اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو استعمال اختیار کرنے والوں پر ہے۔ نہ کہ اس پر، جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ مذہب اسی امالہ کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے۔ لیکن بدیہیات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے۔ قرآن پڑھئے، ان تنبیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے۔

قرآن مجید کی وہی آیۂ کریمہ جس کا پہلے بھی ذکر گذر چکا ہے۔ یعنی الشہوات کے حُبّ و گرویدگی کو قدرت ہی نے انسانی فطرت کے لئے مزین و آراستہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں بعض اہم خواہشوں کی آیت میں تفصیل بھی دی گئی ہے۔ یعنی النساء (عورت) البنین (اولاد، نرینہ) الذہب والفضۃ (سونے اور چاندی) کے "القناطیر المقنطرۃ (انبار) الخیل المسومۃ (اصیل نشان

نعہ حسین گھوڑے) الانعام (مویشیاں) الحرث (کھیتی باڑی)

توجہاں ان کا ذکر ہے، وہیں یہ بھی بتادیا گیا ہے، کہ الخیر کی طالب انسان کی علوی فطرت دنیا کے اس محدود سرمایہ اور قلیل متاع سے تشفی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آل عمران کی اسی آیت کے بعد ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| قل او نبئکم بخیر من ذلکم | بولئے، کیا خبر دوں تمہیں اس چیز کی جو بہتر |
| للذین اتقوا عند ربہم جنات | اور خیر ہے اس سے (وہ چیز یہ ہے) یعنے |
| تجری من تحتہا الانہار | جنہوں نے پارسائی اختیار کی ان کے |
| خالدین فیہا و ازواج مطہرۃ | مالک کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے |
| و رضوان من اللہ واللہ بصیر | نیچے نہریں جاری ہیں۔ ہمیشہ رہنے والے ہیں |
| بالعباد | وان باغوں میں وہ) اور (تمام عیب و نقائص |
| | سے) صاف و پاک جوڑے، اور اللہ کی رضا |
| (آل عمران ع ۲، پارہ ۳) | مندی، اور اللہ اپنے بندوں کا بینا ہے۔ |

انسانی فطرت کے لئے حقیقی الخیر دراصل وہی "رضوان من اللہ" یا "اللہ کی رضامندی" ہے، یعنی لامحدود قدرت و طاقت والے کا انسانی فطرت کے لامحدود احساسات اور خواہشوں کے ساتھ کامل موافقت و تطابق تام، اسی کا نام "رضوان من اللہ" یا خدا کا راضی ہو جانا ہے۔ اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یوں بھی کی گئی ہے:۔

لکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون!
(الخیر) ولی اس زندگی میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو گے
اور وہ سب کچھ جو تم مانگو گے' ذکر لامحدود قوتوں اور قدرتوں والا
لامحدود طلب رکھنے والے سے راضی ہو چکا ہے۔ پس، اب یہ جو چاہیگا
وہ اسی کو پورا کرے گا!)

الجنات، ازواج مطہرات، یا اسی قسم کی اور چیزیں دراصل اسی اجمال کی بعض تفصیلی و تمثیلی شکلیں ہیں، بلکہ حب الشہوات والی آیت کے بعد الخیر کی جن جن شکلوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر لامحدود تمناؤں کی جو بنی جوڑی گئی ہے۔ اور محدود شکلوں میں بعض آرزوئیں یہاں آدمی کی جو پوری ہو

جاتی ہیں۔ تو غرض اس سے یہی ہے کہ آئندہ کی لا محدود طلب کا جذبہ آدمی میں پیدا ہو، پیاس بھی ہے اور پیاسے کو پانی کے چند گھونٹ پلا بھی دیئے گئے ہیں۔ پینے کی اس لذت سے مانوس ہونے، بلکہ پیاس کے بھڑک اٹھنے کے بعد اس وقت تک، جب تک اس پیاس کی تکمیلِ تسکین کا سامان نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پیاسے کو نہ قرار مل سکتا ہے اور نہ اُسے ملنا چاہیئے، پس آرزوؤں اور تمناؤں کے گلا گھونٹنے کی راہبانہ وجوگیانہ تدبیریں فطرت کے قانون سے جیسا کہ گذر چکا، کھلا ہوا مقابلہ ہے، صحیح راہ یہی ہے کہ بجائے دبانے اور بجھانے کے ان آرزوؤں کو صحیح رُخ پر لگانے کی کوشش کی جائے۔ جس کی عملی صورت یہی ہے۔ اور یہی ہو بھی سکتی ہے کہ اپنی نہ ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوؤں کے متعلق ایک طرف تو یہ قطعی فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ متاع الدنیا کے محدود سرمایہ سے ان کی تسکین ناممکن ہے اور دُوسری طرف نکل جانا چاہیئے۔ آدمی کو اس قوتِ قدرت کے لازوال سرچشمہ کی تلاش میں، جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرّہ ذرّہ اپنے لامحدود کمالات کے مظاہرہ سے ادا کر رہا ہے ؏

دلِ من مسافرِ من کہ خدا اش یار بادا!

قرآن ہی میں ایک موقعہ پر الآخرۃ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو یہ فرمایا گیا کہ

لا یبغون عنھا حولا — یعنی (الآخرۃ کی بہشتی اور فردوسی زندگی) سے لوگ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

اسی کے بعد مشہور آیت ہے کہ۔

| | |
|---|---|
| قل لو کان البحر مدادًا | بتا دو، کہ اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے |
| لکلمات ربی لنفد البحر | میرے رب کے کلمات (کے لکھنے کے لئے) |
| قبل ان تنفد کلمات ربی | تو سمندر (کا پانی) ختم ہو جائے گا قبل اس |
| ولو جئنا بمثلہ مددا | کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں اگر |
| | چہ ہم سمندر کے مانند دوسرے سمندر کو بھی لائیں |

پڑھنے والے پڑھتے ہیں، لیکن مقدم الذکر اور مؤخر الذکر دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے۔ شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، حالانکہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے، جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اسی لئے ہونا نہیں چاہیں گے کہ اس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات[1] کے ذریعہ

(1 متفرق آئندہ پر)

سے ظاہر کرتی رہے گی۔ انسانی احساسات اپنے اردگرد، پس و پیش، اندر و باہر، ہر لمحہ، ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیاتِ کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے کھاتے چلے جائیں گے، جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا، اور یوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا موقعہ ابد الآباد تک ملتا جائے گا۔ اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی جدّت پسند فطرت نَو بہ نَو شکلوں میں اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان حاصل کرتی چلی جائے گی، گویا ؎

ہر لحظہ جمال خود نوع دگر آرائی — شورِ دگر انگیزی، شوقِ دگر افزائی

کا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہوگا، عجیب تماشا! اور یہ سب درا صل "رضوان من اللہ" کے حصول ہی کامیابی ہی کی تفصیلات ہوں گی جو "المفلحون" (کامیاب ہونے والوں) کے سامنے لامحدود شکلوں میں پیش ہوتے رہیں گے۔

پس، یہ ہے ہلوعیت یا اس جذبہ کی شدت کے امالہ کی صحیح تدبیر جو الخیر کے حب و طلب کے متعلق آدم زادوں کی فطرت میں قصداً و ارادتاً ان ہی اغراض کی تکمیل کے لئے ودیعت کی گئی ہے۔ یہی اس کی صحیح قیمت، اور یہی اس جذبہ کا صحیح استعمال ہے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم!

معاشی مشکلات کے بنیادی اسباب کی آخری چیز رزقی مدارج و مراتب کا وہ اختلاف رہ جاتا ہے، جو افرادِ انسانی کے کمالاتی و صفاتی تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ کوفت اور دکھ کے اس احساس کا بجائے مادی حالات و واقعات کے زیادہ تر اس کا تعلق انسان کے نفسیاتی کیفیات سے ہے۔ مثلاً ہم اسے یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد، آدمیوں کی جو آج پائی جا رہی ہے، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی، بلکہ کسی فردِ واحد میں نوعِ انسانی کا ظہور منحصر و محدود ہو کر رہ جاتا۔ یعنی دُنیا میں تنہا ایک ہی آدمی اگر پیدا ہوتا، اور اسی حال میں یہاں رکھا جاتا۔ جس حال کو ہم غربت و فلاکت کی انتہائی شکل اس وقت قرار دے رہے ہیں، مثلاً غریزی حرارت، جن بدنی اجزاء کو فنا کرتی رہتی ہے

---

سلہ دگذشتہ صفحہ سے متعلق) کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے۔ تخلیقی کاروبار جس ذریعہ سے انجام پارہا ہے اسی کا نام کلمہ یعنی بات بھی ہے، اور اسی کلمہ یا بات کو قرآن نے کبھی "کن" کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے۔

صرف ان ہی تحلیل یافتہ اجزار کا بدل جس قسم کی خوراک اور خوراک کی جس مقدار سے مہیا ہو سکتا ہو۔ اس سے زیادہ کھانے کے لئے اسے کچھ نہ ملتا، اسی طرح موسمی حالات، گرمی و سردی سے مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس بس انتہائی سامان ہوتا جس سے صرف جان کا جسم سے تعلق باقی رہ سکتا ہو، ظاہر ہے، کہ معاشی ذرائع کا یہ وہ پیمانہ ہے، جس سے ہر وہ شخص مستفید و متمتع ہو رہا ہے، جسے اس دُنیا میں جینے کا موقع مل رہا ہے، بلکہ جینے کا موقع ملتا ہی اس وجہ سے ہے کہ ان چیزوں سے وہ مستفید و متمتع ہو رہا ہے۔

خود سوچیے کہ غربت کے ان حالات کے ساتھ اگر آدمی دوسروں کے ساتھ نہیں، بلکہ اکیلا تنِ تنہا اس زمین پر آتا تو آج مدارج کے اختلاف کی وجہ سے پست زندگی والوں میں کوفت کی کیفیت بلند معیار والوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر جو پیدا ہو رہی ہے۔ کیا پیدا ہو سکتی تھی؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ سارا کوفت اور ذہنی دُکھ محض اس پیمائش کا نتیجہ ہے، جو ہم ایک کی دوسرے کے مقابلے میں کرنا چاہتے ہیں۔ پیمائش کے اسی عمل کے بعد ہم میں کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا ہو جاتا ہے اور اسی کے بعد چھوٹوں میں بڑوں کو دیکھ کر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس حال میں قطعاً پیدا نہ ہوتی اور نہ ہو سکتی تھی۔ جب پیمائش کا میدان ہی ہمارے سامنے نہ ہوتا۔

مطلب یہی ہوا کہ کوفت و قلق کی یہ کیفیت صرف اضافی انتسابات کا ایک ذہنی اثر و ثمرہ ہے، فی نفسہ واقعات سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔

آخریوں بھی تو غور کیجئے کہ طبعی عمر (مثلاً ساٹھ ستر سال) تک پہنچنے کا موقعہ ہم میں جب امیروں ہی کو نہیں، غریبوں کو بھی مل رہا ہے، اسی طرح طبعی عمر سے پہلے مرجانے کا حادثہ اگر غریبوں کے ساتھ پیش آتا ہے، تو امیروں میں بھی اس کی نظیروں کی کمی نہیں ہے۔ عمر کی جس جس منزل میں ناگہانی اموات سے غریبوں کو کبھی کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یقیناً ان ہی منزلوں پر امیروں کی لاشیں بھی آپ کو بکثرت نظر آ سکتی ہیں۔ ایک دن، بلکہ ایک گھنٹہ کی زندگی سے سو سو سال تک زندہ رہنے کے نظائر و امثال دونوں طبقوں میں برابر اور مسلسل ہر قوم، ہر ملک، ہر آبادی میں ڈھونڈنے والوں کو ملتے چلے جا سکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ شکل و صورت، رنگ و بو، ذائقہ و مزہ وغیرہ کے اعتبار سے باہر کا حال کچھ ہی کیوں نہ ہو، مگر آنکھ ہو، یا کان، جگر ہو یا پھیپھڑا، الغرض رئیسہ اعضا، ہوں یا مرؤسہ، حرارتِ غریزی فنا ہونے والے اجزاء کا بدل جب غریبوں کے لئے بھی یہاں مہیا ہو رہا ہے اور امیروں کے لئے بھی، توالد و تناسل کا کام جیسے امیروں میں جاری ہے غریبوں میں بھی یہ

قصہ رُکا ہوا نہیں ہے، حتیٰ کہ چوبیس گھنٹوں میں مسرت و خوشی کے جتنے اوقات امیروں کو ملتے ہیں، جھوٹ بات ہو گی، اگر سمجھا جائے کہ غریبوں کی خوشی و مسرت کے اوقات ان سے کم ہوتے ہیں۔ غم و الم، فکر و تردّد کی جتنی گھڑیاں غریبوں کی ہوتی ہیں، یہ واقعات کا انکار ہو گا، اگر کہنے والا یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ امیروں کے چوبیس گھنٹوں میں غم کی گھڑیوں کا اوسط ان سے کم ہے۔ پس واقعاتی نقطۂ نظر سے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے، آخری نتائج کے لحاظ سے رزقی مدارج و مراتب کے ان اختلافات کا درحقیقت زندگی کے ٹھوس حالات و کیفیات سے چنداں تعلق نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اضافی انتسابات یا پیمائشی تصورات سے آدمی خود بخود اس کوفت کو خریدتا ہے، ناپنے کے عارضہ کو ترک کر کے تجزیہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس وہمی دُکھ کا کانٹا آدمی کے دل میں کیا باقی رہتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہی آدمی، دوسروں کے جامہ دار اور حریر کی شیروانیاں دیکھ دیکھ کر اپنی کھادی کی قمیص پر جب ٹسوے بہانے لگتا ہے تو طاؤس کے قدرتی خلعت زرنگار و عبا، بوقلموں کو دیکھ کر وہ کیوں نہیں جلتا۔ موٹروں پر پھرنے والوں کی سواریاں جس طرح پیادہ پا جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے والوں کو حسد کے شعلوں میں جھلساتی رہتی ہیں۔ یہی چلنے والے، کُڑھنے والے آخر چوکڑیاں بھرنے والے ہرنوں اور چھلانگ مار کر جست کرنے والے شیروں کو دیکھ دیکھ کر کیوں نہیں جلتے، کیوں نہیں کُڑھتے۔ ان ہی کے سامنے تو گِدھوں اور چیلوں کو فضائے آسمانی میں تیرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ خاک اور دُھول سے قطعاً بے تعلق ہو کر صاف ستھری سطحِ ہوا میں ان پرندوں کی سیر کا یہ تماشا ان کے سینوں کا بوجھ کیوں نہیں بنتا۔ یہ نظارے اپنی چھاتیوں کے پیٹنے پر انہیں کیوں مضطر و مجبور نہیں کرتے، حالانکہ یہ کمالات حیوانی طبقات کے ایسے کمالات ہیں، جہاں تک ہزار ہا ہزار سال کی کد و کوشش کے باوجود، جیسا کہ گذر چکا، انسانوں میں امیروں کا طبقہ بھی نہیں پہنچ سکا ہے، تا بغربا چہ رسد؟

زندگی کی کسی ایسی کمالی سہولت سے محرومی جو کسی دوسرے کو میسّر ہو، اگر محرومی کا صرف یہی واقعہ مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہونے والی کوفت کا سبب ہوتا، تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں یہی بات پائی جا رہی ہے۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود محض اس لئے کہ، جن دُوسروں کو یہ کمالات میسّر ہیں، وہ ہمارے ابنائے جنس سے تعلق نہیں رکھتے یعنی وہ آدمی نہیں طاؤس ہیں، درندے ہیں، چرندے ہیں، پرندے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق قطعاً ایک غیر منطقی فرق ہے۔ دُوسرا کوئی ہو، وہ بہرحال دُوسرا ہی ہے۔ خواہ اس کی شکل آدمیوں

کی سی نہ ہو، پس غیر انسانی شکل وصورت رکھنے والے دوسروں کے متعلق کمالاتی وصفاتی تفاوت کے اس اختلاف کو ہم جب ہنسی خوشی کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، اور برداشت کے لفظ کا اطلاق تو اُس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ ان دوسروں کے کمالات کے مقابلہ میں اپنی بے کمالی، یا ان کمالات سے محرومی کا خطرہ بھی تو پیدا نہیں ہوتا، ایک طے شدہ فیصلہ کی شکل میں ہم بھی گذر رہے ہیں، وہ بھی گذر رہے ہیں۔ اپنے حالات میں ہم بھی مگن ہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ دوسرے بھی ہم سے اور ہمارے صفات وکمالات سے بے تعلق ہو کر اپنے اپنے حالات میں سب مست ہیں۔

بہرحال دوسروں کو ملا اور ہم محروم ہیں، مطلقاً اس کا گلہ تو کسی میں نہیں پایا جاتا، اور جو چیز پائی جارہی ہے، وہ ایک حد تک اس کے برعکس ہے یعنی جن دوسروں کے متعلق اپنے ہونے کا خیال آدمی قائم کر لیتا ہے، جس حد تک "اپنائیت" کا یہ تعلق قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ کمی وبیشی، ترجیح وتفضیل کی شکایت وحکایت اسی نسبت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان ہی کے کمالات وصفات کو دیکھ دیکھ کر آدمی زیادہ کڑھتا اور جلتا ہے۔ جنہیں وہ اپنی ذات سے قریب پاتا ہے۔ جس کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔

یہ ساری علامتیں کس بات کی ہیں؟ اسی حقیقت کی، کہ مدارج ومراتب کے اختلاف کی جانب جن بے چینیوں، دُکھوں اور تکلیفوں کو منسوب کر کر کے دنیا میں آج ہنگامے برپا کئے جارہے ہیں، فرضی، من گھڑت، یکطرفہ داستانیں بنا بنا کر عصبی امراض کے بیماروں کو ہول دلی میں مبتلا کر رہے ہیں۔ یک چشمی شعرا، میدانوں میں اتر پڑے ہیں، ان کی شاعری مبالغہ اور اغراق، غلو وافراط کے انتہائی نمونوں کو پیش کر کر کے ان مسکینوں کو، جو صرف دوسروں کی اُگلی ہوئی باتوں کی جگالی کر سکتے ہیں یعنی بدماغ خود و بعقل خویش جو کچھ سوچ نہیں سکتے۔ ان ہی بے چاروں کو آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے سارے عصر مہیجات، جن سے کام لینے والے اس زمانے میں کام لے رہے ہیں۔ بجائے واقعات کے حقیقت بیں نگاہوں میں ان کا زیادہ تر تعلق ذہنی احساسات اور وہمی تاثرات سے ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دوسروں کے ساتھ قدرت کے ترجیحی سلوک اور برتاؤ کا مشاہدہ تو ہمارے جذبات میں کسی قسم کی کوئی جنبش نہیں پیدا کرتا یعنی وہی قدرتی کمالات جو پرندوں کو، درندوں کو عطا ہوئے ہیں اور نوع انسانی کے افراد ان سے محروم ہیں۔ جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ان ترجیحی کمالات کی فہرست مختصر نہیں ہے۔ مگر احتجاج

واعتراض تو کجا، سچ پوچھیے تو کسی کی ان پر نظر بھی نہیں پڑتی۔ اس کا خطرہ بھی نہیں گزرتا کہ جن کمالات وصفات سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے۔ دُوسروں کو ان ہی سے کیوں سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن بجائے ان کے اگر خود ہمارے ابنائے جنس کے ساتھ قدرت اسی قسم کا کوئی ترجیحی سلوک کرتی ہے۔ تو ہم اپنے بال نوچنے لگتے ہیں، چھاتیاں پیٹتے ہیں۔ اور اب تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمیں دوسروں کو نوچنے کھسوٹنے پر بھی اکسانے والے اکسا رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کی ان حرکتوں ہی کو جائز قانونی افعال کی حیثیت سے چاہا جا رہا ہے، کہ دے دیا جائے۔ بلکہ بعض ممالک میں دیا جا چکا ہے۔ حالانکہ بجائے اپنوں کے دوسروں کے ساتھ قدرت کا یہ معاملہ ہمارے غیظ و غضب کے جذبات کا نشانہ بننے کا زیادہ مستحق اور زیادہ صلاحیت رکھتا تھا۔ آخر اپنوں کے کمالات و فضائل کو تو ایک حد تک ہم اپنی طرف منسوب کر کے گونہ تسلی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اگر کوئی چیز میسر نہ آسکی تو یہی کیا کم ہے کہ ہمارے بھائی کو اس سے استفادہ کا موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ ہم اگر پیدل چلنے پر مجبور ہیں، تو ہماری تسکین کے لئے یہی انتساب کافی ہو سکتا تھا کہ ہماری انسانی برادری کے کسی فرد کو موٹر، اور ہوائی جہاز پر سیر کرنے کی صورت فراہم ہو گئی ہے۔ چیلوں اور گرگسوں کی فضائی سیر کے مقابلہ میں اسی سیر کا کسی انسان کو میسر آ جانا چاہیئے تھا کہ ہماری بشاشت اور مسرّت کا باعث ہوتا۔ واقعہ کا تقاضا اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔

لیکن اس عقلی فیصلہ کے خلاف نتائج و آثار کا ظہور جب اس کے برخلاف معکوس شکلوں میں ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے، کہ باہم افرادِ انسانی میں ترجیحی سلوک اور مدارج و مراتب کے اختلاف کو دیکھ دیکھ کر غم و غصے کی جو لہریں دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں یہ عقل کا نہیں، وہم کا، اور صحیح منطقی فکر کا نہیں، بلکہ مغالطوں کا اور صرف مغالطوں کی کرشمہ پردازیوں کا نتیجہ ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ آیتِ قرآنی

ولاتتمنوا ما فضل اللّٰہ
بہ بعضکم علیٰ بعض

اور نہ آرزو کیا کرو، ان چیزوں کی جن کی
وجہ سے برتری بخشی ہے خدا نے بعض کو تم میں سے
بعض پر!

میں جہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں ۔ وہیں برتری اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما کر یہی چاہا ہے کہ بیجا گشتی مغالطوں سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے مسلمانوں کو نجات

عطا فرمائی جائے۔ حاصل یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں اور حاجتوں کی حد تک سوچنا، اور اسی کے مطابق جد و جہد کرنا، یہ اور بات ہے۔ اور فیتے لگا لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھائے لوگ جو غم نداری بز بخر کے عارضہ میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ قطعاً دوسری چیز ہے۔ سعی و عمل کے تو ہم مکلف ہیں۔ اسلام میں اس کی جو اہمیت ہے آغازِ بحث میں اس کی تفصیل گذر چکی، لیکن ناپا ناپی کے ان قصوں میں مبتلا ہو کر لوگ جو ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، اور اسی کا نام انہوں نے دنیاوی فکر اور معاشی تردّد رکھ چھوڑا ہے کسبِ معاش کی ٹھوس، مادّی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایک خود ساختہ غم خود پرداختہ الم ہے۔ جس میں اپنی سبک مغزی کی وجہ سے وہی مبتلا ہو جاتے ہیں، جن میں زندگی کے واقعی اور غیر واقعی حقیقتوں میں تمیز کا سلیقہ نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدارج و مراتب کے اختلاف کے جس قصہ کو آج اتنی بلند آہنگیوں سے جو اچھالا گیا ہے، اتنا شور برپا کیا گیا ہے کہ زمین کانپنے لگی ہے، آسمان تھرا رہا ہے، اور اسی کو معاشی گتھیوں میں سب سے زیادہ "الجھی ہوئی گتھی" قرار دے دے کر اس کے سلجھانے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جا رہا ہے۔ اور ایک سلجھی ہوئی صاف بات کو خواہ مخواہ الجھا کر خود بھی لوگ الجھ رہے ہیں۔ دوسروں کو بھی اُلجھا رہے ہیں۔ ایک خود آفریدہ پھندے کو کھولنے کے لئے بلا وجہ پھندوں پر پھندوں کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں، ایک سیدھی بات کو بیسیوں اُلٹی تدبیروں سے اُلٹ رہے ہیں، سینکڑوں بلکہ سچ یہ ہے کہ لاکھوں لاکھ سال کے تجربات نے نسلِ انسانی کو زندگی کے جن ٹھوس نتیجوں تک پہنچایا تھا، اسی لاحاصل سعی کے درپے ہو کر بیک گردشِ قلم سب کو غلط اور مہمل ٹھیرا دیا گیا۔ جو آسمان تھا اُسے زمین اور جو زمین تھی اُسے آسمان بنا دیا گیا۔ ایک فرضی زخم کو اچھا کرنے کے لئے نت نئے آپریشنوں سے معاشرہ کے جسد کو چھلنی کر دیا گیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، منطقی تجزیہ و تحلیل کی معمولی کارروائی کے بعد ان ساری سنعزی شورشوں کی تہہ میں چند دُور از کار اوہام بے معنی اور بے بنیاد وساوس کے سوا کیا اور بھی کچھ نکلا؟

زیادہ سے زیادہ کہنے والے، اس سلسلہ میں اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ مدارج و مراتب کے ان اختلافات سے جس اندرونی کوفت کو آدمی محسوس کرتا ہے، مان لیا جائے کہ واقعاتی نقطۂ نظر سے اس کی تہہ میں کچھ نہ ہو، لیکن اتنا تو بہرحال تسلیم ہی کرنا پڑے گا، کہ اپنے ابنائے جنس کی بلندیوں اور برتریوں کو دیکھ دیکھ کر پستیوں میں زندگی گذارنے والوں کے دلوں

میں بجا ہو یا بے جا، بلا وجہ ہو یا کسی وجہ سے، لیکن کوفت اور خلش پیدا ضرور ہوتی ہے۔ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اسے جانے دیجیے۔ لیکن جب پیدا ہوتی ہے، ہوتی رہتی ہے، تو ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا، کہ بنانے والے نے انسان کی فطرت کو بنایا ہے۔ اس نہج اور افتاد پر، کہ غیروں کی نہیں، بلکہ اپنوں کی، اپنے ابنائے جنس کی برتریاں اس سے دیکھی نہیں جاتیں۔ "اپنائیت" کا یہ رشتہ جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، کوفت کے اس احساس کی شدّت بھی اسی نسبت سے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس لئے ہوتی ہے، وہ واقعہ نہ ہو لیکن بجائے خود یہ کوفت انسانی فطرت کا تو ایک واقعہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے۔ منطق لاکھ ثابت کرتی رہے، کہ تڑپنے والوں کی یہ تڑپ بے معنی ہے۔ غیروں کی نہیں، بلکہ اپنوں کی خوش حالیوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے مسرور ہونے کے بدحال ہونا، بدعقلی کی بات ہی سفیہانہ فعل ہے۔ فرومایگی اور انتہائی کمینہ حرکت ہے۔ یہ حسد ہے حسد کا وہ پتھر ہے جو بجائے محسود کے پلٹ کر حاسد ہی کے سر کو لہولہان اور اسی کی کھوپڑی کو چکنا چور کرتا ہے۔ اپنی سلگائی ہوئی آگ میں حاسد کو خود ہی جھلسنا اور جلنا پڑتا ہے!

مگر سب کچھ سُن لینے، سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی دیکھا یہی جاتا ہے کہ پستی و بلندی، فراز ونشیب کے اس تماشے سے آدمی کی فطرت عموماً وہی اثر لیتی ہے، جسے عقلاً و اخلاقاً نہ لینا چاہیے تھا فطری جذبے کا زور عقلی پند ناموں کے اوراق کو اُڑا اُڑا کر تتر بتر کر کے رکھ دیتا ہے۔ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی پانے والے اپنے اندر جب پاتے ہیں تو کوفت کی اسی کیفیت کو پاتے ہیں۔ جسے چاہئے تھا کہ وہی پاتے جنھوں نے نہیں سمجھا ہے۔

یقیناً یہ سوال ہی۔ ایسا سوال ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے بے اعتنائی درحقیقت انسانی فطرت کے ایک واقعہ سے بے اعتنائی ہوگی۔ کم از کم قرآن کا جو طرزِ عمل اس باب میں ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے۔ بلاشبہ اس نے ان ترجیحی سلوکوں کے متعلق "فتنہ بازی" کی بدعات سے جیسا کہ ابھی گذرا، ندکا ہے۔ لیکن دوسروں کی بلندیوں کو دیکھ کر پستی میں رہنے والوں کے اندر ان بلندیوں کی آرزو کا پیدا ہونا، اس آرزو کی نہ پوری ہونے کی صورت میں آدمی کا جھنجلانا اور کڑ کڑانا قلق اور بے چینی میں مبتلا ہونا، چونکہ یہ بھی انسانی جبلّت کا اقتضاء ہے۔ ایسا اقتضاء جسے جبلّت سے نکالا نہیں جاسکتا۔ ابھی پیغمبر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے لیکن جبلّت میں جو کچھ ہے اسے کوئی نہیں نکال سکتا اور یہی وہ راز ہے کہ بجائے ازالہ کی فضول کوشش کے امالہ کی اسی پرانی ترکیب سے اسلام نے اس مسئلہ میں بھی کام لیا ہے اور اسی کا ذکر اس مقام پر میرا اصل

مقصود ہے۔

مختلف طریقوں سے یہ سمجھاتا چلا آرہا ہوں، کہ انسانی معاشرہ میں مدارج ومراتب کا اختلاف درحقیقت افراد کے صفاتی وکمالاتی تفاوت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں اور قرآن ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے، ضمناً پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کرچکا ہوں، کہ مدارج و مراتب کے اس اختلاف کا ایک سلسلہ تو وہ ہے، جس کا تعلق زندگی کے غیر معاشی شعبوں سے ہے مثلاً ہم میں سے کسی کا حسین ہونا، کسی کا زشت رُو، کریہہ المنظر ہونا، کسی کی طبیعت کا لگاؤ شعر وشاعری سے ہے، اور دُوسرا، ریاضی وحساب کی باریکیوں سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی ہم میں صنعت وحرفت کا دلدادہ ہے اسی میں اس کا جی لگتا ہے اور کسی کو مابعد الطبیعاتی مسائل وکلیات کے سلجھانے میں مزہ ملتا ہے۔ ترجیح وتفضیل یا قرآنی الفاظ میں فضلنا بعضہم علی بعض کے اس سلسلہ کی تفصیلات لامحدود ہیں!

اسی کے مقابلہ میں ترجیح وتفضیل، برتری وکمتری، بلندی وپستی کا دُوسرا مستقل سلسلہ وہ ہے جس کا تعلق زندگی کے خاص معاشی حالات سے ہے۔ قرآنی اصطلاح میں یوں کہئے کہ الرزق کے لحاظ سے انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر جو برتری وفضیلت بخشی گئی ہے۔ نتیجۃً جس کی وجہ سے ہم میں بعض فراخی وفراغت کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ قرآن میں جس کی تعبیر بسط سے کی گئی ہے۔ اور بعض لوگ ضیق معاش اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، قرآن نے رزق کی اسی حالت اور کیفیت کا نام قدر رکھا ہے۔

**بسط وقدر کی قرآنی اصطلاح کی تشریح**

بات یہ ہے کہ الرزق یا روزی بعضوں کو تو بقدر ضرورت ملتی ہے، بالفاظ دیگر جن کا دخل بہ مقدار خرچ اور آمدنی، بالکل ٹھیک ضرورت کے مطابق نپی تُلی حالت میں، اس طور پر ہوتی ہے کہ ضرورت میں خرچ ہونے کے بعد بچ کر کوئی پس انداز سرمایہ انہیں ہاتھ نہیں آتا۔ لغت میں قدر کا یہی مفہوم ہے یعنی واقع میں جو چیز جیسی ہو ٹھیک اسی کے مطابق اندازہ قائم کرنا۔ یہی قدر کے لغوی معنی ہیں، اور اسی لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسی آمدنی، جو بالکل خرچ کے برابر برابر، ایک دم، بالکلیہ اس کے مطابق ہو۔ اسی کا نام رزق مقدور ہے یعنی ضرورت کے مطابق نپی تُلی روزی اور اسی رزقِ مقدور کے مقابلہ میں، بعضوں کی آمدنی کا پیمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ رزق کے اسی چھلکنے کا نام بسطی پیمانہ ہے۔ اور جو رزق اس پیمانہ پر ملتا ہے، اس کا نام رزقِ مبسوط ہے، کیونکہ بسط کے معنی پھیلانے کے ہیں۔ گویا آمدنی کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس کا دامن خرچ کے حدود سے وسیع اور آگے نکل

کر پھیلا ہوا ہے۔

بہر حال مدارج و مراتب کے اعتبار سے ترجیح و تفضیل کی یہ دو مستقل صورتیں ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے، کم و بیش ہر دو حالات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنہیں برتری عطا کی جاتی ہے، ان کو دیکھ دیکھ کر نہ پانے والوں اور محروم رہ جانے والوں میں ترجیح و تفضیل کی ان دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی حد تک اپنی محرومی کا احساس عموماً پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی احساس سوزش اور کوفت کی شکل بھی بسا اوقات اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے، خاص معاشی شعبہ میں بعضوں کی بعضوں پر برتری یعنی الرزق کے لحاظ سے کسی کا بسط کی حالت میں ہونا اور کسی کا قدر کی حالت میں ہونا قدر والوں کے لئے زیادہ جانگزا اور سوہانِ رُوح کا زیادہ سبب بن جاتا ہے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ گو ضرورت تو اماله کی ترکیب کی ترجیح و برتری کی دونوں صورتوں میں ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، قرآن نے اس مسئلہ میں جتنی توجہ معاشی شعبہ کی طرف اماله کی تدبیروں میں کی ہے، اتنی توجہ غیر معاشی سلسلہ کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ اور ہے بھی یہی بات کہ اس شعبہ میں مدارج و مراتب کے اختلاف اور اس کے نتائج کے آثار کو جتنی اہمیت ہر زمانہ میں حاصل رہی ہے، اتنی اہمیت اسی اختلاف کے دوسرے ابواب کو شاید کبھی نہیں دی گئی۔ اس زمانے میں بجائے اماله کے تفاوت و اختلاف کے اس تفقہ کے ازالہ یا بالکلیہ ختم کر دینے پر جو زور دیا جا رہا ہے زیادہ تر اس کا تعلق بھی اسی تفاوت و اختلاف سے ہے جو رزق اور معائش کے لحاظ سے انسانی معاشرہ کے افراد میں پایا جاتا ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ اماله کی ان ہی تدبیروں کو جو معاشی شعبہ کے اختلافِ مراتب کے سلسلہ میں قرآن میں پائی جاتی ہیں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دوں۔

مطلب یہ ہے کہ معاشی لحاظ سے جو قدر و تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں یعنی رزق و معاش رکھنے والوں کے لحاظ سے ان کے اندر شکوہ و شکایت، غم و غصہ کے جو جذبات متلاطم ہوتے رہتے ہیں، اگرچہ بظاہر ان کا تعلق ان ہی لوگوں سے معلوم ہوتا ہے، جو باوجود ان ہی جیسے انسان ہونے، ان ہی کے ہم نسل، ہم قوم، بلکہ بسا اوقات ہم خاندان، ہم چشم ہونے کے ایسی آمدنیوں سے متمتع ہوتے رہتے ہیں کہ خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں غریب قدری، رزق پانے والا بجائے گا تو کیا۔ بسا اوقات اپنی آمدنی کے مُنہ کو گذرنے والے سال، یا مہینہ، یا ہفتہ، یا دن کے مصارف سے ملانے میں دشواری اور سخت دُشواری محسوس کرتا ہے۔ اور یہی حال اسے ان اندرونی سوزشوں، اور فکری کدوکاوشوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ جن کا نام دُنیا میں معاشی پریشانیاں و رزقی

حیرانیاں ہیں، ایسی صورت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدری رزق والوں کے جذبات غیظ و غضب، گلہ و حکایت، شکوہ و شکایت کا ایک رُخ اگرچہ بسطی رزق والوں ہی کی طرف ہوتا ہو لیکن شعوری یا غیر شعوری، دانستہ یا نادانستہ طور پر سب میں نہ سہی، لیکن اکثریت میں ایک رُخ ان ہی جذبات کا محسوس یا نامحسوس شکلوں میں خود اس ذات کی طرف بھی کسی نہ کسی شکل میں ضرور رہتا ہے جس کے متعلق آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسی نے تقسیم رزق کے اس اختلاف کو قائم کر کے ہمیں ان حالات میں مبتلا کر دیا ہے۔ خواہ ادباً یا اس خوف سے کہ قدری پیمانے پر بھی جو رزق مل رہا ہے، کہیں وہ بھی بند نہ ہو جائے۔ زبانوں پر حرفِ شکایت نہ آتا ہو، بلکہ شکوہ و شکایت کی جگہ شکر و حمد ہی میں لوگوں کو کیوں مشغول نہ پایا جاتا ہو، بلکہ سچ یہ ہے کہ ذاتِ حق جیسی بدیہی ہستی جس کے متعلق قرآن نے

| | |
|---|---|
| افی اللّٰہ شک فاطر السموات | کیا اللہ میں شک ہے، آسمانوں اور زمین |
| والارض | کے پیدا کرنے والے میں؟ |

کا استعجابی و استبعادی سوال شکیوں سے اسی بداہت اور کامل وضوح ہی کی بنیاد پر کیا گیا ہے دراصل شک کے یہ مدعی اگر غور کریں گے، تو وہ پائیں گے کہ خدا سے "روٹھ" کی جو کیفیت کسی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ درحقیقت "روٹھ" کی اسی کیفیت کی غلط تعبیر وہ شک سے کر رہے ہیں اور زیادہ تر بندوں میں اپنے خدا سے روٹھ کا یہ احساس جہاں تک میں نے دیکھا ہے۔ ان ہی معاشی ترجیح و تفضیل کے قصّوں ہی سے اس کے دامن کو بندھا پایا ہے۔ اندر ہی اندر لوگوں میں یہ یا اسی قسم کے وسوسوں کا سبچار اُٹھتا رہتا ہے کہ آخر ہم بھی جب خدا ہی کے بندے ہیں تو ہمیں محروم رکھ کر، یا ہمیں قدر کی حالت میں رکھ کر دوسروں کو بجائے قدر کے قانونِ بسط کے تحت کیوں دیا جا رہا ہے، خصوصاً شکایت کا احساس اس وقت ذرا زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ جب بسطیوں کے مقابلہ میں قدریوں کو اپنے اندر کسی کمال کے پائے جانے کا احساس غلط یا صحیح، کسی طور پر پیدا ہو گیا ہو۔ کچھ بے دینی اور الحاد کے ان ہی دنوں میں نہیں، جن سے دُنیا آج گذر رہی ہے، بلکہ اس زمانے میں بھی، جس کا نام مذہبیت اور دینیت کا زمانہ ہے۔

کہنے والے یہ کہتے چلے آئے ہیں۔ بچپن میں ہم جب مختصر المعانی پڑھتے تھے تو عربی کے یہ دو شعر، جو سینکڑوں سال پرانے، کسی عربی شاعر کے ہیں، پڑھائے گئے تھے ؎

کم عاقلٍ عاقلٍ اعیت مذاہبہ     وجاہل جاہل فی الارض مرزوقا

ھذا الذی ترک الاوھام حائرۃ و صیر العالم النحریر زندیقا

جس کا مطلب وہی ہے کہ

"کتنے علم و دانش، عمل و کردار والوں کو زندگی کی راہوں نے تھکا تھکا مارا ہے، اور کتنے نادان، اَن پڑھ، جاہل، بے عمل غافلوں کو دیکھا جاتا ہے، جنہیں زمین پر روزی پہنچائی جا رہی ہے، یہی واقعہ ہے جس نے انسانی سمجھ کو حیرت میں ڈال رکھا ہے، اور بڑے بڑے جلیل فاضلوں کو اسی نے زندیق اور بے دین بنا کر چھوڑ دیا"

شاید اسی کا ترجمہ حافظؒ نے اپنے اِن مشہور شعروں میں کیا ہے ؎

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است ٭ قوت دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں ٭ طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

ظاہر ہے کہ شاعر کا ہر حال یہ شعر ہی ہے جس کا بالکلیہ واقعہ کے مطابق ہونا ضروری نہیں، شاعری شاعری ہی کب باقی رہتی ہے، جب وہی کہا جائے جو ہے، آخر شاعر کا یہ دعویٰ کہ زمین پر صرف جاہلوں اور غافلوں ہی کو روزی پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ زندگی گذارنے والوں میں کوئی ایسا طبقہ بھی ہے جسے رزق سے بالکلیہ محروم رکھا جاتا ہے۔ بھلا رزق سے محرومی کے بعد کوئی جی ہی کب سکتا ہے۔ بس واقعہ تو یہی ہے کہ جو بھی یہاں جی رہے ہیں، یا جن کو خدا کی اس زمین پر جتنے دن تک بھی جینے کا موقعہ عطا کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک کے لئے الرزق کے جس مقدار کی حقیقی اور واقعی ضرورت ہے تو وہ تو سب ہی کو پہنچ رہی ہے۔ اگر وہ نہ پہنچتی تو شکوہ کرنے کے لئے شاکیوں کا یہ گروہ جیتا ہی کیسے؟ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ رئیسہ اعضا ہوں یا مرؤسہ ہر ایک کے تحلیل یافتہ اجزاء کا بدل سب ہی کے لئے مہیا ہو رہا ہے۔ مافات کی تلافی کا عمل سب ہی میں جاری ہے۔ آنکھوں میں نُور، دلوں میں شعور، بازوؤں میں زور تو سب ہی کے بھرا جا رہا ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ صرف باہر میں ہے۔ یعنی جن چیزوں سے توانائیوں کے یہ ذخیرے مختلف افراد میں تقسیم ہو رہے ہیں، رنگ و بُو، شکل و صورت، ذائقہ اور مزے کے لحاظ سے اختلاف اگر کچھ پایا جاتا ہے تو ان ہی بیرونی صفات میں پایا جاتا ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ توانائیوں کے یہی ذخیرے کسی کے لئے پلاؤ قورمے سے مثلاً مہیا ہو رہے ہیں۔ اور کسی میں نانِ جویں اور نمک ہی سہی۔ لیکن باہر کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد جب وہ "اندر" پہنچ جاتے ہیں

تو پھر ان میں مشکل ہی سے امتیاز باقی رہتا ہے۔ امجد نے سچ کہا ہے ؎

پیٹ میں لقمۂ تر، نانِ جویں یکساں ہے!

سب ہی دیکھتے ہیں، سب ہی سُنتے ہیں، سب ہی چلتے ہیں، پھرتے ہیں، الغرض جن توانائیوں کا ظہور ایک سے ہوتا ہے ان ہی کا ظہور دُوسرے سے بھی ہو رہا ہے۔ بلکہ قوت و طاقت کے مظاہر کی کثرت کن میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے تو شاید کچھ بات اس سے بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اسی نقطہ پر بحث اگر ختم بھی کر دی جائے۔ جب بھی ہر حال میں شاعر کو جھٹلا کر قرآنی آیت

| | |
| --- | --- |
| وما من دابۃ الا علی اللہ | اور نہیں ہے کوئی چلنے والا مگر اس کی |
| رزقھا! | روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے! |

کے مشاہدہ ہی کی تصدیق ہر اُس شخص کو کرنی پڑتی ہے، جو بجائے "شعر" کے واقعات کو واقعات ہی کے رنگ میں دیکھ رہا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حد تک تو شاعر کا بیان اگرچہ شعر ہے۔ اس نے مبالغہ اور غلو کا رنگ جس واقعہ میں بھرا ہے۔ دراصل یہ ترجیحی اور تفضیلی سلوک ہی کا واقعہ ہے جو مختلف افرادِ انسانی میں پایا جاتا ہے۔ پسطیوں کو دیکھ کر قدریوں کو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ قدرت کے وہ مرزوق ہی نہیں ہیں۔ باوجود پانے اور بہت کچھ پانے کے مقابلہ کے بعد گویا، باور کرنے لگتے ہیں، کہ انہوں نے کچھ نہیں پایا ہے۔ اور یہی چیز خدا اور خالق کے متعلق ان کے دلوں میں اعتراض و احتجاج کی اس کیفیت کو پیدا کرتی ہے جس کا نام میں نے "روٹھ" رکھا ہے۔ کمزور اعصاب والے اپنی اس روٹھ کو غیظ و غضب کی شدت میں تھلا کر کبھی کبھی "شک" بھی کہہ دیتے ہیں، یا ممکن ہے کہ شک کی صورت میں اس کیفیت کو بدل دیتے ہوں، لیکن لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں، عام حالات میں اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ روٹھ ہی کی اس کیفیت سے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ شک نہیں بلکہ اپنے پیدا کرنے والے سے ایک قسم کا مخفی احتجاج اور غم و غصہ کی ایک مستور شکل ہوتی ہے۔ ہمیں بھی وہی سب کچھ کیوں نہیں دیا گیا، جو دوسروں کو دیا گیا۔ اگر وہ بھی آپ کے بندے ہیں تو ہم کیا کسی دُوسرے کی مخلوق ہیں؛ مبہم غیر مبہم، واضح غیر واضح شکلوں میں اسی قسم کی بھنبھناہٹ، کڑکڑاہٹ، لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وارستہ مزاج شاعر نے جو یہ کہا تھا ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالبؔ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تو اس کی تہہ میں آپ ہی بتائیے کہ شکایت کے اس باطنی احساس کے سوا اور بھی کچھ ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ الرزق یا معاشی لحاظ سے مدارج و مراتب کے اختلاف کی بنیاد پر قانونِ قدرت کے تحت روزی پانے والوں میں غم و غصہ کی کیفیت ایک تو ان لوگوں کے لحاظ سے پیدا ہوتی رہتی ہے، جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ بسطی پیمانہ پر رزق پا رہے ہیں۔ ان ہی کو سامنے رکھ رکھ کر قدریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو مثلاً مکان، سواری، لباس خوراک وغیرہ کو ناپتا رہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسی کے ساتھ دوسری طرف اسی احساس کا ایک رُخ دانستہ یا نادانستہ، گفتہ یا ناگفتہ شکلوں میں خود پیدا کرنے والے خالق کی طرف بھی ہوتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ الرزق اور معاش میں یہ ترجیحی عمل اور فضلنا بعضہم علی بعض فی الرزق کا یہ تماشا بہر حال تقسیمِ رزق کے خدائی قانون ہی کا نتیجہ ہے۔ کم از کم جن قوموں میں کھل کر ابھی خدا کے انکار کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ان کے اس احساس کا ایک رُخ بہرحال خدا کی طرف بھی ضرور ہوتا ہے۔ اب خواہ ان تاثرات کا حقیقی مادی واقعات سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بالآخر ان احساسات کی انتہا انسان کی اسی جبلّت، اور ان کی آخری تان ان ہی اقتضاءات پر ٹوٹتی ہے۔ یعنی پیدا کرنے والے نے جن پر انسان کو پیدا کیا ہے۔

اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہی وجہ ہے اس بات کی، کہ قرآن میں اس سلسلہ کے تاثرات و احساسات کے ان دونوں رُخوں کے امالہ کی الگ الگ تدبیریں پائی جاتی ہیں اور اب آپ کے سامنے امالہ کی ان ہی قرآنی تدبیروں کو دو الگ الگ عنوانوں کے نیچے درج کرتا ہوں۔

پہلی صورت، یعنی خود اپنے ابنائے جنس کے لحاظ سے غم و غصہ کی، یہ کیفیت، جو دلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے رُخ کو پلٹنے کے لئے میرے خیال کے مطابق فطرتِ انسانی کے ایک دوسرے جبلّی اور فطری جذبے ہی کو اُبھار کر قرآن نے امالہ کی صورت پیدا کرنا چاہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بجائے اختلاف و تفاوت، نشیب و فراز کے معاشی حیثیت سے تمام افرادِ انسانی کو ہم سطح اور برابر برابر کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے معنی کیا ہوں گے ؟ یہی نا کہ جس طرح خدا کی اسی زمین پر جی اور جان رکھنے والی ہستیوں کی حیوانی طبقات میں اپنی خود اکتفائی زندگیوں کی بدولت ایک دوسرے سے الگ تھلگ اس طریقہ سے جو زندگی بسر ہو رہی ہے کہ اس کو نہ اس کی ضرورت ہے، نہ اس کی اُس کو الف، بے سے بے نیاز ہے، اور بے الف سے گویا چاہا جاتا ہے کہ بنی نوعِ انسانی کے افراد کو بھی

اسی قانون کے تحت زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔

آخر حیوانی طبقات کو خود اکتفائیت کی اس بے نیازانہ زندگی سے متمتع ہونے کا موقع، جو یہاں مل گیا ہے۔ تو رزقی اور معاشی مساوات کے قانون کے سوا اس کی وجہ، بتایا جائے کہ اور کیا ہے؟ یہی بات، کہ اپنی اپنی ضرورت اور حاجت کے مطابق دانہ گھاس، آب وخور دوسرے کی امداد کے بغیر چونکہ ان میں ہر ایک کو میسّر آ رہا ہے اور اس طور پر میسّر آ رہا ہے، کہ ہر جنس اور ہر صنف کے ایک فرد کو جو کچھ ملتا ہے، وہی دوسرے کو مل رہا ہے۔ اس لئے ان میں ہر ایک تشفی یافتہ زندگی گذار رہا ہے۔ اور اسی لئے کسی کو کسی کی حاجت نہیں ہے۔ اب سوچنا چاہئے کہ بنی نوع انسانی کے افراد کو بھی معاشی اعتبار سے ہم سطحیت و مساوات کے اسی قانون کے تحت اگر رکھا جاتا تو اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ جیسے بکروں، بیلوں، گھوڑوں، گدھوں وغیرہ وغیرہ حیوانی انواع اور نسلوں کے افراد قطعاً ایک دوسرے سے بے تعلّق ہو کر جی رہے ہیں۔ یہی حال انسانی افراد کا بھی ہو جاتا۔

یہی مقام ہے۔ اس فطرت کے متعلق غور وخوض کا، جس کا سب سے بڑا امتیازی یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مدنی الطبع ہے۔ یعنی باہمی میل جول، اتحاد واتفاق، ہمدردی وغم خواری، مواساۃ ومؤانست، جس کی زندگی سب سے قیمتی ترین سرمایہ ہے۔ اسی سرمایہ کی حفاظت ونگرانی کے لئے کانفرنسوں کے پنڈالوں، مجالس کے اسٹیجوں، مساجد کے ممبروں سے مواعظ ونصائح کا ایک طوفان جاری ہے۔ "اتفاق"۔ "اتفاق"۔ "ہمدردی"۔ "ہمدردی"۔ "یک جہتی" و "یک دلی"۔ کی آوازوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں کیا زندگی کا وہ منحوس نقشہ جس میں بجائے جوڑنے کے آدمی کو آدمی سے توڑا جائے۔ افتراق وانشقاق بے تعلقی، و جُدائی، علیحدگی و بے نیازی کا یہ وحشتناک منظر، کیا انسانی فطرت کے لئے قابلِ برداشت ہوگا؟

رزقی ومعاشی حیثیت سے مراتب ومدارج کا جو اختلاف نسلِ انسانی کے افراد میں پایا جاتا ہے، قرآن میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے

| | |
|---|---|
| نحن قسمنا معیشتهم فی الحیٰوۃ | ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیٰوۃ الدنیا پست |
| الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض | زندگی، میں ان کی معیشت کو، ان کے درمیان |
| درجات لیتخذ بعضهم بعضا | اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج |
| سخریا۔ | کے لحاظ سے یہ اس لئے کیا گیا ہے، تاکہ انسانوں |

میں بعض، بعض سے کام لیں!

اس کا مطلب آج ہی نہیں، صدیوں پہلے مشہور مفسر قرآن القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

ای یستعمل بعضھم بعضا فی حوائجھم فیحصل بینھم تألف وتضام ینتظم بذالک نظام العالم۔

(ص ۱۸۱ ج ۲)

یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام لیں اور اسی ذریعہ سے باہم انسانوں میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض کے ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔

حاصل اس کا کیا ہوا؟ یہی کہ نوعِ انسانی، جن کے افراد فطرتاً و طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ ان ہی کو بجائے توڑنے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کے قصداً و ارادتاً خود پیدا کرنے والے نے مدارج و مراتب کا یہ اختلاف پیدا کر کے یعنی معاشی لحاظ سے بعضوں کو بعض پر برتری عطا کر کے وحدت و وفاق کا ایسا نظام قائم فرما دیا ہے، کہ ساری انسانی برادری گویا زنجیر کی کڑیوں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ مراتب و مدارج کا وہی معاشی نشیب و فراز ان کی وہی زرتی بلندی، و پستی، جسے کرید کرید کر آج اُبھارا جا رہا ہے، اور اسی اختلاف کو دکھا دکھا کر فساد و جدال، فتنہ و فساد کی جہنم انسانی بستیوں میں بھڑکانے والے بھڑکا رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا، اللہ کی ایک ہلکی سی تدبیر سے اسی اختلاف کو قرآن نے اتحاد و اتفاق کا کتنا مستحکم و استوار ذریعہ اچانک بنا دیا، دُوسرے جس سے جُدائی اور فصل کی فصل کاٹنا چاہتے ہیں، بلکہ کاٹ رہے ہیں، اسلام نے اسی کو میل ملاپ اور وصل کے سدا بہار پھول پیدا کرنے کی تدبیر سے بدل دیا، ایسی تدبیر کہ صرف ذہنی تصورات کے رُخ کی ہلکی سی تصحیح اس کے لئے کافی و وافی ہے۔ غلط نقطۂ نظر قائم کر کے جس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اور اپنے بعد ساری دُنیائے انسانیت کے دُکھ کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اب اسی میں راحت و آسائش کی ضمانت بلاشبہ نظر آ رہی ہے۔

اب کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اور بات ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ احتیاجی تعلقات (جو قانونِ تفضیل "بعض علیٰ بعض" کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ان ہی تعلقات کی بنیاد پر کسی آبادی کے افراد میں اس قسم کی وابستگیوں اور پیوستگیوں کا جو تماشا نظر آتا ہے، کہ دھوبی کمہار کا برتنوں میں محتاج ہے، اور کمہار

اپنے کپڑوں کے دُھلانے میں دھوبی کا۔ حجام زرگر کا، زرگر حجام کا، عالم طبیب کا، طبیب عالم کا، کیمیا والے طبعیات والوں کے، طبعیات والے کیمیا والوں کے، اور اس طویل زنجیرے کی تفصیل کا بجائے کتابوں کے، ہر ملک، اور ہر ملک کی ہر آبادی کے اوراق پر چلتی پھرتی تصویروں کی شکل میں ہر جگہ آپ بآسانی مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا تماشا، اسی تقسیم معیشت اور رفعنا بعضھم علیٰ بعض کے اسی شجرۂ طیبہ یا مقدس درخت ہی کا تو ثمرہ ہے۔ جس کی مختلف شاخوں پر ہر آبادی کے مختلف افراد بیٹھے ہوتے ہیں، یا انسانیت کی زنجیر کے حلقوں کی شکل ہر ایک اختیار کئے ہوئے ہے

الحاصل سب کو سب کچھ دے دیا جاتا، بجائے اس کے قدرت نے یہ طریقہ بنی نوع انسانی کے ساتھ جو اختیار کیا ہے، کہ کچھ نہ کچھ سب کو دے کر ہر ایک کو دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے۔ اگرچہ قدر و قیمت کے اعتبار سے باہمی احتیاج کی یہ کیفیتیں بیسیوں شکلوں میں منقسم ہیں لیکن افراد کی باہمی پیوستگی کا یہ نظام ہے تو اسی تفضیل "بعض علیٰ بعض" کے قانون کا نتیجہ، یعنی بعض کو بعض پر صفات و کمالات، عواطف و رجحانات کے حساب سے جو برتری عطا کی گئی ہے۔ اسی نے ہماری آبادی کو گویا اینٹوں کی اس دیوار کی شکل میں ڈھال دیا ہے، جس کی ہر اینٹ دُوسری اینٹ پر قائم اور اسی سے سہارا لئے ہوئے ہے۔ انسانیت کا یہ مایۂ ناز افتخار کہ ؎

جو عضوے بدرد آورد روزگار | دگر عضو ہا را نماند قرار

اگر سوچا جائے تو اس میں فطری انجذاب کے ساتھ ساتھ احتیاجی تعلّقات کے ان مادّی اسباب کا ہاتھ بھی یقیناً نظر آئے گا۔ اور اسی کا اثر ہے کہ باہم اگر ہم ایک دُوسرے کے ساتھ کبھی اُلجھ بھی جاتے ہیں، تو بالآخر عموماً طبیعت غالب آ کر اس غیر طبعی کیفیت کا ازالہ کر کے تعلّقات کو پھر سلجھا دیتی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ دُنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف پیداواروں کی پیدا کرنے کی صلاحیت جو قدرت نے پیدا کی ہے، نظری وسعت و کشادگی سے اگر کچھ کام لیا جائے تو شاید اس قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| وفی الارض قطع متجاورات | اور زمین میں باہم ملے جلے قطعات ہیں |
| وجنّات من اعناب وزرع | اور باغ ہیں انگوروں کے، اور کھیت |
| ونخیل صنوان وغیر | ہیں، درخت ہیں، چند تنے والے، اور |
| صنوان یسقیٰ بماء واحد | ایک تنے والے، سینچے جاتے ہیں، ایک |
| نفضل بعضها علیٰ بعض | ہی پانی سے اور برتری بخشتے ہیں بعض کو |

سے بھی ذہنوں کو چاہا جائے۔ تو اسی واقعہ کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سب کچھ، ہر ملک اور ہر ملک کے ہر علاقہ اور قطعہ میں جو نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ضرورت کی مختلف چیزوں کو قدرت نے مختلف ممالک اور ان ممالک کے مختلف قطعات کے ساتھ جو مختص کر دیا ہے، کسی کو معدنیات، کسی کو زرعیات کسی کو مصنوعات، اسی طرح مختلف حاجتوں کا مختلف اقالیم اور کشوروں کے ساتھ خصوصی تعلق جو نظر آتا ہے، میرے خیال میں تو یہ بھی وہی "تفضیل بعض علی البعض" ہی کی ایک وسیع شکل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ سے کسی آبادی ہی کے افراد کو نہیں، بلکہ مختلف بلاد و امصار میں بکھری ہوئی انسانی برادری کو بھی باہم مربوط رکھنے کا کام قدرت لینا چاہتی ہے۔ اور لینا چاہتی ہے کیا معنی؟ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے دُور دراز ممالک کے رہنے والوں میں مختلف قسم کے جو تعلقات نظر آتے ہیں، مواصلات کی جو آسانیاں آج مہیا ہیں۔ جس زمانے میں ان کا پتہ بھی نہ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کے تاجر دوسرے ملکوں میں، ہندوالے، سندھ میں، سندھ والے ایران میں، ایران والے عرب کے سواحل پر، عرب کے باشندے بحر روم کے کناروں پر، فنیقیہ والے وینس، اور یورپ والے دُوسرے شہروں میں جو گھومتے پھرتے تھے۔ بتایا جائے کہ بجز اسی احتیاجی رشتہ کے اور کونسی چیز تھی۔ جس نے کرۂ زمین کے بُعد المشرقین پر رہنے والوں کو یوں جوڑے رکھا تھا؟

یقیناً یہی قدرتی رشتہ تھا، جس میں مشرقِ بعید کے بعید تر نقاط، مثلاً جاپان و چین کے باشندے اور مغربی آبادیوں کی آخری حدود تک کے رہنے والے، اور جو ان کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے، سب کے سب تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے اور پھولوں کے ہار کے مانند ایک دُوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ ہر علاقہ کا آدمی دُوسرے علاقہ میں گھومتا رہتا تھا۔ قافلوں کا ایک سلسلہ تھا، جو رواں تھا، دواں تھا، ہر ملک کے باشندے دُوسرے ملک کی پیداواروں کیلئے چشم براہ رہتے تھے۔ ہندوستان کے رہنے والے استنبول کے قالین، کاشان کے مخمل، چین کے ظروف کو فخریہ استعمال کرتے تھے۔ عرب کے رہنے والے سیفِ مہند، یا تیغ ہندی کے بھروسہ پر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے۔ اور میں کہاں تک تفصیل کروں، کہ کہاں کہاں کے باشندوں کو کن کن ممالک کے جہازوں کا، تری کی راہوں سے، اور کن کن علاقوں کے قافلوں کا خشکی کی راہوں سے انتظار رہتا تھا۔ جزیروں والوں کو دیکھا جاتا تھا کہ اپنے جزیروں کی پیداواروں کو لئے سمندر کی طرف جھانک رہے ہیں کہ ان کی ضرورت کی چیزوں کو بدلنے والے کب آتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مصری اور چینی کے الفاظ اسی زمانہ کی تاریخی یادگاریں ہیں شکّر کی خاص قسم کا نام مصری اس لئے رکھ دیا گیا تھا کہ مصر سے وہ ہندوستان آتی تھی۔ اور چینی کو بھی چینی اسی لئے کہتے تھے کہ وہ چین سے درآمد ہوتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ علاج و معالجہ جیسی اہم ضرورت میں بھی ایک ملک بغیر کسی دغدغہ کے دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ قدیم یونانی طب کے نسخوں میں روم کی مصطگی، آرمینیہ کی گِل (مٹی) کشمیر کا بنفشہ خطا (چینی ترکستان) کی بادیان، اور کیا کیا تبادلہ کن کن ملکوں کی پیدا شدہ دوائیں کہاں کہاں استعمال ہوتی تھیں۔ بلکہ آثارِ قدیمہ والے دُور دراز ملکوں کے سکوں کو مختلف علاقوں میں پا پا کر آج جو متحیّر ہو رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بغداد کا سکّہ سائبیریا میں بلکہ ہندوستان کے ڈھلے ہوئے پیسے اور روپے میکسیکو (امریکہ) تک میں جو نکل رہے ہیں، اگر ان قصوں کو بھی

| | |
|---|---|
| نحن قسمنا بینھم معیشتھم | ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیٰوۃ الدنیا |
| فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم | دبستِ زندگی، میں ان کی معیشت کو |
| فوق بعض درجات لیتخذ | ان کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم نے |
| بعضھم بعضاً سخریا۔ | بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ |
| | سے، (اس لئے) تاکہ انسانوں میں بعض، بعض |
| | سے کام لیں! |

کے قرآنی اشارے کی وسیع پیمانے پر تفسیر ہی سمجھا جائے، تو اس کے انکار کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے مگر خدا ہی جانتا ہے کہ کس جُرم کی پاداش میں اچانک یورپ کی سرزمین سے وطنیت کے بھوت نے سر نکالا، وہی بھوت انسانیت پر سوار ہو گیا۔ جھوٹی غیرت، جاہلی حمیّت کے غلط جذبات کو بھڑکا بھڑکا کر ان ہی کو جو ملے ہوئے تاریخ کے نامعلوم قرون سے ملے ہوئے تھے، خود اکتفائیت کے مغالطی ہتھوڑوں سے اچانک توڑ پھوڑ کر جُدا کر دیا گیا۔ دُوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی ضرورتوں کو ہر ملک خود مہیا کرے۔ اسی افتراقی و انشقاقی نظریہ کا غوغا بلند کیا گیا۔ اپنی اپنی منڈیوں میں اپنے اپنے راگ الاپنے کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹوں کی مسجدوں کی تعمیر کا انتظام ہر جگہ درست ہونے لگا۔ ابتداء میں یورپ اور ایشیا جیسے وسیع علاقوں ہی کی حد تک خود اکتفائیت کی یہ تحریک محدود تھی۔ لیکن جس اساسی نقطہ پر اس تحریک کی بنیاد قائم کی گئی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بات ان وسیع علاقوں ہی تک محدود نہ رہے، کھُلی ہوئی بات ہے کہ ہر ہر اقلیم مختلف ملکوں میں اور ہر ملک مختلف صوبوں میں، ہر

صوبہ مختلف اضلاع میں، ہر ضلع مختلف تعلقوں میں، ہر تعلقہ مختلف دیہات کی شکل میں مختلف سہولتوں کی وجہ سے بٹا ہُوا تھا اور ہے۔

"ہر جگہ کے رہنے والے بجائے دُوسروں کے اپنی ضرورت خود پُوری کریں۔"

خود اکتفائیت کے قانون کی جب یہی تعبیر تھی اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے۔ تو ملکوں سے آگے بڑھ کر صوبوں میں، اور صوبوں سے بھی متجاوز ہو کر اضلاع کے رہنے والوں تک یہ خود اکتفائیت کے جھگڑے اگر پڑنے لگے ہیں، تو جو بویا گیا تھا یہ تو اسی کی اُگی ہوئی فصل ہے، جسے بہر حال بنی آدم کو کاٹنا ہی پڑیگا بلکہ کیا تعجب ہے کہ اضلاعی حدود کو توڑ کر تعلقوں، بلکہ گاؤں تک میں یہ عارضہ پھیل جائے۔ آبادیوں کی بیگانگیاں جس رفتار سے آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ بہ ظاہر اس کا انجام تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن خیر دوسرے ملکوں کا رنگ تو ابھی ہلکا ہے عصمت کے دائرے سے بیچاری "بی بی" کو باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہے۔ چاہنے والے اگر چاہتے بھی ہیں۔ تو جو نہیں چاہتے ہیں وہ ان کی چاہ کو کب پوری ہونے دیتے ہیں۔ لیکن وطنیت اور وطنیت کے ساتھ ساتھ خود اکتفائیت کے معلم اوّل غریب یورپ ہی کو اپنے ہاتھوں کی اس بھڑکائی ہوئی آگ میں خود کو دنا پڑا ہے۔ بیگانگی نے عداوت کی آگ سلگائی، اب اسی آگ میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود یورپ کو بھی بھننا پڑتا ہے۔ اور یورپ کے ساتھ ان مسکینوں کو بھی بالآخر اس جلن میں حصہ لینا ہی پڑا جنہیں مختلف ترکیبوں سے یورپ والوں نے اپنا طفیلی بنا لیا ہے۔

اب سوچنے والوں کی آنکھیں کھُلی ہیں۔ چاہا جا رہا ہے کہ اس ٹوٹی ہوئی دُنیا کو اور ٹوٹی ہوئی تو غلط تعبیر ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑی ہوئی اس دنیا کو پھر جوڑا جائے۔ تب عصبۃ الاقوام (لیگ آف نیشنس) یا تخفیف اسلحہ اور اسی قبیل بیسیوں ناموں سے بیسیوں تجویزیں بچاری جارہی ہیں تا کہ جو الگ کئے گئے ہیں، باہم انہیں پھر ملا دیا جائے۔ حالانکہ دُور کی ان کوڑیوں کے لانے میں وقت ضائع کرنے سے کتنا آسان تھا، کہ اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ خود اکتفائیت کے اس حیوانی خبط کو دماغوں سے نکال کر پھر بنی آدم کے گھرانوں کو لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا کے اسی قدرتی قانون کے ماتحت چھوڑ دیا جائے، آزاد چھوڑ دیا جائے تا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جس حال پر ان کے احتیاجی و معاشی تعلقات قائم تھے۔ اسی حال پر پھر وہ واپس ہو جائیں۔

الغرض سب کو سب کچھ پیدا کرنے کی تلقین کی جگہ ہر ملک کو ان ہی چیزوں کے پیدا کرنے

کا مشورہ دیتے ہوئے جنہیں اپنے ماحول اور موسمی دیہاتی خصوصیات کے لحاظ سے بآسانی بہتر شکلوں میں وہاں کے باشندے پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر ایک ملک کی آبادیوں کو دوسرے ممالک کی آبادیوں سے پیوستہ و وابستہ کر دیا جائے تو یوں بھی یہ بات خود اکتفائیت کے ہوائی اصول کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ کیونکہ گڑبڑ کر بقولِ شخصے

"نکما جیا بُرے احوال"

کی شکل میں مثلاً صنعتی ممالک کو جبراً و قہراً کسی نہ کسی طرح مصنوعی ذرائع سے کام لے کر غیر فطری طور پر اگر چہ زرعی ملک میں بدل دیا جا سکتا ہے، یوں ہی زرعی علاقوں میں بھی صنعتی کاروبار پھیلایا جا سکتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ واقع میں جو زرعی علاقے ہیں۔ زرعی پیداواریں جتنی عمدہ شکلوں میں وہاں مہیا ہو سکتی ہیں بالجبر زرعی بنائے ہوئے خطوں کی پیداواریں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی حال مصنوعات اور ضروریاتِ حیات کی دوسری چیزوں کا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر چاہا جائے تو انگور یا انار نہیں پیدا ہو سکتے۔ یقیناً ہو سکتے ہیں۔ اور جب کوشش کی گئی تو سُنا گیا، دیکھا گیا کہ یہاں انگور پیدا ہوئے۔ لیکن کابل یا کشمیر کے انگوروں یا اناروں کا مقابلہ کیا وہ کر سکتے ہیں؟ جب ہندوستان کے آملے کو بیچ کر ہم کابل کے انگور کھا سکتے ہیں، قندھار کے انار سے کام دو دہن کو اتنے پہنچا سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے ملک کی قدرتی پیداواروں کا دوسرے ممالک کی قدرتی پیداواروں سے جب بآسانی تبادلہ کر سکتے ہیں تو خواہ مخواہ ایک فرضی خیال کہ یہ ہندوستان ہی کا پیدا کیا ہوا انگور چونکہ ہے۔ اس لئے بدمزہ ہی کیوں نہ ہو، کابل و کشمیر کے انگوروں پر ہمیں اسے ترجیح دینا چاہیئے۔ وسواس اور وہمی احساس کے سوا یہ چیزیں اور کیا ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ممالک و اقوام کی ان معاشی وابستگیوں سے چاہنے والے اگر چاہیں تو لیگ آف نیشنز (جینوا والی) یا مجلس اقوام (ہیگ والی) وغیرہ کے مقاصد کو ایک حد تک اس ذریعہ سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، یہی ہٹلری جنگ، جو ابھی لڑی گئی خود اسی کے تجربات بتا رہے ہیں، کہ زندگی کی معمولی معمولی سہولتوں مثلاً مٹی کے تیل جیسی چیزوں تک نے جنگ سے لوگوں کو بیزار بنا رکھا ہے۔

اُف! کونین کی کیابیوں نے ملیریا کے مریضوں کو جتنا پریشان کیا ہے کیا ان لوگوں پر اس کی ہنت ہو سکتی ہے۔ کہ جس ملک سے کونین برآمد ہوتی تھی اس سے جنگ کا ارادہ کریں۔ آپ اقوامِ عالم کی جلسوں میں اسی جنگ کو روکنے کے لئے قوموں کو اس پر تو مجبور کرنا عقل کا اقتضار سمجھتے ہیں کہ باوجود استطاعت کے آئندہ وہ جنگی جہازوں کی تعداد معینہ مقدار سے نہ بڑھائیں، یا سرے سے

حربی آلات واسلحہ کے کارخانے ہی بند کر دیئے جائیں۔ کیا جنگ کے ان ہی خطرات کے انسداد کی ایک صورت یہ بھی نہیں ہوسکتی ہے کہ زندگی کی ضرورتوں میں ایک ملک کو دُوسرے ملک کا کچھ اس طرح محتاج بنا دیا جائے، کہ ایک کا کام دُوسرے کے بغیر چل ہی نہ سکے۔ یعنی دمی قدرت کا جو قانون ہے اسی پر دُنیا کو واپس ہو جانے کی اجازت دے دی جائے۔ تو بالکلیہ نہیں، ایک بڑا سبب قوموں کی پنجہ آزمائیوں کے روکنے کا کیا یہ اندیشہ نہیں ہوسکتا ہے کہ لڑائی کی صُورت میں ان چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا۔ جن کی برآمد کا دار و مدار اسی قوم پر ہے۔ جس سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو انسدادِ جنگ کے اسباب میں ایک مؤثر سبب کی حیثیت سے یقیناً یہ ایک بڑی بات ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ قومیت کا آسیب قوموں کے سروں پر جو کھیل رہا ہے۔ اس بھُوت کے اتارنے میں پہلے کامیابی حاصل ہو جائے۔

اور یوں بھی تجربہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جس مُلک میں جن پیداواروں کی تیاری کا دستور اس ملک کی خصوصیات کی بنا پر جو چلا آرہا تھا۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس ملک کے باشندوں کو عموماً ایک فطری مناسبت ان ہی چیزوں سے ہو جاتی تھی۔ مہارت وکارکردگی میں دُوسرے ممالک ان کا مقابلہ مشکل ہی سے کرسکتے تھے۔ یہ تجربہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ہر ملک میں ہر قسم کی چیزوں کی پیدا کرنے کی کوشش پر خود اکتفائیت کے نظریہ کے زیر اثر اصرار نا یوں بھی چنداں مفید نہیں، اسی طرح مفید نہیں جیسے اس زمانے میں دُنیا کے اس قدیم اصُول کو جو توڑا گیا تھا، یعنی عموماً قاعدہ تھا کہ حصولِ معاش کا جس خاندان میں جو ذریعہ پشتینی طور پر چلا آرہا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اسی پیشہ کو اختیار کرتے ہوئے نسلاً بعد نسل چلے آرہے تھے۔ جس کا اس فائدہ کے سوا کہ نسبتاً معاشی افکار میں لوگ اس لئے کم مبتلا ہوتے تھے۔ کہ اپنی معاش کا ذریعہ ان کے نزدیک متعین ہوتا تھا۔ ایک دھوبی کا لڑکا پیدا ہونے کے بعد مطمئن رہتا تھا، سمجھتا تھا کہ روزی کمانے کے لئے مجھے وہی کرنا ہے جو میرا باپ کر رہا ہے۔ دھوبیوں کی اولاد اگر بڑھ رہی تھی، تو ظاہر ہے کہ دھلانے والوں کی نسلوں میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی زمانہ میں یہ نہیں جانا کہ کسی پیشہ ور کو اس کی شکایت پیدا ہوئی ہو کہ باپ کے جس پیشے کو اس نے اختیار کیا تھا اس کی مانگ نہیں ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ اور گفتگو کا تعلق عام حالات ہی سے ہے۔

بہرحال اس فائدے کے سوا بڑا فائدہ اس کا یہی تھا کہ بچپن سے ہر پیشہ ور کا پیشہ چونکہ

طے شدہ ہوتا تھا۔ اس لئے ہر بیٹا اسی وقت سے، جب سے ہوش سنبھالتا تھا، باپ سے اپنے پیشہ کے گُروں کو سیکھتا رہتا تھا۔ مسلسل عملی مشق وقت آنے تک اس فن میں اس کو ماہر بنا دیتی تھی۔ اور یوں بھی موروثی موثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان ہی میں دیکھئے تعلیم و تعلم کا جدید مغربی اصول پر ڈیڑھ صدی سے اس ملک میں رواج ہے۔ ہر ہر صوبہ میں بیسیوں کالج، بلکہ یونیورسٹیاں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں مدارس قائم ہیں۔ لیکن اس ملک کے جن خاندانوں کا موروثی پیشہ تعلیم اور تعلم اور دماغی کاروبار تھا، مثلاً برہمن یا کائستھ، جدید تعلیم کے سلسلہ میں کیا ان کا کوئی مقابل ہے؟

بنگال کے بنگالی، کہا جاتا ہے کہ تعلیمِ جدید میں بہت آگے نکل گئے ہیں، لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ آگے نکلنے والوں میں اکثریتِ کبیرہ کن لوگوں کی ہے؟ پوچھ لیجئے، دیکھ لیجئے وہی چیٹرجی، بینرجی، مکرجی وغیرہ برہمن، یا مترا، گھوش وغیرہ کائستھ خاندان کے لوگ آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یعنی وہی لوگ، جن کے آباؤ اجداد ہزار ہا سال سے تعلیم میں آگے بڑھے ہوئے تھے۔ یہی حال مدراس میں مرہٹہ وغیرہ کے ان علاقوں کا ہے، جہاں سمجھا جاتا ہے کہ جدید تعلیم نے اچھے اور ممتاز افراد پیدا کئے ہیں۔ بہرحال جو حال افراد کا ہے، وہی اقوام کا ہے۔ جن پیداواروں کا جس جس ملک سے قدرتی تعلق مدتِ دراز سے رہا ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ ان ہی ملکوں سے ان پیداواروں کے متعلق اچھی قسموں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان کی کارکردگی کی عمدہ صلاحیتوں کو بجائے ابھارنے اور ترقی دینے کے مُردہ کرنے کی کوشش خاص اغراض کے تحت نہ کی جائے۔ اور ممالک کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا۔ اپنے ملک ہندوستان میں تو دیکھ رہا ہوں، کہ موروثی پیشوں سے لوگوں کو ہٹا ہٹا کر جب سے دوسرے شعبوں کی طرف دعوت دینے میں ہمت افزائیوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداء میں کچھ لوگوں کو نفع محسوس ہوا ہو، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ میں شکم ؁ کا سوال تمام سوالوں سے زیادہ اہم جو اِس وقت بنا ہوا ہے، مرنے سے پہلے لوگوں کو موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا ہے، تو اس میں بڑا دخل ان ہی غلط ہمت افزائیوں کو ہے پہلے اپنے باپ کے موروثی پیشے اور اس پیشے کی آمدنی پر لوگ قانع تھے۔ ہزار ہا ہزار سال سے ایک خاص قسم کی مطمئن زندگی عموماً سب کو میسر تھی۔ لیکن آج ان ہی غریبوں کو گم کردہ نشیمن پرندوں کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے کہ ادھر سے ادھر مارے پھرتے ہیں، معاش کا جو آبائی ذریعہ تھا وہ بھی کھو بیٹھے اور دوسرا نیا ذریعہ رزق کامل نہیں رہا ہے اور ملے بھی، تو زندگی کا جو آبائی معیار تھا، وہ نظر سے پوشیدہ ہو گیا۔ اب کوئی معیار ان کے سامنے ایسا نہیں ہے، جس پر پہنچ کر اطمینان کا سانس

وہ لے سکتے ہوں گے

" ایں ہم رفت، آں ہم رفت "

خیر میں کدھر نکل گیا، دماغ میں بات تھی، موقعہ اظہار کا آ گیا جی نہ چاہا کہ کترا کر نکل جاؤں۔ اب پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشی مراتب و مدارج کے اختلافات اور ان ہی اختلافات سے پیدا ہونے والی پستی و بلندی کو اہمیت دے دے کر اس زمانے میں ہر ملک و قوم کے حق میں اس مسئلہ کو ایک مستقل "شعلۂ جوالہ" کی شکل جو عطا کی گئی ہے۔ ایسا "شعلۂ جوالہ" کہ تقریباً ہر ملک کے باشندے کانپ رہے ہیں، ڈر رہے ہیں کہ دیکھئے اس شعلہ میں ہمیں کب جھونکا جاتا ہے۔ خانہ جنگی اور طبقاتی معرکہ آرائیوں کا ذریعہ اسی مسئلہ کو بنانے والے اس تک میں کب بناتے ہیں۔

اب کسی کو مجھ سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن میرا خیال تو یہی ہے کہ قرآن نے فکری تصحیح سے کام لے کر اسی مسئلہ کو جس سے بداندیشوں نے چاہا ہے۔ کہ انسانی برادری کو ہر ملک اور قوم میں ٹکرا دیں، بجائے ٹکرانے کے اسی کو بچھڑے ہوؤں سے ملانے کا ذریعہ اتنی آسانی سے بنا دیا ہے کہ نقطۂ نظر کو قرآنی مشورہ کے مطابق بدلنے کے ساتھ ہی وہ کانٹا ہی درمیان سے نکل جاتا ہے۔ جسے چبھا چبھا کر بیٹھے بٹھائے آدم کی اولاد کو لوگوں نے بے چینی اور بلاوجہ کی کلفت و قلق میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اونچ نیچ کے قصہ کو دیکھ کر سماج کے بعض افراد کے قلوب میں دوسرے افراد سے جو گرانیاں پیدا کرائی جا رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ قرآن نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، توڑنے کی جگہ جوڑنے کا ذریعہ اسی قصہ کو اس نے امالہ کے جس طریقہ سے بنا دیا ہے انصاف سے غور کرنے والوں کے لئے اس میں انشاءاللہ تسلی و سکینت کا بڑا سرمایہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ امالہ کی اس تدبیر سے اس چبھن اور خلش کو تو ہم مٹا سکتے ہیں، جو باہم افراد انسانی میں معاشی مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے، مگر باہمی احتیاجات کا یہ پیچ در پیچ زنجیرہ، جس میں تقسیم معیشت اور تفضیل بعض علیٰ بعض کے قانون کے تحت آدم کی اولاد جکڑی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت کے اس نظام میں رزقی اعتبار سے کسی کا بلند مقام پر فائض ہو جانا اور کسی کا پست جگہ پر رہ جانا ناگزیر ہے۔ آخر جب سب کچھ سب کو نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ صلاحیتوں اور سلیقوں کے مختلف ملکات اور کمالات و صفات کے مختلف حصوں کے

مختلف افراد معنہ دار ہیں، اور ہر کمال، ہر صفت اپنے نتائج کی قدر وقیمت کی وجہ سے برابر نہیں ہے۔ خصوصاً معاشی برتری جن کمالات وصفات کے بل بوتے پر لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ چوں کہ ان کی تعداد ہر آبادی میں تھوڑی ہوتی ہے۔ اس لئے بآسانی ان کا بدل ضرورت مندوں کو میسّر نہیں آتا۔ بخلاف ان کے جو ان معاشی برتری رکھنے والے افراد کے محتاج ہوتے ہیں، اکثرت تعداد کی وجہ سے ان کا بدل ہر جگہ بآسانی مل جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی امیر یا تاجر کا ملازم تو ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں ان کے پاس سے چلا جاؤں گا، تو وہی کام جو میں انجام دیتا ہوں، اسی کام کے کرنے والے بیسیوں ان کو مل سکتے ہیں۔ لیکن نوکری چھوڑ کر میں اگر علیحدہ ہو گیا، تو میرے کام سے استفادہ کر کے اُجرت دینے والے دنیا میں چونکہ کم ہیں۔ اس لئے ایسا آدمی، جس کی مجھے ضرورت ہو، اس کا تلاش کرنا میرے لئے آسان نہ ہوگا۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا تعلق روزمرّہ کے مشاہدہ سے ہے۔

قانونِ بسط کے تحت رزق حاصل کرنے کا ذریعہ قدرت جن کے لئے فراہم کرتی ہر درحقیقت ان کی برتری کا راز یہی واقعہ ہے یعنی ہونے کو، تو وہ بھی دُوسروں کے محتاج ہوتے ہیں لیکن جن کے یہ محتاج ہوتے ہیں، ان بے چاروں کا بدل تو انہیں بآسانی مل سکتا ہے، اور مل جاتا ہے۔ بخلاف ان کے جو اُن کے محتاج ہوتے ہیں کہ ان کو عموماً ایسے افراد کے پانے میں دشواری پیش آتی ہے جو ان کا اور ان کے کام کا محتاج ہو۔

یہی وہ نقطۂ بحث ہے جہاں پر اس معاشی زنجیرے کے ان حلقوں کو جو اپنے آپ کو رزقی حیثیت سے پستی میں پاتے ہیں، یعنی وہی لوگ جو بجائے بسط کے قانونِ قدر کے تحت روزی پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بسطی رزق والوں سے اگر شکایت نہ بھی پیدا ہو، لیکن خود پیدا کرنیوالے کی طرف سے ان کے قلوب میں اگر یہ سوال اُٹھے کہ بجائے دُوسروں کے، زنجیر کے اس حلقے میں مجھے ایسی جگہ کیوں دی گئی جہاں پر رہنے والوں کو قدری معیشت گذارنی پڑتی ہے۔ آخر قانونِ قدر کے نشانہ ہم ہی کیوں بنے۔ بسطیوں کا جو پیدا کرنے والا ہے، خالق میرا بھی تو وہی ہے، پھر ان کو اتنا دیا گیا، دیا جا رہا ہے، کہ خرچ کرنے، خُوب اچھی طرح دل کھول کر بھی خرچ کرنے کے بعد پس ماندہ کرنے کا ان کو موقع مل جاتا ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ آج کھانے کو اگر مل گیا تو

چہ خورد بامداد فرزندم

کی فکر اس وقت اندر اندر ہماری جان کھائے جاتی ہے، سر چھپاتے ہیں تو پاؤں کھلتا ہے، اور پاؤں پر کپڑا ڈالتے ہیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کے دلوں کا یہی احساس (شعوری یا غیر شعوری عدپ) اس مسئلہ کا وہ رخ ہے جس کا تعلق بجائے مخلوقات یا اپنے ابناء جنس کے خالق تعالیٰ کی ات کی طرف ہے۔ اس سوال کا یہ جواب کہ بنی نوعِ انسان کے بکھرے ہوئے افراد کی تنظیم اور باہم ان میں پیوستگی و وابستگی کے تعلقات کو پیدا کرنے کے لئے کسی کا اوپر اور کسی کا نیچے ہونا ضروری تھا وسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ سب ہی اگر انجن ہی بن جائیں گے تو ڈبہ اور بوگی آخر گاڑی کا کون منصب بنے گا۔ اور گاڑی میں جب ڈبے یا بوگی ہی نہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ صرف انجن سے کیا کام چلیگا۔ واہ ساری گاڑی کی روحِ رواں انجن ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح جسدِ انسانی میں ہر ہر عضو کو دل و دماغ ں کا مقام اگر عطا کیا جائے گا تو پھر ہاتھوں، ٹانگوں، انگلیوں کے وظائف کون ادا کرے گا۔

واقعات کی حد تک بلاشبہ یہ ایک معقول جواب ہے، یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جمادات طرف سے اگر یہ مطالبہ پیش ہو کہ نباتات کی صفات سے ان کو کیوں محروم رکھا گیا یا نباتات ن جانب سے احتجاج کی یہ آواز بلند ہو کر حیوانی کمالات سے محروم کر کے سلسلہ وجود میں ان کا درجہ بست کیوں کر دیا گیا! اسی طرح حیوانات اگر چلانے لگیں کہ آدم کی اولاد جن صوری و معنوی قوتوں ے سرفراز ہے، وہی قوتیں، جن کی بدولت ساری کائنات پر انسان کی حکومت قائم ہے۔ سب پر ہ مالکانہ اقتدار جمائے ہوئے جس قسم کا تصرف چاہتا ہے، کرتا ہے، ان سے وہ کیوں محروم ہیں۔ غرض متفاوت صفات و کمالات رکھنے والی اس دنیا کے ہر طبقہ کی طرف سے پستی و بلندی راز و نشیب کے اسی سوال کو اگر اٹھایا جائے تو بتایا جائے کہ مذکورہ بالا جواب کے سوا، کہنے الے اور کیا کہہ سکتے ہیں، خدا کی مخلوق ہونے میں (جمادات و نباتات، حیوانات و انسان) جب ب برابر ہیں، تو کسی کو کم، کسی کو زیادہ جو دیا گیا ہے اس کی توجیہ میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مطالبہ کے معنی تو یہی ہوئے، کہ گوناگوں بوقلموں، موجودات سے بھری ہوئی یہ دنیا نیا صرف ایک ہی ہستی کی شکل میں بدل دی جائے، یعنی وہی بات کہ سب کو انجن ہی انجن بنا دیا ائے جس کا دوسرا مطلب یہی ہوگا کہ ریل گاڑی اور اس کے منافع و فوائد کے سارے قصہ ہی کو تم کر دیا جائے۔ مگر بایں ہمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی عقل اس جواب سے طمینان حاصل کرنے کے باوجود جب انفرادی طور پر قدری زندگی کی کش مکشوں میں مبتلا ہوتی ہے تو اس وقت تفاوتِ صفات کا یہ فلسفہ اور اس فلسفہ کے مصالح دماغوں سے عموماً غائب ہو جاتے ہیں، سب جانتے ہیں، روزمرہ کے ان تجربات کو سب مانتے ہیں کہ "انسانی معاشرہ" کا سارا

ولدومدار، صفات وکمالات اور ان سے پیدا ہونے والے مدارج ومراتب کے اسی اختلاف و تفاوت ہی پر قائم ہے۔ اس کو ختم کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ احتیاجی تعلقات کا وہ رشتہ جو اس وقت ہم میں ایک کو دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے، اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ختم ہو جائے گا جیسے خود اکتفائی زندگی رکھنے والے حیوانات میں ان روابط کے فقدان کی وجہ اختلاف وتفاوت کا یہی فقدان بنا ہوا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بیلوں کی قطار سے کوئی بیل، یا گھوڑوں کے اصطبل سے کوئی گھوڑا، بکریوں کے منڈوں سے کوئی بکری اگر غائب ہو جاتی ہے۔ تو ان میں کسی کو بگاؤ آمد کر خر رفت" کے اس قصہ" کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بڑی تو بڑی "انسانی آبادی" کا کوئی معمولی رکن، مثلاً کوئی حجّام، کوئی دھوبی ہی کچھ دن کے لئے اگر کہیں چلا جاتا ہے، تو لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ حلال خوروں یا بھنگیوں تک کی اسٹرائیک، بڑے بڑے شہروں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ ان بیّن مشاہدات، کھلے کھلے تجربات کے باوجود قدری پیمانہ پر رزق پانے والوں میں شکایت کا یہ احساس آخر کیوں پایا جاتا ہے؟

عام طور پر" تقدیر" کے مسئلہ کو بھی چاہا جاتا ہے کہ اس شکایت کے ازالہ کا ذریعہ بنا لیا جائے پڑھنے والے ان ہی مواقع پر پڑھ دیتے ہیں ؎

کوئی پادشاہ وامیر ہے، کوئی بے نوا وفقیر ہے
جسے چاہا جیسا بنا دیا، تیری شان جلّ جلالہٗ

آخر معاشی نشیب و فراز یا بسط و قدر کا یہ قصہ، ان صفات وکمالات، فطری ملکات و رجحانات ہی کے ساتھ جب وابستہ ہے، جن کے نتائج قدر وقیمت کے اعتبار سے قدرتاً مختلف ہیں تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسانی فطرت کا جو پیدا کرنے والا ہے، وہی فطرت کے ان جبلّی لوازم و آثار کا بھی خالق ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| کل شیٔ من القدر حتی العجز والکیس ؟ | ہر چیز تقدیر ہی سے ہے حتی کہ زندگی کے کاروبار میں بیچارگی ودرماندگی اور دانائی وہوشیاری! |

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں

| | |
|---|---|
| واللّٰہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر | اور اللہ جس کی روزی میں چاہتا ہے بسط پیدا کر دیتا ہے اور جس کی روزی میں چاہتا ہے قدر پیدا کر دیتا ہے |

کے الفاظ میں الرزق کے بسط و قدر کو حق تعالیٰ نے براہِ راست اپنی مشیّت ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں، امارت و غربت، یا بسط و قدر کے متعلق یہ آخری جواب ہے، جو عام مذاہب کی طرف سے دے کر بولنے والوں کی زبان بند کر دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن بھی اسی جواب کو آخری جواب ٹھہراتے ہوئے خاموش ہو جانے پر لوگوں کو اگر مجبور کرتا تو اپنے دلائل اور اپنی حجتوں کے متعلق "حجۃ بالغہ" یعنی ایسی دلیل ہونے کا دعویٰ ہی وہ کیوں کرتا جو شکوک و شبہات کی انتہائی جڑوں تک پہنچ کر ان کی باریک سے باریک رگوں اور ریشوں کو گہرائیوں سے نوچ نوچ کر اکھاڑ پھینکتی ہے۔

آئیے اور اس مسئلہ میں بھی قرآن کی "حجۃ بالغہ" کا تماشا کیجیے، کوئی طول طویل بات نہیں ہے۔ بلکہ وہی امالہ کی پرانی ترکیب سے کام لیتے ہوئے قرآن نے لوگوں کو، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ادھر متوجہ کیا ہے کہ الرزق کی تقسیم بسط اور قدر کے ان دو مختلف پیمانوں پر قدرت جو کر رہی ہے اس کے متعلق یہ سوال کہ "ایسا کیوں کر رہی ہے؟" ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب دینے کا واقعی استحقاق اسی کو حاصل ہے اور اس کے سوا اور کس کو ہو سکتا ہے۔ جو قصداً و ارادتاً ان دو مختلف پیمانوں پر الرزق کو اپنے پیدا کئے ہوئے بندوں میں بانٹ رہا ہے، لیکن قبل اس کے کہ خود بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے سے پوچھا جاتا۔ قرآن نے لوگوں کی اس حماقت پر مطلع کیا ہے، کہ انہوں نے پیشقدمی کر کے بغیر کسی حق کے اپنی طرف سے سوال کے خود تراشیدہ بے بنیاد، قطعاً بے بنیاد غلط جوابات گھڑ لیے اور ان ہی غلط جوابوں کو صحیح علم باور کر کے ادھر ادھر قدریوں نے بیٹھے بٹھائے، اپنے آپ کو ایک ناشدہ اندرونی کوفت میں مبتلا کر رکھا ہے، اور دوسری طرف اسی غلط علم اور غلط احساس کا نتیجہ بسطیوں پر یہ مرتب ہو رہا ہے کہ اپنے متعلق وہ الگ ایک بے جا خوش اعتقادی کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ حاصل اس کا بھی وہی ہے، کہ غلط علم سے لوگوں نے اس مسئلہ میں بھی جو غلط نقطۂ نظر قائم کر لیا ہے۔ اسی غلط علم کی تصحیح کر کے نقطۂ نظر کا امالہ قرآن نے ایک ایسے اعجازی رنگ میں کر دیا ہے، کہ جن شکووں اور شکایتوں یا کڑکڑاہٹوں اور جھنجھناہٹوں سے آج آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا گیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس امالہ کے بعد ان کے خطرے کی بھی قلوب میں گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟ اگرچہ ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جس توجہ کی یہ قرآنی آیتیں مستحق تھیں، اتنی توجہ ان کی طرف نہیں کی گئی، بہر حال توجہ کی گئی ہو، یا نہ کی گئی ہو، قرآن میں، تو موجود

ہیں اور ان ہی کو کتاب میں پیش کرتا ہوں، سب سے پہلی آیت اس سلسلہ کی تو وہی ہے، جو سورۃ الفجر میں بدیں الفاظ پائی جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| واما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن واما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اہانن کلا۔ | مگر آدمی سو جب جانچتا ہے اس کا مالک اس کو، تب عزت عطا کرتا ہے اسے، اور نعمت سے سرفراز کرتا ہے اس کو تو کہنے لگتا ہے وہی آدمی کہ میرے مالک نے میری عزت بڑھائی اور آدمی ہی کو جب اس کا مالک جانچتا ہے، تب نپی تلی کر دیتا ہے روزی کو اس کی، تو کہنے لگتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا۔ ہرگز نہیں! |

(الفجر)

میں دوسروں کو کیا کہوں، خود اپنا حال بھی مدت تک اس آیت کے متعلق عجیب تھا۔ یعنی ابتدائے زندگی میں اس کا جو ترجمہ سمجھ میں آیا تھا، اس کی بنیاد پر یہ خیال گذرتا تھا کہ اللہ میاں نے جس بندے کو نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے وہ اگر یہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے نعمت سے سرفراز فرمایا، تو غلط کیا کہتا ہے۔ آخر وہ یہ نہ کہے تو کیا کہے، پھر اسی کو کلا کے توبیخی لفظ سے ڈانٹنے کے کیا معنی؟ اسی طرح دوسرے جزء کے متعلق بھی یہی وسوسہ ہوتا تھا کہ ضیق معاش میں مبتلا ہو کر جو بیچارہ اپنے ہم جنسوں میں ہلکا اور سبک ہو رہا ہے، اہانت و ذلت کی اس کیفیت کا اگر اظہار کرتا ہے تو ایک واقعہ کا اظہار کرتا ہے۔ اگرچہ اس پچھلی بات کے متعلق یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ اس میں مالک کی شکایت کا پہلو چونکہ پیدا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہو۔

حافظ کا شعر یاد آجاتا تھا کہ ؎

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ — تو در طریق ادب کوش گو گناہ من است

لیکن خیر "طریق ادب" کے ذیل میں "ربی اہانن" (میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا) کی شکایت کو تو داخل کیا جا سکتا ہے، مگر پہلے جزء میں تو اس کی بھی گنجائش نہ تھی، بلکہ

| | |
|---|---|
| اما بنعمۃ ربک فحدث | تو اپنے رب کی نعمت کا چرچا کر |
| یا اسی کے مفاد کو دہرانے والی یہ حدیث | |
| فلیر اثر نعمتہ علیہ | پس چاہیے کہ دکھائے اللہ کی نعمت کا اثر اپنے اوپر! |

وغیرہ میں تو اسی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نعمت سے جو سرفراز ہو، چاہیئے کہ وہ اس کا اعلان کرے، پھر جن پر اکرام کیا گیا اور جو نعمتوں سے نوازے گئے ہیں، وہی بے چارے "ربّی اکرمن" (میرے مالک نے میرا اکرام و اعزاز کیا) کے الفاظ کے ساتھ تحدث بالنعمۃ کے حکم کی تعمیل اگر کرتے ہیں تو غلطی کیا کرتے ہیں، زجر و توبیخ کا مستحق ان کو اس مقام پر کیوں ٹھہرایا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال تک اسی انجمن میں الجھتا رہا، کتابوں میں بھی دیکھتا تھا، لیکن ژولیدگی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔

مدت کے بعد جو بات تھی، جب وہ واضح ہوئی تو صرف یہی نہیں کہ اس مقام کے متعلق جو شکوک تھے، ان ہی کا ازالہ ہو گیا، بلکہ اس سوال کا، یعنی الرزق کو بانٹنے والے نے بسط و قدر کے دو مختلف پیمانوں پر کیوں تقسیم کیا ہے۔ صحیح علم کی روشنی میں اس کا جو واقعی جواب تھا وہ بھی مل گیا اور یہ معلوم ہوا کہ ان دو مختلف پیمانوں پر رزق پانے والوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی رزق کی نوعیت کے متعلق بغیر کسی استحقاق کے بے بنیاد، غلط احساسات جو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں الرزق کے خود بانٹنے والے نے صحیح علم عطا کر کے ان غلط احساسات کو، چاہا ہے کہ مٹا دیا جائے اور ہے بھی یہی بات، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ الرزق کی تقسیم میں یہ طریقۂ کار بانٹنے والے نے کیوں اختیار کیا۔ اس کے صحیح جواب کا واقعی علم ظاہر ہے کہ رزق کے بانٹنے والے اور دینے والے ہی کو ہو سکتا ہے۔ دینے والا ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کیوں دے رہا ہے۔ لینے والے کیا بتا سکتے ہیں، اور کیسے بتا سکتے ہیں۔ کہ دینے والے نے اُس پیمانے پر نہیں، اس پیمانے پر۔ اُس شکل ہیں نہیں، اس شکل میں اُنہیں کیوں دیا، یا کیوں دے رہا ہے؟ علمی دیانت و امانت کا اقتضاء زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس کیوں کے جواب میں جہل کا اعتراف کر لیا جائے۔ جس چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، کہہ دیں کہ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں، اور جب تک دینے والا خود نہ بتا دے، ہم کچھ جان بھی نہیں سکتے، قطعاً نہیں جان سکتے۔ حقائق و واقعات کے صحیح علم اور صادق تحقیق کی یہی اور صرف ایک ہی متعین راہ ہے۔ اس سے ہٹ کر کہنے والے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس کی وقعت خود آفریدہ اوہام اور خود تراشیدہ وسوسوں سے زیادہ، قطعاً زیادہ نہیں ہے۔ اب علم و تحقیق کے اس صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر غور کیجئے کہ بسط کے پیمانے پر جن لوگوں کو یہاں روزی مل رہی ہے، مذکورہ بالا علمی و تحقیقی معیار کی بنیاد پر کیا ان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ روزی دینے والے سے علم پائے بغیر وہ خود بخود یہ نقارہ پیٹنے لگیں — کہ

دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب عزت ونعمت کے لئے کیا گیا ہے۔ اور دینے والے کا یہ مقصود ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں مجھے معزز ومفتخر کیا جائے۔ کیا جاننے سے پہلے کسی چیز کے جاننے کا یہ بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علمی امانت کے مقررہ حدود سے ہٹ کر عقلی ٹٹول سے کام لیتے ہوئے آدمی اگر کچھ خیال کر سکتا ہے تو یہی خیال کر سکتا ہے کہ دینے والے پر نہ تو میرا قرض باقی تھا۔ اس اس پر میں نے یا میرے باپ دادوں نے کسی قسم کا کوئی احسان بھی نہیں کیا تھا۔ میرا کوئی خاص رشتہ ناطہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہے، ایسا رشتہ یا تعلق جو صرف میری ذات ہی کے ساتھ مخصوص ہو، بلکہ تعلق اس کے ساتھ اگر ہے بھی تو وہی تعلق جو اس کی ہر مخلوق اس کے ساتھ رکھتی ہے الغرض العیاذ باللہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ بھتیجا، نہ میرا وہ مقروض ہے اور نہ ممنونِ کرم۔ ایسی صورت میں عقل اگر کچھ سوچ سکتی ہے تو یہی سوچ سکتی ہے کہ بلا وجہ مجھے امتیاز بخشنے اور میرے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھنے کا کوئی سبب جب نہیں ہے تو یہ خیال کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب کر کے خصوصیت کے ساتھ میری عزت افزائی کی گئی ہے، یعنی قرآن کے الفاظ میں

ربی اکرمن          میرے مالک نے مجھے عزت بخشی!

کا دعویٰ بسطی معاش رکھنے والوں کی طرف سے خود ہی غور کرنا چاہئے کہ کتنا مضحک، بے بنیاد وقطعاً بے سروپا دعویٰ ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ بسط کے پیمانے پر ان کو کیوں روزی مل رہی ہے؟ اولاً تو اس کیوں کے جواب میں صحیح منطق کی رُو سے جہل کا اعتراف یہی ان کا صحیح علمی مقام تھا، ثانیاً بجائے دینے والے کے ان پانے والوں کے لئے اگر کچھ نہ کچھ جواب تراش ہی لینا ضروری تھا، تو جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس کا اقتضاء بھی یہ قطعاً نہ تھا کہ جواب میں وہ "ربی اکرمن" (میرے مالک نے مجھے عزت بخشی) کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں۔ لیکن کیا کیجئے کہ جاہل انسان کو بسا اوقات اپنے جہل پر علم کا دھوکا لگتا ہے اس کے بعد دلوں میں ایسے خیالات، زبانوں پر ایسے مقالات جاری ہو جاتے ہیں، جن کے متعلق ادنیٰ تامل سے بھی اگر کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جس کے سوچنے کا انہیں کوئی حق نہ تھا، وہی وہ سوچ رہے ہیں۔ اور بولنے کی جو بات نہ تھی وہی وہ بول رہے ہیں۔ یعنی جھوٹ سوچ رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں۔

اور جو حال اس سلسلے میں بسطیوں کا ہے دیکھا جاتا ہے کہ قدری پیمانے پر رزق پانے والے بھی اسی غلطی کے شکار ہیں۔ وہی علمی بد دیانتی کہ جس کے جاننے کا کوئی صحیح علمی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا اسی کے جانے، اور جان کر ماننا، قطعاً غلط احساسات کا اسی بے بنیاد وہم کو سبب بنائے ہوئے ہیں

آخر ٹھیک خرچ کے مطابق نپی تلی شکل میں جنہیں دینے والا رزق عطا کر رہا ہے۔ یعنی قدری پیمانے پر جو رزق پا رہے ہیں، ان کی طرف سے یہ اعلان کہ پیدا کرنے والے نے قدری رزق دے کر چاہا ہے کہ اپنے ہم جنسوں میں ہمیں رسوا اور ذلیل ہو کر جینا پڑے، یعنی قرآنی تعبیر میں

ربی اھانن          میرے مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا!

کے احساسات سے جو خود اپنے آپ کو بھی جلاتے رہتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کو ان مغالطی وسوسوں میں مبتلا کرنے کے جرم کے مجرم ہو رہے ہیں، کہ مذہب نے جس ذات کی رحمتوں، اور رأفتوں کا اتنی بلند آہنگیوں سے چرچا پھیلایا ہے۔ ذرہ ذرہ میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی مہربانیوں کرم فرمائیوں کا مطالعہ کیا جائے۔ رحم سے بھری ہوئی اس ذات نے بغیر کسی سابق قصور کے ان بیچاروں کو رسوائی کی اس جہنم اور ذلت کی اس دوزخ میں کیوں جھونک دیا ہے۔ آخر یہ فیصلہ کہ ذلیل و خوار ہی کرنے کے لئے قدریوں کے ساتھ قدرت یہ برتاؤ کرتی ہے۔ اس کی بنیاد کیا ہے؟ تحقیق و علم نے قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کو ایسے کون سے مقدمات دیئے ہیں، جن کی روشنی میں ان کے دماغوں نے "ربی اھانن" (میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے اس نتیجہ کو پیدا کیا ہے؟ دینے والے سے پوچھے بغیر خود پانے والوں کو اس فیصلے کا اختیار کیا دنیا کی کوئی منطق دے سکتی ہے؟ سوچا جائے تو یہاں بھی منطق سے کام لینے والوں نے الٹی منطق ہی سے کام لیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت نہ سیدھی منطق ہی کا حق ان کو پہنچتا تھا، نہ الٹی منطق کا! بلکہ وہی بات یعنی اعترافِ جہل، ان کا صحیح علم اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔ مگر جب منطق ہی کے دامن کو انہوں نے پکڑا تھا عقل ہی سے فیصلہ مانگنے پر یہ مضطر و مجبور تھے، تو اسی سے ان کو پوچھنا تھا کہ میں نہ تھا۔ پیدا کرنے والے نے مجھے پیدا کیا۔ ان کمالات وصفات کے ساتھ پیدا کیا، جن کا نام انسانی کمالات ہے۔ مجھے بینائی بخشی گئی، شنوائی بخشی گئی۔ فہم و فراست، فکر و نظر کی قوتیں مجھ میں بھری گئیں۔ ایسی قوتیں بھری گئیں جن میں ہر ایک بجائے خود انمول نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کی کوئی قیمت دینے والے کو میں نے ادا نہیں کی تھی بغیر کسی معاوضہ اور مزدوری کے بجا نا ان نعمتوں سے میں نوازا گیا۔ پھر کیا یہ عقل کا مشورہ ہو سکتا ہے، کہ وہی جس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا، بلاوجہ کسی قصور و جرم کے بغیر میری رسوائی اور خواری کے درپے ہو جائے۔ ذلت کا طوق پہنا کر میرے بھائیوں کے درمیان برسرِ بازار وہی میری رسوائی کے تماشے سے لذت گیر ہونے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہی قصہ یعنی بتانے کا جو واقعی حقدار تھا۔ اس سے پوچھے بغیر یہ جو رزق

اہانن" ربی اہانن" یعنی ہائے ہائے قدری رزق دے کر میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے ساتھ قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کا گروہ کوچہ و بازار میں جو چلاتا چیختا پھرتا ہے۔ اور احساس اہانت کی دہکتی انگیٹھی کو اپنے سینوں میں لئے ادھر ادھر جو مارا مارا پھرتا ہے۔ کسی حیثیت سے بھی ان کا یہ فیصلہ اور اس فیصلہ کا اثر احساسِ اہانت کیا علم کے صحیح معیار پر یا مسکین بدنام عقل ہی کی راہ نمائی میں ایک لمحہ کے لئے بھی قابلِ التفات یا مستحقِ توجہ ہو سکتا ہے؟

بہرحال تقسیم رزق کے ان دو مختلف پیمانوں کے متعلق بلاوجہ نہ جاننے والوں نے اپنے جس وہم کو علم باور کر لیا تھا، یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ ان کا یہ علم غلط تھا، ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو واقعہ ہے اس کے صرف ایک سلبی اور منفی پہلو ہی کا یہ علم ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صحیح نہیں ہے، مگر یہ سوال، کہ پھر صحیح واقعہ کیا ہے۔ انسان ہونے، یا خدا کی مخلوق ہونے میں باوجودیکہ سب برابر ہیں، ایسی صورت میں ترجیحی وجوہ کے بغیر بعضوں کے لئے بسط کے پیمانے پر، اور بعضوں کو قدر کے پیمانے پر آخر روزی کیوں بانٹی جا رہی ہے؟ مانا کہ جاہل انسان نے جو وجہ تراش لی تھی، وہ غلط سہی، لیکن صرف اس کے غلط ہونے کی واقفیت یہ تو نہیں بتاتی کہ قدرت کے اس طرزِ عمل کی صحیح اور واقعی وجہ کیا ہے؟ یعنی سلبی پہلو سے واقف ہونے سے ظاہر ہے کہ مسئلہ کا جو ایجابی پہلو ہے، پھر بھی آدمی کے لئے وہ مجہول ہی رہ جاتا ہے۔

کیا قرآن میں اس کا جواب نہیں دیا گیا ہے؟ کیسی عجیب بات ہے، قرآن کے گنے چنے وہی الفاظ جو سورۂ الفجر سے میں نے نقل کئے ہیں ان ہی میں سلب کے ساتھ ایجاب کا بھی صحیح علم حالانکہ عطا کیا گیا تھا۔ لیکن عموماً خدا کے کلام کو بھی پڑھنے والے جب اسی طریقے سے پڑھتے ہیں، جیسے انسانی کلام پڑھا جاتا ہے تو یہ دیکھا گیا ہے کہ قرآن جو کچھ دینا چاہتا ہے، جیسا کہ چاہئے، اس کے پانے سے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ زیادہ مطلب و معنیٰ کے لئے عام طور پر چاہا جاتا ہے کہ الفاظ بھی اسی کی نسبت سے زیادہ ہوں، لیکن قرآن کے تجربہ کار ہی جانتے ہیں کہ اس کا رویہ اس باب میں مختلف ہے۔ اپنے ایک ایک لفظ میں عموماً معانی کے سمندروں کو وہ بند کرتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جاتا، بلکہ معانی کے مطابق قرآن میں الفاظ کا بھی طوفان پیدا کر دیا جاتا، تو جس آسانی کے ساتھ محمل ہونے کی وجہ سے آج اس کی حفاظت ہو رہی ہے، یہ تو نہیں جا نتا کہ ہر زمانے میں وہ اسی طرح ممکن ہوتا، جیسے آج ہو رہا ہے۔ یہیئے، اسی مسئلہ میں دیکھئے، کچھ نہیں، صرف "ابتلاء" کا لفظ جسے مذکورہ بالا دو آیتوں میں فقط دو دفعہ دہرا دیا گیا ہے، غور کرنے والے اگر اس میں غور کریں گے، تو مسئلہ کے ایجابی پہلو کے متعلق وہ جو کچھ بھی جاننا چاہتے

دریافت کرنا چاہتے ہیں، یقین کیجئے کہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں ان کو مل جاتا۔ پہلے ابتلاہ کے اس لفظ کے جو معنی ہیں، اسے سمجھ لیجئے، پھر جن مطالب پر وہ مشتمل ہے خود بخود سمجھنے والوں کی سمجھ میں آنے لگیں گے۔

ابتلاہ کے آخر میں "ہ" کا جو حرف ہے۔ یہ تو ضمیر ہے اور انسان اس کا مرجع ہے۔ رہ جاتا ہے۔ اب صرف "ابتلا" یہ ماضی کا صیغہ ہے، مصدر اس کی ابتلاء ہے جو اردو میں بھی عموماً مستعمل ہے۔ امتحان، یا آزمانا، جانچنا اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو اب ابتلاہ کا ترجمہ ہوا، آدمی کے رب نے آدمی کا امتحان لیا، یا آزمایا، جانچا، یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی ہوئے، رہا مطلب، سو غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ امتحان، یا آزمانے، جانچنے کے الفاظ انسان کی طرف جب منسوب ہوتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے، اس کے ایسے حالات، جن سے امتحان لینے والا ناواقف ہوتا ہے۔ چاہتا ہے کہ امتحان کے ذریعہ سے ان ہی حالات کو جانے مثلاً اس کے معلومات کیسے ہیں؟ فلاں علم میں اس کی استعداد کیسی ہے۔ یہ، یا اسی قسم کے نامعلوم امور سے واقفیت امتحان لینے والے کی غرض ہوتی ہے۔ پھر خدا کی طرف بھی امتحان کے لفظ کو جب منسوب کیا جاتا ہے۔ تو العیاذ باللہ اس کا مطلب بھی کیا یہی ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے؟ یعنی خدا بندوں کے جن حالات سے ناواقف ہے۔ امتحان میں ڈال کر چاہتا ہے کہ ان ہی حالات کو وہ جانے، خدا کو سرے سے نہ ماننا یہ دوسری بات ہے۔ لیکن خدا کو خدا مان کر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو اس مطلب کے انتساب کی جرأت ہو سکتی ہے۔ پس سوال یہی ہے کہ کسی کا امتحان جب خدا لینا چاہتا ہے۔ یا کسی کو آزمانا یا جانچنا چاہتا ہے تو پھر اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ عام مذاہب ادیان میں عموماً، خصوصاً قرآن میں بکثرت ابتلا، یا اسی کے ہم معنی الفاظ کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے۔ دریافت طلب یہی بات ہے کہ اس وقت اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ جب یہ مسلّم ہے کہ خدا کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوقات کے صفات و افعال کے مماثل قرار دینا مذہباً ناجائز ہے۔ کم از کم قرآن نے لیس کمثلہ شئی (کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے) کا اعلان کر کے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا ہے۔ کہ ذات میں ہو، یا صفات میں، یا افعال میں، الغرض کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ ٹھہرانا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سماعت، بصارت، علم و حیات وغیرہ جیسے صفات قرآن میں جو خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نسبت سے ان کا وہ مطلب قطعاً نہیں ہے جو انسان کی طرف ان ہی صفات کو منسوب کرنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے

مثلاً بصارت، یعنی دیکھنے ہی کی ایک صفت ہے، آدمی کی طرف جب بصارت اور بینائی کے الفاظ کو ہم منسوب کرتے ہیں، تو اس وقت بینائی کی اس صفت سے مراد ایسی صفت ہے جو عمل کرنے میں رنگ اور روشنی کی محتاج ہوتی ہے اور بُعد مفرط نہ ہو، قرب مفرط نہ ہو۔ ان شروط کے ساتھ اس کے آثار کا ظہور مشروط و وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بجنسہٖ اسی بصارت کے لفظ کو خدا کی طرف جب منسوب کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ خدا دیکھتا ہے، تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ خدا کی یہ صفت نہ رنگ کی محتاج ہے، نہ روشنی کی۔ نہ دُوسرے شرُوط کی۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے۔ ہر حال میں دیکھتا ہے۔ پھر دیکھنے کے اس لفظ کا جو حال ہے۔ اگر جانچنے، آزمانے اور امتحان لینے کا بھی یہی حال ہو یعنی انسان کی طرف منسوب ہونے کی صُورت میں اور معنیٰ ہو، اور خدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دُوسرے معنیٰ ہوں تو آپ ہی بتائیے کہ اور ہوتا کیا؟ یہ کتنی بڑی غلط بد گمانی ہے جو بعضوں سے میں نے سُنی کہ ایسے مواقع پر اعتراض پڑنے کے بعد اعتراض سے گریز کے لئے خدا کی طرف امتحان و ابتلاء کے منسوب ہونے والے الفاظ کے معنیٰ کو مولوی بدل دیتے ہیں حالانکہ آپ نے دیکھا، کچھ اسی ابتلاء و امتحان کے لفظ کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام کُلّی قانون ہے جو ذات و صفات و افعال وغیرہ وغیرہ سب ہی پر حادی ہے۔ خدا اپنی تمام تر شان میں جیسے نرالا، بے مثل و بے نظیر ہے، اسی طرح ابتلاء و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ اس امتحان سے، جو ایک مخلوق دُوسری مخلوق کی لیتی ہے قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا ہی چاہئے۔ رہا یہ سوال کہ خدا کی طرف منسُوب ہونے کی صُورت میں ابتلاء و امتحان، آزمانے یا جانچنے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایسی بات نہیں ہے جو لوگوں کو معلوم نہ ہو، آخر کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات میں، بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں، بلکہ جس زندگی کو آدمی اس وقت زمین پر گذار رہا ہے مسلّم اس کی یہ پُوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان ہی کی زندگی ہے۔ ایسی آیتیں، مثلاً

خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم أیکم احسن عملا۔

پیدا کیا، خدا نے موت اور حیات کو تاکہ جانچے تمہیں (یعنی یہ جانچے کہ) تم میں عمل میں سب سے اچھا کون ہے؟

یا ــــ

انا خلقنا الانسان من نطفۃ

ہم نے پیدا کیا آدمی کو ایک ملے جلے نُطفہ

امشاج نبتلیہ فجعلنٰہ سمیعاً بصیراً۔ — ہے، تاکہ جانچیں ہم اس کو، پس بنایا ہم نے اسی انسان کو شنوا و بینا!

ظاہر ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی کیا کمی ہے؟ حاصل جن کا یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو کوئی خاص رُخ ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے اور یہ کہا ہے، تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دُوراہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے، درحقیقت فطرت کے اسی اقتضاء کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دُوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پُوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے۔ خلاصہ یہی ہُوا کہ خدا کی طرف ابتلاء و امتحان کے جو الفاظ منسوب کیے جاتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا، امتحان لے کر انہی کو جاننا چاہتا ہے۔ بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء و امتحان ہے۔

اب آئیے، بسط و قدر کے، دو مختلف پیمانوں پر رزق کی تقسیم کے متعلق عوامی اوہام اور غلط خیالات کی تردید کے بعد قرآن میں جو ایجابی علم ابتلاء کے لفظ سے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب متعین کیجئے۔ جو باتیں اب تک آپ کو ابتلاء و امتحان کے متعلق معلوم ہو چکی ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہُوا؟ اللہ اللہ بات کیا تھی اور غلط معلومات سے انسان کی فکری معکوسیت کن کن غلط نتیجوں کو پیدا کر رہی ہے۔ بسطی پیمانے پر رزق پانے والے انہی بادیدہ خیالات میں مگن ہو کر اکڑ رہے تھے۔ اترا رہے تھے کہ ان کا اکرام کیا گیا۔ اپنے ہم چشموں، ہم جلیسوں میں ان کا سر اونچا کیا گیا ہے۔ گویا وے قدرت کے چہیتوں اور پیاروں میں ہیں، یونہی ضرورت کے مطابق قدر کے پیمانے پر جن کی روٹیاں مہیا ہو رہی ہیں، خود اپنے دماغ کے بھپاروں سے گرم ہو ہو کر کڑھ رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے۔ کہ ہمیں پیدا کر کے رسوا کیا گیا۔ یہی ایک رونا تھا جس کے ساتھ وہ رو رہے تھے۔ غم کے آنسوؤں سے اپنے چہروں کو دھو رہے تھے۔ مگر یہ تو خود تراشیدہ خیالات، غلط معلومات سے نکالے ہوئے غلط نتائج تھے۔ ظاہر ہے کہ "ابتلاء" کا خدائی اعلان اب جس حقیقت کو دا شگاف کر رہا ہے یعنی ناواقفوں، جاہلوں کو واقف بنایا جا رہا ہے کہ تقسیمِ رزق کی دونوں شکلوں اور دونوں پیمانوں میں بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے کی غرض یہ ہے کہ جس کسی کو جس پیمانے پر بھی بسط کے پیمانے پر ہو یا قدر کے پیمانے پر، جو کچھ بھی جس شکل میں دیا

جا رہا ہے۔ ہر ایک سے دینے والے کا یہ مطالبہ ہے کہ جو کچھ انہیں دیا جا رہا ہے۔ اس کے استعمال کے صحیح اور غلط طریقوں میں سے جو صحیح طریقہ ہے اسی کو اختیار کریں۔ جس کے دوسرے معنیٰ یہی ہوئے کہ ہیئت کے ان دونوں حالوں (بسط وقدر) دونوں میں بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ دیا گیا ہے، واقعہ کے صحیح علم کی روشنی میں اب سُوجھ رہا ہے کہ درحقیقت ہر ایک سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سچ پوچھو تو مانگا گیا ہے۔ اسی لئے تو سمجھا جاتا ہے کہ رزق میں جو یہاں بڑھائے گئے ہیں، نہ جاننے کی وجہ سے اپنے اپنے دلوں میں خواہ وہ کسی قسم کے خیالات پکا رہے ہوں، لیکن جو واقعہ ہے اس کے جان لینے کے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں بڑھائی گئی ہیں، اور الرزق جن کا گھٹایا گیا ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے اپنے متعلق خواہ جس قسم کا بھی غلط خیال وہ قائم کرلیں، لیکن سچی بات حقیقت کے مطابق یہی ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں گھٹائی گئی ہیں، جاننے والے سے جو واقعہ ہے، اس کا صحیح علم پانے کے بعد سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے، بلکہ اس کے سوا وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہاں تو خیر "اجمال" سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سورۃ "الانعام" کو ختم کرتے ہوئے اسی اجمال کی تفصیل خود قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

| | |
|---|---|
| وھو الذی جعلکم خلائف | اور خدا ایسا ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا |
| فی الارض ورفع بعضکم فوق | جانشین (خلیفہ) بنایا اور تم میں بعض کو بعض کو |
| بعض درجات لیبلوکم فیما | درجوں میں اونچا کر دیا۔ (یہ اس لئے کیا گیا ہے) کہ |
| اتاکم ان ربک سریع العقاب | جانچے خدا تمہیں ان چیزوں کے متعلق جو تمہیں اس |
| وانہ لغفور رحیم۔ | نے دی ہیں، قطعاً تمہارا مالک زود انتقام بھی ہے، |
| | اور قطعاً بلا شبہ وہی بہت بڑا بخشنے والا اور بہت |
| (الانعام) | زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ |

جس کا حاصل یہی ہے کہ زمین اور زمین کی پیداوار وں پر قابو عطا کر کے مدارج و مراتب کا جو اختلاف نسلِ انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینے والے نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے، اسی لئے دیا ہے، تاکہ وہ جانچے اور آزمائے، گویا الفجر میں جو بات مجمل تھی وہی یہاں مفصّل ہے۔ اسی طرح "الاولاد" کے ساتھ "الاموال" کو فتنہ کا نام قرآن میں جو دیا گیا ہے۔ تو اسی حقیقت اور اسی واقعہ سے ان الفاظ کے ذریعہ قرآن پردہ اٹھانا چاہتا ہے۔ معاشی زندگی کے ان درجاتی اختلافات کے متعلق جہل نے جو تاریکیاں پھیلائی ہیں۔ قرآن کا قاعدہ ہے کہ علم کی روشنی دے کر پہلے ان تاریکیوں

کا ازالہ کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد اسی علم کے مطابق عمل کا نظام پیش کر کے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر ایک اپنے علم کو صحیح علم کے مطابق بنانے کی کوشش کرے اور طبعی طریقہ عملی زندگی کی تصحیح کا یہی اور صرف یہی ہے۔ علم کی تصحیح سے پہلے عمل کے اصلاح و درستگی کا جو لوگ ارادہ کرتے ہیں، یقین مانئے، کہ چلنے کی حد تک تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چل رہے ہیں، لیکن چلنے والے ہی جانتے ہیں کہ قدم قدم پر جہل کی آہنیں بیڑیاں کس طرح ان کے لئے روک بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس مسئلہ میں خیال کیجئے، تقسیم رزق کے ان دو پیمانوں سے پیدا ہونے والے مشکلات سے آپ چاہتے ہیں۔ کہ لوگوں کو نجات بخشی جائے۔ لیکن تقسیم رزق کے اس دو ہگے نظام کا جن واقعات سے تعلق ہے۔ ان واقعات کے متعلق علم اور تحقیق کے صحیح ذرائع سے صادق معلومات جو درحقیقت واقعات کے مطابق ہوں ان معلومات کے حاصل کئے بغیر "مشکلات، معاشی مشکلات" مدارج و مراتب کے اختلاف و تفاوت سے پیدا ہونے والے مشکلات، ان ہی الفاظ کو اگر آپ رٹتے رہیں گے۔ تو دوسروں کو جانے دیجئے، اپنے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے، تشفی و اطمینان کی خنکیوں کا کوئی اثر آپ اپنے اندر محسوس فرما رہے ہیں۔ ہر عملی اقدام جو صحیح علم کی روشنی میں نہ ہو، اسی کا نام تو غیر حکیمانہ اقدام اور اَن سائنٹی فک طرز عمل ہے۔ اسی مسئلہ میں کیا ہوا، یا کیا ہو رہا ہے؟ مسئلہ چھیڑ دیا گیا، سوال اٹھا دیا گیا۔ لیکن اللہ کے بندوں میں کوئی نہیں جو یہ پوچھے کہ جھگڑنے والو! باہم ایک دوسرے پر بھڑنے والو! اس عملی پیچیدگی سے پہلے طے کرنے کی باتیں تو یہ ہیں کہ رزق کی تقسیم کا تعلق کس ذات کے ساتھ ہے؟ وہ خدا کی ذات ہے یا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟ اور خود اس سوال سے پہلے تنقیح طلب سوال یہی ہے۔ کہ جھگڑنے والے سرے سے خدا کو مانتے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر مانتے ہیں تو سب مانتے ہیں، یا کوئی پارٹی بحث کرنے والوں کی صرف خدا کو مانتی ہے۔ یا کوئی نہیں مانتی؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو حق تعالیٰ کو مانتے ہیں اور مومن ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا سچا رسول جو یقین کر چکے ہیں۔ اس یقین میں ادنیٰ ترین شک بھی ان کی فطرت کے لئے ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ ان کا اور ان لوگوں کا طریقۂ بحث و تحقیق ایک کیسے ہو سکتا ہے جو سرے سے العیاذ باللہ حق تعالیٰ کے وجود ہی کو جھٹلا رہے ہیں۔ یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق دعویٰ کے انکار پر ان کو اصرار ہے، فکر و نظر کی راہ دونوں کی ایک کیسے ہو سکتی ہے؟ اور یہ سارے مسائل کیا ہیں؟ علم ہی سے تو ان کا تعلق ہے۔ واقعہ کیا ہے؟ خدا ہے یا نہیں ہے؟ خدا کے رسول واقع میں تھے بھی یا (استغفر اللہ، استغفر اللہ) اس میں ابھی کچھ دبدھا اور تردد ہے؟ ٹھیک

ٹھیک واقعات کے مطابق ان سوالوں کے جوابات کا صحیح صحیح علم طے شدہ فیصلوں کی صورت میں جب تک بحث و تحقیق کرنے والے حاصل نہ کر لیں گے، کیا فکر و نظر کی کوئی منطق اس مسئلہ پر ان کو گفتگو کرنے کی اجازت دے سکتی ہے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ اثبات ہی میں جواب کا علم حاصل کیا جائے۔ بندگانِ خدا! حاصل اگر کر سکتے ہو تو نفی و انکار ہی کے متعلق آخری فیصلہ، ایسا فیصلہ حاصل کر لو، جس میں شبہ اور شک کی پھر گنجائش، کسی قسم کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مگر نفی ہو یا اثبات، دونوں سے قطع نظر کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے صحیح علوم کو درمیان میں لانے کی کیا حاجت ہے؟ خدا کا نام یا مذہب کا نام ایسے مواقع پر اگر لیا جاتا ہے تو غرض اس سے یہی تو ہوتی ہے کہ خدا نے جو علم اس مسئلہ میں دیا ہے۔ یا مذہب میں جو معلومات اس کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ پیش کرنے والے ان ہی کو تو خدا کے یا مذہب کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ہم تو جہاں تک جانتے ہیں، یہی جانتے ہیں۔ ایسا مذہب جس کے ماننے والے اسے سچا مذہب بھی مانتے ہوں، جو معلومات اس میں ملتے ہوں، انہیں خداداد علوم بھی یقین کرتے ہوں لیکن مذہب کے ان معلومات اور خدا کے عطا کردہ ان علوم کا زندگی کے جن مسائل سے تعلق ہو، ان ہی کے متعلق جب ٹھیک واقعات کے مطابق فکر و تحقیق، بحث و تمحیص کا قصہ چھڑے تو ان معلومات اور ان علوم سے خطرہ ہو، کہ ان کی راہ نمائی میں ہم غلط نتائج تک پہنچ جائیں گے دیوانہ ہی ہوگا جو ایسے علوم اور معلومات کو اپنا مذہب یقین کر لے۔ اور ایسی باتوں کو سمجھے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں، اس عقلی انتشار، ذہنی پراگندگی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ بہ ثباتِ عقل و ہوش اس قسم کے متناقضات ایک دوسرے کی تغلیط کرنے والی باہم دو متضاد چیزوں کو اپنے دماغ اور دل میں کوئی کیسے جگہ دے سکتا ہے۔ لعنت ہے، ایسے مذہب پر اور اس کے معلومات پر جو عمل کے وقت بجائے صحیح راہنمائی کے غلط راہوں پر اور بجائے راستی کی جنت کے جھوٹ کی جہنم میں آدمی کو دھکیل دے۔

بہر حال ہم مسلمانوں کے نزدیک، مذہب معلومات کے اس مجموعہ کا نام ہے جس کا تعلق علم محیط کے لازوال سرچشمہ سے ہے۔ علم کا وہی ابدی سرچشمہ جس سے نہ غائب پوشیدہ ہے اور نہ حاضر مستقبل میں بھی جو کچھ پیش آنے والا ہے، پیش آنے سے پہلے وہ جانا ہوا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ ہے اس پر بھی اور وہ باطن کی گہرائیوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس پر بھی علم کی یہ لازوال قوت حاوی ہے، اور اس طور پر حاوی ہے جس سے کسی شئے اور کسی مسئلہ کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے۔ جس کے جھٹلانے کی

قوت ہمارے قلوب سے سلب ہو چکی ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا یقین ہمیں دلایا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ ہم جینا بھی چاہتے ہیں اور اسی طرح ہم میں ہر ایک مسلمان قطعی فیصلہ کی صورت میں یہ طے کئے ہوئے ہے کہ اسی پر وہ مرے گا بھی۔ مذہب کا یہی مطلب ہمیں سمجھایا گیا ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔ جن مذاہب کی صداقتوں میں جھوٹ کے عناصر تحلیل ہو چکے ہیں، اگر اُن کے ماننے والوں میں مذہب کسی "مصلحت آمیز دروغ" کا نام ہے تو شاید وہ مجبور بھی ہیں۔ وہ کسی مذہب کی طرف انتساب کی قیمت اگر صرف یہی سمجھتے ہیں کہ پُرانے آباؤ اجداد کی وہ ایک مردہ یادگار ہے۔ عملی زندگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو ان پر کون ملامت کر سکتا ہے۔ جب ان کا علم ہی غلط ہو چکا ہے، غلط علم سے صحیح عمل اور صحیح عمل کے صحیح نتائج کی توقع اگر وہ نہیں کر رہے ہیں تو انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں میں اپنے پیغمبر کے ساتھ جن کا نفاقی تعلق نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے مذہب کے صحیح معلومات کو جاننا چاہتے ہیں اور ان ہی کے لئے مندرجہ ذیل معلومات پیش کئے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حیوانی طبقات کے مقابلہ میں آدم کی اولاد کے ساتھ رزق کی تقسیم میں دوُرنگی کا یہ طریقہ جو قدرت کی طرف سے اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مقصد صحیح علم کی روشنی میں کیا معلوم ہوتا ہے۔ بسط کے پیمانہ پر ہو یا قدر کے، جس پیمانہ پر بھی جنہیں رزق دیا گیا ہے، دینے والا اُن سے کیا چاہتا ہے؟ جیسا کہ میرا التزام ہے۔ اسلامی مستندات سے اس کا جواب بھی ان ہی الفاظ میں درج کروں گا جو ان میں پائے جاتے ہیں، اور یہ بات، کہ ان مطالبات کی تکمیل و تعمیل پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں اور جو خلاف ورزی کریں گے، انہیں کن خمیازوں کو آخرت ہی میں نہیں، دُنیا میں بھی کیا بھگتنے پڑیں گے۔ قرآن میں چونکہ ان تمام امور کی طرف اشارے کئے گئے ہیں اس لئے اپنی رسائی" کی حد تک ان کا بھی ذکر کروں گا۔

بلکہ سچ پُوچھئے تو ان سارے طول طویل مباحث کی تہہ میں درحقیقت جس چیز کا تذکرہ مقصود ہے، وہ یہی آخری بات ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی مرضیات کی پرواہ نہ کر کے اپنی معاشی زندگی، جو گذار رہے ہیں۔ ان کی معادی اور آئندہ پیش آنے والی زندگی ہی نہیں، بلکہ موجودہ معاشی زندگی کو بھی قدرت کس طرح تلخ بنا کر چھوڑتی ہے۔ یاد ہوگا کہ اس سوال کے جواب میں بحث کا آغاز ہُوا تھا یعنی دعوےٰ کیا گیا تھا کہ جو سُکھ کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے متعین راہ یہی اور صرف یہی ہے کہ پیدا کرنے والے ہی کو اپنا الہ المعاد اور الہ المعاش بنا کر پُوجتے چلے جائیں۔ اب آئندہ جو چیزیں

آپ کے سامنے آئیں گی۔ وہ اسی بات کی تفصیل ہو گی۔ یعنی حق تعالیٰ کو الہ المعاد بنانے کے ساتھ الہ المعاش بنا کر پوجنے کی کیا شکل ہے۔ اس راہ پر چلنے کے نتائج آئندہ زندگی ہی میں نہیں، بلکہ موجودہ زندگی میں بھی کن شکلوں میں سامنے آتے ہیں اور اس راہ سے ہٹ کر بغاوت و انحراف کی زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق مرنے کے بعد ہی نہیں، مرنے سے پہلے ہی قرآن کن خمیازوں کی دھمکیاں دیتا ہے۔ اور تجربہ ان کی کس حد تک توثیق و تصدیق کر رہا ہے۔ لیکن بحث شروع کرنے سے پہلے ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بسط و قدر کے دو مختلف پیمانوں پر تقسیم رزق کا جو سلسلہ دُنیا میں جاری ہے، ایک طرف تو اس کا یہ حال ہے کہ کوئی آبادی یا بستی ایسی نہ ہوگی، جس میں اپنے ماحول اور مقامی خصوصیات کے لحاظ سے رزق پانے والوں کی یہ دونوں قسمیں نہ پائی جاتی ہوں یعنی دُوسروں کے اعتبار سے اس آبادی کے عام باشندوں کو آپ خواہ کچھ ہی قرار دیں بسطی یا قدری لیکن خود آبادی کے باشندوں کو دیکھا جاتا ہے، کہ اپنی جماعت میں بعضوں کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہ بسط کی حالت میں ہیں، اسی طرح دُوسروں کو ان کے مقابلے میں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ قدر کی زندگی رکھتے ہیں لیکن دُوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسا آدمی، جو کسی آبادی میں بسطی معاش والا سمجھا جاتا ہے، بسا اوقات وہی اس بستی کے باہر رہنے والوں کے مقابلے میں قدری قرار پاتا ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ رزق کی یہ دونوں حالتیں (بسط و قدر) درحقیقت معاشی مدارج کی اضافی و نسبتی شکلیں ہیں یہی نہیں، کہ ایک آدمی کسی آبادی میں تو بسطی سمجھا جاتا ہو، اور آبادی کے باہر دُوسروں کے اعتبار سے خود وہی اپنے آپ کو قدر کی حالت میں پاتا ہو۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں معاشی زندگی ہی کے بعض شعبوں میں یہ بالکل ممکن ہے کہ اپنے آپ کو بسط کے حال میں پائے اور دُوسرے شعبہ میں وہی قدر کی کیفیت محسوس کرے۔ رزق کی ان دونوں کیفیتوں کی اضافی ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے، کہ صحیح طور پر افراد کی تعیین دُشوار ہے عمل کی صحیح راہ ایسی صورت میں یہی ہے کہ آدمی بسط کی حالت میں جب اپنے آپ کو پائے، سمجھے کہ بسطی ہدایات کے عمل کا وقت ہے۔ اور جب قدر کی حالت میں اپنے آپ کو دیکھے تو اس وقت ان ہدایتوں کی رہنمائی حاصل کرے جن کا تعلق قدریوں سے ہے۔

بہرحال یہ سوال کہ جب سب خدا ہی کے بندے اور اسی کے آفریدہ ہیں، تو تقسیم رزق کے سلسلہ میں کسی کو بسط کے پیمانہ پر دے کر امیر اور دُوسروں کو قدر کے پیمانے پر دے کر غریب کیوں بنا دیا گیا ہے۔ امیروں کے ساتھ قدرت کا ایسا کونسا انوکھا رشتہ ہے جو عزت و نعمت بر د

نوازے جارہے ہیں، اور غریبوں کا خدا نے کیا بگاڑا تھا کہ افلاس و غربت کا طوق پہنا کر اُن کو رسوا اور ذلیل کیا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کی بنیاد تو اس پر قائم تھی۔ یعنی واقعہ اگر یہ ہوتا کہ دینے والے کی طرف سے سمجھا جائے کہ لوگوں کو دیا جاتا ہے، صرف دیا جاتا ہے، دے دیا جاتا ہے۔

لیکن جب صورتِ حال یہ نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہاں مانگا گیا ہے۔ اور جسے جتنا زیادہ دیا گیا ہے اسی قدر اُس سے زیادہ مانگا گیا ہے۔ خود دینے والا جب یہی اعلان کر رہا ہے اور اپنے دینے کی غرض یہی بتا رہا ہے، تو جو دینے والے نہیں ہیں، ان کے وسوسوں کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے، جو نہیں جانتے تھے اور جاننے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ بے جانے بوجھے وہ جو کچھ کہہ رہے تھے۔ قطعاً وہ بات اُلٹ گئی۔ اب تو اسی کو زیادہ دینا پڑے گا، جسے زیادہ دیا گیا ہے اور وہی ہلکا پھلکا ہے، جسے نہ زیادہ دیا گیا ہے، نہ اس سے زیادہ مانگا جائے گا۔ اور شاید رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اکثریت و عمومیت کو زیادہ تر قدری پیمانے پر رزق غالباً اسی لئے بانٹا جاتا ہے کہ خدا ان کی ذمہ داریوں کو کم اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ آخر ایسی ذمہ داریاں اور ایسا بوجھ جن سے نہ ہر شخص بآسانی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہر ایک میں اس بوجھ کے لادنے کی صلاحیت ہی ہوتی ہے۔ اگر اکثریت کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے تو خدا کی مہربانی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر آبادی میں معدودے چند افراد کو بسط کے پیمانے پر دے کر بسطی ذمہ داریاں عائد بھی کی جاتی ہیں تو اس طور پر کہ خود اپنی خواہش اور رضامندی سے وہ ان ذمہ داریوں کو لینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ آخر بسطی پیمانے پر رزق پانے والوں میں ایسا کون ہے، جو خود تو قدری رزق کا طالب تھا لیکن قدرت نے اس پر بسطی رزق کا بوجھ لاد دیا ہو، عام طور پر دیکھا تو یہی جاتا ہے۔ کہ بسطی رزق کے حاصل کرنے میں ہر ایک کوشش کی انتہائی شکلوں کو ختم کر دیتا ہے۔ بلکہ حاصل کر لینے کے بعد بھی اس کی بقاء بلکہ ارتقاء کی ممکنہ صورتوں کے مہیا کرنے میں قطعاً کسی قسم کی کوتاہی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو اپنے رزق کے اس بسطی پیمانے کو قدری پیمانے سے بدلنے پر دل سے راضی ہو سکتا ہو۔ پس، یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے۔ خود لاد لینے والے کی خواہش اور مرضی سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات کہ ان ہی سے زیادہ مانگا جاتا ہے جن کو زیادہ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا فطری مطالبہ ہے کہ مذہب تو خیر مذہب ہی ہے، بغیر کسی استثناء کے دُنیا کے تمام ملل و ادیان میں بسطیوں کی ذمہ داریوں کی فہرست طویل ہوتی

ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ غیر مذہبی دائروں میں بھی مطالبوں کا سارا نزلہ اسی طبقہ پر نازل ہوتا ہے جو نسبتاً بسطی پیمانہ پر رزق پاتے ہیں، مذاہب میں خیر وخیرات، صدقات وزکوٰۃ، صلۂ رحمی ومواسات وغیرہ وغیرہ مختلف ناموں سے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں تو ٹیکس، ریونیو نہ ... باج، خراج اور کیا کیا بتایا جائے، کہ کن کن ناموں سے حکومتیں بھی اگر مانگتی ہیں تو ان ہی سے مانگتی ہیں۔ اسی طرح چندہ، فنڈ، بھری، امداد واعانت وغیرہ اسمار مختلفہ سے قومی کارکنوں کا حملہ اگر ہوتا ہے تو ان ہی پر ہوتا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جس کے پاس کچھ پس ماندہ رہ جاتا ہو، ظاہر ہے کہ مانگا اگر جائے گا تو اسی سے مانگا جائے گا۔ اور یہ بات جیسا کہ گذر چکی، ان ہی لوگوں کو میسّر آسکتی ہے، جنہیں قانونِ بسط پر روزی مل رہی ہے۔ باقی جن لوگوں کی آمدنی خرچ کے ساتھ نپ تل کر ملتی ہو، یعنی قدر کے پیمانے پر جو رزق پا رہے ہیں ان سے مانگنے والے آخر کیا مانگیں گے۔ ان کے پاس باسی ہی کب بچتا ہے۔ جس کے لئے کھانے والوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فطری نقطہ سے ہٹے ہوئے ایسے انحراف یافتہ قلوب، جن کا ذکر قرآن میں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| واذا قیل لھم انفقوا مما | اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں |
| رزقکم اللہ قال الذین | جو روزی عطا کی ہے، اس سے خرچ کرو تو |
| کفروا للذین آمنوا انطعم | انکار کرنے والے، ماننے والوں سے کہتے |
| من لو یشاء اللہ اطعمہ | ہیں، کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں خدا چاہتا |
| ان انتم الا فی ضلل مبین | تو کھلا سکتا تھا، نہیں ہو تم مگر (یعنی جو لوگ |
| | غریبوں کی امداد کا مطالبہ امیروں سے کرتے |
| | ہیں) لیکن کھلی گمراہی میں! |

فطرت کے ان بیماروں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو عام حالات میں خود بسطیوں کا طبقہ خود بھی اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے، جن کا بسط کی حالت میں مطالبہ کیا جاتا ہے اور اسی لئے الرزق کے بسطی پیمانے کے متعلق قرآن نے ابتلائی وامتحانی ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے، میرے نزدیک تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے۔ جس کی تصدیق ہر اس شخص کی فطرت کرتی ہے، جو خدا نخواستہ کسی شدید غیر فطری عارضہ کا شکار نہ ہو گیا ہو، لیکن بسطی پیمانے کے ساتھ ساتھ الرزق کے قدری پیمانے کو بھی ابتلائی وامتحانی قرار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ ارشاد ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ ۔ | لیکن انسان ہی کو خدا جب جانچتا ہے اور اس جانچنے کے سلسلہ میں اپنی تنگی کردیتا ہے ، اسکی روزی کو |

یعنی قدری پیمانے پر بھی رزق جنہیں دیا جاتا ہے ۔ ان کا بھی ابتلا ہی مقصود ہے ۔ دُوسرے الفاظ میں اس کا یہی مطلب ہوا کہ ان کو بھی جو کچھ دیا جاتا ہے ۔ لینے ہی کے لئے دیا جاتا ہے ۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ، عام احساس اس سلسلہ میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ قدر کے پیمانے پر جو لوگ روزی پاتے ہیں ، سمجھا جاتا ہے کہ روزی کے حساب سے ان کا قدر اور تنگی کی حالت میں ہونا ہی کافی ہے ۔ اب مزید ذمہ داری اُن پر کیا عائد ہوگی ؟

لیکن دوسرے مذاہب و ادیان کے متعلق تو میں نہیں کہتا ۔ قرآن میں ایک طرف ذمہ داریوں کا ایک سلسلہ اگر ایسا پایا جاتا ہے جن کا تعلق بسطیوں سے ہے تو دُوسری طرف ذمہ داریوں ہی کی ایک فہرست ایسی بھی ہے ، جن کے متعلق لوگوں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو ، لیکن میرے نزدیک براہِ راست ان کا رُخ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جو قدری پیمانے پر یہاں رزق پا رہے ہیں ۔ اور اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جیسے مکلف بسطیوں کا طبقہ ہے ٹھیک اسی طرح قدریوں کے گروہ کو بھی قرآن نے ذمہ دار بنایا ہے ۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ دونوں طبقات کی قرآنی ذمہ داریوں کو الگ الگ درج کروں ۔

**بسطی رزق کی ذمہ داریاں**

جیسا کہ ابھی یہ بات گذری کہ بسطی پیمانے پر رزق پانے والوں کی ذمہ داریاں تو اتنی بدیہی ہیں کہ نہ صرف دُوسرے ، بلکہ خود بھی اپنے آپ کو یہ طبقہ ذمہ دار محسوس کرتا ہے ۔ اسلام کے مطالبات بھی ان سے وہی ہیں ، جن کا عام نام خیر و خیرات ، انفاق فی سبیل اللہ ہے ۔ اسی عام مطالبہ کی ایک منظم قانونی شکل الزکوٰۃ ہے جس کی تفصیل قانونی ابواب کے ذیل میں کی جائے گی ، قرآن میں اسی مطالبہ کا ذکر اجمالاً و تفصیلاً کیا گیا ہے ۔ خود اسی موقعہ پر یعنی سورۃ الفجر کی اسی آیت میں جس میں بسطی رزق کے متعلق اکرامی نظریہ کی تردید کلّا ( ہرگز نہیں ) کے لفظ سے فرمانے کے بعد یہ جو ارشاد ہوا ہے ۔

| | |
|---|---|
| بل لا تکرمون الیتیم ولا تحاضون علی طعام المسکین | بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور مسکین کے کھانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے ! |

اس میں بھی بسطیوں ہی کی ذمہ داریوں کا اظہار اجمالی الفاظ میں کیا گیا ہے ، یہ دکھانے کے لئے ، کہ قرآن اپنے مطالبات کو عائد کرتے ہوئے کتنی نازک منطقیانہ تعبیر میں ان کو پیش کرتا ہے بطور

نمونہ کے ان الفاظ کی کچھ تشریح اگر کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ نعمت و عزّت پانے کے بعد پانے والوں میں جو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میرا اکرام کیا گیا ہے، اور مجھے عزت بخشی گئی ہے۔ قرآن نے "کلّا" کے لفظ سے تو چاہا ہے کہ لوگ اس خیال کو اپنے اندر سے نکال دیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت و عزت پانے والا تو خیر اپنے اندر سے اس خیال کو اپنے نکال بھی دے سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ نعمت و دولت، عزت و ثروت سے جو یہاں سرفراز ہوتے ہیں انہیں بہر حال دوسرے لوگ معزز اور بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، کسی کے پاس کچھ نہ ہو، علم نہ ہو، فضل نہ ہو، فضائل و کمالات کے جتنے سلسلے ہیں سب ہی سے خالی ہو۔ لیکن اگر کسی جاگیر پر وہ قابض ہے، کسی فرم کا وہ مالک ہے تو لوگ باوجود کچھ نہ ہونے کے محض اسی دولت و ثروت کی وجہ سے اسے اپنوں میں بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں۔ عموماً آبادیوں کے بڑے آدمی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں الرزق اسے سطحی پیمانہ پر میسّر آ رہا ہے۔ پھر قرآن کلّا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے تردید جو کر رہا ہے۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ نعمت و عزت کو صرف اپنے اعزاز اور اپنے بڑاپا کا ذریعہ بنا لینا، قرآن نے دراصل لوگوں کو اس سے روکا ہے۔ رُک کر پھر اسی عزت و شرف سے جو نظرتاً دولت و ثروت رکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے، اس کے استعمال کے ذریعہ کی طرف ان آیتوں میں راہنمائی فرمائی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو عزت دولت مندوں کو حاصل ہوتی ہے، چاہا یہ جاتا ہے کہ اس عزت اور بڑائی کو ان لوگوں کی عزت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا جائے، جنہیں دُنیا بلا وجہ اپنی آنکھوں سے گرا دیتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت ان بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے باپ کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ تقریبوں میں، شادیوں میں، تہواروں اور عیدوں کے مواقع پر کہ باپ رکھنے والے بچے اچھے اچھے کپڑوں میں اپنے اپنے باپوں کے ساتھ خوش خوش اُچھلتے کودتے، ناز نخرے کرتے آ رہے ہیں۔ دل میں جس چیز کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ابا جی کہہ کر، باپ کی فطری محبّت کو اُبھار اُبھار کر کام نکال رہے ہیں۔ لیکن ان ہی مجلسوں میں وہ بچے بھی ہوتے ہیں، جن کے باپ مر چکے ہیں، وہ اپنے دل کی آرزو کس سے کہیں، ابا جی، فلاں چیز بک رہی ہے، لے دیجئے کس سے کہیں، ان کے نازوں کا اٹھانے والا اس پورے مجمع میں کوئی نہیں ہوتا۔ جو اُن کی طاقت تھی وہ ڈھیر خاک ہو چکی۔ دل ہلا دینے والی کیفیت ہوتی ہے۔ جب مجمع میں کوئی بچہ اس شان کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ یہی وقت ہے ان لوگوں کی آزمائش کا، جنہیں بڑائی بخشی گئی ہے اور عزت

عطا کی گئی ہے۔ کہ اپنی بڑائی اور اپنی عزت سے کام لیتے ہوئے سوسائٹی کے اس معصوم کسمپرس ہستی کو بڑائی عطا کریں، ایک ایسا تعلق اس کے ساتھ پیدا کریں کہ ان کی بڑائی کی وجہ سے ان بچوں کی بھی عام نگاہوں میں بڑائی پیدا ہوجائے۔ گویا ان کی عزت کی وجہ سے لوگ ان بچوں کی بھی عزت کرنے لگیں۔ اکرامِ یتیم کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ حال تو ان بچوں کا ہے جن میں انسانی کمالات و قویٰ کی ابھی نشوونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کے ساتھ ہر مجمع، ہر آبادی میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ وہ بھی پایا جاتا ہے جن کی قوتیں ارتقائی مدارج کو طے کرنے کے بعد کسی وجہ سے ساکن اور معطل ہوگئیں اور اسی وجہ سے بسا اوقات معمولی کھانے کی ضرورت بھی وہ اپنے دست و بازو سے پوری نہیں کر سکتے۔ ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں "المسکین" کہا گیا ہے۔ ان لوگوں کو جنہیں بسطی پیمانہ پر روزی ملتی ہے۔ یعنی ضروریاتِ زندگی میں خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس پس ماندہ ہوجاتا ہے۔ ان ہی لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ یہ پس ماندہ دولت اس لئے تمہیں نہیں دی گئی ہے کہ صرف اپنے ہم جنسوں، ہم چشموں میں اپنی بڑائی کا آلہ اس کو بناؤ۔ بلکہ تمہارے ابنائے جنس میں کسب و سعی کی قوتیں جن کی ٹھنڈی پڑ گئی ہیں صرف یہی نہیں کہ ان کو کھلاؤ، بلکہ مذکورہ بالا آیت میں "تحاضون" کا لفظ فرمایا گیا ہے۔ جس کا مصدر محاضہ ہے۔ محاضہ کے معنی ہیں باہم مل کر لوگوں کو آمادہ کرنا۔ تو اب مطلب یہ ہوا کہ اربابِ ثروت کو ایسا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے جس کی وجہ سے نہ صرف خود، بلکہ دوسرے دولت مندوں میں بھی مسکینوں کی امداد و اعانت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لوگ امدادِ مساکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں۔ اور یہ تعلیم اس عام قاعدے پر مبنی ہے، کہ عموماً ہر سوسائٹی اور ہر سماج زیادہ تر اپنے طریقۂ کار میں دولت مندوں ہی کو نمونہ بناتی ہے۔ جس ملک کے دولت مند اپنی دولت کو کھیلوں، تماشوں، عیاشیوں، فضول خرچیوں میں صرف کرتے ہیں، دیکھا دیکھی دوسرے بھی ان ہی بے ہودہ مشاغل میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور جہاں دولت مندوں میں نیکیوں، غربا پروری اور مساکین نوازی کی رسم جاری ہوجاتی ہے، تو دوسرے بھی اُن کو دیکھ کر خیر کے ان ہی ابواب میں اپنی پسماندہ دولت کو صرف کرتے ہیں۔

الحاصل قرآن کے اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت و نعمت عزت و آبرو جنہیں دی جاتی ہے، اسی لئے دی جاتی ہے اور یہی اس بڑائی اور اکرام کا صحیح استعمال ہے۔ جو نعمت و عزت کی وجہ سے آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآنی آیت :-

احسن کما احسن اللہ الیک — نیکی کر، جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی!

میں بھی اس حسن سلوک کا، جو قدرت کسی کے ساتھ کرتی ہے، یہی صحیح استعمال بتایا گیا ہے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ "الشکر" کے لفظ سے مذہب میں جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو، خداداد نعمتوں کا یہی استعمال ہے۔ بلکہ اس عام قاعدے کی بنیاد پر، جس پر عموماً اسلامی تعلیمات مبنی ہیں۔ یعنی عمل کی تصحیح کا طریقہ اسلام میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے لوگوں کے علم کی تصحیح کر دی جائے، علم جب درست ہو جاتا ہے، تو قدرتی طور پر عملی اصلاح پر آدمی خود بخود آمادہ ہو جاتا ہے بلکہ صحیح علم سے خود بخود صحیح عمل پیدا ہونے لگتا ہے۔ آپ قرآن میں عملوا الصالحات سے پہلے عموماً "امنوا" کا جو لفظ پاتے ہیں تو اس کا منشا بھی یہی ہے۔ ایمان دراصل علمی تصحیح ہی کا دوسرا اصطلاحی نام ہے۔ جسے پیغمبر کے توسط سے اہل ایمان حاصل کرتے ہیں۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً سورۂ کہف میں باغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو یعنی بستی پہلانے پر جسے رزق دی گئی تھی۔ اس کے متعلق کہنے والوں کی زبان سے یہ فقرہ جو کہلوایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لولا اذ دخلت جنتک | اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ میں |
| قلت ماشاء اللہ لا قوۃ | داخل ہوا تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے سب اللہ |
| الا باللہ! | کا چاہا ہے، نہیں ہے قوت لیکن اللہ ہی سے |

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پانے کے بعد آدمی کو چاہیئے، کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دے، مثلاً باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا۔ حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت، جو کچھ بھی، جس کسی میں ہے، اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے۔ ظاہر ہے، کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو، ان کو دیکھ کر چاہیئے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ و اثر ہے۔ باغ ہی کو دیکھیئے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں پتے، پھول، پھل، اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشو و نما بارآوری میں دخل ہے۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے آدمی پیدا کرتا ہے؟ باغ تو خیر باغ ہی ہے، ایسی چیزیں جنہیں ہم

انسانی مصنوعات خیال کرتے ہیں۔ بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے۔ مثلاً ریل گاڑی اور اس کے انجن ہی کو لیجئے، سوچئے، انجن کے اجزا، لوہا، تانبا، پیتل انجن کے مزاجی و ہنری عناصر اور اس کے سوا جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے۔ بتایئے کہ آگ ہو، یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے؟ پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے۔ کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت ہی کا ایک بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے۔ کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؛ سوچتے چلے جایئے، اگر آپ حقیقت پر نظر جماتے ہوئے سوچیں گے تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی "ماشاء اللہ" کہنا پڑے گا! یعنی سب اللہ کا چاہا ہوا ہے۔ اور اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں[1]۔ یہ تو پہلے فقرے "ماشاء اللہ" کا مطلب ہوا

---

[1] یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات و اکتشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں، فکر و غور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں، میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات و ایجادات یا انکشافات جن لوگوں سے منسوب ہیں۔ زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فیصد نہیں تو ۹۰ فی صدی یہ وہی لوگ ہیں جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقعہ ہی نہیں ملا، یا کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے، یا تو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے مقابلہ میں ان کی تعلیم صفر کی حیثیت رکھتی ہے ہماری بیسویں صدی کے موجدِ اعظم ایڈیسن ہی کو لیجئے۔ اس بہرے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں۔ سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری و عقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں تو چاہئے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں موقعہ ملا یا ملتا رہتا ہے۔ ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا۔ لیکن جب واقعہ یہ نہیں ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات و ایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں۔ دوسری بات اسی کے ساتھ جسے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و اکتشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک ان ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بالکل دُور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا۔ مصر کے مشہور عیسائی مجلہ "الہلال" کی اشاعت ۱۹۲۲ء نومبر میں ایک مقالہ اسی توارد کے متعلق شائع ہوا ہے۔ استقرار و تتبع سے مقالہ نگار نے عہدِ حاضر کی (۱۴۳) ایجادوں کے متعلق ثابت (باقی برصفحہ آئندہ)

رہی دُوسری بات، یعنی "لا قوۃ الا باللہ" یہ اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے جو عموماً ایسے موقعہ پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے۔ خیال یہ گذرتا ہے کہ ہیں تو یہ سب کچھ قدرتی پیداوار اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج۔ لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہو سکتا، اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد و قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی اس وقت تک جیسا کہ چاہئے اس کے پھلنے پھُولنے کی کیا صُورت ہو سکتی ہے۔ اور اتنا حصّہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے۔ اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات و ایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا احمق کون ہوگا جو سمجھتا ہو کہ انجن کے لوہے، یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے۔ ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

دراصل اسی کے متعلق اس دُوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کر لیا جائے یعنی یہ سوچنا چاہئے کہ بلا شبہ ان امور کے ظہُور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہئے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عملی قوّتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ کھُلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں، تو ان قوّتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں۔ جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ بلکہ جو ہمارا پیدا کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے، کہ اسی کے ارادہ و مشیّت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے "لا قوۃ الا باللہ" دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شکر کے سلسلے میں بھی حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کر لی جائے اور اس سلسلہ میں واقعہ جب یہ ٹھہرا کہ نعمتوں کی شکل میں جو کچھ ہم سے باہر ہے، وہ تو ماشاءاللہ کا اور جو کچھ ہمارے اندر ہے، وہ "لا قوۃ الا باللہ" کا مظاہرہ ہے۔ اور نعمت ہی کیا، یوں بھی ہر شخص

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) گیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے، مثلاً امریکہ میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتہ میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی کا خیال پا رہا ہے آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے ۱۲

کے لحاظ سے یہ سارا عالم بجز "ماشاء اللہ" کے، یعنی جو کچھ ہے، سب اللہ کا چاہا ہوا ہے۔ اس کے سوا اور کیا ہے؛ یہ تو باہر کا حال ہے۔ اسی طرح ہر شخص کے اندر جس قسم کی قوتیں، طاقتیں، کمالات وصفات پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ "لاقوۃ الا باللہ" ہی کی تو نمائش ہے۔ گویا ان ہی دو فقروں میں سارا عالم آفاقی ہو، یا انفسی، یعنی آدمی کے باہر ہو، یا اندر، دونوں کا صحیح علم سمٹ کر آ گیا ہے۔ سوچنے والے جتنے زیادہ سوچتے چلے جائیں گے، اسی حد تک اس علم کی واقعیت ان پر واضح ہوتی چلی جائے گی اور جو اپنے علم کو اس طریقہ سے واقعات کے مطابق کر لے گا۔ ظاہر ہے کہ اب اس کے بعد جس صحیح راہِ عمل کا مطالبہ کسلی پیمانے پر رزق پانے والوں سے کیا گیا ہے۔ وہ خود بخود ان کے علم کا ایک منطقی نتیجہ کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ یعنی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نعمتیں اور جن قوتوں سے ان نعمتوں کو آدمی حاصل کرتا ہے، دونوں میری نہیں، بلکہ براہِ راست حق تعالیٰ ہی کی ہیں، تو خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقۂ عمل اختیار کرنے میں اسے کیا دشواری پیش آئے گی۔ ہاں، جنہوں نے اپنے علم کو واقعات کے مطابق کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا علم تو ان کا درست ہو چکا ہو، مگر یقین کی کیفیت جیسی کہ چاہئے اسے حاصل نہ ہوئی ہو۔ دقت اگر کچھ ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ تو ان ہی کو ہو گی یا ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسی علم کو مستحکم اور قلوب میں پوری قوت کے ساتھ جاگزیں کرنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ علاوہ باطنی احساس کے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے، ظاہری اعضاء سے بھی "شکر" ادا کرنا چاہئے۔ کیونکہ عموماً آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے۔ حدیثوں میں ہے، بخاری کی روایت ہے:-

> جب کوئی پانی پیتا ہے، کھانا کھاتا ہے، تو خدا پسند کرتا ہے کہ کھانے والے اور پینے والے اُس کی تعریف کریں اور گن گائیں!"

نیز کھانے، پینے، پہننے، الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائی نمونوں کو مسلمانوں کے لئے چھوڑا ہے۔ سب کا مطلب وہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو مسلمان اپنے اندر نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں، کہ عمل کو آسان کرنے کی یہی تجربی و نفسیاتی راہ ہے۔ نہ صرف زبان، بلکہ روایتوں میں جو یہ آتا ہے کہ تمام نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت خدا کے کسی بندے کے لئے ہو سکتی ہے یعنی "مغفرت" جب قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت حق تعالیٰ کی طرف سے سنائی گئی تو نمازوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتغال اور زیادہ بڑھ گیا۔ پوچھنے والوں

نے جب پوچھا، تو فرمایا گیا:۔

افلا اکون عبدا شکورا — کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہی نہیں بلکہ دُوسرے اعضاء و جوارح سے بھی "شکر" کی مشق کر کے اپنے باطنی احساس کو ابھارتے رہنا چاہیئے۔

بہر حال مقصود اصلی سب کا آخر میں وہی عمل کی تصحیح ہے۔ جس کے لئے علم کی تصحیح کرائی جاتی ہے۔ اور علمی احساس کو مکمل زندہ و بیدار رکھنے کے لئے مذہب نے علاوہ دل کے چاہا ہے کہ لوگ زبان سے بھی، اعضاء سے بھی الغرض ہر اس ذریعہ سے، جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد سے کام لینا چاہیئے تاکہ بسطی رزق کی صورت میں ضروریات میں صرف ہونے کے بعد آدمی کا جو حصہ لوگوں کے پاس پس ماندہ رہ جاتا ہے، اس کے صحیح استعمال میں آسانی ہو۔ یہی رزق مبسوط کی ذمہ داری ہے۔ اور اس کا وہ ابتلا و امتحان ہے جس سے بسطیوں کو عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اجمالاً اس سارے کاروبار کا نام خواہ عملی شکل میں ہو یا علمی، پھر زبان سے ہو، یا جوارح کا اس کا تعلق ہو، سب کا نام "شکر" ہے۔ قرآن میں بسطیوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ کہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام جنہیں حق تعالیٰ نے بسطی زندگی عطا فرمائی تھی۔ بارگاہِ الٰہی میں التجا فرماتے ہیں کہ:۔

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ — میرے پروردگار! میرے دل میں یہ بات ڈالئے کہ جس نعمت سے آپ نے مجھے سرفراز فرمایا ہے اس کا شکر ادا کروں!

قرآن میں اس کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تاذن کا لفظ اعلان کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں کہ منادی کر دی گئی ہے۔ یعنی اسی شکر کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

واذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم — اور جب منادی کی تمہارے مالک نے کہ اگر تم شکر کروگے تو میں قطعاً تمہیں بڑھاتا ہی چلا جاؤں گا

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ دینے والے کی مرضی کے مطابق جو طریقۂ عمل اس کی دی ہوئی چیز کے متعلق آدمی اختیار کرتا ہے، اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ اس عمل میں وہ امانت داری کا اظہار کرے گا، اسی قدر زیادہ اس کے سپرد بھی کیا جائے گا۔ لیکن بجائے اس کے اگر دینے والے کی مرضی کے خلاف خیانت سے کام لے گا تو قرآن میں اسی مطالبۂ شکر کے بعد یہ دھمکی دی گئی ہے:۔

ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ اور اگر تم ناشکری کروگے (تو یاد رکھو) کہ میرا عذاب بہت سخت ہے۔

جس کا تفصیلی قصہ انشاء اللہ عنقریب سنایا جائے گا۔

بہر حال بستی رزق کی حقیقی ذمہ داری درحقیقت یہی فریضۂ شکر ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ بھی ہے وہ اسی فریضۂ شکر کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب ان ذمہ داریوں کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق قدری رزق سے ہے۔

## قدری رزق کی ذمہ داریاں

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ "قدری رزق" کے متعلق عام خیال لوگوں کا کچھ ایسا ہے کہ رزق کی تنگی، یا معاشی ضیق، بالفاظ دیگر جس کی تعبیر غربت و فلاکت سے کی جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رزق کا یہ حال بجائے خود ایک ابتلاء اور ایسا ابتلاء ہے۔ جس میں مبتلا ہونے والے کے لئے یہی ابتلاء کافی و وافی ہے۔ ایسی حالت میں ان پر مزید ذمہ داریوں کے اضافہ کی گنجائش ہی کیا ہے! مشہور ہے کہ

ع خداوند روزی بحق مشتغل

یعنی روزی میں جو کشائش و وسعت رکھتے ہیں، ان کو تو خدا اور خدا کے احکام کی تعمیل کا موقعہ حاصل ہے۔ اسی لئے مذہب نے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی ہیں، تو وہ اس کے مستحق ہیں لیکن غریب قدری رزق رکھنے والا، جس کا عمومی حال یہ ہو کہ سر چھپاتا ہے تو پاؤں کھلتے ہیں۔ ایک جگہ کو سیتا ہے تو دوسری جگہ ادھڑ جاتی ہے۔ جس کی معاشی زندگی اس ادھیڑ بن کی شکار رہو، ظاہر ہے کہ ایسے

پراگندہ روزی، پراگندہ دل

آدمی سے مزید اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بظاہر یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ بقول ایک دل جلے انگریز کے، جس نے اسی غربت و فلاکت کا ذکر کرتے ہوئے جھنجھلا کر لکھا تھا۔

"غربت کی کش مکش کرنے سے قلب کی صفائی ہوتی ہے۔ یہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اس کش مکش سے سابقہ نہیں پڑا ہے ورنہ تمام کش مکشوں میں، جن میں کسی انسان کو پھنسایا جا سکتا ہے یہ (غربت و افلاس) سب سے زیادہ پست اور ذلیل کرنے والی کش مکش ہے۔" (داستان دہقان مصنفہ ڈارلنگ)

سعدی نے بھی مختلف پیرایوں میں اسی خیال کو ادا کیا ہے۔ ان کا زبان زدِ عام شعر اسی سلسلے کا یہ بھی ہے ؎

شب چو عقدِ نماز می بندم　　چہ خورد بامداد فرزندم

اور گو محدّثین کے اصُول پر ان مشہور اقوال کا آثارِ نبوت سے ہونا مشتبہ ہے۔ لیکن بہرحال مسلمانوں میں مشہور ہے اور اسلامی بزرگوں نے اپنی کتابوں، اپنی گفتگوؤں میں اُنہیں عموماً استعمال کیا ہے مثلاً :-

کاد الفقر ان یکون کفرا　　قریب ہے کہ ناداری اور محتاجی کفر بن جائے

یا :-

الفقر سواد الوجہ فی الدارین۔　　محتاجی اور ناداری دونوں جہان کی روسیاہی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو دُعائیں اسنادِ صحیح کے ساتھ منسوب ہیں، ان دعاؤں میں سے ایک دُعا میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنی :-

اللّٰھم انی اعوذ بک من فتنۃ الفقر!

اے اللہ میں فقر و محتاجی کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں

بعض دُعاؤں میں یہ بھی آپؐ فرماتے :-

اقضِ عنی الدّین واغننی من الفقر!　　مجھ سے میرے قرض کے بار کو اتروائیے اور محتاجی سے مجھے بے نیاز کیجئے!

سچ پوچھئے تو "قدری رزق" کے ان ہی حالات کی طرف مذکورہ بالا اقوال اور حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جن کے متعلق اس انگریز نے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدری رزق کے بعض مدارج ایسے ہولناک، جاں گسل، روح فرسا ہوتے ہیں کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی نصیحت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

قدری رزق کے دراصل یہی ہوش رُبا حالات ہیں، جن کی ذمہ داریاں بجائے قدریوں کے اسلام نے ان لوگوں پر عائد کی ہیں، جو بسط کے پیمانہ پر قدرت کی طرف سے روزی پاتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر آبادی کے ان طبقات کو جو بسطی معاش سے سرفراز ہیں، ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ ان سے لیا جائے گا اور ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا جو ان ہی کے ساتھ ان ہی آبادیوں میں

قدری زندگی لذا ادرہے ہیں۔ اسلام کو اپنے اصول پر اتنا اصرار ہے کہ قدریوں کے اسی حق کو بسطیوں سے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ میں تلوار تک اٹھائی۔ الزکوٰۃ کے نام سے بسطی آمدنی رکھنے والوں پر باضابطہ قانون کی شکل میں ایک ایسا فرض (زکوٰۃ) عائد کیا گیا ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اسلام کے چار اہم ارکان میں وہ ایک بڑا اہم رکن ہے۔ اس قسم کا اہم رکن کہ عہدِ صدیقی میں باضابطہ اعلانِ جنگ ان لوگوں کو دے دیا گیا تھا، جو قدریوں کے اس حق سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ایک ڈوری بھی اس حق کی اگر دبالی جائے گی تو ان پر قتال اور ان سے جہاد کیا جائے گا۔

اور صرف الزکوٰۃ ہی نہیں، ہر آبادی کے ارباب بسط پر صدقۃ الفطر کے نام سے جو صدقہ واجب کیا گیا ہے اور اس طور پر واجب کیا گیا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے یہ صدقہ نکالا جائے، جن کا آدمی کفیل ہوتا ہے۔ ہر سال تقریباً کروڑ ہا کروڑ روپے کی شکل میں دُنیا کے مسلمان اس صدقہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور گو مقصود بالذات قربانی سے صدقہ نہیں ہے، لیکن قرآن میں

واطعموا البائس والفقیر — اور کھلاؤ (قربانی سے) مصیبت زدہ محتاج کو

کا جو حکم قربانی ہی کے متعلق پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک بڑا مقصد قربانی کا یہ بھی ہے کہ قدری رزق رکھنے والوں کو بسطیوں سے امداد دلائی جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الزکوٰۃ کی مستقل مد کے سوا قدریوں کی امداد کی اور بھی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں منقول ہے

ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ ثم تلا لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ — مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی وہ آیۃ تلاوت کی جس کا ترجمہ ہے نیکی کو ہرگز نہ پاسکو گے جبتک وہ خرچ نہ کرو، جسے تم چاہتے ہو۔

اور اسی لئے سمجھا یا جاتا ہے، کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول، یعنی

اذا ادیت زکوٰتک فقد قضیت ما علیک — تم نے جب زکوٰۃ ادا کر دی، تو تم پر جو حق تھا، اسے پورا کر دیا!

یہ صرف حکومت کے اس مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جسے امیروں سے غریبوں کے لئے وصول کرنا اسلام

نے واجب ٹھہرایا ہے۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد حکومت اب امیروں سے مطالبہ نہیں کر سکتی۔ خود قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| ان تبدوا الصدقات فنعما | اگر صدقات کھلے بندوں ادا کرو، تو یہ بھی |
| ھی وان تخفوھا وتؤتوھا | اچھا ہے، اور اگر اسے چھپاؤ اور دو ناداروں |
| الفقراء فھو خیر لکم ویکفر | کو، تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور زائل کرے گی |
| عنکم سیئاتکم | یہ پوشیدہ خیرات تمہاری برائیوں کو! |

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ صدقات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جسے علانیہ، کھلے بندوں دیا جائے اور یہ بات اسی صدقہ میں پائی جا سکتی ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے اور دوسری قسم الصدقات کی وہ ہے، جسے چاہئے کہ آدمی چھپا کر ادا کر دے۔ قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں کا ازالہ اس خفیہ صدقہ سے ہوتا ہے، جو آدمی کو بری معلوم ہوتی ہوں کہ "السّیئات" بری باتوں ہی کو کہتے ہیں۔ اُن حدیثوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جن میں خبر دی گئی ہے۔ کہ بلاؤں کو صدقہ کے ذریعہ سے ٹالا جا سکتا ہے۔ یا صدقہ خدا کے غصے کو بجھا دیتا ہے۔ غالباً یہ خاصیت خفیہ صدقات ہی کی بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ صدقات کی اسی قسم کے متعلق غالباً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ کہ انہیں اس طریقہ سے لوگوں کو دیا کرو کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں کو نہ ہو۔ صرف یہی نہیں، بلکہ آئندہ قانونی الواب میں آپ پائیں گے کہ عام خیر و خیرات، صدقات کے سوا اسلام نے قرض کو بھی نیکی کی ایک بڑی اہم مد قرار دیا ہے۔ اتنی اہم، کہ قرض چاہنے والوں کی طرف سے قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر خدا نے خود قرض کا مطالبہ فرمایا ہے:۔

| | |
|---|---|
| من یقرض اللہ قرضاً حسناً | کون اللہ کو اچھا قرض دیتا ہے۔ تو بڑھائیگا |
| فیضاعف لہ | اللہ اس کو۔ |

قرآن میں تو صرف قرض کی حد تک یہ فرمایا گیا ہے، لیکن مشہور حدیث، جس میں بیماروں اور عام حاجت مندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشہور روایت ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمائیں گے:۔

| | |
|---|---|
| یا ابن آدم استطعمتک فلم | اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا |
| تطعمنی قال یا رب کیف اطعمک | تو تُو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ بندہ کہے گا، مالک! |
| وانت رب العلمین، قال اما | میں آپ کو کیسے کھلا سکتا تھا؟ آپ تو خود |

| | |
|---|---|
| علمت انه استطعمک | ہمارے جہان کے پالن ہار ہیں تب خداوند تعالیٰ |
| عبدی فلان فلم تطعمه | فرمائیںگے تجھے کیا اس کی خبر نہ تھی کہ میرے فلاں بندے |
| اما علمت ان لو اطعمته | نے تجھ سے کھانا طلب کیا تو تُونے اسے نہ کھلایا کیا |
| لوجدت ذالک عندی | تُو نہیں جانتا تھا کہ اگر اس شخص کو تُو کھلاتا تو پاتا تُو اس |
| | کھانے کو میرے پاس |

اسی طرح پیاسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان حاجت مندوں کی جگہ قائم فرما کر پلانے کا مطالبہ کیا ہے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ ان ذمہ داریوں کو، جو قدریوں کی طرف سے بسطیوں پر عائد ہوتی ہیں، کتنی اہمیت عطا فرما دی ہے۔ غالب مرحوم نے شاید اسی حدیث کے مطلب کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

اور قدری رزق کی پیچیدگیوں کے حل کی صرف یہی صورتیں اسلام نے اختیار نہیں کی ہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ باوجود مقدرت واقتدار کے پیغمبر اور پیغمبر کے جانشینوں (صلوات اللہ علیہم وسلامہ) نے زندگی کے جس نمونے کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کھانے، پینے، پہننے، رہنے سہنے کا جو معیار قصداً اختیار فرمایا گیا تھا، اس کی ایک مصلحت اگر یہ سمجھی جائے کہ غریبوں ۔ یعنی قدری معیشت رکھنے والوں کی دل دہی اور تسکینِ خاطر بھی اس طرزِ عمل سے مقصود تھی، تو ایسا سمجھنے کے کافی وجوہ موجود ہیں۔ آخر خود ہی غور کرنا چاہیئے کہ جس کا دعویٰ ہو کہ

اوتیت مفاتیح خزائن الارض (بخاری)

(مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں)

اور یوں بھی خدا کی طرف سے ہر قسم کی روحانی اور مادی قوتوں سے جو ہستی سرفراز تھی۔ کیا اسی کے متعلق مجبوری اور معذوری کا ہلکا سا وسوسہ بھی ہو سکتا ہے[1]، جن مسلمانوں کو خبر دی گئی ہے

---

[1] السبکی نے قاضی عیاض کے حوالہ سے اندلس کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ طلیطلہ کا رہنے والا ایک شخص صالح نامی تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس نے دعویٰ کیا کہ ان زھدہ لم یکن قصدا ولو قدر علی الطیبات لا کا \ (یعنی آنحضرت صلعم کی زاہدانہ زندگی قصد واختیار کا نتیجہ نہ تھی۔ آپ میں اگر اچھے کھانوں کے (باقی برصفحہ آئندہ)

کہ زمین کو سونا بنانے کا اختیار بھی آپ کو سپرد کیا گیا تھا۔ اُحد پہاڑ نے چاہا تھا کہ اپنی تمام چٹانوں کے ساتھ زرِ خالص کی شکل آپؐ کے لئے اختیار کرلے، اور جو مسلمان نہیں ہیں کم از کم اتنا تو سب ہی کو ماننا چاہئے کہ جس پیوند دوز، کمبل اور کھجوروں کی شاخوں سے چھائے ہوئے مکان میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات جس وقت ہوئی تھی، اس وقت اگر وہ چاہتے تو دس لاکھ مربع میل کے بادشاہ کی حیثیت کا لباس اور مکان بھی رکھ سکتے تھے۔ مگر آخر وقت تک نہ خود اس اقتدار سے فائدہ اٹھایا اور نہ اپنے خاندان والوں کو اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمایا ان کی چہیتی صاحبزادی بھی چکی ہی پیستی رہیں۔ اور مشکیں بھرتی رہیں، سوال یہی ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ مؤطا امام مالکؒ کی روایت

| | |
|---|---|
| ان المصائبي لتعزوا المسلمين | میری مصیبتیں تمام مسلمانوں کی مصیبتوں کے |
| في مصائبهم | وقت تسلی کرتی رہیں گی! |

میں اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مستور ہے۔ ندا ہی جانتا ہے۔ کہ پیغمبر اور منیب کے گھرانے والوں کی زندگی کا یہ معیار قدری معیشت رکھنے والوں میں سے کتنے خستہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا رہا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا، بلکہ اسی کو نمونہ بنا کر اگر امراء اپنی زندگی کے معیار کی نگرانی کرتے رہیں، ایسے تکلفات سے حتی الوسع پرہیز کریں، جن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے خواہ مخواہ غریبوں کو بے جا حسرتوں کے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے۔ تو یقیناً غریبوں کی دل دہی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ نے (باوجود سب کچھ رکھنے کے) جس قسم کی زندگی گذاری۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جسے جتنی زیادہ بلندی عطا کی جائے پستی میں رہنے والوں کی خاطر سے چاہئے کہ حتی الوسع وہ اپنی زندگی کے معیار کو زیادہ بلند ہونے نہ دے

حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ عتبہ بن فرقد جو کسی صوبہ کے عامل تھے، خدمتِ والا میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ ان کو اندر ہی بلا لیا حضرت

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ، کھانے کی مقدرت ہوتی تو ضرور کھاتے) گویا فقر کو وہ مجبوری و معذوری کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔ لکھا ہے کہ اس زمانے کے علماءِ اندلس نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ اور وہ سُولی پر چڑھا دیا گیا۔
(دیکھو کتاب نظام الحکومۃ النبویہ، الکتانی ص۹۹ ج ۲)

عمرؓ کی موٹی جھوٹی غذا کو دیکھ کر عتبہ نے کہا :-

هل لك من طعام يقال له الحوارى

آپ کیا ایسی خوراک استعمال نہیں کرتے جس کا نام میدہ ہے۔

جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عتبہ کو خطاب کر کے پوچھا۔

یا ابن فرقد هل ترى احدا من العرب اقدر منی۔

ابن فرقد! سرزمین عرب میں مجھ سے بھی بڑی مقدرت والا اس وقت کوئی ہے؟

عتبہ نے جواب میں وہی کہا جو کہا جا سکتا تھا۔ یعنی آپ سے زیادہ مقدرت رکھنے والا کون ہے؟
تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال وجواب کے بعد پوچھا

ویلک یسع ذلک المسلمین؟ قال لا

ابن فرقد! کیا سارے مسلمانوں کو میدہ کا یہ آٹا میسر آسکتا ہے؟ اس نے کہا نہیں!

اس طرز زندگی کا جو اصل مقصد تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

بئس الوالی انا اکلت طیبتها واطعمت النّاس کراديشها (ص ۳ ج ۵ طبری)

میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا اگر اچھا اچھا تو خود کھاؤں اور لوگوں کو بری، خراب خستہ چیزیں کھلاؤں!

عام رمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دُنیا کے امیروں کے لئے جو نمونے چھوڑے ہیں، آج ان نمونوں سے سلجھانے والے چاہیں تو دُنیا کی بہت سی الجھی ہوئی معاشی گتھیاں سلجھا سکتے ہیں۔ تفصیل کے لئے تو ان کی سوانح عمری ہی پڑھنی چاہئے، کیسی عجیب بات ہے، خلاف عادت آپ کو محض غریبوں کے خیال سے ایسی غذا اختیار کرنی پڑی، جو ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی تھی، کھانے کے بعد پیٹ بولتا تھا۔ آپ پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے

ان شئت قرقر وان شئت لا تقرقر مالك عندی ادم حتى یفتح الله للمسلمین۔ (طبری ص ۲۰۵ ج ۴)

تیرا جی چاہے تو گڑگڑا، اور تیرا جی چاہے، تو نہ گڑگڑا، مگر تیرے لئے میرے پاس سالن اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ قحط کی موجودہ مصیبت مسلمانوں کے سر سے نہ ٹل جائے۔

آپ ہی کے زمانے کا واقعہ ہے، حمص کے والی نے ایک علیہ (اٹاری) بنوائی تھی۔ جس پر خود رہتے تھے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ہوئی۔ بارگاہِ خلافت میں طلب ہوئے۔ حضرت عمرؓ سامنے بلا کر ڈانٹ کر پوچھ رہے تھے :۔

| | |
|---|---|
| بَنَيْتَ العلية واشرفت | تم نے اٹاری (بالاخانہ) بنوایا ہے، اور |
| بها على المسلمين والارامل | عام مسلمانوں، بیواؤں اور یتیم پر اسی |
| واليتيمة | کے ذریعہ سے شرافت و بلندی حاصل |
| (محب طبری ص ۵۵ ج ۲) | کی ہے۔ |

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیوند دوز کپڑوں میں دیکھ کر اس زمانے میں جب مسلمانوں کے آپ امیر اور خلیفہ تھے، دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا :۔

| | |
|---|---|
| لم ترقع قميصك ! | اپنے کرتے میں آپ پیوند کیوں لگاتے ہیں؟ |

جواب میں اسی نکتہ پر اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| لانه يخشع القلب ويقتدى | اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے اور |
| به المؤمنين. (طبری ص ۳۲ ج ۲) | مسلمان اس کو نمونہ بنا سکتے ہیں! |

بلا شبہ فقر کی یہی وہ روح پرور، حوصلہ افزا، شکل ہے جس پر اس کے اختیار کرنے والے، جتنا چاہیں، فخر کر سکتے ہیں۔ اور ارادی مسکنت کی یہی شانِ رفیع ہے جس کے لئے خلقِ خدا کے سچے ہمدردوں نے دُعائیں مانگی ہیں[1] اور سچ تو یہ ہے کہ بسط پر مقتدر ہونے کے باوجود قدریوں کی تسلّی کے لئے قدری زندگی کے معیار کو اختیار کرنے والوں ہی کو ان ذمہ داریوں کی تکمیل کا بآسانی موقعہ مل سکتا ہے۔ جو قدری معیشت رکھنے والوں کی طرف سے مذہب نے ان پر عائد کیا ہے۔

بہرحال قدری معیشت کی دشواریوں کو سہولتوں سے بدلنے کے لئے یہ تو اسلامی

---

[1] اور یہی حل ہے اس شبہ کا، جو اس موقعہ پر عموماً دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ابھی کچھ دیر پیشتر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کا ذکر گذرا، جن میں فقر سے بے نیازی کی خواہش آپ نے کی۔ یا دوسری دعا جس میں محتاجی و فقر کے فتنہ سے آپ نے پناہ مانگی ہے، سوال ہوتا ہے کہ باوجود اس کے پھر پیغمبرؐ نے اپنی زندگی فقر کی کیوں رکھی، بلکہ بعض دعاؤں میں آپ نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مسکین زندہ رکھئے الخ حل یہی ہے کہ اضطراری فقر اور محتاجی جو باعث فتنہ بن جاتی ہے اس سے تو پناہ مانگی گئی ہے اور جس فقر کو آپ نے اختیار فرمایا یا جس کی دعا کرتے تھے وہ یہی اختیاری فقر و مسکنت ہے۔ ۱۲

ہدایتوں کا وہ سلسلہ تھا، جن کا خطاب بجائے قدریوں کے بسطیوں سے ہے۔ واقعہ تو یہ ہے، کہ جن جاں فرسا پیچیدگیوں اور کش مکشوں میں قدری زندگی آدمیوں کو مبتلا کر دیتی ہے، ان کے حل کے لئے اسلامی دستور کے یہی قوانین کافی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ عمل کرنے والے جیسا کہ چاہئے ان پر عمل بھی کریں۔ اور قدرت نے جو ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کو بسطی پیمانے پر روزی پانے والے طبقات اپنا فرض خیال کریں۔ قدریوں کے جو حقوق بسطیوں کی آمدنیوں میں اسلام نے قائم کئے ہیں۔ حکومتیں ان حقوق کو حاصل کر کے حقداروں تک پہنچانے کا باضابطہ نظم اگر قائم کر دیں اور یہی براہِ راست جو مطالبات اس سلسلہ میں بسطیوں سے کئے گئے ہیں۔ ان مطالبات کی تکمیل ہوتی رہے جنہیں معاشی بلندی عطا کی گئی ہے۔ پستی میں رہنے والوں کے خیال سے وہ بھی اپنی زندگی کے معیار کو حتی الوسع پست ہی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قدری معیشت کی جن تلخیوں کا دُنیا کو شکوہ ہے۔ بہت کچھ اس کے ازالے کی صورت یوں ہی نکل آسکتی ہے۔

لیکن اسلام کامل دین ہی کیوں ہوتا، اگر اسی نقطہ پر اپنی تعلیم کو ختم کر دیتا ــــ آپ دیکھئے، ایک طرف بسطیوں کو خطاب کر کے قدری زندگی کی الجھنوں کے سلجھانے کی جو تدبیریں ں نے اختیار کی ہیں، وہی کیا کم تھیں۔ لیکن دوسری طرف براہ راست قدری معیشت رکھنے والوں کو بھی جو ہدایتیں دی گئی ہیں۔ کاش! ان ہدایتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی، تو غریبوں کے طبقات کو اس کا تجربہ ہو سکتا تھا کہ اپنی جن معاشی بے چینیوں اور قلبی کلفتوں میں وہ بسطیوں کے بظاہر دستِ نگر نظر آتے ہیں، بجائے دوسروں کے بہت کچھ ان کے ازالہ کا سامان وہ خود بھی کر سکتے ہیں۔ اور اب میں ان ہی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

**نون مدو عد** | یہ میری ایک اصطلاح ہے۔ اور قرآن سے ماخوذ ہے۔ مد کے قانون سے را اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی
ما متعنا به ازواجا منهم
زهرة الحیوۃ الدنیا
لنفتنهم فیه (طٰہٰ)

اور نہ اُٹھائیو! اپنی دو آنکھوں کو ان کی
طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے
نعمتیں بخشی ہیں، یہ پست زندگی کی تازگی ہے
تاکہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں!

بعض الفاظ کی کمی وبیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

| | |
| --- | --- |
| ولا تمدن عینیک الیٰ | اور نہ اٹھا اپنی دونوں آنکھوں کو ان |
| ما متعنا بہ ازواجا منھم | چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے کی |
| ولا تحزن علیھم۔ | شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا ہے اور |
| (کہف) | نہ اس پر غم کھانا۔ |

ان دونوں آیات میں مدعین سے منع کیا گیا ہے۔ مدّ کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں۔ اور عین کے معنی آنکھ۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ جنہیں گویا بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔ اردو میں مدّ نظر کا لفظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ جو مدّ عین کا مفہوم ہے۔ خیر، یہ تو الفاظ کا سرسری حاصل ہوا۔ بسطی طبقات کی تعبیر جن الفاظ سے یہاں کی گئی ہے، غور کرنے کی یہی چیز ہے پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے۔

(۱) پہلی بات اس سلسلے کی "ازواجا" کا لفظ ہے۔ بسطی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اشارہ کیا گیا ہے۔ مشاہدہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے۔ عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری لباس، پوشاک، مکان وغیرہ وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی۔ باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود رہتی ہے۔ لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا۔ دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ پھر شکل وصورت، رنگ وروغن کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان امیروں کے کمروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے۔ دوسری طرف کسی کونے میں دیکھیے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھا ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیر رہتے ہیں، ان کی چھڑی دانیوں میں رکھا نظر آئے گا۔ اور یہ تو ان کا حال ہے جن کا شمار نسبتہً متوسط طبقات بلکہ کہئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ چھٹ بھیوں میں جو گنے جاتے ہیں، ازدواجی مذاق میں ان کی یہ کیفیت ہے۔ باقی ان میں جو بڑے ہیں ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ہر

چیزیں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد گئی ہے تو صرف "ازدواجیت" اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سُنا ہی نہیں گیا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے مد مقابل دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل وصُورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی، چونکہ قبلہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس دُوسری مجازی مسجد کا کعبہ کی سمت واقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے واقعہ میں تو وہ مسجد نہ ہو سکی۔ لیکن دیکھنے والوں کو اگر مغالطہ ہو جائے اور شکل وشباہت سے دھوکہ کھا کر اس میں نماز پڑھنے لگیں تو کچھ تعجب نہیں!

(۲) دوسری چیز "زہرۃ الحیٰوۃ الدنیا" کے الفاظ ہیں۔ "الحیٰوۃ الدنیا" تو ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ پست زندگی کی تعبیر ہے۔ رہا زہرہ سو لغت میں اس کے معنیٰ تازگی اور شادابی کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ ایک تو انسان کی موجودہ زندگی کے واقعی ضروریات ہیں۔ یعنی ایسی ضرورتیں، جن کے بغیر اپنی زندگی کو آدمی گذار نہیں سکتا۔ معاشی اصطلاح میں جنہیں NECESSARY کہتے ہیں۔ اور دُوسری چیز مثلاً وہ ہیں، جن کا اصطلاحی نام LUXURY ہے۔ سچ پوچھئے تو زہرۃ الحیٰوۃ الدنیا" زندگی کے ثانی الذکر لوازم کی قرآنی تعبیر ہے۔ دوسرے مقام پر اسی کو کبھی "زینۃ الحیٰوۃ الدنیا" بھی کہا گیا ہے۔ یعنی زندگی کی آرائش وزیبائش سے ان کا تعلق ہے۔

ان امور کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب مذکورہ بالا آیات کے مفہوم کو سمجھنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ بسطی طبقات کی طرف نگاہ اٹھانے سے جب ان آیتوں میں منع کیا گیا ہو تو یہی قرینہ ہے اس بات کا، کہ براہِ راست ان آیتوں کے خطاب کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے۔ جو معاشی لحاظ سے بسطی نہیں، بلکہ قدری زندگی رکھتے ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بسط وقدر انسان کے معاشی مدارج کی اضافی شکلیں ہیں۔ اس لئے ان کے استعمال میں یہی چاہئے کہ کسی خاص طبقہ کو متعین کر کے محدود نہ کر دیا جائے، بلکہ وہی بات کہ اپنے آپ سے بالاتر طبقات کے حساب سے جو لوگ یہ پاتے ہوں کہ معاشی لحاظ سے وہ قدر اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں۔ وہی ان آیتوں کا اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں، جن کی طرف حق تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی ہے۔

مقصود تو ان آیتوں سے یہی ہے کہ ہر شخص کو معاشی جد وجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر

نظر رکھنی چاہیے۔ دُوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائیگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں لوگ مبتلا نہ کریں۔ گویا دُوسرے الفاظ میں وہی بات جس کی طرف قرآن ہی کی آیت

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ — اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے

بعضکم علی بعض! — خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے!

میں توجہ دلائی گئی ہے۔ میں نے بھی کہیں لکھا ہے۔ کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے پورا ہونے کے باوجود جو دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں۔ وہ دنیا میں اگر تنہا پیدا ہوتے، اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا۔ پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی مسرور ہوتا، کیوں نہیں، آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گذاریں۔ تجربہ بتا دے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدرتی معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہو گا، کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ ہے۔ لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مذکورہ بالا آیات کے جن الفاظ کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے، ان پر غور کیجئے، نظر آئے گا کہ ان الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے۔ آخر سوچئے کہ بسطیوں کے جن حالات کو دیکھ دیکھ کر قدریوں کا گروہ محزون و مغموم رہتا ہے، تجزیہ کے بعد ان کی حقیقت کیا وہی نہیں ہے کہ زیادہ تر ان میں وہی ازواجی مذاق یعنی ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں رکھنے اور ہر شئے کے مدمقابل کے مہیا کرنے کے شوق سے ان کا تعلق ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک قسم کی ابلہی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ تاجروں اور کاریگروں، کارخانہ داروں سے پُوچھئے، وہی ابلہ نہ چونچلوں کے اس راز سے خُوب واقف ہیں اسی لئے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں اور قالبوں میں ڈھال کر وہ ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان بیچاروں کی ماؤف ذہنیت سے جو ازدواجیت کے ذوق کی عموماً مریض ہوتے ہیں، فائدہ اٹھاتے ہیں بسطیوں کو جو کچھ دیا گیا ہے، جو اس کی اس واقعی حقیقت پر متنبہ ہو جائے گا جس کی طرف قرآن نے "ازواجا" کے لفظ سے اشارا کیا ہے۔ ظاہر ہے، کہ حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اسی ابلہی کی ہوس اپنے اندر کیوں پیدا کرے گا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور حدیث

من حسن اسلام المرء ترکہ — آدمی کے اسلام کی خوبی کی یہ دلیل ہے کہ لاطائل

مالا یعنیہ!        اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کردے!

کا ایک مصداق آدمی کا یہ طرزِ عمل بھی ہے، بلکہ حدیثوں میں جو آیا ہے۔

یکفیک من الدنیا ما سد جوعتک ووارٰی عورتک وان کان شیٔ یظلک فذاک وان کان لک دابۃ فبخ۔ (کنز العمال)

دُنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے تیری بھوک کا ازالہ ہوجائے اور جس سے تیری ستر پوشی ہوجائے اور ان چاکے ساتھ اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے سائے میں تُو رہے۔ دستی کسی قسم کا گھر تو پھر یہ تو ہے ہی اسی کیساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔

اس میں بھی اسی حقیقت کی یافت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب اس کے بعد زہرۃ الحیوٰۃ الدنیا" کے الفاظ پر غور کیجئے، میں نے عرض کیا تھا کہ اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں "زینۃ الحیوٰۃ الدنیا" سے بھی کی گئی ہے۔ یعنی جن سرمایوں کو بسطیوں کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے، قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ کہ اس کا تعلق بھی زندگی کی ضرورت سے نہیں، بلکہ زینت سے ہے۔ جن لوگوں کو حیاتِ دنیا کی زینت دی گئی ہے۔ اس زینت کے استعمال سے تو ان کو منع نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ منع کرنے والوں کو ڈانٹا گیا ہے۔ جس کا ذکر اپنے مقام پر آچکا ہے۔ لیکن سوال ان لوگوں کے متعلق ہے جو حیاتِ دنیا کی اس زینت، یا زہرہ سے محروم ہیں۔ کیا ان کی محرومی اس قابل ہے کہ اس پر حزن کیا جائے۔ اور اس حزن وملال کو مٹانے کے لئے زینت ہی کو اپنی زندگیوں کا مقصود بنا لیا جائے؟ قرآن میں سخت تہدیدی لہجہ میں یہ فرماتے ہوئے

تریدُ زینۃ الحیٰوۃ الدُّنیا۔        کیا اس پست زندگی کی زینت کو تم اپنا مقصود بناتے ہو؟

حیاتِ دنیا کی زینت کو مقصود بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیوں روکا گیا ہے؟ کیا خدا کا اس میں فائدہ ہے؟ آخر حیاتِ دنیا کی زینت سے جو سرفراز کئے گئے ہیں۔ انہیں اس کے استعمال سے جب منع نہیں کیا گیا ہے۔ تو زینت کا استعمال ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ناراضی کا سبب کیسے ہوسکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہاں خطاب ان لوگوں سے ہے۔ جن کی معاشی زندگی زینت کے اسباب سے خالی ہے۔ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بلاوجہ زینت کو اپنا مطلوب بنا کر وقت کو رائیگاں نہ کریں۔ جب ضرورت پوری ہو رہی ہے تو غیر ضروری چیزوں کی طلب میں اپنے آپ کو دکھ میں آدمی

کیوں مبتلا کرے۔ بلکہ مذمین والی آیتوں میں سے ایک آیت جو سورۂ طٰہٰ میں پائی جاتی ہے، اس کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں

ورزق ربک خیر و ابقیٰ۔ — تیرے مالک کی روزی تیرے لئے خیر بھی اور زیادہ باقی رہنے والی بھی!

اگر غور کیا جائے تو حیاتِ دُنیا کی زینت کو مطلوب بنانے سے روکنے کے دوسرے وجوہ بھی اسی سے سمجھ میں آسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ زینت سے ہٹ کر اگر آدمی ان ہی ضروریات پر قناعت کرے جن کی بدولت اس کی زندگی گذرتی رہتی ہے، قرآن نے جس کا نام "رزق رب" رکھا ہے، تو زینت کی لَو کو دل سے نکالنے کے ساتھ ہی رب کی یہی روزی آدمی کے لئے خیر کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ خیر کے معنی یہی ہیں کہ وہی اس کی فطرت کے لئے بہتر اور خوشگوار بن جاتی ہے اور — یہ حاصل تو "خیر" کے لفظ کا ہُوا۔ رہا دُوسرا لفظ "ابقیٰ" کا جو اس کے بعد ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ آدمی جب تک جیتا ہے، اس وقت تک ضروریاتِ حیات بہرحال اس کے لئے مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے۔ جب تک قدرت ان ضرورتوں کو اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے۔ جن پر اس کی زندگی مبنی ہے۔ اس لئے جب تک زندگی ہے اُس وقت تک ان ضرورتوں کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ اور جب تک یہ ضرورتیں فراہم ہوتی رہتی ہیں اسی وقت تک زندگی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اور زندگی کی ان ضرورتوں کو ایک دوسرے سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا۔ بخلاف ان چیزوں کے، جن کا تعلق حیاتِ دُنیا کی زینتوں سے ہے۔ کہ زندگی کے ساتھ ان کی بقار کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا۔ آئے دن لوگوں کو یہ ملتی ہی رہتی ہے اور چھنتی بھی رہتی ہے۔ کتنے زینت والے ہیں جو جیتے رہتے ہیں اور حیاتِ دُنیا کی ان زینتوں کے بغیر جیتے رہتے ہیں۔ جن سے کسی زمانہ میں وہ مالا مال تھے "زینۃ الحیٰوۃ الدنیا" کو مطلوب و مقصود بنانے سے منع کرنے کا یہ دوسرا فائدہ ہے۔ جس کی طرف "ابقیٰ" کے لفظ سے میرے خیال میں قرآن میں ایما کیا گیا ہے۔ اور غالباً یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے:-

ما قل وکفیٰ خیر مما کثر والھیٰ۔ — ایسی چیز جو کم ہو، لیکن کافی ہو، وہ بہتر ہے اس چیز سے جو ہو تو بہت، لیکن آدمی کو غفلت میں مبتلا کر دے۔

(ضیائی المختار)

(یعنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے غافل بنا دے)

اور یہ مطلب "زہد" کا ہُوا۔ باقی اسی قانون کا دُوسرا جُزو جسے "عدّ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے، یہ اصطلاح بھی قرآن ہی کے الفاظ سے ماخوذ ہے۔

مقصد یہ ہے کہ قدری معیشت رکھنے والوں کو ایک تو سلبی حکم یہ دیا گیا ہے کہ طرح طرح کی نعمتوں اور حیاتِ دُنیا کی تروتازگی زیب و زینت سے جو لوگ سرفراز ہیں ان کی طرف مدّعینن نہ کرنا چاہئے۔ یعنی ان کی طرف ٹکٹکی باندھنے یا لَو لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اسی کے ساتھ قرآن ہی کے دُوسرے ایجابی حکم کو ملا لیا جائے۔ یعنی اس قسم کی آیتوں کو، جن میں سے ایک مشہور آیت یہ ہے :-

| | |
|---|---|
| وان تعدوا نعمة الله | اور اگر اللہ کی نعمت کو تم گنو، تو نہ گن |
| لا تحصوها | پاؤ گے اس کو! |

مذکورہ بالا آیت میں نعمتوں کے عدّ (شمار) کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام مدّ کی مناسبت سے "عدّ" رکھ دیا گیا ہے۔ مدّ کا قانون تو سلبی حکم پر مشتمل ہے، یعنی مدّعینن سے روکا گیا ہے اور عدّ والا قانون ایجابی و اثباتی ہے۔ یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈوبا ہُوا ہے، انہی کے گننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانونِ مدّ کی تعمیل کرتے ہوئے نایافتہ نعمتوں سے نگاہوں کو ہٹا کر یافتہ نعمتوں کو اگر آدمی شمار کرنے لگے تو بسطیوں کی طرف آنکھ اُٹھانے، ان کے معاشی حال سے اپنے معاشی حال کو ناپنے کی وجہ سے قلب میں شکوے شکایت کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف ان کا ہی ازالہ نہیں ہو جائے گا، بلکہ یافتہ نعمتوں کے شمار کرنے، یعنی قانونِ عدّ پر عمل کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ جذباتِ شکر کی مسرتوں سے دل بھر جائیں گے۔ بخاری و مسلم وغیرہ میں جو یہ حدیث پائی جاتی ہے، یعنی

| | |
|---|---|
| قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم | تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے |
| اذا نظر احدکم الی من | مال و دولت میں اس پر برتری عطا کی گئی ہو |
| فضل فی المال، فلینظر الی | تو چاہئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو |
| ماھو اسفل منہ۔ | (مال و دولت کے حساب سے) اس سے نیچے ہیں۔ |

میں تو سمجھتا ہوں کہ قانونِ عدّ ہی کی تعمیل کی یہ ایک عملی شکل ہے، مطلب وہی ہے کہ بسطیوں کی دولت و ثروت، اُبہت و شوکت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قدری معیشت سے جو لوگ غیر مطمئن ہو جاتے ہیں

اور نایافتہ کی حسرتیں ان کو بے چین کرتی رہتی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ ان نعمتوں کو شمار کریں جو انہیں حاصل ہیں۔ اور ان حاصل شدہ نعمتوں کے شمار کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو چاہئے ان لوگوں کو دیکھے جو نعمتوں کے حساب سے اس سے بھی فروتر درجہ میں ہیں۔ سعدی نے جسکی مثال دی ہے کہ بغیر جوتے کے ایک دن راہ چلنے کا مجھے اتفاق ہوا، اپنے افلاس کا دل میں شکوہ پیدا ہوا تھا کہ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی، جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر

"سپاس نعمتِ حق بجا آوردم و بر بے کفشی صبر کردم"

اللہ کی نعمت کا شکر بجالایا، اور جوتے کے نہ ہونے پر دل کو صبر ہو گیا!

اور کوئی شبہ نہیں کہ قدری معیشت کی طرف جن جن تکلیفوں کو منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے بعد صرف زائل ہی نہیں، بلکہ زحمتیں راحتوں سے بدل جاتی ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث کے راویوں میں عوف بن عبد اللہ بن عتبہ بھی ہیں۔ صاحب جمع الفوائد نے ان کا یہ ذاتی تجربہ نقل کیا ہے۔ یعنی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا ہے:۔

کنت اصحب الاغنیا فما کان اکثر ھمامنی کنت اری دابة خیرا من دابتی وثوبا خیرا من ثوبی فلما سمعت ھذا الحدیث صحبت الفقراء واسترحت۔

(مجمع الفوائد ص ۱۵۲ ج ۱)

میں پہلے امیروں کی صحبت میں زندگی گزارا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مجھ سے زیادہ غم والم والا کوئی نہ ہوگا۔ میں دیکھتا کہ دوسروں کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اور دوسروں کے کپڑے میرے کپڑوں سے اچھے ہیں، لیکن جب سے مذکورہ بالا حدیث میں نے سنی، میں نے فقیروں کی صحبت اختیار کی، بس اس دن سے چین میں ہوں!

**قدری معیشت اور قانون صبر!**

اور اب سمجھا جا سکتا ہے کہ اس صبر کا کیا مطلب ہے؟ جس کا مطالبہ اگرچہ ان تمام کشمکشوں، پریشانیوں اور بے چینیوں میں کیا گیا ہے، جو موجودہ زندگی کے شعبہ میں پیش آتی ہیں یا آسکتی ہیں۔ لیکن ان ہی پریشانیوں میں قدری معیشت کی پریشانیاں بھی ہیں جن کے متعلق قرآن میں اسی صبر کے قانون سے استعانت اور امداد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صبر سے جن مقامات پر کام لینا چاہئے۔ ان میں "اموال کے نقص" کا بھی

قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ اور جو لوگ قدری معیشت کی پریشانیوں میں صبر سے کام لیتے ہیں

| | |
|---|---|
| الصابرین فی البأساء والضراء | یہی جو جنگی مصائب اور معاشی تکلیفوں کے وقت صبر کرنے والے ہیں! |

کے ذیل میں شمار کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "مدّو عدّ کے قانون" کو سمجھ لینے کے بعد قدری معیشت رکھنے والوں کے لئے "صبر" کے مطالبہ کی تکمیل میں غور کرنا چاہیئے، کیا اب بھی دشواری پیش آسکتی ہے؛ آخر "صبر" کا کیا مطلب ہے، شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے، یعنی

| | |
|---|---|
| حبس النفس عن الشکوی (ج ۴ ص ۲۱۶) | اپنے جی کو شکوہ و گلہ سے روکے رکھنا۔ |

ظاہر ہے کہ "مدّو عدّ کے قانون" کا علم، جن الفاظ میں قرآن نے عطا کیا ہے، جس کی تشریح گذر چکی۔ اس علم کی روشنی میں "صبر" کے مقام تک آدمی قدرتی طور پر پہنچ جاتا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ ان قوانین سے علم کی تصحیح کے بعد شکوہ شکایت کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، بلکہ بجائے اس کے دل کو شکریوں کے جذبات سے معمور بنایا جاسکتا ہے۔ "صبر" غریب کا جن لوگوں نے دار دئ تلخ "نام رکھ چھوڑا ہے۔ حتیٰ کہ بعضوں نے تو صبر کے اس نقطہ تک کو عربی زبان کے لفظ "صبر" سے ماخوذ قرار دیا ہے، جو ایلوا جیسی تلخ چیز کا نام ہے۔ پھر اس تلخی کو مٹانے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں سے دُنیا کے اکثر ادبیات میں کام لیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت کا اسلام نے جو طبعی طریقۂ کار اختیار کیا ہے، یعنی عمل کی تصحیح کے لئے علم کی تصحیح یہاں بھی اسی طریقۂ کار کو اختیار کرنے کے بعد آپ نے دیکھا کہ "صبر" کا عمل اس علم کا ایک لازمی منطقی نتیجہ بن جاتا ہے، جو مدّ و عدّ کی آیتوں سے ہمیں بخشا گیا ہے۔ یعنی بسطی معیشت والوں کی دولت و ثروت کو دیکھ دیکھ کر قدری معیشت والوں کو جو کوفت اور دُکھ ہوتا رہتا ہے۔ دُکھ کا یہ کانٹا نکل جاتا ہے۔ ایک سکون میسّر آتا ہے، ایسا سکون جو لوگوں کے سامنے اپنے افلاس اپنی تنگ دستی کے اظہار سے آدمی کو بے نیاز بنا دیتا ہے، یہی لے دے کر صبر کا مطلب ہے، ورنہ جو چیزیں آدمی کو میسّر نہیں ہیں ان کے لئے جدوجہد کرنا خواہ جزئی اسباب کی راہ سے سعی و کوشش کی جائے، یا کائناتی پیداوار جس کے قبضۂ قدرت میں ہے، دُوسرا نام جس کا سبب الاسباب ہے۔ اس کے آگے عرض و معروض کر کے ان

چیزوں کے حصول کی تدبیر اختیار کی جائے یعنی دعا کی جائے، صبر کے منافی نہ وہ ہے، نہ یہ ہے سعی وعمل کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا، پہلے کہہ چکا ہوں، رہی دوسری تدبیر یعنی مسبب الاسباب ہی سے براہ راست ان کو مانگنا اور طلب کرنا، سو اس کا حکم تو قرآن ہی میں ہے، اسی آیت کے بعد جس میں مدعین سے منع کیا گیا ہے، یہ ارشاد ہے

واصطبر لعبادته نحن نرزقك والعاقبة للتقوىٰ

اور اپنے مالک کی عبادت پر ڈٹا رہ، ہم تجھے روزی پہنچائیں گے، اور اچھا انجام تو پرہیزگاری کا ہے!

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ارباب ثروت و دولت کی طرف ٹکٹکی باندھنے سے تو کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر اور اپنے آپ کو ان سے ناپ ناپ کر لوگ اپنے ہاتھوں خود کو ذہنی لکد کوب اور دماغی کوفت میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ بلکہ بجائے اس کے قرآن حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہو۔ عبادت کی تشریح کرتے ہوئے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

الدعاء مخ العبادة

عبادت کا مغز دعا ہے!

بلکہ بعض روایتوں میں تو ہے کہ

الدعاء هو العبادة

دعا ہی عبادت ہے!

پس عبادت پر ڈٹے رہنے کا مطلب یہی ہوا کہ دعا پر ڈٹے رہو، آگے وعدہ کیا گیا ہے، کہ

نحن نرزقك

ہم تمہیں روزی پہنچاتے رہیں گے!

گویا دعا کے راز سے واقف ہونے کے بعد جو اس پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ روزی کے اس سرچشمہ پر جا کر کھڑا ہو گیا ہے۔ کہ جس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے، وہیں سے مل رہا ہے۔ پس صبر کی تلقین سے مقصود یہی ہے کہ غیروں کے سامنے ذلیل ہونے سے اللہ کے بندوں کو بچایا جائے۔ ورنہ حق تعالیٰ سے مانگنا، اس کے آگے اپنی ضرورتوں کے لئے گڑگڑانا، یہ تو بندوں کی زندگی کے نصب العین کی تکمیل ہے۔ اسی لئے شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ

الصبر عندنا حبس النفس عن الشكوى لا الى الله (فتوحات ص ۲۱۶ ج ۲)

صبر کی حقیقت ہمارے یہاں یہ ہے کہ اپنے جی کو آدمی شکوہ شکایت سے روک رکھے لیکن خدا کے آگے نہیں!

یعنی خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں کا پیش کرنا، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ ترمذی کی جو یہ حدیث ہے، کہ:۔

| | |
|---|---|
| قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم | جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہو، اگر اپنی |
| من نزلت بہ فاقۃ فانزلھا | اس حاجت کو لوگوں پر وہ پیش کریگا تو اسکی |
| بالناس لم تسد فاقتہ ۔ | حاجت پوری نہ ہوگی اگر وہ جس پر فاقہ کی |
| ومن نزلت بہ فاقۃ فانزلھا | مصیبت نازل ہوئی اور اپنی اس حاجت کو |
| باللہ فیوشک اللہ برزق | اس نے خدا کے سامنے پیش کیا تو قریب ہے کہ دیر |
| عاجل او عاجل ۔ | یا سویرا اس کے پاس روزی پہنچ کر رہے گی |

الحاصل "الرزق" کا جو حقیقی مالک و مختار ہے، اس کے آگے اپنی ضرورت کو پیش کرنا، پیش کرتے رہنا اور اس ضرورت کی تکمیل کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا اسی کا اصطلاحی نام "توکل" ہے۔ قرآن میں:۔

| | |
|---|---|
| رب المشرق والمغرب | پالنے والا مشرق کا اور مغرب کا نہیں |
| لا الٰہ الا ھو ! | ہے الٰہ کوئی اس کے سوا ! |

کا علم عطا فرمانے کے بعد:۔

| | |
|---|---|
| فاتخذہ وکیلا | پس بنالے تو اسی کو اپنا وکیل ! |

کے فرمان میں اسی "توکل" کا امر اور حکم دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قدرتی معیشت کی کشمکشوں میں صبر کی راہ کھول کر اور صبر کے دامن کو "دعا، و توکل" سے جوڑ کر، زندگی کے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے کہ معیشت کی قدرتی اور تنگی خواہ کسی حال میں پہنچ گئی ہو، لیکن عمل کرنے والے ان قاعدوں پر عمل کر کے چاہیں تو ہمیشہ اپنے آپ کو خوش رکھ سکتے ہیں، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کی آیت

| | |
|---|---|
| واصبر نفسک مع الذین | اور روکے رکھیو اپنے آپ کو ان لوگوں |
| یدعون ربھم بالغداۃ | کے ساتھ جو پکارتے ہیں، اپنے مالک کو |
| والعشی یریدون وجھہ | صبح و شام، مقصود بنایا ہے ان لوگوں نے |
| ولا تعد عیناک عنھم ترید | اللہ کے وجہ کو، اور نہ ہٹا یو اپنی دونوں |
| زینۃ الحیوۃ الدنیا ولا | آنکھوں کو ان سے، کیا مقصود بنانا چاہتے |

تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان امرہ فرطا۔

ہو، تم پست زندگی کے بناؤ سنگار کو، اور نہ اطاعت کرنا ان لوگوں کی جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من مانی) کے اور ہے بات اسکی حد سے گذری ہوئی!

اس میں بھی صبر کی تلخیوں کو مٹانے کی ایک تدبیر بتائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی عمل کے اختیار کرنے میں آدمی کو اگر دشواری محسوس ہو، تو عام قاعدہ ہے، کہ نمونوں اور مثالوں سے پست ہمتوں میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کو مذکورہ بالا آیت میں اسی کی ہدایت کی گئی ہے، حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہ اللہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا، یعنی یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ اور اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا، یہی مسلمان کی ہستی کا مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا آخری خلاصہ یہی ہے، پس حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے وجہ اللہ کو اپنا مقصود اور اپنے وجود کا نصب العین ٹھہرا لیا ہے۔ ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھو، زندہ ہوں تو ان ہی کے صحبت میں رہو، نشست و برخاست ان ہی کے ساتھ رکھو اسی طرح جو اس دنیا کی زندگی ختم کر کے دوسرے عالم میں جا چکے ہیں۔ ان کے حالات و سوانح کا پڑھنا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان ہی لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو رو کے رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تنہا صبر کے مقام پر اگر کسی کا پاؤں نہ جمتا ہو، تو ایسے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسلامی نصب العین رکھنے والے بزرگوں کے نمونوں سے فائدہ اٹھائیں جو زندہ ہیں، ان کو دیکھیں، جو مر چکے ہیں ان کے حالات کتابوں میں پڑھیں اور اپنے نصب العین میں کامیاب ہونے کے لئے جو طریقۂ عمل ان کا تھا، یہی وجہ اللہ کو اپنا مقصود بنانے والے جیسا کہ چاہیئے زیادہ وقت اللہ ہی کے ذکر و فکر میں ان ہی کا طریقہ اختیار کریں۔ آخر میں یہ فرما کر کہ

ولا تعد عیناک عنھم

اور نہ ہٹا ئیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے

سے گویا اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسے حیات دنیا کی زینت والوں کی طرف ٹکٹکی باندھنے، اور نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، اسی کے بالمقابل چاہیئے کہ ان نمونوں پر نگاہ جمائے رکھو، ان کو دیکھ دیکھ کر تسلی حاصل ہوتی رہے گی۔ آگے پھر اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے، جس کا "مدعین" کے قانون میں ذکر گذر چکا ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اپنے وجود کا نصب العین یہ قرار دے رکھا

ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آرائشوں، آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی آخری سانس پوری کریں گے۔ قرآن ہی میں ایسوں کے متعلق اس قانون کا بھی اعلان فرمایا گیا ہے۔ کہ

| | |
|---|---|
| من کان یرید الحیٰوۃ | اور جو مقصد بنا لیتا ہے اسی پست زندگی |
| الدنیا وزینتھا نوف | اور اس کے زینت (بناؤ سنگار) کو، پورا |
| الیھم اعمالھم فیھا | کرتے ہیں ان اعمال کو اس میں اور نہیں کمی |
| وھم فیھا لا یبخسون! | کی جاتی ہے دینے میں! |

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حیاتِ دنیا اور اس کی زینت کے حاصل کرنے کو جو لوگ اپنے جینے کا مقصد نصب العین ٹھہرا لیتے ہیں، اور اسی راہ میں سعی و عمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کو اپنے عمل کے نتیجوں سے محروم نہیں کیا جاتا، بلکہ جدّ و جہد، سعی و عمل کے مطابق نتائج سے قدرت ان کو سرفراز کرتی ہے، قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، آج اس کی تفسیر ان ممالک کے باشندوں کے طرزِ عمل سے ہو رہی ہے۔ جنھوں نے اسی حیاتِ دنیا کی زینت بناؤ سنگار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔ اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج بھی ان کے سامنے آئے ہیں[1]۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ جن کا آیت کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کو ان کی پیروی سے منع کرتے ہوئے ان کے خصوصی صفات پر بیان

---

[1] جو اپنے وجود کا مقصدِ حیات کو بنائے ہوئے ہیں ان ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ ایک اور آیت ہے فرمایا گیا ہے۔ من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید (اور جو مقصود بناتا ہے اس عاجلہ (جلد ملنے والی چیز یعنی دنیا) کو تو جلد عطا کرتے ہیں، اس میں جتنا ہم چاہتے ہیں جس کے لئے) جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ العاجلہ یعنی جلدی پیش آنے والی زندگی، جو اسی حیاتِ دنیا کی دوسری قرآنی تعبیر ہے۔ جو اسی کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں ان کو اسی دنیا میں دیا جاتا ہے۔ لیکن سب کو دے دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے فرمایا گیا ہے۔ جتنا ہم جسے چاہتے ہیں اسی دنیا میں دے دیتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ دنیا خواہوں میں ہر ایک کی ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ بھی مشاہدہ کی بات ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ سورۂ ہود کی جس آیت کی اصل عبارت میں نے نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پورا پورا دے دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر دونوں میں کچھ تضاد سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورۂ ہود والی آیت میں (باقی آئندہ صفحہ پر)

کئے گئے ہیں۔ کہ ان کے قلوب پر قدرت غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اپنے رب کو وہ بھول جاتے ہیں۔ اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو، اس کے پیچھے رواں ہو جائیں، اور جس طرح بن پڑے اس خواہش کو پورا کریں۔ اسی لئے قدرت کے جو مقررہ حدود ہیں، ان ہی حدود پر ٹھہر نہیں سکتے۔ ان کی زندگی صرف زیادتیوں سے معمور ہو جاتی ہے۔ اور اس کی تصدیق بھی ان ہی ممالک کے باشندوں کی زندگی عمل سے ہو رہی ہے۔ جو زینة الحیٰوة الدنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی وعمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ گو دنیا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے اُن کے سامنے آجاتے ہیں لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان ہی کے متعلق یہ بھی اعلان کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اولٰئک لیس لھم فی الاٰخرة | یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے آخرت میں ان |
| الا النار وحبط ما صنعوا | کیلئے مگر صرف آگ اور تہس نہس ہو کر رہ گیا جو کچھ |
| فیھا وبطل ما کانوا یعملون! | کیا دھرا تھا انہوں نے دنیا میں اور بے نتیجہ ہو کر |
| | رہ گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا! |

---

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) سعی وعمل کے نتائج کے متعلق قانون بنایا گیا ہے یعنی محنت وکوشش کسی کی رائیگاں نہیں جاتی۔ نوف الیھم اعمالھم فیھا (پورا کرتے ہیں ان کے اعمال کو) سے صراحۃً اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر نتائج مرتب ہوتے ہیں، بخلاف اس آیت کے جس کا ذکر بنی اسرائیل کی سورة میں ہے، یعنی حاشیہ میں جو نقل کی گئی ہے۔ اس میں صرف ان لوگوں کا حال ہے، جو آرزو کرتے ہیں اور دنیا خواہوں میں بلاشبہ ایک بڑی جماعت اسی عمل کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ لیکن محنت وجفاکشی ان سے نہیں ہو سکتی، ان ہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جتنا چاہتے ہیں ہم دیتے ہیں۔ الغرض سورہ ہود میں عمل کے نتائج سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جاتا۔ دنیا میں بھی یہی قانون ہے اور آخرة کا بھی یہی ہے۔ اسی بنی اسرائیل والی آیة کے بعد ہے من اراد الاٰخرة وسعیٰ لھا سعیھا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورا (جو آخرت کی زندگی کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے، اور اسی نصب العین کے مطابق سعی وعمل میں سرگرمی دکھاتا ہے۔ تو ان کی کوشش بھی مشکور ہوتی ہے)

بالفاظ دیگر نتائج سے ان کے عمل کو محروم نہیں کیا جاتا۔ البتہ آخرت کے نتائج عمل وسعی پر اسی وقت ہوتے ہیں، جب عمل کرنے والا مومن ہو۔

ایمان کے بغیر آخرت کی مساعی بارآور نہیں ہوتی"

مسلمانوں کو ان کی پیروی اور اطاعت سے منع کیا گیا ہے۔ اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو وجہ اللہ والا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جائے گا اور اس کی توثیق بھی مشاہدہ اور تجربہ سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں جنہوں نے ان قوموں کی راہ اختیار کی، خواہ وہ ہند میں ہوں یا ترکی میں، مصر میں ہوں یا مراکش میں، جس نسبت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں، وجہ اللہ کے نصب العین سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اس نصب العین سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی اور کچھ باقی رہتا ہو یا نہ رہتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان تو قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔

بہر حال صبر کی داروئے تلخ کو خوشگوار بنانے کے لئے یہ تو وہ تدبیریں تھیں جو اسلامی وثائق میں پائی جاتی ہیں، لیکن قرآن نے ان ہی تدبیروں پر معاملہ کو ختم نہیں کر دیا ہے، بلکہ زینۃ الحیوٰۃ الدنیا کے نصب العین والوں کے سامنے ان کی سعی و عمل کے نتائج جیسے آتے ہیں اسی طرح قرآن نے صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل کی ہے۔ پہلا نتیجہ تو اس عمل کا یہی ہے جسے ایک سے زائد مقام پر

ان اللہ مع الصابرین — قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ قدری معیشت کے سلسلے میں جس صبر کی تلقین تقدیریوں کو کی گئی ہے، وہ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی انہیں محزون رکھتی ہے، اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقعہ پر امداد حاصل کریں گے تو پائیں گے کہ ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت و رفاقت کی دولت انہیں ملی ہوئی ہے، جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے جس کا معاوضہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔ اور خدا ہی جس کے ساتھ ہو جائے، سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں پا لیا۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ صبر کرنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ انہیں یہ بشارت سنا دی جائے کہ

| | |
|---|---|
| اولٰئک علیھم صلوات من | یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف |
| ربھم ورحمۃ واولٰئک | سے صلوات نازل ہوتے ہیں اور رحمت اور یہی |
| ھم المھتدون۔ | ہیں وہ لوگ جنہوں نے راہ پائی۔ |

تو یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی اس معیت ہی کے نتائج ہیں جو صبر کی بدولت آدمی کو میسر آتے ہیں۔ آخر خدا ہی جس کے ساتھ ہو گیا ہو، اگر خدا کی طرف سے اس پر صلوٰۃ کا نزول ہو، خدائی نعمتوں سے وہ مالا مال ہو

جائے اور سیدھی راہ زندگی کی اس کے سامنے آجائے تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور کسی دوسری
بات کا امکان ہی کیا ہے پھر زینۃ الحیوٰۃ الدنیا کو نصب العین بنانے والوں کے سامنے
جیسے ان کے اعمال کے نتائج آتے ہیں اسی طرح صبر کے اس عجیب و غریب عمل کے متعلق قرآن میں
اگر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

| | |
|---|---|
| انما یوفی الصابرون | اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہے کہ صبر |
| اجرھم بغیر حساب۔ | کرنیوالوں کو ان کا اجر بغیر کسی حساب کے دیا جاتا ہے |

تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہوتی ہے۔ جس عمل کی بدولت لامحدود طاقتوں والے خدا کی معیت
میسر آتی ہے۔ صلوات اور خدا کی رحمتوں سے جو عمل آدمی کو ڈھانک دیتا ہو، جس کی روشنی میں
سیدھی راہ پر عمل کرنے والے پڑجاتے ہوں، یقیناً ان کا غیر محدود اجر جی تو ہے جو ان شکلوں میں
ان کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

بہر حال موجودہ زندگی کے مصائب کا مقابلہ صبر سے کرنا، اور صبر کو خوشگوار بنانے کے
لئے مذکورہ بالا قرآنی تدبیروں سے فائدہ اٹھانا، جن نتائج کا وعدہ اس عمل پر کیا گیا ہے اس
قلب کو قوی رکھنا، اسلامی دماغوں کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ایک فطری احساس
کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، گویا مسلمانوں کے دماغ کی منطق ٹھیک قرآنی منطق بن گئی تھی۔
مضمون، جسے طول طویل الفاظ میں مجھے بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوں
جو کچھ میں نے کہنا چاہا تھا وہ کہہ بھی سکا یا نہیں۔ لیکن دیکھئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس
مشہور قول پر غور کیجئے۔ فرمایا کرتے تھے۔

| | |
|---|---|
| ما ابتلیت ببلاء الا کان | نہ مبتلا ہوا میں کسی مصیبت میں کہ میں اپنے لئے |
| علی فیہا اربع نعم، اذا لم | اس میں ان چار نعمتوں کو نہ پاتا ہوں۔ یعنی یہ |
| تکن فی دینی، واذا لم تکن اعظم | مصیبت میرے دین میں نہیں ہے دکھ گیا ہوا جب |
| منہا واذا لم احرم | اس سے بڑی مصیبت ہو سکتی تھی وہ نہ تھی، اور جب |
| الرضی واذا ارجوا الثواب | حق کی رضامندی سے اس مصیبت کی وجہ سے میں |
| فیہا۔ | محروم نہ ہو، اور جب ثواب کی امید اس |
| (ازالۃ الخفاء وغیرہ) | مصیبت پر لگاتا ہوں۔ |

ہر مصیبت میں معاً چار نعمتوں کا احساس فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بیدار ہو جاتا ہے۔ اور وہ نعمتیں کیا

وہی بات کہ اسلامی نصب العین جس کی تعبیر آپ نے دین سے کی، یعنی وہ محفوظ رہ گیا، دوسری بات وہی ہے جس کا ذکر نعمتوں کے شمار یعنی قانونِ قدر کے ذکر میں گذر چکا۔ اور تیسری بات حدود اللہ سے متجاوز ہونے کے جرم میں بجائے اس مصیبت کے مبتلا نہ ہوا، چوتھی بات ان ہی نتائج کی طرف اشارہ ہے جن کا عمل صبر پر قرآنا مرتب ہونا ضروری ہے۔ ایک ایک مصیبت سے چار چار نعمتوں کو کھینچ کھینچ کر نزولِ مصیبت کے ساتھ ہی نکال لینا، اس حیرت انگیز اثر کی دلیل ہے۔ جو قرآن نے اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا تھا۔ لیکن اب تو قرآن کے پڑھنے والے ہی کتنے ہیں اور جو ہیں بھی وہ قرآن سے اپنی موجودہ زندگی کی دشواریوں کے حل کا کام ہی کب لینا چاہتے ہیں، خود میرا یہ طرزِ عمل کہ قرآن سے ان چیزوں کو نکال نکال کر مسلمانوں کے آگے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں، جہاں تک سمجھ رہا ہوں، عام مذاق کے لحاظ سے یہی نہیں کہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی جائے گی، بلکہ اکثروں پر میری یہ باتیں شاید گراں گذر رہی ہیں۔ لیکن میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھایا گیا ہے، چاہتا ہوں، کہ دوسرے بھی کاش اس کے سمجھنے میں میرا ساتھ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدری معیشت کے مشکلات کے حل کی جو ذمہ داریاں سبلی معیشت رکھنے والوں پر عائد کی گئی ہیں۔ اپنی ان ذمہ داریوں کو، اگر وہ نہ بھی محسوس کریں، حکومتوں پر جو فرائض قدریوں کے ان حقوق کی بجا آوری کے سلسلے میں اسلام کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں۔ ان حقوق کے حاصل کرنے میں حکومتیں لاپروائی سے بھی کام لیں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دوسروں پر اگر اختیار نہیں ہے تو اپنے آپ پر تو قدری معیشت رکھنے والوں کو اختیار ہے۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ جن تدبیروں پر عمل کرنے کا مطالبہ براہِ راست خود قدریوں سے کیا گیا ہے۔ دوسروں سے قطع نظر کر کے صرف ان ہی مطالبات کی تکمیل پر اپنے آپ کو اگر یہ آمادہ کرلیں تو تجربہ ان کو بتائے گا، کہ اپنی دشواریوں کے حل کا اقتدار بجائے دوسروں کے زیادہ تر خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے، وہ چاہیں تو قدری معیشت کی اکثر و بیشتر کلفتوں کا ازالہ اسلام کی ان ہی تدبیروں کی امداد سے بسہولت تمام کر سکتے ہیں۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا جو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتا، ایسوں کو توصیح معنوں میں دوسروں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کی ہمت بھی نہیں کرنی چاہئے۔ اپنی ذات کے متعلق جن سہولتوں کو ہم خود مہیا کر سکتے ہیں، جب ان ہی کے مہیا کرنے کی توفیق ہمیں نہیں ہوتی تو ہماری جو سہولتیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں ان کے مطالبہ کا آخر ہمیں

حق ہی کیا پہنچتا ہے؟

**ایک ضروری تنبیہ** خدا ہی جانتا ہے کہ کیا اسباب پیش آئے۔ لیکن دیکھا یہی جاتا ہے کہ فقراء کے جو حقوق، امراء کے اموال میں ہیں، بلکہ قدری معیشت رکھنے والوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں عام حسنِ سلوک کے جو احکام اسلام نے بستی طبقات کو دیئے ہیں ان کا شمار تو فرائض و واجبات میں کیا جاتا ہے۔ اسی لئے فرائض و واجبات میں ان کو شمار کیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کو جن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ ان کا اقتضاء یہی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قدری معیشت کے متعلق عملی تدبیروں کا مطالبہ خود قدریوں سے بھی تو الفاظ کے ان ہی قالبوں میں کیا گیا ہے۔ جن کا اثر وہی وجوب اور فرضیت ہے۔ لیکن عام طور پر ان مطالبات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ کیوں؟ زیادہ سے زیادہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ان احکام کو کچھ نیک مشوروں کی حیثیت سے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدری معیشت کے مصائب کا احساس لوگوں کو جب ہوتا ہے۔ تو ان کا دھیان بھی ان قرآنی احکام کی طرف نہیں جاتا، جن پر عمل پیرا ہونا ایسی حالت میں ان پر فرض کیا گیا ہے۔ آخر زہرۃ الحیٰوۃ الدنیا والوں کی گوناگوں نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھانے سے قرآن نے جن الفاظ میں منع کیا ہے۔ کیا وہ معمولی الفاظ ہیں؟

• لا تمدن۔ نہی کے لفظ پر غور کیجئے۔ صرف یہی نہیں کہ بصیغۂ نہی اس فعل سے روکا گیا ہے؟ جس کی خلاف ورزی قطعاً حرام ہو جاتی ہے۔ بلکہ آخر میں مشدد نون کے اضافہ نے اس حکم میں جتنی قوت بھر دی ہے۔ اس سے معمولی عربی صرف کا جاننے والا بھی واقف ہے۔ لیکن اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سوچنا چاہئے کہ ایسے سخت تاکیدی فرمانِ الٰہی کے متعلق ہمارے احساسات کیا ہیں؟ اور یہ وقت اس حکم کی تعمیل کی توفیق کتنوں کو ہوتی ہے؟ اور جو حال تدمین کے اس قانون کا ہے یہی حال نعمتوں کے حد والے قانون کا بھی ہے۔ یہی حال ان دفعات کا بھی ہے جن میں صبر اور صبر سے متعلقہ احکام نافذ کئے گئے ہیں۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ قدری معیشت کی ان ذمہ داریوں کے متعلق جو الفاظ مسلمانوں میں آج مروج ہیں معنوی حیثیت سے خواہ ان کا مآل وہی کیوں نہ ہو جو قرآنی الفاظ کا مآل ہے۔ لیکن نہیں معلوم کیوں قرآنی محاوروں کو ترک کر کے دوسرے الفاظ کو ان کا قائم مقام بنا کر پھیلا دیا گیا ہے۔ مثلاً ایسے مواقع میں لوگوں کو قناعت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لالچ اور حرص سے روکا جاتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ کہ ان الفاظ کا مقصد بھی اگرچہ قریب قریب وہی ہے، جو

قرآنی الفاظ کا مفاد ہے۔ لیکن قرآنی تعبیروں کو چھوڑ دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان غیر قرآنی اصطلاحات کو قرآن میں نہ پاکر شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس قائم ہو گیا ہے، کہ یہ قرآنی مطالبات ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بدگمانوں کا ایک گروہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے، جو سمجھتا ہے کہ شاید غیر قوموں سے مسلمانوں میں قناعت و کم طلبی وغیرہ کے جذبات منتقل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مغالطوں میں جو خود مبتلا ہو گئے ہیں، یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں اس میں زیادہ تائید ان لوگوں کو قرآنی تعبیرات کے ترک ہی سے حاصل ہو رہی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر قرآنی الفاظ کی اشاعت ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس سلسلہ کے قرآنی بیانات کے متعلق صحیح طور پر یہ بھی طے نہیں ہوا ہے کہ ان کا تعلق معیشت کی کس خاص کیفیت سے ہے۔ یعنی جن قرآنی آیات کا تعلق قدری معیشت اور اس کی دشواریوں کے حل سے ہے ان کے متعلق عام مسلمانوں میں جہاں تک میں جانتا ہوں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے۔ بلکہ عموماً یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ ان کا خطاب ہر شخص سے ہے۔ خواہ وہ قدری معیشت رکھتا ہو، یا نسلی، یہی وجہ ہے کہ جن خاص مواقع پر ان قرآنی احکام اور مشوروں کو استعمال کرنا چاہیے۔ عام طور پر ان موقعوں پر لوگ ان کے استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ان آیتوں سے جو منافع پہنچنے چاہئیں، جیسا کہ چاہیے، نہیں پہنچ رہے ہیں، ضرورت جب پیش آتی ہے تو لوگوں کے سامنے عموماً ان اشعار اور مقولوں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ جن میں غیر قرآنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر براہ راست قرآنی آیتوں کے استعمال کا رواج مسلمانوں میں باقی رہتا، تو یقیناً اس کے آثار و نتائج موجودہ حال سے مختلف ہوتے۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آپ کے سامنے معیشت کی دونوں قسموں اور ہر قسم کے متعلق اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں براہ راست قرآنی الفاظ ہی میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ حدیثوں کا استعمال بھی صرف تشریح و تفصیل کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے

| | |
|---|---|
| قل الحق من ربک فمن شاء | سچی بات بول دے جو تیرے رب سے تجھ تک |
| فلیؤمن ومن شاء فلیکفر [۱] | پہنچی ہے پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے انکار کرے |

---

[۱] یہ بات خاص طور پر سوچنے کی ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآن میں اسی موقعہ پر آئی ہے، جہاں قدری معیشت کی الجھنوں کا عملی علاج یہ بتایا گیا ہے کہ وجہ اللہ کو نصب العین بنا کر جینے والوں کی صحبت پر صبر کرو اور ان ہی پر اپنی نگاہیں جمائے رکھو۔

کی اس آیۂ کریمہ کو تلاوت کرکے چپ ہو جاتا ہوں۔

یہاں تک تو ان ذمہ داریوں کا ذکر تھا، جو رزق کی بسطی و قدری حالتوں میں قرآن نے عائد کی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے جن نتائج پر قرآن نے تنبیہ کی ہے اس کی تفصیل پیش کردی جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بحث کا حقیقی حاصل مضمون کا یہی حصہ ہے۔ اسی میں اس شبہ کا جواب آپ کو مل سکتا ہے۔ جس کا ذکر ابتدا مضمون میں کیا گیا تھا یعنی معاشی زندگی میں خدا کو الہ المعاش بنانے سے جو گریز کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کم از کم موجودہ زندگی میں اس کے نتائج سے انہیں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے باشندوں کی باغیانہ زندگی ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔ اسی خیال کو تردید واقعات کی روشنی میں اب آپ کے سامنے ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ میں قرآن کی ساری معاشی دھمکیاں صرف دھمکیاں نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے وہ حقیقی و مشاہداتی حقائق ہیں۔ وباللہ التوفیق!

اجمالاً پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ درحقیقت اسی کی تفصیل اب مقصود ہے۔ قرآن میں "معیشت" کا ذکر کرکے ایک خاص قانون کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ومن اعرض عن ذکری | اور جو کترایا میری یاد سے، تو یقیناً اس کے |
| فان له معیشةً ضنکا | لئے ہے ایسی معیشت جو ضیق اور تنگی سے بھری ہے۔ |

ضیق اور تنگی، یہی ضنک کے لغوی معنی ہیں۔ حاصل اس کا یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو جو یاد کرنا نہیں چاہتا، قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کی معیشت میں قدرت تنگی اور ضیق پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قانون زندگی کے ہر حال اور ہر پہلو کو حاوی ہے۔ اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ رزق کے حساب سے خواہ آدمی بسط کی حالت میں ہو یا قدر کی، جو اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے اعراض و گریز کرے گا، اس کی معیشت تنگی اور ضیق کی شکار ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ بالکل ایک تجربی چیز ہے۔ اسی لئے علماء نے اس کی تفصیل کی طرف کم توجہ کی، یعنی یہ بات کہ ایسی حالت میں ضیق اور تنگی کی کیفیت معیشت میں کیوں پیدا ہو جاتی ہے اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ تجربہ ہی اس کا بہترین جواب ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں قرآن ہی کی متفرق آیتوں کے مضمون پر اگر غور کیا جائے

تو علاوہ تجربہ کے یوں بھی اس کے اسباب اور ان اسباب سے پیدا ہونے والے آثار کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس باب میں اپنے خیالات عرض کرتا ہوں۔

**بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے نتائج**

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مال و دولت کی غرض یہی سمجھی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں ان سے امداد ملتی ہے۔ لیکن بسطی معیشت کا یہ مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے، قرآن ہی کی آیت ہے۔

| | |
|---|---|
| واما من اعطیٰ واتقیٰ و | تو جس نے دیا اور ڈرا اور تصدیق کی اس |
| صدق بالحسنیٰ فسنیسرہ | نے اچھی باتوں کی تو قریب ہے کہ ہم آسان |
| للیسریٰ | کریں اس پر سہولت کی زندگی کو! |

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "الیسریٰ" یعنی آسانیوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے، جو دیتے ہیں، دینے کا مقصد یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔ واتقیٰ و صدق بالحسنیٰ (ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کی) یہ ان اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتے ہیں، یعنی خدا سے جو ڈرتا ہے اور اچھی باتوں کو، جنہیں خدا پسند کرتا ہے، مانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہوگا، تو کسے ہوگا؟

بہر حال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "الیسریٰ" (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خدا کے خوف سے خدا کی مرضی کے مطابق حقداروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں، باقی یہ بات کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں، سو جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ بالکل ایک تجربہ کی بات ہے اور جہاں تک میرے غور و فکر کا تعلق ہے اس باب میں اس سے زیادہ شاید اور کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس راہ سے ہٹ کر زندگی گذارتے ہیں، یعنی وہی بات کہ اس معاملہ میں خدا اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو یاد کرنا نہیں چاہتے، بلکہ اس کے ذکر سے اعراض کرتے ہوئے، مثلاً اس اصول کو اختیار کرتے ہیں، جس کا ذکر اسی الیسریٰ والی آیت کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| واما من بخل واستغنیٰ و | اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی باتوں |

کذب بالحسنیٰ۔ کو جس نے جھٹلایا!

یعنی جو لوگ بجائے اعطا، (داد و دہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کیوں اختیار کرتے ہیں اسی کی طرف، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آگے کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو بے نیاز کر دیتے ہیں اور بظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے۔ ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کے پورا ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑیگا؟ کس کس سے کہنا ہوگا۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بنک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں بے غم رہتا ہے، ہر ضرورت جو پیش آسکتی ہے اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے۔ کہ تمام احتیاجات میرے پاس جو جمع ہے۔ جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کو بھی پہننے کو جی چاہے گا بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہوگی، جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ جس ڈاکٹر کو چاہوں گا بیمار پڑ جانے کی صورت میں بلوا سکتا ہوں۔ جس دوا کی طبیب ضرورت ظاہر کرے گا منگوا سکتا ہوں۔ روپے کے متعلق "استغنا" یا "غنا بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو ارباب بخل پر مسلط ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا بظاہر یہ ایک حق کی بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے۔ نہ صرف انسانوں سے ہی بلکہ بتدریج ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت جس کا انہیں ممکن ہے شعور بھی نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بالآخر بے تعلق بنا کر ہی رہتی ہے اور یہ بھی بات کہ خدا کی ضرورت تو اسی بے چارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو۔ اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو۔ لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے، جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا جملہ و کذب بالحسنیٰ (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ حسنیٰ (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتاً بخل زدہ انسان انہیں جھٹلاتا ہے۔ اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے صلہ رحمی، غرباء پروری، حسن سلوک، الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں۔ آخر ان باتوں کی پرواہ وہ کیوں کرے؟ آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے، یا مخلوق خدا کے خیال سے۔ لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے

بے نیازی و استغنا، کا احساس مسلط ہو، وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا۔ اپنی تمام بے مروتیوں بد اخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب رکھتا ہے کہ کوئی میرا کیا کرے گا؟

اس تکذیب بالحسنیٰ کے ردعمل میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے عمومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے۔ محفلوں میں، مجلسوں میں، لوگ اس کی دنائتوں، خباثتوں کا ذکرہ کرتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ذلتوں کی تہہ میں عداوت کا یہی مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے، کہ "بخیل خدا کا دشمن ہے!" مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغنا، "اس کے آگے" کوئی میرا کیا کرے گا!" اسی جواب کو دُہراتا رہتا ہے اور ہے بھی یہی ت کہ بے چارے عوام اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں ہے، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى

پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس
کیلئے دشواریوں اور سختی بھری زندگی کو!

علوم نہیں، قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے یعنی عوام سے ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے کیا اس کے ہنجۂ قتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے۔ یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے۔ یہ تو خیر عام بات ہے اور رات دن یہ ہوتا رہتا ہے، مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اس سے الگ بات ہے یعنی سب کچھ کو اس کے قبضۂ اقتدار میں دیتے ہوئے قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت و ثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے اور غالباً بخل زدہ دی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداءً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے لیکن قدرت کی تماشائیت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو بجائے "الیسریٰ" (آسان زندگی) کے "العسریٰ" (سخت و دشواریوں سے بھری ہوئی زندگی)، اس پر آسان کر دی جاتی ہے۔ وہ سب کچھ کھا سکتا ہے، لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ سب کچھ

چھین سکتا ہے لیکن کچھ چھین نہیں سکتا۔ الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام وعیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کرسکتا ہے دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کر دیا گیا ہے۔ انتا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں، عموماً بخیل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ہے اس طرفہ تماشا ہیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرع زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے، موجوں پر موجیں گذرتی رہتی ہیں۔ اسی پر سے گذرتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کور بخت کور نصیب کی تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف واعراض کر کے بخل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

فسنیسرہ للعسریٰ — پس قریب ہے کہ ہم آسان بنادیں گے ان کے لئے دشواریوں کو

(دنیوی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تیسیری مشاہدہ ہے، جس کی نقد مثالیں دنیا کی آبادیوں میں جہاں ڈھونڈئے آپ کو مل سکتی ہیں۔ ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ طرز زندگی کی دشوار ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہے۔ اور جیسے ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

کذب بالحسنیٰ — جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو!

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی بخل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جاحظ کی مشہور کتاب "البخلاء" کے مطالعہ سے اپنے شوق کو مت پورا کر سکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا "الحسنیٰ" کی تکذیب کے متعلق تو کوئی میرا کیا کرے گا جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے رد عمل کا ظہور جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو، وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں۔ شاید اپنے دل کو مطمئن کر لیتا اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کی تنگی وضیق کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہو سکتی ہیں اور نہیں جانتا کہ انسانی احساسات رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں ا

ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی۔ مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے۔ عزت اور آبرو ہی کا بچانا ہے۔ لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے۔ کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے۔ تاہم جو اذیت اپنی بے عزتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے، چوں کہ قلب کی ایک مخفی کیفیت ہے۔ جس پر گذرتی ہے وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں!

مگر دوسری سزا، یعنی "العسریٰ" کی تیسیر یعنی دشوار اور کٹھن زندگی جو ان کے لیے آسان کر دی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں "آب اندر رہ کر جس تشنہ لبی" کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آ رہا ہے، یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سہولتوں اور آسانیوں کے لیے جو چیز حاصل کی جاتی ہے۔ مغالطوں میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنا لیتا ہے، اور یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| من اعراض عن ذکری | جو کترایا میری یاد سے تو ٹھیک ہے اس کے |
| فان لہ معیشۃ ضنکا! | لئے زندگی ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی۔ |

کی مشاہداتی مبین اور کھلی ہوئی تفسیر، مرنے سے پہلے جسے ان لوگوں کو دیکھنی پڑتی ہے جو خدا اور اس کی ذمہ داریوں کے یاد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

باقی مغالطوں میں مبتلا ہونے کا جو ذکر میں نے کیا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے پاپڑ جو اس مسکین کو بیلنے پڑتے ہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد وہی "استغنیٰ" کا راز ہے۔ یعنی دوسروں سے بے نیاز بنانے کی جو صلاحیت دولت میں نظر آتی ہے۔ یہی بات کراتی ہے ان لوگوں سے جو کچھ کراتی ہے۔ لیکن کیا واقعہ بھی یہی ہے جو اب میں لوگوں سے کیا کہوں۔ صبح و شام ہر شہر، ہر بستی و آبادی میں

| | |
|---|---|
| ما اغنیٰ عنہ مالہ | نہ کام آیا اسے مال ہی اس کا، اور نہ وہ |
| وما کسب | جو کچھ کمایا اس نے! |

کی قرآنی آیت کا تجربہ لوگوں کو کرایا جا رہا ہو۔ صرف اسی وقت نہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اسی سورۃ واللیل کے اندر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ما یغنی عنہ مالہ اذا | نہیں کام آتا ہے مال اس کا جب |
| تردیٰ! | برباد ہوتا ہے وہ! |

خواہ یہ تباہی اور بربادی، مال کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہو، یا صاحب مال کی، کہ یہ تو خیر ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ بکثرت قرآن ہی میں آپ کو اس مضمون کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی۔

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم کانوا اکثر منہم واشد قوۃ واثارا فی الارض فما اغنی عنہم ما کانوا یکسبون۔

کیا وہ چلتے پھرتے نہیں زمین میں، پھر دیکھتے وہ، کہ کیا حال ہوا اُن کا جو ان سے پہلے تھے۔ ان سے قوت میں بھی اور زمین پر آثار (عمارتیں اور دیگر آثار) کے چھوڑنے میں یہ گذرے ہوئے لوگ زیادہ بھی تھے اور شدید بھی تھے، پر نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ، جو کمایا تھا انہوں نے!

دولت و امارت، سلطنت و حکومت شوکت و قوت کی غنا بخشیوں کے مغالطہ کا ازالہ ہر تھوڑے تھوڑے دن پر قدرت صحیفۂ عالم پر کرتی رہتی ہے۔ آج ہی دُنیا میں عددی کثرتوں اور حربی و جنگی قوتوں، حیرت انگیز اختراعی و ابتدائی ایجادوں سے استغنا حاصل کرنے والی توموں پر جو گذر رہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ انہوں نے زمین کو الٹا پلٹا، اور کیا کیا چیزیں نہیں نکالیں شورہ نکالا، گندھک نکالا، زغال کے معدنوں کا پتہ چلایا، پٹرول کے خزانوں کا سُراغ لگایا اور زمین کی ان ہی ودیعتوں سے کیا کیا کام نہیں نکالے۔ لیکن

فما اغنی عنہم ما کانوا یکسبون!

نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ، جو کمایا تھا انہوں نے۔

کا تجربہ ان میں کتنے کر چکے اور جو باقی ہیں، اُنہیں آج نہیں تو کل بہر حال اس کا تجربہ کرنا ہی پڑیگا یہاں بھی کرنا پڑے گا اور وہاں بھی، جہاں کہنے والوں سے کہلایا جائے گا

ما اغنی عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ"

نہ کام آیا آج، مجھے میرا مال، تباہ ہو گیا میرا سامان غلبہ (اقتدار)

لیکن یہ تو بڑے پیمانہ کی باتیں ہیں، زیادہ تر ان آیتوں کا تعلق اقوام و امم سے ہے۔ میں تو اشخاص و افراد تک کے متعلق دیکھ رہا ہوں کہ صاحبِ مال زندہ بھی ہیں، مال ان ہی کا مال ہے۔ دُوسروں کی نگاہوں میں وہ خوش حال بھی ہیں، سب کچھ ہے، لیکن باوجود اس کے

ما اغنی عنہ مالہ وما کسب

نہ کام دے سکا اس کو مال اس کا اور جو کچھ کمایا تھا اس نے

کی تفسیر بھی کر رہے ہیں۔ اس راہ کے خوردوں، اور مردوں کو تو چھوڑیئے۔ میں آپ کے سامنے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انفرادی دولت مند کو پیش کرتا ہوں، جو کسی خاص صوبہ یا ملک نہیں، بلکہ ہفت اقلیم کے امیروں میں بھی سب سے بڑا امیر گنا گیا۔ اسی کی شہادت اسی کی زبانی سن لیجئے۔

"میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اس کا حساب بھی نہیں کر سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ میری جائداد ۱۵ کروڑ پونڈ (۰، کھرب روپے) سے زائد کی ہے"

دیکھا آپ نے! پچھتر کروڑ روپے سے زائد کی دولت موجود ہے۔ اس پر اقتدار کلی حاصل ہے ابھی وہ مرا بھی نہیں ہے، زندہ ہے، لیکن غنا بخشیوں کی ضمانت العیاذ باللہ جس قاضی الحاجات کے اندر پوشیدہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے متعلق اعلان کرتا ہے۔

"میں ساری جائداد کو دے ڈالنے کو بخوشی تیار ہوں، اگر ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا کھا سکوں!"

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اپنے اخبار "سچ" مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۲۷ء میں ملک النزول (یعنی گھاس لیٹ کے بادشاہ) مسٹر راک فیلر آں جہانی کی اس ذاتی شہادت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"اس کی (راک فیلر جو زندہ تھا) عمر ۸۰ سال کی ہو چکی ہے۔ ابتدا ہی سے سوء ہضمی کی اس کو بیماری ہے، حال یہ ہے کہ بجز دودھ اور بسکٹوں کے ایک قلیل مقدار کے وہ دن بھر کچھ کھا نہیں سکتا۔"

مولانا عبد الماجد نے کسی انگریزی وثیقہ سے یہ خبر نقل کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بے چارا راک فیلر اس میدان کا تنہا آدمی نہیں ہے جو اس خبر کی تحقیق و تلاش میں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جائے دولت کے اعتبار سے آپ کو راک فیلر جیسے سرمایہ دار ممکن ہے کہ دنیا میں نہ ملیں لیکن ابتداء سے سوء ہضمی کی شکایت "پیٹ بھر کھانا کھانے کی" نہ پوری ہونے والی تمناؤں میں تو اس راہ کے اتنے پیاسے فی صدی راہرو آپ کو ہر گلی کوچے میں مل سکتے ہیں۔ جناب راک فیلر آنجہانی کے دوسرے ہم چشم، ہم قدم، جو ابھی ایں جہانی ہیں۔ میری مراد ہنری فورڈ صاحب شاہ موٹران سے ہے۔ اسی اخبار "سچ" میں ان کے متعلق بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

"وہ (ہنری فورڈ) ایک نحیف الجثہ، لاغر اندام، دائم المرض

بزرگ ہیں، جن بے چاروں نے اپنی زندگی کی خاطر سالہا سال سے انچ
اوپر ہر قسم کی لذیذ اور پُر تکلف غذاؤں کو حرام کر رکھا ہے۔ ڈاکٹروں کی
ایک جماعت ہر وقت ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ کسی وقت کھانے
میں بد پرہیزی نہ کر بیٹھیں۔

اور یہ واقعہ تو چند ہی دن ہوئے، دُنیا کے اخباروں میں چھپا تھا کہ یہی ہنری فورڈ صاحب، جنہیں عربی اخبار اور رسالے "اغنی اغنیاء العالم" یعنی "سارے عالم کے امیروں کا سب سے بڑا امیر" کے خطاب سے ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔ ان کے اکلوتے نورِ نظر پر بیماری کا حملہ ہوا۔ سب کچھ کیا گیا جو ہنری فورڈ جیسے باپ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ لیکن دولت کے متعلق "غنا بخشی" کا انسانی نظریہ غلط ثابت ہوا اور خدا کی بات

| | |
|---|---|
| وما یغنی عنہ مالہ اذا تردی | اور نہیں کام دیتا ہے مال اس کا، جب گرتا ہے وہ |

پوری ہوئی۔ لیکن قدرت کی مجازاتی کارفرمائیاں کیا اسی حد پر ختم ہو جاتی ہیں؟ بالفاظِ دیگر اعراض زندگی کو "معیشت ضنک" یعنی تلخیوں اور تنگیوں سے ایسوں کی معیشت جو بھری جاتی ہے، اس کو تلخ بنانے کی کیا صرف ایک ہی صورت ہے؟ قرآن کی ایک پوری سورۃ جس کا نام "سورۃ ہمزہ" ہے۔ "عم یتساءلون" ہی کے پارے کی مشہور سورۃ ہے۔ اس میں بھی صرف ایک اس معاشی مسئلہ کے ایک خاص پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال پہلے پوری سورۃ کو ترجمہ کے ساتھ لکھ دیتا ہوں۔

| | |
|---|---|
| ویل لکل همزۃ لمزۃ الذی | تف ہے، ہر چغلی مارنے والے، عیب |
| جمع مالا وعددہ یحسب ان | چینی کرنے والے کمینے، جو جمع کرتا ہے مال کو |
| مالہ اخلدہ کلا لینبذن | اور گنتا رہتا ہے، اس کو خیال کرتا ہے کہ |
| فی الحطمۃ وما ادراک | دوام بخشتا ہے مال اس کا، ہرگز نہیں، وہ جھونک |
| ما الحطمۃ نار اللہ الموقدۃ | دیا جاتا ہے الحطمہ میں، اور کس نے تجھے بتایا |
| التی تطلع علی الافئدۃ | کہ الحطمہ کیا چیز ہے، آگ ہے اللہ کی |
| انھا علیھم مؤصدۃ | سلگائی ہوئی، جھجھاتی ہے دلوں پر، اس |
| فی عمد ممددۃ | آگ کے پٹ بند ہیں، لمبے لمبے کھمبوں میں! |

آگے دو نتائج تک یہ نظریہ آدمی کو پہنچاتا ہے۔ بیان کیا گیا تھا اسی طرح مذکورہ بالا سورۃ یعنی سورۃ ہمزہ

میں اسی مال اور سرمایہ کی بابت ایک دوسرا عام خیال جو پایا جاتا ہے، اسی کی تعبیر

یحسب انّ مالہ اخلدہ — خیال کرتا ہے کہ دوام بخشتا ہے اس کو مال اس کا

کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی کی راحتوں اور سہولتوں کو دیرپا بنانے کی یا قرآنی اصطلاح کی رو سے "خلود بخشی" کی کیفیت مال میں پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ کا ذخیرہ جتنا زیادہ بڑھایا جائے گا۔ راحتوں اور سہولتوں کی دیرپائی اور خلود کی ضمانت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً دو سو روپے ماہوار کے خرچ سے زندگی کا جو معیار قائم ہوتا ہے۔ اس معیار کو وہی برقرار رکھ سکتا ہے جو اس آمدنی کو قائم رکھے اور اس معیار کو جو بلند کرنا چاہتا ہے۔ چاہیئے کہ اپنی آمدنی کو بھی بڑھائے۔

مال کے متعلق "خلود بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو صرف "جمع" مال کے سمیٹنے ہی پر نہیں، بلکہ ان گوناگوں پیچیدہ تدبیروں اور ترکیبوں پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے۔ قرآن میں جس کی طرف عدّدہ کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہی ایک لفظ ان تمام حسابی چکروں پر حاوی ہے۔ جن کی عامیانہ تعبیر "ننانوے کے پھیر" سے کی جاتی ہے۔ بلکہ اگر وسعتِ نظری سے کام لیا جائے، تو اکاؤنٹ اور فینانس وغیرہ کے پرشوکت الفاظ سے موجودہ زمانے میں مالی کاروبار کے جن شعبوں کو موسوم کیا جاتا ہے، ان پر بھی "عدّدہ" کے قرآنی لفظ کو ہم منطبق کر سکتے ہیں۔

آگے قرآن میں "کلّا" کا لفظ ہے۔ جو ایک تردیدی کلمہ ہے۔ جس کا اردو ترجمہ "ہرگز نہیں" کیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ "جمع و عدّ" کی یہ ہنگامہ آرائیاں، خلود اور دیرپائی کے جس مقصد کے لئے لوگ برپا کئے ہوئے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ سرمایہ کے متعلق "جمع و عدّ" کی یہ تدبیریں خلود کی نصب العین کے حاصل کرنے میں اُنہیں کامیاب بنائیں گی قطعاً غلط ہے۔ اس کے بعد جو یہ الفاظ ہیں۔

| | |
|---|---|
| لینبذنّ فی الحطمۃ وما | قطعاً پھینک دیا جاتا ہے وہ الحطمہ میں اور |
| ادراک ما الحطمہ نار اللہ | کس نے بتایا تجھے کہ الحطمہ کیا چیز ہے۔ آگ |
| الموقدۃ التی تطّلع علی | ہے اللہ کی سلگائی ہوئی جو چڑھ جاتی ہے |
| الافئدۃ انّھا علیھم موصدۃ | دلوں پر۔ اس آگ کے پٹ بند ہیں۔ ان |
| فی عمد ممددۃ۔ | لوگوں پر لمبے لمبے کھمبوں میں |

لفظی ترجمہ تو قرآنی الفاظ کے سامنے لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن مطلب اس کا کیا ہے؟ موجودہ زندگی
کے بعد جو دُوسری زندگی آنے والی ہے۔ کیا ان کیفیات و حالات سے اس زندگی میں ان لوگوں
کو دوچار ہونا پڑے گا، یا آئندہ زندگی کے سوا موجودہ زندگی میں بھی ہم ان کیفیتوں کو ا
لوگوں کے اندر پا سکتے ہیں۔ جن کی طرف "جمع و عدّ" کے ان آثار اور نتائج کو منسوب کیا گیا
سورۃ کے ابتدائی الفاظ۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ — تف ہے ہر چشمک مارنے والے عیب
چینی کرنے والے کے لئے۔

کو پہلے سمجھ لینا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اسی سے اس سوال کا جواب بھی نکل آئے؟

ہمزہ کا مادّہ ہمز ہے اور لمزہ کا مادّہ لمز ہے۔ ہمز کے معنی کچو کے لگانے کے ہیں۔
کا لفظ اردو میں بھی اسی ہمز سے بنا ہے۔ سوار اپنے جوتوں میں لوہے کی کیل جیسی چیز اس لئے لگا
ہیں کہ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت جب پڑتی ہے۔ تو کچو کے لگانے کا کام اسی کیل سے
جیں، قریب قریب لمز کا مفہوم بھی یہی ہے، منجد اور معانی کے منتہی الارب میں زدن اور سو
یعنی مارنا اور جلانا بھی لمز کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ تو ان الفاظ کے ابتدائی معانی تھے۔ بعد کو ی
ہو گیا کہ جن کے اقوال و افعال سے دل مجروح و زخمی ہوتے ہوں اور اپنی گفتار، رفتار سے
لوگوں کو جلاتے ہوں۔ ان ہی کو ہمزہ لمزہ کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ اسی لئے عام مف
نے چشمک زنی کرنے والے نقرے کسنے والوں کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے والے نقل
والے، غیبت کرنے والے وغیرہ الفاظ میں ہمزہ لمزہ کی تشریح کی ہے۔ اب غور کرنے کی
یہی ہے کہ مال کے متعلق "جمع و عدّ" کے گورکھ دھندوں میں جو لوگ شب و روز منہمک و مشغ
رہتے ہیں، ان کا ہمز و لمز کے ان صفات سے کیا تعلق ہے؟

بات یہ ہے کہ "خلود بخشی" اور "دیرپائی" کی ضمانت مال اور سرمایہ میں محسوس
کر کے "جمع و عدّ" کی اس مہم میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنے والوں کو یوں تو بہت کچھ
پڑتا ہے، لیکن حاصل سب کا یہی ہوتا ہے کہ جو آ چکا ہے۔ اس سرمایہ کے ایک ایک پیسہ کی
کی جائے۔ اور جو ابھی نہیں آیا ہے۔ اس کے آنے کے ممکنہ ذرائع کو کسی طرح ضائع نہ ہونے
جائے۔ اب اسی کے ساتھ اکبر مرحوم کی اس حقیقت طرازی کو بھی سامنے رکھ لیجئے، جو ا
نے فرمایا ہے ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سُن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھے گا
عقود فطرت کے ہیں مقرر جو یہ کھُلے گا، تو وہ بڑھے گا

یہی بات اس سرمایہ پر بھی صادق آتی ہے جو زندگی گذارنے کیلئے دُنیا میں آدمی کو دیا گیا ہے مطلب ہے کہ سرمایہ پر جو لوگ "جمع وعدّ" کا عمل شروع کرتے ہیں، تو لازماً ان کے سامنے دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں. اگر اپنے سرمائے کے بڑھانے میں کامیاب ہوئے، تو قدرتاً دُوسروں کا سرمایہ ٹ جائے گا اور اگر ناکام ہوئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ دوسروں کو سرمایہ بڑھ گیا اور اُن ٹ گیا. جہاں تک میں خیال کرتا ہوں. "جمع وعدّ" کی مہم کا یہی وہ نقطہ ہے جو مقابلہ کے میدان میں آدمی کو بہرحال گھسیٹ کرلے ہی آتا ہے. جس کی طرف قرآن ہی دوسری جگہ

الھٰکم التکاثر حتی زرتم — غفلت میں ڈال دیا تم کو "التکاثر" نے یعنی
المقابر — دولت بڑھانے کے باہمی مقابلہ نے) حتیٰ کہ
زیارت کی تم نے قبروں کی!

الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے. "التکاثر" کا مادہ کثرت ہے. یہی کثرت جب "تکاثر" کی شکل اختیار تی ہے، تو کثرت طلبی میں مقابلہ اور COMPETITION کا مفہوم اس سے سمجھا جاتا ہے یہ التکاثر ط ایک ایسا خبط ہے کہ وہی آدمی جو صرف زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کے ارادے سے ی جدوجہد کی راہوں میں ابتداءً قدم رکھتا ہے. اگر کہیں ننانوے کے پھیر میں پڑکر "التکاثر" یدانِ مقابلہ میں کود جاتا ہے، تو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت کا سوال ایسوں کے نے سے ہٹ گیا اور صرف "مقابلہ" کا بھوت سر پر سوار ہو گیا. جیسے جیسے آگے بڑھنے کے قع مقابلہ کے اس میدان میں لوگوں کو ملتے چلے جاتے ہیں اس مقابلہ کا دائرہ بھی بدلتا جاتا ہے ارہیں کسی گاؤں کے باشندوں سے مقابلہ تھا، تو گاؤں سے آگے بڑھ کر اب کسی تعلقہ کے سرمایہ وں کو اپنا ہم چشم بنالیا جاتا ہے. یوں ہی تعلقہ سے آگے بڑھ کر ضلع، ضلع کے دائرے کو چھوڑ وبہ، صوبہ سے نکل کر ملک. اور ملک کے دائرے کو بھی توڑ کر ساری دُنیا میں چاہتا ہے کہ اسی وڑا اس راہ میں سب سے آگے نکل جائے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں میں انسانیت کی ساری یخ میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ "التکاثر" کی راہ میں مسلط ہو جائے. الھٰکم لت میں ڈال دیا تم کو) کے الفاظ سے قرآن نے اس دماغی خبط کی طرف اشارہ کیا ہے جس التکاثر کے بیمار مبتلا ہو جاتے ہیں. حالانکہ مسلسل مقابلہ کے اسی میدان میں آئے دن ان کو

یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ چلنے والوں میں کتنے ہیں جو گرتے جاتے ہیں، چھپتے جاتے ہیں قبروں میں دُھنستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن "التکاثر" کے خبطیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی اور یہی مطلب ہے قرآن کے الفاظ

حتیٰ زرتم المقابر — حتیٰ کہ زیارت کر چکے تم قبروں کی!

کا۔ یعنی ایک دو قبروں ہی نہیں، بلکہ "المقابر" جو "قبر" کی جمع ہی نہیں، بلکہ منتہی الجموع یعنی جمع کی انتہائی شکل کا صیغہ ہے۔ ان "المقابر" کی زیارت بھی مقابلہ کے ان دیوانوں میں چونک پیدا نہیں کرتی، اور کبھی دوسروں کی قبروں کو دیکھ کر اپنے قبری انجام کا خیال ان کے سامنے آتا بھی ہے تو فوراً اپنی تسلی اور اس دماغی خبط کی تصحیح کے لئے اپنے سامنے اپنی آئندہ نسلوں کو لے آتے ہیں، گویا توجیہہ یہ کر لی جاتی ہے کہ مقابلہ کے میدان کے ان نتائج سے اگر مجھے تمتع اور استفادہ کا موقعہ قبر نہ دے سکے گی تو کیا ہوگا۔ میری آئندہ نسلیں تو اس سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ یوں "المقابر" کی زیارت جس تنبیہ کو ان میں بیدار کر سکتی تھی۔ توجیہہ کی اسی لوری کو سنا کر اسے بھی یہ سُلا دیتے ہیں۔ اور ہر طرف سے بے خوف ہو کر "التکاثر" کے اس میدان میں اپنا نصب العین اسی مقصد کو بنا لیتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں، ان الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی

وتاکلون التراث اکلا لما — اور "التراث" کو تم کھا رہے ہو سمیٹ کر کھانے کی شکل میں!

آیت کریمہ میں "التراث" کا لفظ "وارث" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ عربی زبان میں اس وزن اور اس شکل کے الفاظ اشتراک کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ گویا پہلی نسلوں کے ساتھ پچھلی نسلیں جس سرمایہ میں شریک ہوں، ان ہی کو "التراث" کہتے ہیں۔ دوسرا جزء اسی آیت میں "اکل لم" کا ہے۔ "اکل" کے معنی تو کھانے کے ہیں، رہا "لم" کا لفظ، تو عربی زبان میں "رجل ملمّ" اس شخص کو کہتے ہیں جو قوم کے بکھرے ہوئے افراد کو سمیٹ کر کسی نقطہ پر جمع کرنے والا ہو۔ منتہی الارب میں ہے "رجل لم" "جمع کنندہ قوم یا عشیرہ پراگندہ را" لغت کی اسی کتاب میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے:۔

تاکلون التراث اکلا لما ای — تم کھاتے ہو "التراث" کو "اکل لم" کی شکل میں یعنی

نصیبک ونصیب صاحبکم — اپنا حصہ بھی اور اپنے ساتھی کا حصہ بھی کھا جاتے ہو

حاصل اس کا یہی ہوا کہ سرمایہ اور دولت سے استفادہ کی یہ شکل کہ پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک وہ بایں شکل منتقل ہوتی چلی جائے کہ دوسروں تک قطعاً اس سرمایہ کا کوئی حصّہ نہ پہنچ سکے بلکہ جو کچھ ہو، دانہ دانہ، رتی رتی، سب ایک ہی خاندان، خاص نسل اور خاص طبقہ ہی تک پوری طاقت کے ساتھ اس طور پر اس کو محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی غیر کے مُنہ میں اس کی کوئی کھیل بھی اڑ کر نہ پہنچ سکے۔ گویا وہی بات، جس کے انسداد کے لئے صلحی فتوحات کے مقبوضات اور آمدنیوں کے متعلق قرآن میں

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم

(تاکہ نہ بن جائے ایسی دولت جو تمہارے سرمایہ داروں ہی کے درمیان دگھومتی رہے)

کا قانون نافذ کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی کے توڑ پر یہ "اکل لم" سرمایہ داروں کا ایک خاص شیوہ ہے۔ مسٹر ڈارلنگ نے امریکہ و یورپ کے موجودہ نظامِ سرمایہ داری کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ جو لکھے ہیں۔

"یہ قبضہ میں رکھنے والوں اور تعاقب کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں۔"

(داستانِ دہقاں ص ۳۳۸)

میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآنی الفاظ "اکل لم" ہی کی گویا یہ تفسیر ہے اور اسی کے بعد وہ حالت اس راہ کے چلنے والوں کی ہوجاتی ہے۔ جس کی طرف بخاری کی مشہور حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ، یعنی

کالذی یاکل ولا یشبع

اس شخص کی حالت جو کھاتا ہی اور سیر نہیں ہوتا

میں ایما فرمایا ہے، بلکہ قرآن کا وہ تمثیلی بیان گویا ان ہی لوگوں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یعنی اس مثالی شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، یا قرآنی الفاظ میں

اخلد الی الارض واتبع ھواہ

ہمیشہ کے لئے گڑ گیا زمین میں اور پیچھے چل پڑا اپنی خواہش کے!

کی کیفیت جس پر مسلط ہوگئی تھی، اسی کے متعلق ارشاد ہے

فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث۔

تو اس کی مثال اُس کتے جیسی ہے کہ اگر اسے دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا۔ نہ دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا۔

سرمایہ کے متعلق یہ خیال، کہ زندگی کی ضروریات وحاجات کی تکمیل کا وہ ذریعہ ہے۔ یہ چیز تو اس کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے، بلکہ بجائے اس کے "سرمایہ" اور "مال" بذاتِ خود اس کا مقصود ومطلوب بن جاتا ہے۔ اسی لئے ہر حال میں "جمع وعد" کا یہ مریض ہانپتا ہی رہتا ہے، ملے جب بھی نہ ملے جب بھی کتوں کی طرح زبان نکالے اپنے اوپر حرص کی ایک ایسی کیفیت طاری کئے رہتا ہے کہ گویا اسے اب تک کچھ ملا ہی نہیں ہے۔ "جمع کرتا جائے، گنتا چلا جائے" اس کا کام اب فقط یہی رہ جاتا ہے۔ قرآن ہی میں

وتحبون المال حبا جما — اور چاہتے ہو مال کو حب جم کے ساتھ!

جو فرمایا گیا ہے، اگرچہ میں اپنے خاص نقطۂ نظر کی بنیاد پر جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ بجائے مبسوط الرزق طبقات کے یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس آیت کا تعلق قدری رزق پانے والوں کے اس گروہ سے سمجھا جائے جو رزق کے اس قدری پیمانے کو اپنی اہانت اور ذلت کا سبب ٹھہرا لیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اگر اس کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ سرمایہ داروں کا یہ گروہ بھی یقیناً مال سے اسی قسم کا عشق مفرط پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی ہر چیز سے ٹوٹ کر صرف مال ہی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ شب وروز وہ "جمع وعد" ہی کے ادھیڑبن میں مبتلا رہتا ہے۔ اپنی ساری عقلی وذہنی قوتوں کی جولانیوں کی آماجگاہ "جمع وعد" کے معاملہ کے اسی میدان کو قرار دے لیتا ہے۔ اسی میں رات دن وہ "التکاثر" والے معاملہ میں مشغول ومنہمک رہتا ہے۔ اور یہی چیز اس میں اس خیال کو پیدا کر دیتی ہے، کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع ہو گیا ہے، یہ اس کی عددی کرتبوں اور معاشی مہارتوں کا نتیجہ ہے۔ قرآن کے سب سے بڑے تاریخی سرمایہ دار (قارون) کے حوالے سے یہ فقرہ جو منقول ہے یعنی وہ کہتا تھا کہ

انما اوتیتہ علی علم عندی — اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ مجھے یہ دولت جو دی گئی ہے، یہ میرے اس علم کا نتیجہ ہے جو میرے پاس ہے!

وہ اسی خیال کی ترجمانی ہے، جس کا پیدا ہونا اس قسم کے لوگوں میں ان کے اعمال وافعال کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ اسی بنیاد پر ان کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جو جاری ہوتے ہیں

لن تبید ھذہ ابدا — قطعاً اب دیر تک قائم کیا ہوا یہ نظام آمدنی برباد نہیں ہو سکتا!

یا اسی کے قریب قریب متعدد مقامات پر قرآن ہی میں ان کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں تو وہ اسی زعم باطل کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قبضۂ اقتدار میں جو کچھ بھی آیا ہے۔ یہ ان کی حسابی اور عددی چالاکیوں اور رفیانہ نشل چابکدستیوں کا ثمرہ ہے۔

اور یہی مقام ہے جس پر پہنچنے والوں کا ہمز و لمز کے ان امراض میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جن کا قرآن کی مذکورۂ بالا سورۂ ہمزہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جو رزق کی سلبی حالت میں ہو، یا قدری میں۔ دونوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ وہ دونوں رزق کے قدرتی پیمانے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی حال میں ہو، ایسے آدمی کی نگاہ رزق کے معاملہ میں قدرت اور اس کی مشیت ہی پر بھی رہتی ہے لیکن جو

اوتیتہ علی علم عندی          دیا گیا ہے مجھے میرے اس علم کی بناء پر
                                 جو میرے پاس ہے!

کے مغالطہ میں الجھ گیا یا الجھا دیا گیا ہو۔ وہ ان لوگوں کو بھی جو مقابلہ کے میدان میں اس سے پیچھے رہ گئے ہوں اور ان کو بھی، جو آگے بڑھ گئے ہوں دونوں ہی کے دونوں حالتوں کا ذمہ دار خود ان ہی کو قرار دے گا۔ اور دے گا کیا معنی، تجربہ شاہد ہے کہ قرار دیتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ "جمع و عدّ" کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانیوالوں پر تو وہ حماقت و سفاہت، ناعاقبت اندیشی اور اس قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کرتا ہے اور یہ حملہ شدت کی صورت عموماً اس لئے بھی اختیار کر لیتا ہے کہ "جمع و عدّ" کی مہم میں عموماً ناکام زیادہ تر وہی بے چارے رہ جاتے ہیں جو اپنی آمدنی کو زندگی کی سہولتوں، اور راحتوں میں خرچ کرتے ہیں۔ خواہ خود اپنی ذات سے اس کا تعلق ہو، یا اپنے بال بچوں، اعزہ و اقربا اور دوسرے مستحقین پر انہوں نے خرچ کیا ہو، اب کھلی ہوئی بات ہے کہ خرچ کرنیوالوں کو جو راحت و آرام رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے وغیرہ میں نصیب ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس کمبخت و کم نصیب کو کیسے میسّر آ سکتی ہے جس نے اپنے ہر ہر پیسے پر پہرہ بٹھا دیا ہو۔ اور جمع و عدّ کی اس مہم میں جو ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں ہو کہ جو آ چکا ہے وہ جانے نہ پائے اور جو آ سکتا ہے۔ اس کے آنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ظاہر ہے کہ دولت اور سرمایہ میں جو اس سے فروتر ہیں۔ ان کی رفاہیت اور خوش باشی کو دیکھ دیکھ کر اگر اس میں

رشک و حسد کی آگ جل اٹھے تو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جس کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ تو اِکّوں اور جھٹکوں پہ مارا مارا یا جوتیاں ہی چٹخارتا بازاروں میں گھومتا پھرے۔ اور جس کو پاس کچھ نہیں ہے وہ موٹروں اور جوڑیوں پر اڑا پھرے۔ اس حال کو دیکھ کر بے چین ہو جانا ایک قدرتی بات ہوتی ہے اور اسی باطنی سوزش پر پانی ڈالنے کے لئے وہ ان خرچ کرنے والوں پر ہجری کلمات کے ساتھ برسنے لگتا ہے۔ خصوصاً اگر اس خرچ کرنے والے غیر سرمایہ دار انسان کو کسی وقت سرمایہ دار صاحب سے کچھ لینے کی ضرورت پیش آجائے، خواہ وہ قرض ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو لیکن مطالبہ کی تکمیل کا معاملہ تو بعد کا ہے۔ سب سے پہلے اس بے چارہ کو ان شعلوں میں دیر تک جھلسنا پڑتا ہے۔ جن کی صورت تو بظاہر نصیحت اور خیر خواہی کی ہوتی ہے لیکن در حقیقت حقیقی محرک اس کی تہہ میں وہی آگ ہوتی ہے، جو ان سرمایہ داروں کے دلوں میں چھپی ہوتی ہے چونکہ ان ظالموں کو اس قسم کے بے سرمایہ لوگوں سے خوف بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے جلی کٹی جو بھی سُنانی ہوتی ہے، عموماً اُن کے مُنہ پر سُنائی جاتی ہے۔ قرآن ہی میں ایک جگہ ان ہی سرمایہ داروں کے متعلق یہ جو الفاظ پائے جاتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| الذین یبخلون ویامرون | وہی جو بخل اختیار کرتے ہیں اور حکم دیتے |
| الناس بالبخل ویکتمون | ہیں لوگوں کو بُخل کے اختیار کرنے کا اور چھپاتے |
| ما اتاھم اللہ من فضلہ | ہیں اس چیز کو جو اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ نے |
| | انہیں عطا کی ہے! |

تو ایک پہلو اس کا یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر پہلے تو خرچ کرنے والوں کو یہ کفایت شعاری، عاقبت بینی وغیرہ کے الفاظ میں بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ جب سب کچھ سُنا لینے کے بعد مطلب پر آتے ہیں تو بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتمانِ فضل سے کام لیتے ہیں یعنی کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو خود کچھ نہیں ہے۔ خیر یہ صورت تو ان کے ساتھ پیش آتی ہے جو میدانِ مقابلہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ باقی آگے نکلنے والوں کے مُنہ پہ تو ممکن ہے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑے۔ لیکن پس پشت یہ شکست خوردہ میدانِ مقابلہ میں ہارنے والا سرمایہ دار ہر گفتنی و ناگفتنی کو اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور ان ہی باتوں کو اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی وجہ قرار دیتا ہے۔ اس نے بے ایمانی کی، دھوکہ دیا، فریب سے کام لیا، یہ کیا، وہ کیا، حالانکہ یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے۔ اسی حسد کی آگ کے ظہور کی ایک

شکل ہوتی ہے۔ جس میں "جمع وعدّ" کا یہ ماہر سرمایہ دار جلتا بھنتا رہتا ہے۔ بعض علماء نے
ہمزہ لمزہ کے ان دو لفظوں کی تفسیر کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے۔

العیب فی الوجه لمن وفی
بالغیب همز وقیل عکس
ذلک ویدخل فیه
السخریه والاستهزاء
والمحاکاة۔

سامنے منہ پر کسی کو بُرا بھلا کہنا یہ تو لمز ہے اور
پیٹھ پیچھے کہنا ہمز ہے۔ بعض ان دونوں الفاظ
کی تشریح بالعکس اسکے کرتے ہیں بہرحال مسخراپن
کسی کے ساتھ کرنا، کسی کا ٹھٹھا اڑانا، کسی کی نقل
بیانی، ہمز و لمز کے تحت یہ ساری باتیں داخل ہیں

اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمزہ اور لمزہ کے
ن دو قرآنی الفاظ میں سے ایک کا تعلق اگر ان لوگوں سے رکھا جائے جو "جمع وعدّ" کی مہم میں
پے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق یہ قرار دیا جائے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو
ں مہم میں آگے بڑھ جاتے ہیں تو اس مشہور علمی قاعدے کی بنیاد پر یعنی تجدید سے تاسیس بہتر
ے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں کا ایک ہی مصداق قرار دینا، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے
دو کو، دو مختلف معانی پر محمول کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

اب خیال کیجئے۔ اس شخص کی نفسی کیفیات اور باطنی واردات کا، جو حال میں
ود بخشی کی کرامتوں کو پوشیدہ قرار دے کر "جمع وعدّ" کے گھن چکر میں مبتلا ہو گیا ہو۔ اور اسی
دونی گردش نے بالآخر اس کو ہمز و لمز کے مقام تک پہنچا دیا ہو۔ وہ ان سے بھی بگڑا ہوا ہے
اس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور اُن سے بھی رُوٹھا ہوا ہے جو آگے نکلے ہوئے ہیں۔ اسی کے
ٹھہر آئے ہوئے پیسے کے متعلق جو طے کئے ہوئے ہو کہ اسے نکلنے نہ دیا جائے گا، اور ہر وہ پیسہ
ابھی نہیں آیا ہے لیکن اس کے آنے کا کچھ بھی امکان ہے۔ اس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ
ہرحال اس کو آنا ہی چاہئے۔ خود ہی سوچنا چاہئے کہ باہر سے ایسا آدمی خواہ کچھ ہی نظر آتا ہو۔
ن اندر جھانک کر دیکھئے تو بجز آگ ہی آگ کے اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے، خصوصاً زندگی
ناگزیر ضروریات میں آئے ہوئے پیسوں میں سے کچھ پیسوں کا خرچ ہوتا رہنا چونکہ بہرحال
ی ہے۔ اسی طرح جن آمدنیوں کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت اور ہر
میں ان کا حاصل ہونا کب ضروری ہے۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے اس چوٹ کا، جو نکل نکل کر ہر
ہ اس کے دل پر لگتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس کے آنے کا امکان تھا۔ جب اس آمدنی سے اسے

محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس کے قلق اور بے چینی کی صحیح روئداد وہی دے سکتا ہے، جس پر گذرتی ہو بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسوں کے لئے خرچ ہوتے ہی کی صورت میں نہیں، بلکہ خرچ ہو جانے یا جمع شدہ سرمایہ کے ضائع ہو جانے کے خطرات بھی جن بھیانک صورتوں میں انہیں ڈراتے اور دھمکاتے رہتے ہیں اور مختلف اندیشے اور احتمالات جن جن شکلوں میں انہیں کپکپاتے رہتے ہیں۔ بجائے خود یہ ایک مستقل بلائے جان کی صورت میں اس کے اندر تہلکہ مچاتے رہتے ہیں جس سے نجات کی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہوتی، آخر اس راہ کے بعض تجربہ کاروں سے کتابوں میں اس قسم کے اعترافات جو ملتے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے مشہور کروڑپتی کارنیگی کا یہ زبان زد عام فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا،

"لاکھ پتی (ملینر) کبھی مسکرا نہیں سکتا۔" (منقول از "ہلال مصری مئی ۱۹۶۵ء")

یا اسی قارون آباد کے دوسرے شاہ دولت راک فیلر آنجہانی کے متعلق یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں "کامیابی" کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی۔ راک فیلر نے اٹھ کر اس وقت تقریر کی:۔

"کیا ان کی مراد کامیابی سے مال دولت کمانا ہے۔ کیا اسی کا نام کامیابی ہے؟ میں کہتا ہوں اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مفلس وہی ہے جس کے پاس مال کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے ابتداء ہی میں اس کا اختیار دیا جاتا، کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں، تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہو، یا ہو تو بہت تھوڑا، بقدر ضرورت ہو لیکن اسی کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے؟"

("الہلال" مصری جون ۱۹۲۲ء)

ان اعترافات کی تہ میں بجز ان نفسیاتی کیفیات و حالات کے اور کونسی چیز چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھیئے۔ اس کے بعد سورۂ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا:۔

"وہ جو مال جمع کرتا ہے اور گنتا ہے اسے، خیال کرتا ہے کہ مال اسے خلود اور دیرپائی عطا کرتا ہے، ہرگز نہیں، قطعاً وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمہ (چور چور کر دینے والی) میں اور یہ الحطمہ کیا چیز ہے آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر اور اس آگ کے

پٹ بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (اس پر) جو لمبے لمبے ستونوں پر کھڑی ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ حقیقی رنگ میں یہ کیفیت تو ان کے سامنے اسی وقت پیش آئے گی جب ہر حقیقت اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہوگی۔ لیکن جو "کل" ہونے والا ہے۔ دیکھنے والے چاہیں تو آج بھی اس آتشیں مکان کا تماشا کر سکتے ہیں۔ جس کی دیواریں بھی آگ ہی کی ہیں اور جس کی چھت بھی آگ ہی کی ہے۔ ایسی چھت جو لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہے۔ اور اسی آتشیں مکان میں اسے جھونک کر پٹ بند کر دیا گیا ہے۔ نکلنے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود ہیں، آخر قرآن ہی میں تو

وان جہنم لمحیطۃ بالکافرین — اور قطعاً جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو

فرمایا گیا ہے۔ کم از کم

احاط بہم سرادقہا — اس جہنم کے سرا پردوں نے ان کا احاطہ کر لیا ہے

اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو چیز آج اندر ہے، وہی تو کل باہر نکل آئیگی اجساد کا تروّح اور ارواح کا تجسد' ارباب حقائق کا مسلمہ ہے۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں، کہ "جمع وعدد" کے مجرموں کے متعلق سورۂ ہمزہ کی جس سزا کو صرف اُدھار ہی اُدھار سمجھا جا رہا ہے اگر غور کیا جائے تو اسی سورۃ کے الفاظ میں "نقد" کی جھلک بھی ان لوگوں کو نظر آ سکتی ہے، جو مال و سرمایہ کے ساتھ انسانی نفسیات کے تعلقات کا مطالعہ ان قرآنی آیات کی روشنی میں کریں گے۔ یقیناً سوچنے والوں کو اس "آتشیں گرداب" کی کچھ سوجیں آج بھی محسوس ہو سکتی ہیں جس میں پھنس کر "جمع وعدد" کے ان مجرموں کو ہر حال میں چکراتے ہی رہنا پڑتا ہے۔ یہی جذبہ قدرت کی سلگائی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر کے ان کی چھاتیوں پر چڑھ کر مونگ دلتی رہتی ہے ـــ باہر سے دیکھنے والوں کو یہ بے چارے نظر آتے ہیں کہ ان کے اوپر بھی روپیہ ہے اور نیچے بھی روپیہ ہے۔ وہ روپیوں ہی میں جاگتے اور اسی میں سوتے ہیں۔ لیکن جس کی نظر اندر کا کچھ بھی اندازہ کر سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی اشارات کی تصدیق میں وہ شک کر سکتا ہے۔ بلکہ ہَمز و لَمز کے جو شعلے ان کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے۔ وہی ان شکلوں میں ان کی زبانوں کی راہ سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ گویا باطن کی شہادتِ ظاہر کی یہ حالت ہوتی ہے، بلکہ سورۂ ہمزہ کی یہی آیت یعنی ـــ

بحسب ان ماله اخلده ۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشتا ہے

نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے۔ بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے۔ غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں جس "الشجرہ" کا ذکر ہے اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول، یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا۔ جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔ اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ یہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے۔ اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ

الاولیٰ عدم القطع بھا۔ زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کیا جائے۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے۔ کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اس کی تعیین میں کیوں سر کھپائیں خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو۔ آخر، اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور، یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا ہے۔

لیکن اگر حضرت آدم علیہ السلام کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولادِ آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے تو اس وقت دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "الشجرہ" کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ بہکائے ہوئے "الشیطان" نے حضرت آدم کو کہا کہ

ھل ادلک الی شجرۃ الخلد؟ کیا راہ نمائی کروں تمہاری، ہمیشگی کے درخت کی طرف؟

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ ادا کرایا گیا ہے کہ اس نے آدم و حواء کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس "الشجرہ" سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ

اس "الشجرہ" کے استعمال کے بعد تم دونوں کو "خلود" حاصل ہو جائے گا۔ یعنی

| | |
|---|---|
| تکونا من الخالدین | ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں |

کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے اور دوسری طرف سورۂ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں "خلود بخشی" کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے۔ اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو۔ لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے تو جہاں تک قرآن کا اقتضاء ہے یہ خیال چنداں بعید نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آخر ان امور پر غور کیجئے

(۱) حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

| | |
|---|---|
| کلا منہا رغدا حیث | دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر جہاں |
| شئتما ولا تقربا ھذہ | سے جی چاہے۔ اور نہ قریب پھٹکنا اس درخت |
| الشجرۃ فتکونا من | کے کیونکہ تب ہو جاؤ گے تم اپنی حد سے نکلنے |
| الظالمین۔ | والے یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے! |

آج یہی دیکھا جاتا ہے۔ کہ اولاد آدم کے سوا، زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گذار رہی ہیں، کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی چرتی چگتی رہتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیرپائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ان سب میں صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد کل کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جس کے متعلق "خلود بخشی" کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مال اور سرمایہ آج جو مل رہا ہے، کل وہی ملتا رہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسکی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے۔ جیسا کہ بہ تفصیل اس پر بحث ہو چکی۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ "شجرۃ الخلد" کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے "سوآۃ" (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں۔ آدم کی اولاد میں یہی دیکھا جاتا ہے بلکہ قرآن ہی کے حوالہ سے گذر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے۔ تو "الحسنیٰ"

یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے۔ گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

(۳) اسی الشجرہ کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیئے گئے۔ آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق قائم رہنا چاہیے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قرآن میں بھی جیسا کہ گذر چکا من بخل واستغنیٰ کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بہ ظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔ گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس الشجرہ کے استعمال سے چونکہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو۔ اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

(۵) شیطان نے اس شجرۃ الخلد کی ایک صفت ملک لا یبلیٰ بھی بیان کی تھی۔ یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن سونا اور چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے تو نہ دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پرانے اور فرسودہ ہو گئے اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تر و تازہ حال میں روپیہ دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت میں واپس ہوا سی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے۔ ایسی سلوکہ شئے جو پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

(۶) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی شجرۃ الخلد کی سزا میں ہبوط اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ تمہارے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔ یعنی بعضکم لبعض عدو۔ آدمؑ کی اولاد میں بھی آج جتنے جھگڑے، رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں، یا بڑے پیمانوں پر آخری

پھر ان تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔

میرے ذہنی انتقال کے اسباب یہی تھے، میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے صرف دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ وھو اعلم بمرادہ۔

---

بہرحال ان قرآنی بیانات کا تعلق تو ان سے تھا جو مال کے ساتھ بخل اور جمع و عد کا تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ان ہی سرمایہ داروں میں بعضوں کو جو دیکھا جاتا ہے کہ "العسریٰ" کی زندگی بسر کرتے کرتے اچانک کبھی کبھی کچھ دن کے لئے ایک ہی دن دو دن کے لئے سہی کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اب ان پر گویا "الیسریٰ" کی زندگی آسان کی گئی ہے۔ مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص، جس نے ساری عمر ایسی گذاری جس کا گذارا شاید کسی ادنیٰ درجہ کے غریب قدری معیشت رکھنے والے کے لئے بھی دشوار ہو۔ لیکن یہی غریبوں سے بھی غریب تر زندگی رکھنے والا چند دنوں کے لئے امیر بننے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یا وہی، جو "جمع و عد" کے جالوں اور چالوں سے کام لے کر تمام عمر غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کا ذریعہ اپنے سرمائے کو بنائے رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کو غریبوں کی جیبوں میں پہنچا کر سینکڑوں اور ہزاروں روپے وصول کرتا رہتا ہے، اس طور پر وصول کرتا رہتا ہے کہ وصولی کی اس مہم میں کسی غریب کی غربت، کسی لاچار کی لاچاری پر لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا دل ترس نہیں کھاتا۔ لیکن ناگاہ دیکھا جاتا ہے کہ شہر کے کسی موڑ اور چوراہے پر کسی پڑاؤ یا اسٹیشن کے سامنے زمزم کے نام سے کسی بلند و بالا اونچی عمارت کی تعمیر میں وہی اس لئے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو آرام ملے گا۔ مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے۔ یا از قبیل چیرٹی CHARITY اور خیرات خانے کے نام سے کسی بڑی رقم کا اعلان اس احساس کے ادعاء کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کا دل آدم کی بے سرمایہ اولاد کے لئے روتا رہتا ہے۔ مفلوک الحالوں کے لئے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ انسانی ہمدردی کے ان ہی شریفانہ جذبات سے بے کل ہو ہو کر کبھی ہسپتال کھولتا ہے، کبھی محتاجوں کے لئے مشہور کرتا ہے کہ اس نے سدا برت جاری کیا ہے۔ غریبوں میں غلہ تقسیم کرتا ہے حالانکہ یہ واقعات آئے دن دنیا میں پیش آتے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دلوں میں یہ سوال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ نظریہ ابتلائیت کے انکار کے بعد کرنے والے یہ سب کچھ جو کرتے ہیں، تو

کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ خدا اور خدا کی ذمہ داریاں ہی اگر انہیں یاد رہتیں، تو سرمایہ کے جمع کرنے میں وہ خدا کی مرضیات سے بے پروائی ہی کیوں برتتے۔ یہ نہیں تو کیا واقعتہً غریبوں کی غربت پر ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا دل دکھا ہے؟ انسانی برادری کے متعلق ان کے دل میں کیا رحم کا کوئی جذبہ حقیقتاً متلاطم ہوا ہے؟ جن کی مالی فربہی سراسر غریبوں کے خون ہی کے چوسنے سے پیدا ہوئی ہے۔ کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے۔ افلاس پھیلا پھیلا کر ملک کے عام باشندوں سے امراض کے مقابلہ و مقاومت کی قوت جن کے کرتوتوں کی بدولت سلب ہوئی ہو کیا ان ہی بے دردوں کو ان بے چاروں کی بیماریوں سے بھی کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب وہ خرچ کرتے ہیں تو یقیناً سوال ہوتا ہے کہ کیوں کرتے ہیں؟ آیئے سنیئے۔ قرآن کی آیتیں سنیئے۔ آپ خود نہیں سوچتے، تو قرآن جو کچھ کہتا ہے خدارا اُسے تو سوچا کیجیئے۔ ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یؤمن بالله والیوم الآخر۔ | (احسان کر کے احسان جتلانے والوں کی مثال) اس شخص جیسی ہے جو خرچ کرتا ہے اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کیلئے۔ اور نہ مانتا ہے وہ اللہ کو اور نہ پچھلے دن کو۔ |

(یعنی قیامت کے دن جو بدلہ کا دن ہے اس کے یقین سے بھی وہ محروم ہوتا ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرنے والے صرف اسی لئے خرچ نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس خرچ سے خوش ہوگا یا خدا کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ بلکہ خرچ کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے جس میں نہ یہ مقصود ہوتا ہے۔ نہ وہ، بلکہ رئاء الناس (لوگوں کو دکھانا) یہی ان کے مصارف کا نصب العین ہوتا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ دیکھنے اور دکھانے کا تعلق خدا سے جو توڑ چکا ہو اب وہ دکھائے بھی تو آخر کسے دکھائے۔ جس کو غریب بنا کر وہ اپنی امیری پیدا کرتا ہے۔ ان ہی غریبوں کی آنکھوں میں اپنے دھرمسالوں، اپنے ہسپتالوں سے، سچ پوچھیے تو سرمایہ داروں کا یہ طبقہ خاک جھونکنا چاہتا ہے "تکذیب بالحسنیٰ" سے پیدا ہونے والی لعنتوں کو اس تدبیر سے چاہتا ہے، کہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے اور اسی لئے سینکڑوں چوچلوں کو نکلنے والی یہ بلی دراصل "حج" کے لئے گرگستی ہے۔ بلکہ سب نہیں تو ایک بڑا گروہ ان میں ایسے بد باطنوں سیاہ سینوں کا بھی ہوتا ہے جو "رئاء الناس" کی اس کمان سے بھی غریبوں کے قلوب کو ہمزولمز

کے تیروں اور برچھیوں سے گھائل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ دوسروں کی تسلی ہو۔ جیسے اس خیال سے باوجود قدرت و اختیار کے اللہ کے خاص بندے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، غربت کی زندگی گذارتے ہیں۔ ٹھیک اسی کے مقابلہ میں دوسروں کو تلملانے اور جلانے کے لئے اپنی مالی زور اور سرمایہ کی قوت کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں اور جن کی نیت یہ نہ بھی ہوتی ہو۔ لیکن "نظریۂ ابتلائیت" سے ہٹ کر خرچ کرنے والوں کے سامنے یہ بات تو ضرور ہوتی ہے کہ دوسروں پر ان کی دولتمندی کا رعب قائم ہو۔ ان کی بڑائیوں کا دنیا میں چرچا ہو۔ وہ کتنا بڑا آدمی ہے محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

بہرحال اب یہ ہو یا وہ ہو، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عمر بھر کی غربت کی زندگی کے بعد چند دنوں کی امیری کے اس مظاہرے سے جو اغراض ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ ان میں کہاں تک کامیاب ہونے کا موقعہ ان کو دیا جاتا ہے۔ قرآن نے ایک مثالی بیان سے بایں الفاظ اس کو واضح کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| فمثلہ کمثل صفوان علیہ | تو اس کی (دریا، الناس کیلئے خرچ کرنیوالوں |
| تراب فاصابہ وابل فترکہ | کی) مثال ایسی ہے جیسے کوئی چٹان ہو، اس پر |
| صلدا لایقدرون علیٰ شیئ | گرد بھی ہے تو برسی اس پر بارش، بس چھوڑ دیا |
| مما کسبوا واللہ لایھدی | اس کو (یعنی گرد آلود چٹان کو) سپاٹ نہیں |
| القوم الکافرین۔ | ہاتھ لگتی ان کو اپنی کمائی، اور اللہ نہیں راہ نمائی |
| | فرماتا ہے ناشکروں کی۔ |

ایک مطلب تو اس کا وہی ہو سکتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن ہی کی دوسری آیتوں میں آیا ہے۔ کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے۔ اس طور پر برباد ہو جاتا ہے کہ ان مصارف کا کوئی ثمرہ ان کے ساتھ نہیں جاتا۔ آخر خدا کو دکھانے کے لئے جو خرچ نہیں کرتا تو اس وقت، جب خدا ہی سے بدلہ پانے کی گھڑی سامنے آئے گی۔ اسے کیا مل سکتا ہے۔ جن لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قیامت کے دن وہ تو بدلہ دے نہیں سکتے۔ اور جو بدلہ اس وقت تقسیم کرے گا اسے دکھایا نہیں گیا تھا۔ قرآن کی اس قسم کی آیتیں، مثلاً۔

| | |
|---|---|
| مثل ما ینفقون فی ھٰذہ | مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں اس پست |
| الحیوٰۃ الدنیا کمثل ریح | زندگی میں اس ہوا کے مانند ہے جس میں پالا |

| | |
|---|---|
| فیھا صر اصابت حرث | مارنے والی ٹھنڈک تھی پہنچی۔ یہی پالا مارنے |
| قوم ظلموا انفسھم | والی ہوا ان لوگوں کی کھیتی پر، جنہوں نے اپنے |
| فاھلکتہ وما ظلمھم | آپ پر ظلم کیا تھا اس برباد کر دیا۔ اسی ہوا نے |
| اللہ ولکن کانوا انفسھم | اسی کھیتی کو اور نہ ظلم کیا خدا نے ان پر لیکن اپنے |
| یظلمون۔ | آپ پر وہ خود ظلم کرتے رہتے ہیں! |

یا:-

| | |
|---|---|
| فسینفقونھا ثم تکون | پس وہ خرچ کرتے ہیں، پھر بن جاتا ہے |
| علیھم حسرۃ۔ | یہی خرچ ان کے قلوب کی حسرت۔ |

ظاہر ہے کہ غیر ابتلائی انفاق کے یہ وہ نتائج ہیں جو مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ان کے سامنے پیش آئیں گے۔

لیکن صفوان، یعنی چٹان والی مثال جو دی گئی ہے۔ جس پر گرد جمی ہوئی، پانی کی ایک بوچھار آتی ہے اور دھو دھا کر اسے صاف ستھرا سپاٹ بنا دیتی ہے، اس مثال پر اگر غور کیا جائے تو ریاء الناس والے مصارف یعنی بجائے خدا کے لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرنے والے جو خرچ کرتے ہیں اور جس قسم کے اغراض شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے سامنے ہوتے ہیں ان سارے اغراض پر موجودہ زندگی ہی کے حساب سے یہ مثال صادق آتی ہے۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ پبلک کی آنکھوں میں دھرمسالوں اور ہسپتالوں کی خاک جھونکنے والے سود خواروں کو باوجود یہ سب کچھ کرنے کے، دنیا نے کیا کبھی اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے؟

ممکن ہے کہ وقتی طور پر سپاس اور شکر کے الفاظ پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہو جاتے ہوں۔ لیکن تشکر و امتنان کی یہ گرد لوگوں کے قلوب پر کتنی دیر تک جمی رہتی ہے جوں ہی کہ ان دھرمسالے بنانے والوں، ہسپتال کھولنے والوں کے متعلق یہ خبر شہر میں پھیلتی ہے کہ ہزار روپے دے کر آج فلاں بے چارے کی لاکھ روپے کی کوٹھی نیلام کرا دی گئی۔ اس کا یہ سارا کیا کرایا کیا دھل کر نہیں رہ جاتا؟

میں پوچھتا ہوں کہ وہ حکومتیں بھی تو جگہ جگہ ہسپتال قائم کرتی پھرتی ہیں، سڑکیں بناتی ہیں، پل بھی تعمیر کرتی ہیں، ٹیکس کے ظالمانہ مطالبات، بھاری بھرکم محصولوں کے ذکر سے دنیا چیخ اٹھتی ہے، عدالت و انصاف، تعلیم اور ذرائع تعلیم کے ان سوداگروں کے متعلق آخر دلوں میں کیوں روا

داری نہیں پیدا ہوتی؟ جم جم کر آخر وہ گرد کیوں دُھل دُھل جاتی ہے۔ جیسے بنی آدم کے قلوب پر مختلف ترکیبوں اور تدبیروں سے اس قسم کی چالاک حکومتیں بچھاتی رہتی ہیں۔ کیا یہ دلیل نہیں ہے اس بات کی کہ "ریا، الناس" کے مصارف کا اثر قائم بھی ہوتا ہے تو بہت جلد زائل ہو جاتا ہے۔ دلوں کی گہرائیوں میں جو خیالات ان کے متعلق جاگزیں رہتے ہیں۔ دب جانے کے بعد وہی ابھر کر اُن پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ریا، الناس کے جس خرچ میں آنکھوں کا دکھانا اور دلوں کا دُکھانا مقصود ہو، یا دکھانا نہ سہی، اپنے مالی جلال اور سرمایہ کی قوت کا رعب جمانا مقصود ہو خود ہی خیال کیجیے کہ دکھانے یا جمانے کے ان دونوں عمل کے اثر کی عمر بھی کتنی ہو سکتی ہے۔ اپنے بچوں کے عقیقوں میں، ختنوں میں، شادیوں میں، محلّے، ٹولے، بھائی برادری والوں کو دکھانے کے لئے مشرق میں جو مصارف کئے جاتے ہیں۔ اور رغیب مشرق کی آتشبازیوں، پٹاخوں ڈھول باجوں، رقص و سرود کی محفلوں پر بہنے والے یورپ و امریکہ کے باشندوں کے متعلق ان ہی ممالک کے اخباروں کی زبانی جو یہ خبریں سنی جاتی ہیں کہ معمولی روزمرّہ دوست احباب کی دعوتوں میں اڑانے والوں نے برازیل اور پیرو سے منگائے ہوئے رنگ رنگ کے پتنگوں کو کھانا کھلانے کے بعد یہ کہتے ہوئے اُڑایا کہ صرف اسی دعوت کے لئے ہزارہا روپے خرچ کر کے یہ پتنگے زندہ حالت میں ان ملکوں سے منگوائے گئے تھے۔ (دیکھو الہلال مصری مئی ۱۹۲۵ء) یا پھول کے گلدستوں کی جگہ ہر ہر مہمان کے ہاتھ موتیوں سے بھرا ہوا ایک ایک صدف صادق رخصت کے وقت دیا گیا۔ یا سگریٹ پینے کے لئے مہمانوں کے سامنے جو کاغذ تقسیم کیا گیا وہ سو سو روپیہ کے نوٹ والا کاغذ تھا۔ یہ اور اسی قسم کے ریا، الناسی مصارف کے آثار و نتائج آپ ہی بتائیے کہ

كمثل صفوان عليه — مانند اس چٹان کے جس پر گرد جمی ہو۔
تراب فاصابه وابل — پس پہنچی اس پر بارش، پھر چھوڑ دیا
فتركه صلدا۔ — اس کو سپاٹ (ننگا)

کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے؟

آپ نے اپنی نورچشمی سلمہا کی تقریب کی یاد کو حافظوں میں منقوش کرنے کے لئے مانا کہ لاکھوں لاکھ اڑا دئیے۔ لیکن آپ کی نورچشمی بہرحال، آپ ہی کی نورچشمی ہیں۔ دوسروں کو آخر کب تک مجبور کریں گے کہ وہ آپ کو، آپ کی نورچشمی سلمہا کو، ان کی شادی کو خواہ مخواہ یاد رہی

رکھتے چلے جائیں، کب تک؟ دن، دو دن، زیادہ سے زیادہ ہفتہ، دو ہفتے! بھلا اس کی فرصت موجودہ کش مکش کی زندگی میں کسے ہے کہ تمام مشاغل سے دست بردار ہو کر وہ صرف اسی سبق کو گھونٹتا اور رٹتا چلا جائے کہ فلاں صاحب نے اپنے صاحبزادے کی ختنہ میں اتنا روپیہ صرف کیا اور صاحبزادی کی شادی میں اتنا لٹایا۔ کن کن جتنوں اور کیسے کیسے کٹھن راستوں سے لوگ روپے حاصل کرتے ہیں۔ اور "العسریٰ" کی کیسی کیسی عسرتوں، ضیق حالیوں میں باوجود قدرت و قوت کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی گذارتے اور گذرواتے ہیں ـــ اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ لڑکی کی شادی کے دن اپنی امیری کے مظاہرہ کا موقع ان کو میسّر آجائے۔ ان کو موقعہ دیا جاتا ہے اور ساری جمع کی کرائی دولت ایک دو دن کے اندر ارمانوں اور حوصلوں کے قدموں پر نثار کر دی جاتی ہے۔ پھر اس گرد کے سوا ان کو اور کیا ملتا ہے جو کچھ دن کے لئے پبلک اور عام مخلوق کے دماغوں اور دلوں پر جمتی ہے، جنہیں نہ آپ سے تعلق ہے، نہ آپ کے بچوں سے، نہ آپ کے معارف سے، گویا ایک چٹان ہے جس پر آپ کا کوئی اندرونی اثر نہیں ہے۔ اسی چٹان پر گرد جمتی ہے اور ڈھل جاتی ہے۔ ہلکی سی بوچھار اس کے دھو دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بہرحال جس طرح دیکھئے ــ

فسينفقونها ثم تكون عليهم حسرة

پس خرچ کرینگے (اس جمع کی ہوئی دولت کو) اور وہی دولت بن جائے گی ان کے لئے (بالآخر) حسرت و افسوس!

کے سوا آخری انجام "دیار الناس" کے ان معارف کا کیا کبھی کچھ اور بھی ہوا ہے؟

پس واقعہ وہی ہے، کہ جو خدا کے لئے خدا کی مخلوق پر خرچ نہیں کرتا ان ناشکروں کے معارف کو یوں ہی برباد اور لاحاصل بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے سوچنے والوں کو اسی بات کے سوچنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ کہ خرچ کرنے کے بعد وہ سوچتے ہیں تو حسرت و ندامت کی آگ ہی پر انہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ پرانی قوموں کے متعلق قرآن میں ذکر کیا گیا تھا۔ کہ پیغمبر، ان سے پوچھتے تھے۔

"اتبنون بكل ريع اية تعبثون؟"

"کیا بناتے ہو! ہر ٹیلے پر نشان. کھیل کرتے ہو! (یعنی جن عمارتوں کا کوئی حاصل نہیں وہ بناتے ہو)

لیکن ان کے متعلق تو سمجھا جا سکتا تھا کہ عقلی ارتقا کے میدان میں، ان کی دماغی سطح حیوانیت کے

قریب تھی۔ اس لئے اس قسم کی حماقتوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن ارتقار کی آخری منزلوں پر براجنے کے مدعی دماغوں کو بھی جب دیکھا جارہا ہے کہ سڑک کے ہر ہر موڑ پر اسٹیچو کھڑا کر رہے ہیں۔ پارکوں اور سبزہ زاروں کے بیچ میں پتھر کی مورتیاں بٹھا رہے ہیں۔ ان پر بھی اور ان بنیادوں ٹاوروں پر بھی، جن کے اندر نہ گرمی ہی سے کسی کو پناہ مل سکتی ہے اور نہ سردی ہی میں وہ کسی کو امان دے سکتے ہیں۔ لاکھوں لاکھ روپے ہر سال خرچ ہو رہے ہیں۔ ان ہی لوگوں سے چھین چھین کر خرچ ہو رہے ہیں جنہیں سر چھپانے کے لئے گھاس کا چھپر بھی بمشکل میسر آتا ہے۔ فٹ پاتھوں پر بھی لیٹنے کے لئے جن کے پاس بستر نہیں ہیں۔ اخباروں کے سوا اوڑھنے کے لئے بھی جو بیچارے اپنے پاس کوئی سامان نہیں رکھتے۔ ”انسان“ کو دکھانے کے لئے آپ ہر سال غریبوں کی کمائی ہوئی آمدنیوں کو اس طرح جو پھونک رہے ہیں۔ اپنے روشن دماغ اور ترقی یافتہ عقل سے کبھی آپ نے پوچھا بھی کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ جو مر چکے ہیں کیا پتھروں میں ان کی شباہتوں کے قائم کر دینے سے واقعی وہ جی اٹھتے ہیں۔ چمگادڑوں کے سوا جن گنبدوں اور میناروں میں اور کوئی بس نہ سکتا ہو، ان کروڑہا کروڑ روپوں سے تعمیر ہونے والے میناروں اور گنبدوں میں واقعی یہ خاصیت ہے کہ جو واقعہ گذر چکا ہے اسے نہ گذرنے دے؟ مرنے والا جو مر چکا ہے اسے نہ مرنے دے؟

واللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ — اور اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا ناشکروں کو!

کے سوا آپ خوب غور کیجئے، اچھی طرح سوچئے اس کا کوئی اور جواب آپ کو کسی حیثیت سے کبھی بھی مل سکتا ہے؟ ڈوب مرنے کی بات ہے کہ جیتی جاگتی سورتوں کو تو بھوکوں مارا جائے اور مردہ تصویروں، اسٹیچوں کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ ان سے فنونِ لطیفہ میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ آرٹ زندہ ہوتا ہے، حسن کاری کی روح تازہ ہوتی ہے۔

افّ لکم و لما تعبدون — تف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جنہیں تم پوجتے ہو

وہاں ان ہی خرچ کرنے والوں میں ایک طبقہ جو اُن لوگوں کا ہے جن کے ”سرمایہ“ میں ابتلائی ذمہ داریوں کے متعلق تو ایک حبہ بھی نہیں ہوتا لیکن خود اسی ”سرمایہ“ کو ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ قرآن میں ایک عجیب اشارہ ان لوگوں کے متعلق بھی پایا جاتا ہے۔

سورۃ البلد[1] میں جن کی طرف

اھلکت مالاً لبدا — کھپا یا ہے میں نے مال ڈھیروں

کے دعوے کو منسوب کیا گیا ہے۔ وہیں ایک فقرہ بالکل اسی کے متصل یہ بھی ہے۔ یعنی :۔

ایحسب ان لن یقدر — کیا وہ خیال کرتا ہے کہ بس چلے گا

علیہ احد ؟ — اس پر کسی کا ؟

دُوسروں سے مجھے بحث نہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس آیت کے متعلق جو بات آتی ہے، اسے عرض کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مال اور سرمایہ میں خلود بخشی کی قوت پا کر " جمع وعدد " کی تدبیروں پر عمل کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا تھا۔ کہ صرف یہی نہیں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ نمانوے کے اس پھیر میں اُلجھ جانے والوں کو اسی وقت بھر کس نکال دینے والی " الحطمہ " اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں جھونک دیا جاتا ہے جو اپنی اندرونی لکد کوب سے انہیں چور چور کرتی رہتی ہے اور وہ بے چارے باطن کے ان ہی آتشیں کیفیات میں الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ اسی طرح خرچ کرنے کے متعلق یہ خیال کہ وہ خطرات سے محفوظ کر کے آدمی کو اطمینانی زندگی بسر کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، کہ مذکورہ بالا سوال یعنی

" وہ کیا خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا ؟ "

اس میں بھی گویا چونکایا گیا ہے۔ کہ خطرات سے محفوظ ہو جانے کے مقصد میں وہ کامیاب ہُوا ہے یا ناکام ہُوا ہے۔ اس کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سوال کو اپنے دل میں اٹھائے اور سوچے کہ دولت کی خواہ جتنی بڑی سے بڑی مقدار اس مقصد کے لئے خرچ کی جائے پھر بھی آدمی کیا اپنے آپ کو، اور اپنے سرمایہ کو خطرات سے محفوظ پاتا ہے؟ یعنی

" بس نہ چلے گا اب اس پر کسی کا ؟ "

اسی سوال کو اٹھا کر دیکھئے، اس کے دل کا، اس کے دماغ کا احساس کیا ہے؟ بلاشبہ عجیب سوال ہے۔ وہی نہیں جو بے چارے انسدادِ خطرات کی راہ میں دس بیس ماہوار خرچ کرتے ہیں بلکہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کروڑہا کروڑ، حتیٰ کہ آج تو ارب ہا ارب کے خرچ کرنے والوں

---

[1] اس سورۃ البلد کی ابتدائی آیتیں لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد ووالد وما ولد لقد خلقنا الانسان فی کبد ۱۲

کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کی حد تک تو وہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خوب خرچ کرتے رہتے ہیں۔ لاکھوں لاکھ تعداد والی فوجیں رکھتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار اور اسلحہ تیار کرتے ہیں۔ نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا تقریباً اکثر و بیشتر حصہ اسی راہ میں بہاتے رہتے ہیں۔ عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیٹ کو نہیں، پاؤں ہی کو آرام پہنچانے کے لئے ریلیں بناتے ہیں، سڑکیں تعمیر کرتے ہیں، عوام کا کام نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو۔ لیکن کہتے یہی ہیں کہ ان ہی کو روشن دماغ بنانے کے لئے تعلیم گاہیں کھولتے ہیں — یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں۔ لیکن باوجود سب کچھ کرنے کے دوسرے ہی نہیں، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ قرآنی سوال ؎۔

| | |
|---|---|
| ایحسب ان لن یقدر | کیا خیال کرتا ہے وہ، کہ اب بس نہ |
| علیہ احد | چلے گا اس پر کسی کا؟ |

کے جواب میں "نہیں" کے سوا ان اربوں اور کھربوں کے خرچ کرنے والوں کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت تک تو کوئی دوسرا جواب نہیں ملا ہے۔ ایک خطرہ مٹتا ہے تو دس خطرات دانت نکالے پورب سے پچھم سے، دکن سے اُتر سے جھانکنے لگتے ہیں۔ ہر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد "سرمایہ" کی بڑی سے بڑی مقدار ان ہی سر نکالنے والے خطرات کی راہوں میں آگ اور دھواں بن بن کر قرآنی آیت ؎۔

| | |
|---|---|
| حبط ما صنعوا فیہا وباطل | تہس نہس ہو کر رہ گیا، جو کچھ کیا دھرا تھا |
| ما کانوا یعملون | انہوں نے، اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔ |

کا تماشا عبرت پذیر نگاہوں کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے۔ خرچ کر کر کے چھوٹے دائروں کے خطرات سے اس قسم کے خرچ کرنے والے پاتے ہیں۔ کہ وہ محفوظ ہو گئے کہ اچانک اس سے بڑے خطرے کو دیکھتے ہیں کہ سر پر کھڑا دھمکا رہا ہے۔ آدمی کیا کرے، کتنا خرچ کرے؟ تاریخ جن جن خرچ کرنے والوں کے قصے سناتی ہے، سناتی جاتی ہے، بتاتی جاتی ہے۔ کہ خرچ کے ہر پیمانے پر خطروں کا لوگوں کو شکار ہونا پڑا، کتنے دن کی بات ہے۔ ابھی ابھی گذری ہے، آدمی دُنیا اور اس کی پیداواروں کا شخصی مالک نزار، جس کے ذاتی معارف کی فہرست تیار کرنے والوں نے یہ پتا لگی ہے کہ ؎۔

"جو ٹوپی پہنتا تھا وہ سلّم ایک جگ مگ جگ مگ کرنے والا گویا ایک شعلہ تھا۔ ایک نہیں، دو بڑے بڑے موتیوں کے ہار اس پر لپٹے ہوئے تھے۔ سامنے سب سے اوپر ایک لعل تھا جس پر الماس کی ایک صلیب چڑھائی گئی تھی۔ ہاتھ میں ملکہ کیتھرائن کا وہ عصا تھا جو صرف زرِ خالص سے ڈھالا گیا تھا۔ جس کے اوپر رنگ رنگ کے انمول جواہر جڑے ہوئے تھے۔ عصا کے سر پر ایک لٹو تھا الماس کا۔ اور اس کے سوا بھی وقتاً فوقتاً استعمال کے لئے اس کے خزانے میں جو جواہرات رہتے تھے۔ جن میں الماس زمرد یاقوت وغیرہ سب ہی طرح کی چیزیں تھیں۔ جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ اسی ملین پونڈ (ایک ارب بیس کروڑ روپے) کیا جاتا تھا۔ اور جن میں بعض جواہر کی تاریخ ہزار ہزار سال سے بھی متجاوز تھی" (الہلال دسمبر ۱۹۲۶ء)

لیکن وہ بھی جب واقعہ نے ثابت کر دیا کہ

لن یقدر علیہ احد — نہیں قابو مل سکتا کسی کا اس پر!

کے مقام تک نہ پہنچ سکا۔ اور بہزار بے کسی و بے بسی وہ بھی، اس کے بچے بھی، اس کی محبوب بیوی بھی اسی کے سامنے تڑپا تڑپا کر ذبح کئے گئے۔ تو جن مسکینوں نے خود اپنا اور اپنے عزیزوں اپنے رشتہ داروں اور دوسرے حقداروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہزار یا لاکھ وغیرہ اعداد کی صورت میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے۔ کس بنیاد پر ان غریبوں سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جانے کا دعویٰ کر کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں۔

خلاصہ یہی ہے کہ اپنی بسطی معیشت میں اللہ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کرنے والوں کو نہ تو سرمایہ کے جمع ہی کرنے میں چین کی صورت میسر آتی ہے اور نہ خرچ ہی کرنے میں "سکون" کا کوئی حصہ انہیں نصیب ہوتا ہے۔ دیکھا یہی جا رہا ہے، اور قرآن میں جو کچھ سنا گیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اضطراب اور بے چینی، تڑپ اور قلق، خلش اور تپش، سوز اور جلن، درد اور کرب، گھٹن اور کڑھن کی سانس ان کے اندر بھی جاتی ہے اور وہی باہر بھی آتی ہے۔ ان ہی بدبو آتشیں گرم گرم سانسوں کے ساتھ یہ جیتے بھی ہیں اور جس دن

مرتے ہیں تو آخری سانس بھی ان کی باطن کی ان ہی متعفن گندی کیفیتوں میں ٹوٹتی ہے، مرنے سے پہلے ہی قدرت کا انتقام ان کے معاشی جرائم کی سزا ان دردناک خمیازوں کا رنگ اختیار کرلیتی ہے اور اب میں تلاوت کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن کی اس عجیب وغریب آیت کو جس میں عالم کے ایک مشہور تاریخی سرمایہ دار کو خطاب کر کر کے کہنے والے یہ عجیب بات

ولا تنس نصیبک من الدنیا — اور نہ بھول، تیرا حصہ جو دُنیا میں ہے!

کہتے تھے۔ قارون، جس کے خزانے نہیں، بلکہ قرآن ہی میں ہے کہ اس کے خزانے کی کنجیاں قوت اور زور والوں کا جتھا بمشقت لاد کر لے چلتا تھا۔ اسی قارون کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا۔ جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دین تو خیر دین ہی ہے۔ دُنیا میں جو تیرا نصیبا اور حصہ ہے اُسے تو نہ بھول! اس سے تو لاپرواہی نہ برت۔ جو از سرتا پا روپیہ ہی روپیہ تھا۔ روپیہ ہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ روپیہ ہی میں سوتا اور اسی میں جاگتا تھا۔ دین میں نہیں، بلکہ دُنیا میں بھی اس کا جو حصہ تھا اسے بھول گیا تھا۔ کم از کم اس آیت پر جب کبھی میرا گذر ہوا، حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے؟ جس کے اندر دنیا اور دُنیا کی دولت کے سوا اور کچھ نہ تھا، اسی کے متعلق یہ کیسے باور کیا جائے کہ اسی کے حافظہ سے دُنیا اور دُنیا میں اس کا جو حصہ تھا وہی پھسل کر باہر نکل پڑا تھا۔ لیکن قرآن ہی کی روشنی میں جو کچھ اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کیا اس کو پڑھنے کے بعد بھی اب کسی کو اس حقیقت کے متعلق، خواہ وہ جتنی بھی حیرتوں اور اعجوبوں سے بھری حقیقت ہو اس کی واقعیت میں شک کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟ جس کے پاس سب کچھ ہے اسی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ دے دیا گیا اور کچھ نہیں دیا گیا۔ یہی تو قدرت کا مخفی داؤ اور مکر اللہ کے طلسمی مظاہر ہیں کہ ہوتا کچھ ہے اور سمجھا جاتا کچھ ہے۔ درا صل اس ساری طول طویل بحث کا مقصد سچ پوچھئے تو اسی قارونی تماشے کی نمائش تھی۔

ونی ذالک ذکری لمن — اور اس میں چونک ہے ان کے لئے جن
کان لہ قلب او القی — کے پاس دل ہے یا جھکائی جس نے اپنی
السمع وھو شہید — شنوائی اس حال میں، کہ وہ حاضر ہے!

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں جس جرم کی پکڑ اتنی سخت ہو۔ اگر آخرت میں قدرت کی یہی مخفی گرفت مجرموں کے سر پر اژدہوں اور سانپوں کی شکل میں آئے، اپنے مال ہی کی مختلف جیبوں سے اسے کچلا جائے اور روندا جائے جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے تو اس پر تعجب نہ کرنا

چاہئے۔ بلکہ حدیثوں میں جو کچھ آیا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ بھی قرآنی آیت

| | |
|---|---|
| ولا یحسبن الذین | اور ہرگز ہرگز نہ خیال کریں، وہ لوگ جو |
| یبخلون بما اتاھم | بخالت کرتے ہیں ان چیزوں میں جو دے |
| اللہ من فضلہ ھو | رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے |
| خیرا لھم بل ھو | کہ یہ بات (بخل) بہتر ہے ان کے لئے بلکہ |
| شر لھم سیطوقون | بُرا ہے یہ ان کے لئے۔ قریب ہے طوق ڈالا |
| ما بخلوا بہ یوم القیامۃ | جائے ان کو ان چیزوں کا جس کے ساتھ وہ |
| (آل عمران) | بخالت کرتے تھے۔ قیامت کے دن! |

کے آخری جزء "سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ" (یعنی جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا تھا۔ اسی کا طوق اُن کے گلوں میں ڈالا جائے[1]) کی تفصیلات اور اخروی تشکلات ہیں۔ میرے سامنے چونکہ اس وقت اخروی انتقام اور ان کی تفصیلات نہیں ہیں۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ان حدیثوں کا مطالعہ کتابوں میں کر لیا جائے۔ جن کے ترجمے بھی اردو زبان میں ہو چکے ہیں۔ اس وقت تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دُنیا ہی میں جس جُرم کے نتائج ان بھیانک شکلوں میں سامنے آتے ہوں۔ اندازہ کرنے والوں کو اندازہ کرنا چاہئے کہ آخرت میں ان کا حال کیا ہوگا؟! اللہ کے پیغمبروں، بنی آدم کے خیر خواہوں، بلکہ درحقیقت خود ارحم الراحمین نے کتنا بڑا کرم اور احسان

---

[1] صحیح بخاری و مسلم نیز صحاح ستہ کی صحیح حدیثوں میں آیا ہے۔ کہ جنت و دوزخ میں جانے سے پہلے میدانِ حشر کے اس اجتماعِ عظیم میں اپنے سرمایہ کے متعلقہ ابتلائی ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے گریز کرنے والے اپنے آپ کو پائیں گے کہ مالہ شجاع اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ یاخذ بلہزمتیہ۔ یعنی شدقیہ یقول انا مالک انا کنزک" (ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہوگا جس کا سر بالکل چکنا ہوگا اور جس کے چہرہ پر دو سیاہ نشان ہوں گے۔ لپٹ پڑے گا ان ہی بخیلوں کی گردنوں سے اور ان کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا، کہے گا "میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا دفن خزانہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما کر اس آیت کو تلاوت فرماتے جس کا میں نے ذکر کیا۔ انہی حدیثوں میں ہے کہ اونٹوں اور دوسرے مویشیوں پر زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں پر قیامت کے دن ان ہی جانوروں سے انہیں روندا جائے گا۔ یہ بھی ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو پیشانیاں اور پیٹھیں ان سے داغی جائیں گی۔ یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز معلوم ہوگی کہ موجودہ دنیا کے پیمانۂ وقت کے حساب سے آنحضرت صلعم نے پچاس ہزار سال اس کی مدت بیان فرمائی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین ۱۲

کیا ہے کہ واقع ہونے سے پہلے لوگوں کو نتائج و عواقب سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ چونکنے والے چونک جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو بھی وہی کہنا پڑے جو بالآخر کہنے والوں کو بہرحال وہی کہنا پڑتا ہے جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| حتی اذا جاء احدھم | تاآنکہ جب آ گئی ان پر موت، تو کہا، کہ |
| الموت، قال رب لولا | میرے پروردگار! کیوں نہ مہلت دی |
| اخرتنی الی اجل قریب | آپ نے کسی قریب زمانے تک تو پھر میں |
| فاصدق واکن من | صدقہ کرتا اور ہو جاتا میں سلجھنے والوں |
| الصالحین۔ | میں! |

مدت ہوئی اخبار "سچ" میں چھپا تھا۔ اطالیہ کے مشہور کروڑپتی گوئسپ لوگیانی کے متعلق، کہ دولت کے متعلق "جمع وعدّ" کی تدبیروں پر عمل کرنے کے بعد کروڑوں روپے کا جب وہ مالک ہو گیا اور کومو نامی جھیل کے کنارے ایک رشک ارم کوٹھی بنا کر چاہا تھا کہ اب اطمینان کی سانس اپنی اس فردوسی کوٹھی میں لے۔ لیکن اچانک دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی کوٹھی کی ایک چھت میں پھانسی پڑی ہوئی اس کی لاش لٹکی ہوئی ہے اور لاش کے نیچے اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ پڑا ہوا ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

"مجھے اپنی طویل زندگی میں تجربہ ہو گیا کہ راحت کی تلاش اگر ہے، تو روپے کے ڈھیروں میں وہ نہیں ملتی۔ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں، اس لئے کہ تنہائی اور افسردگی سے میں عاجز آ گیا ہوں۔ جس وقت نیویارک میں میں معمولی مزدور تھا، اس وقت مجھے مسرت حاصل تھی۔ لیکن آج کروڑوں کا مالک ہوں مگر میری افسردگی کی انتہا نہیں، اور ایسی زندگی پر میں موت کو ترجیح دیتا ہوں"

اور یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ کارنیگی، امریکہ کے ارب پتی کا یہ قول گذر چکا کہ

"لاکھ پتی آدمی مسکرا نہیں سکتا"

راک فیلر کے بیان کا بھی کہیں ذکر آیا تھا۔ کہ

"سب سے بڑا مفلس وہی ہے جسے روپے کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے"

اسی اخبار "سچ" ہی میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ جیمس وہائٹ نامی انگلستان کے نامور رئیس تھے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی (مدیر سچ) نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک (انگلستان) کے نامور امراء میں ان کا شمار تھا۔ بڑے ذہین اور طباع مشہور تھے ان کی سوجھ بوجھ کا لوگ لوہا مانتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ آج ایک تھیٹر کھول کر لاکھوں لاکھ کا ڈھیر لگا دیا۔ کل روئی کے کارخانے جاری کر کے روپے کا انبار لگا دیا۔ یہ سول گھوڑ دوڑ کی بازیوں میں بازی لگا کر لاکھوں لاکھ جیت لیا۔ ایک روز ربڑ کے ٹائر کی فیکٹری کے مالک ہو گئے۔ دولت و ثروت، فہم و فراست کے ساتھ سوسائٹی میں گھلنے ملنے کا بھی بڑا شوق رکھتے تھے۔ شاہی خانوادے تک رسائی تھی۔ الغرض جمع ہی نہیں بلکہ عدد و املاک یعنی اس راہ کے ہر سلسلہ کے ماہر و شاطر تھے۔ لیکن ہوا کیا؟ مولانا ہی ارقام فرماتے ہیں:۔

• ایک دن جب انگلستان میں ٹھیک سورج گرہن کا میلہ لوگ منا رہے تھے۔ دیکھا گیا کہ بند کمرے میں سانس سے خالی ان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ سرہانے ایک تحریر بھی تھی جس میں لکھا تھا:۔

(ترجمہ یہ ہے)

• موت کے دروازے پر قدم رکھتے وقت اپنے آخری مضمون میں اس شخص کے نقطۂ نظر سے موجودہ تمدنی زندگی پر تبصرہ کروں گا، جو سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے۔ میں نے بادشاہوں تک کی میزبانی کی ہے، بڑے بڑے امراء اور والیانِ ریاست سے میری بے تکلفی کا یارانہ رہا ہے۔ سیاسیات کے حلقہ میں بھی رہا ہوں، ایک تھیٹر کا مالک بھی رہا ہوں، ایک ایک دن میں ساڑھے سات سات لاکھ پونڈ (ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ) کی دولت کمائی ہے۔ اخبارات کا حصہ دار رہا ہوں۔ گھوڑ دوڑ کی بازی میں ایک ایک لاکھ پونڈ جیتتا رہا ہوں۔ مانچسٹر تک اپنی اسپیشل ٹرین پر گیا ہوں۔ اس لئے موجودہ تمدنی زندگی پر رائے دینے کا حق رکھتا ہوں۔

آج میں اپنی زندگی کے آخری دن، جب کہ ماضی کے سارے نقشے جلدی جلدی میرے پیشِ نظر ہو رہے ہیں، مجھے نظر آ رہا ہے۔

موجودہ تمدن بجز حرص و خواہشِ نفسانی حبِّ جاہ کے اکھاڑے کے اور کچھ نہیں ہے۔ جذباتِ عالیہ اور قناعت اب خواب و خیال میں ہیں۔ اور ان کی جگہ ایک نفرت انگیز ہنگامہ برپا ہے۔ ایک طرف شہوتِ جاہ شہوتِ زر، شہوتِ زن کا زور ہے، دوسری طرف پرشوکت دنیا تخلیقِ جدید کے خبط میں مبتلا ہے۔ ہر شخص پر دُھن سوار ہے کہ محنت کم کرے اور روپیہ زیادہ ملے اور گلچھرے خوب اڑانے کو ملیں۔ زرپرستی کی اس شدت کو دیکھ کر رُوح لرز اٹھتی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے، میں خدا کے آگے جھکتا ہوں، میں اسی سے لو لگاتا ہوں۔ میں قماربازی کی معصیت میں مبتلا رہا ہوں۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہیئے"۔

("سچ" ۳۰ جولائی ۱۹۲۷ء بحوالہ سنڈے ایکسپریس)

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اب تک پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ آیتِ قرآنی ہ۔

ومن اعرض عن ذکری — اور جو کترایا میری یاد سے تو اس کیلئے

فان له معیشة ضنکا۔ — ہے ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی معیشت!

کی شاہداتی اور تجربی تفسیر کے لئے کافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ذکر اللہ سے انحرافی زندگی جس نقد انتقام کے تجربات کو آئے دن پیش کرتی رہتی ہے، جس پر گذرتی ہے وہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اندرونی کش مکش کے ان نتائج و آثار کے مشاہدہ کرنے کا بسا اوقات موقعہ ملتا رہتا ہے جن میں بظاہر سکھ اور درحقیقت سراسر دُکھ بھری زندگی رکھنے والے لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ — وہی جنہیں اونچے اونچے بنگلوں، طرح طرح کے گملوں، پُرشوکت سواریوں کے درمیان خدم و حشم کے جمگھٹوں میں بھی سے

زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

یا سے

غضب کی الجھنیں ہیں، زندگی، بس بس میں باز آیا
باطمینان دَم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی

اور اسی قسم کے اشعار پر سر دُھنتے پایا گیا ہے۔ جن کی نگاہوں میں غالب شاعروں میں صرف اس لئے بڑا شاعر ہے کہ سے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک!

جیسے اشعار نے بڑی بات کہہ دی ہے جو اُن کے دل میں تھی۔ اکبر مرحوم کے ایسے اشعار، مثلاً ؎

غریب اکبر کے گرد کیوں ہیں جناب واعظ سے کوئی کہہ دے
اسے ڈراتے ہو موت سے کیا، وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

یا ؎

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں — مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں!

سن کر ہمیشہ تڑپتے اور پھڑکتے ہی دیکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے اسی کی غمازی یہ اشعار کر رہے ہیں۔ آج بھی کسی کو شوق ہو نظریۂ ابتلائیت سے لاپرواہو کر بسطی معیشت رکھنے والوں کا تجربہ ان اشعار کو سنا کر وہ کر سکتا ہے۔ کسی مجلس میں جہاں اس طبقہ کے لوگ جمع ہوں، آپ مذکورہ بالا اشعار یا اسی مفہوم کو دوسرے شاعروں نے بکثرت اپنے شعروں میں ادا کیا ہے۔ انہیں سُنایئے اور پھر دیکھئے تماشا۔ دیکھئے کہ اپنے دل کے حالات کا آئینہ ان حرکات و سکنات کو کس طرح بنا رہے ہیں جو ان اشعار کو سننے کے بعد ان پر طاری ہوتے ہیں۔

البتہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے اور بجا سوال ہے کہ قدرت کے ان نقد خمیازوں کو بھگتنے اور بھگتتے رہنے کے باوجود پھر یہ کیا ہے کہ ان میں کوئی بھی بسطی معیشت سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ اور نہ انحرافی طریقۂ عمل کو ترک کر کے بازگشت پر کوئی آمادہ نظر آتا ہے۔ اگر واقعی ان ہی کانٹوں اور سوزشوں میں ان کی زندگیاں جلتی اور بھنتی رہتی ہیں، تو ایسی کون سی چیز ہے جو انہیں اندر ہی اندر پکڑے رہتی ہے۔ سب کچھ کہتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں۔ عقل رکھتے ہیں، ہوش رکھتے ہیں، حواس رکھتے ہیں، جب چاہیں پلٹ سکتے ہیں، پھر سکتے ہیں۔ پھر وہ کیوں نہیں پلٹتے، کیوں نہیں پھرتے؟

اب میں اس کا جواب کیا دوں، حالانکہ پڑھا جاتا، تو قرآن ہی میں اس کا جواب بھی مل سکتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے، خصوصاً اس زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن

اَن دیکھے اسباب وعلل کو بتانے کے لئے پیغمبر آئے تھے۔ اُن ہی اَن دیکھی باتوں کو دلیل بنا کر پیغمبروں کی پیغمبری اور انبیاء کی نبوتوں میں شک اندازی کی جا رہی ہے۔ طبیب کے پاس مریض اسی لئے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا پتہ اسے نہیں چل رہا ہے، طبیب سے ان کا علم حاصل کرے اور اسی کے مطابق طریقۂ علاج اختیار کرے۔ لیکن مرض کے جن مخفی اسباب کی طبیب نشان دہی کر رہا ہو، مریض اگر ان ہی مخفی اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت ہی کا انکار کرنے لگے۔ کہنے لگے۔ کہ اپنے مرض کے جن اسباب کو میں جانتا ہوں چونکہ ان اسباب کی تم نشان دہی نہیں کر رہے ہو۔ یعنی جو کچھ میں جانتا ہوں، وہی چونکہ تم نہیں بتا رہے ہو اسی لئے تمہارے طبیب ہی ہونے پر مجھے بھروسہ نہیں، بتائیے کہ اس قسم کے مالیخولیا رکھنے والے مریضوں کا علاج دُنیا کا کوئی طبیب کر سکتا ہے؟

حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہ تھی۔ ان ہی چیزوں کے بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لئے تو خدا نے نبوت اور وحی کی نئی راہ کھولی تھی۔ لیکن کہنے والوں کو اگر اس پر اصرار ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی انحطاط کے مریضوں کے لئے پیغمبروں کی پیغمبری ــ اور نبیوں کی نبوت ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

یہی سوال ہے، کتنا اچھا، کتنا معقول سوال ہے۔ دُکھ اور دُکھ کے اسباب سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے۔ انحرافی زندگی اگر دُکھ ہے تو چاہئے تھا کہ آدمی اس سے بھاگتا لیکن بھاگے لگا گیا۔ دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ بڑھنے والوں کا غلو دن بہ دن اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ستو کے حلقوں میں جکڑنے والے کوشاں رہتے ہیں، کہ ہزار حلقوں والی زنجیریں ان پر چڑھا دی جائیں، یوں ہی ہزار والے لاکھ کی، اور لاکھ والے جہاں تک جا سکتے ہیں، جانے میں قطعاً کمی نہیں کرتے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ لکھ پتی کبھی مسکرا نہیں سکتا۔ لیکن جو لکھ پتی ہیں، وہ کروڑ پتی بننے کے لئے، اور کروڑ پتی ارب پتی بننے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ پھر یہ قصہ کیا ہے؟

اب آپ مانئے یا نہ مانئے، لیکن قرآن ہی میں اسی ذکرِ اللہ سے انحراف کی پاداش میں اس خودسری مخفی سزا کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ارشاد ہے۔ـــ

| | |
|---|---|
| ومن یعش عن ذکر الرحمٰن | اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمٰن کی یاد سے تو پیچھے لگا |
| نقیض له شیطانا فهو له قرین | دیتے ہیں ہم اس کے ایک شیطان کو پھر وہ اس |

کا ساتھی بن جاتا ہے۔ (زخرف ع ۴)

اور یہ ہے درحقیقت "ضنکی معیشت" اور تلخ زندگی کے پھل کا وہ مخفی غیر مرئی درخت، جس کے پھل کا مزہ تو ان میں سے ہر ایک کو چکھنا ہی پڑتا ہے جن کی زندگی، ذکر اللہ سے کٹ کر گذرتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ درخت ہی جب تک اکھاڑا نہ جائے گا۔ پھل کے پھلنے کو کون روک سکتا ہے۔ کیسے روک سکتا ہے، اور انسانی فطرت کے جگر میں جڑ قائم کرنے والا یہی وہ درخت ہے جس کے اکھاڑنے اور نکالنے کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ جس چیز کی حرارت سے وہ مرجھاتا ہے، مرجھا کر گرتا ہے، گرنے کے بعد خودبخود اس کی جڑ نکل جاتی ہے اسی حرارت کے مہیا کرنے کا سامان کیا جائے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں، وہی پوچھتے ہیں کہ یہ "الشیطان" آخر کیا بلا ہے؟ خدا جانے، دینے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ بے چارا کچھ نہیں ہے، صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے۔ پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے زمین کے اس کرہ پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے۔ نہ ڈرنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا ہے، برستا چلا جاتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلّی دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے اس کو اسی لئے بنایا گیا ہے، یہی اس کا کام ہے۔ ایک جگہ نہیں، قرآن میں مختلف مقامات میں

ان عبادی لیس علیھم سلطان — میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں

کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے:۔

واجلب علیھم بخیلک — اور چڑھا لا ان پر (آدم کی اولاد پر) اپنے
ورجلک۔ شارکھم فی — سوار اور پیادوں کے ساتھ اور ساجھی بن جا
الاموال والاولاد وعدھم — ان کے اموال اور اولادمیں اور وعدوں
ومایعدھم الشیطان — کے سبز باغ دکھا ان کو۔ اور نہیں وعدے
الاغرورا! — کرتا ہے ان سے شیطان، مگر صرف فریب!

"الاولاد" کے ساتھ "الاموال" میں جن لوگوں کے وہ ساجھی اور شریک بن جاتا ہے، یقین مانئے کہ ان ہی سکیموں کو "دخل" کی شکل میں ہو، یا "خرچ" کی راہوں میں۔ ہر حال میں ان ہی مغالطی احساسات میں مبتلا کرتے ہوئے وہ گھسیٹے لئے چلا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل قرآن کے حوالہ سے گذر چکی۔ انحرافی

زندگی گذارنے والوں کو اس حال میں جو دیکھا جاتا ہے کہ گھسٹتے بھی جاتے ہیں، چلاتے بھی جاتے ہیں جلتے بھی جاتے ہیں اور گھٹتے بھی جاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں، چڑھتے بھی جاتے ہیں، تو درحقیقت وہ خود نہیں بڑھتے، خود نہیں چڑھتے، قرآن کی روشنی میں دیکھئے، اس شیطان کو جو انہیں دبوچے ہوئے بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ اس نے آدمؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریته (میں ڈھاٹی لگاؤں گا اُس کی اولاد کو) گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لگ رسی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں۔ اسی کو اردو میں ڈھاٹی لگانا اور عربی میں "احتناک" کہتے ہیں۔ بہار میں ٹھری لگانا کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو ٹھری لگا کر لوگ لے چلتے ہیں۔ جو گدھوں اور گھوڑوں کی تذلیل کی شکل ہے۔ شیطان نے بھی دعویٰ کیا کہ انہیں گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا! گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے، گویا وہی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ کمل کو یہ نہیں چھوڑتے، بلکہ کمل ہی انہیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ جب تک کہ یہی پڑھ کر اس پر نہ پھونکا جائے جس کے سوا دُنیا کے کسی جھاڑ اور پھونک کو وہ نہیں سنتا۔ صحیح حدیثوں میں وہ آیا ہے۔

اذا ذکر اللہ خنس — جب آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے تب ہی وہ پیچھے سرک جاتا ہے

ورنہ جب تک یہ نہیں ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے باور کرائے کہ وہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے۔ دھوکہ دیتا ہے کہ وہی خلود بخش ہے۔ جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں باور کراتا رہتا ہے، کہ وہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا

---

لہ مسلمانوں میں بعض چیزیں کچھ ایسے طریقے سے مشہور ہیں کہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاج اور علاج کے طریقہ کا تو سب ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ یہ علاج ہے کس مرض کا؟ اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں یہی ذکر اللہ کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تصوف کا سارا دارومدار اسی کثرت ذکر پر ہے۔ صوفی کہتے ہی اس کو ہیں جو کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہ ہو اور اسی دوام ذکر کی کیفیت کو حاصل کرنے کے ارباب تصوف نے بے شمار طریقے ایجاد کئے ہیں۔ لیکن یہ سوال کہ ہر وقت، ہر حال میں خدا کے ذکر کی آدمی کو ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ دُوسرے فوائد کے سوا ذکر اللہ کا سب سے بڑا فائدہ اسی تسلیط شیطان کے مرض کا ازالہ ہے۔ اس کا واحد علاج ہی یہ ہے لہ۔

ہے ۔الغرض جو ہے، شیطانی تسلیط کے بعد نظر آتا ہے، کہ وہی نہیں ہے اور جو نہیں ہے، عجیب بات ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ وہی ہے۔ یہی ترجمہ ہے، آیتِ کریمہ قرآنیہ

| | |
|---|---|
| وما یعدھم الشیطان الا غرورا۔ | اور نہیں وعدہ کرتا ہے ان سے شیطان لیکن صرف فریب اور دھوکہ ! |

کا۔ اور اب سمجھ میں آتا ہے اس کا مطلب کہ وہی قرآن، وہی اسلام جس کی تعلیم ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، بلکہ آسمان و زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے، خدا نے سب کو انسان ہی کے لئے بنایا ہے، اسی قرآن میں :۔

| | |
|---|---|
| وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ | اور نہیں ہے پست زندگی، لیکن صرف سرمایۂ فریب ! |

اور ان جیسی آیتوں کو بھی جو پایا جاتا ہے تو ان کا کیا مطلب ہے ؟ حالانکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان آیتوں میں اسی نظریہ کو دہرایا گیا ہے۔ جس کے ماننے والوں نے دنیا اور دنیا کی چیزوں کو مایا اور مایا کا جنجال قرار دیا ہے۔ بہتوں کو دونوں نظریوں میں تناقض نظر آتا ہے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ اسلام کی تشریح و تفصیل کرنے والوں میں دو مستقل گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ جو اسلام کو دُنیا کا بھی ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں، وہ تو اس قسم کی آیتوں، حدیثوں کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں اور جن پر دینی جذبہ کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں کو پیش کر کر کے ان کے خیال کی تردید کرتے ہیں، حالانکہ نہ وہ غلط ہے اور نہ یہ غلط ہے۔ یعنے والوں میں دُنیا اور دُنیا کی پیداواروں کو جو ابتلائی ذمہ داریوں کے ساتھ لیتے ہیں اور ٹھیک وہی مثال، جو پیغمبر سے بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں مروی ہے اسی کو اپنی عملی زندگی میں دستور العمل بناتے ہیں۔ ان کی یہی دُنیا آخرت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے اس حدیث کے ایک جز کا پہلے بھی ذکر آیا ہے۔ یہاں پوری حدیث نقل کی جاتی ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| جلس النبی صلی اللہ علیہ | تشریف لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر |
| وسلم علی المنبر وجلسنا | پر اور ہم لوگ آپ کے اردگرد بیٹھ گئے |
| حولہ فقال ان مما اخاف | تب اللہ کے پیغمبرؐ نے کہنا شروع کیا۔ بلا |
| علیکم بعدی ما یفتح اللہ | شبہ میں جس چیز سے ڈرتا ہوں، اپنے بعد |
| علیکم من زھرۃ الدنیا | وہ وہی چیزیں ہیں جنہیں فتح کرائیگا اللہ |

وزينتها فقال رجل
او يأتي الخير بالشر يا رسول
الله فسكت عنه فقالوا
ما شانك تكلم رسول
الله ولا يكلمك واريناا
انه ينزل عليه فافاق
يمسح الرحضاء قال
اين السائل آنفاً؟ ان
الخير لا يأتي الا بالخير وان
هذا المال خضرة حلوة
وان مما ينبت الربيع ما
تقتل حبطا او يلم الا
اكلة الخضر فانها اكلت
حتىٰ اذا امتدت خاصر
تاها استقبلت عين الشمس
فثلطت وبالت ثم رتعت
وان هذا المال حلوة من
اخذه بحقه ووضعه
في حقه فنعم المعونة هو
ونعم صاحب المال هو لمن
اعطى منه المسكين واليتيم
وابن السبيل او كما قال
صلى الله عليه وسلم وان
من يأخذه بغير حقه كالذي
يأكل ولا يشبع ويكون عليهم

تعالیٰ تم لوگوں کے لئے دنیا کی تروتازگی
ہے اور اس کی زینت بناؤ سنگار ہے
(یعنی آمدہ اسلامی فتوحات کی طرف
اشارہ فرمایا جا رہا تھا) تب کہا ایک
آدمی نے اے اللہ کے رسول! کیا خیر
اور بھلائی کے بعد شر اور برائی آئے گی؟
(یعنی بھلائی سے کیا برائی کا نتیجہ پیدا ہوگا)
تب چپ ہوگئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم، تو لوگوں نے کہنا شروع کیا، رسول
اللہ تو ایک بات فرما رہے تھے۔ تجھ
سے تو نہیں بول رہے تھے (جو تو نے
خواہ مخواہ سوال کیا) اسی حال میں دیکھا
گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل
ہونے لگی (یعنی نزول وحی کے وقت کی
خاص کیفیت آنحضرتؐ پر طاری ہوگئی)
پھر اس حال سے افاقہ ہوا اور آنحضرت
صلعم پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرمایا کہ
ابھی جس نے سوال کیا تھا وہ کہاں ہے
پھر فرمایا کہ اچھی چیز نہیں پیدا کرتی لیکن
اچھے ہی نتائج کو (مگر جب اس کا استعمال
صحیح طور پر کیا جائے) پھر فرمایا کہ دیکھو
یہ مال اور سرمایہ ہریالی میٹھی چیز ہے
برساتی پرنالوں کے کنارے جو ہریالی
اگتی ہے (حالانکہ اچھی چیز ہے لیکن اس
کو جب کوئی جانور زیادہ مقدار میں کھا جاتا

شہید ایوم القیامۃ. (رواہ البخاری ومسلم النسائی) جاتا ہے تو، وہی مار ڈالتی ہے یا قریب موت کے پہنچا دیتی ہے مگر ایسی مویشیاں

جو صرف ہری ہری دوب کو چرتی ہیں کہ وہ انہیں کھاتی ہیں۔ پھر جب ان کے دونوں پیٹ برابر ہو جاتے ہیں تو آفتاب کے سامنے دھوپ میں جا کے بیٹھتی ہیں، پھر گوبر کرتی ہیں۔ اور پیشاب کرتی ہیں پھر جا کر چرتی ہیں۔ (اس مثال کو بیان کر کے فرمایا) پس یہی حال مال کا ہے، بڑا میٹھا ہے۔ جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ لے اور حق ہی میں اسے خرچ کرے تو پھر یہ بہترین امداد ہے اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا آدمی ہے۔ یہ اپنے اس مال سے مسکین، یتیم مسافر کو دیتا ہے۔ بہرحال یہی الفاظ، یا جیسے رسول اللہ صلعم نے فرمایا اور فرمایا کہ جو اس مال کو اس کے حق کی راہ سے نہیں لیتا اس کی مثال ایسی ہے کہ کھائے جاتا ہے لیکن پیٹ اس کا نہیں بھرتا اور قیامت کے دن یہی مال اس کے خلاف گواہ بن جائے گا!

آپ نے دیکھا اسلام کے نقطۂ نظر کو، وہی مال اور وہی سرمایہ جس سے عموماً مذہبی مزاج والوں نے ہمیشہ نفرت ہی کا اظہار کیا ہے۔ لوتھر کا دین، حالانکہ سمجھا جاتا ہے کہ روشن خیالی کا دین تھا۔ لیکن چونکہ وہ بہرحال دین ہی تھا۔ اس لئے "ٹھیٹھ گدھوں" کے خطاب سے زیادہ لوتھر کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ کسی اور نام سے ان دولت مندوں کو موسوم کرے۔ جن کے متعلق انجیل میں خبر دی گئی تھی ۔ کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ آسمانی بادشاہت میں دولتمندوں کو گھسنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اسلام اسی دولت، اسی سرمایہ اور مال کو خیر کہتا ہے اور یہ کہ بجائے خود وہ قطعاً شر نہیں ہے۔ البتہ شریروں کا غلط استعمال اس کو "شر" بنا دیتا ہے۔ یہی حال ہے مذکورہ بالا احادیث کا، بلکہ سچ پوچھئے تو جو کہتے ہیں کہ سب کچھ یہیں ہے، یہاں کے سوا کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔ قرآن میں

لم یرد الا الحیوٰۃ الدنیا — نہ مقصود بنایا اس نے لیکن صرف اسی پست زندگی کو

یا۔

ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا۔ — یا کھو گئیں ان کی سرگرمیاں اسی پست زندگی میں!

وغیرہ الفاظ میں جس مسلک کی تعبیر کی گئی ہے، یعنی وہی مسلک جو آج مغربی اقوام وملل اور ان کے طفیل کی اکثریت پر مسلط ہے۔ یعنی پیٹ اور روٹی والا خالص مادی نظریہ اور ٹھیک اسی کے بالمقابل جو

کہتے ہیں، کہ "کچھ بھی یہاں نہیں ہے" یا جو کچھ بھی ہے سو گننے کے لئے نہیں، بلکہ بھاگنے اور صرف بھاگنے کے لئے ہے۔ جس کا ذکر، جیسا کہ گذر چکا، قرآن میں

رھبانیۃ ابتدعوھا ما — رہبانیت کا مسلک جسے ہم نے ان پر

کتبناھا علیھم! — واجب نہیں ٹھہرایا تھا!

کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ الغرض مادیت اور روحانیت ان دونوں افراطی و تفریطی متناقض نظریات کے درمیان حسب دستور بجائے ازالہ کے اپنی پرانی تدبیر امالہ سے کام لے کر اسلام نے انسانی فطرت کو اس کی وہ کھوئی ہوئی چیز عطا کر دی جسے پیغمبروں کی تعلیم سے ہٹنے کے بعد وہ ہمیشہ کھو بیٹھتی ہے۔ الخیر لایاتی الا بالخیر (اچھی چیز نہیں پیدا کرتی لیکن اچھے ہی نتائج کو) یہی وہ پیغمبرانہ فقرہ ہے جس میں وہ سارا مضمون سمٹ کر آ گیا ہے جسے اب تک بسطی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دولت اور سرمایہ سے جب غلط نتائج کا تجربہ لوگوں کو ہونے لگا اور تاریخ کا کونسا دَور ہے جس میں سرمایہ اور مال کے ان تلخ نتائج کی تلخیاں لوگوں کو نہ چکھنی پڑی ہوں۔ آج بھی یہی ہوا ہے، ہو رہا ہے اور کل بھی یہی ہوا تھا۔ ہوتا چلا آیا ہے۔ چیخنے والے جب چیخنے لگے اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کو اس راہ میں چیخنا ہی پڑا ہے تو عطائیوں نے نمدے کو دیکھ کر مریض کے واویلا کو نمدے ہی کی طرف منسوب کر دیا۔ سرمایہ اور مال دولت اور ثروت کے نام سے تبرّہ بازیاں شروع ہو گئیں۔ اسی پر لعنتوں کے تیر، نفرتوں کی گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ان ہی لعنتوں اور نفرتوں نے کبھی رہبانیت و کلبیت کی شکل اختیار کی، کسی ملک میں مزدکیت کا چولا پہن کر اسی نے سر اٹھایا اور آج وہی اشتراکیت و اشتمالیت اور ازیں قبیل مختلف "یتوں" کے بھیس میں سرمایہ داروں کو دھمکا رہی ہیں، مالداروں کو ڈرا رہی ہیں۔

لیکن انسانیت کی تصحیح و علاج کے لئے جن طبیبوں کو قدرت پیدا کرتی ہے۔ ان قدرتی اطباء نے سرمایہ کو نہیں بلکہ ان کو ٹوکا جو سرمایہ کو غلط طریقہ سے استعمال کر رہے تھے۔ ان کو سمجھایا جنہوں نے خود الجھ کر دولت سے کام لینے کے فطری طریقوں کو الجھا دیا تھا۔

"قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو، اور قسم ہے اس کی جس نے نر و مادہ (مرد و عورت) پیدا کئے"

قرآن مجید نے ان ہی عجیب و غریب قسموں اور تاریخی انقلابات کے عمیق اشاروں، مردوں اور

عورتوں اور باہم ان کے تعلقات سے پیدا ہونے والے نتیجوں کے کنائی ذکر کے بعد

ان سعیکم لشتیٰ — تعلقاً تمہاری کوششیں (عملی سرگرمیاں) طرح طرح کی ہیں۔

فرما کر :۔

فاما من اعطیٰ واتقیٰ — پس جس نے دیا اور ڈرا، اور الحسنیٰ (اچھی

وصدق بالحسنیٰ فسینسرہ — باتوں) کی تصدیق کی تو ہم قریب ہے کہ آسان

للیسریٰ۔ — کریں گے اس پر آسان زندگی کو!

میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس سلسلہ میں اب تک کہا گیا ہے۔ یا کہا جارہا ہے یا کہا جا سکتا ہے۔ "الیسریٰ" (آسان زندگی) کی ضمانت لی گئی ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو عطائی مشوروں سے ہٹ کر قدرتی طبیبوں کے اس علاج کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ کہنا تھا' پہلے کہا جا چکا ہے۔ پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ پھر اسی کو پڑھیں، غور سے پڑھیں، علاج کا یہی لازوال فطری طریقہ ہے۔ فطرت کی راہوں سے ہٹ کر جو بھی چلنا چاہے گا۔ دُکھ کے ساتھ اسے واپس ہی ہونا پڑے گا۔ آج نہیں تو کل اسے پچھتانا ہی پڑیگا ایک کانٹا اگر نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے۔ اگر ایک گرہ کھلے گی تو کھل کر وہی بیسیوں گرہوں کی شکل اختیار کرلے گی۔ عارف رومی نے اپنے تمثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے۔ مثنوی میں ہے :۔

کس بزیر دم خر خارے نہد — خر نہ داند دفع او برمی جہد

ایک آدمی کسی گدھے کے نیچے کانٹا چبھا دیتا ہے! — گدھا کانٹے نکالنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لئے کودتا پھاندتا ہے!

می جہد آں خار محکم تر زند — عاقلے باید کہ آں خارش کند

کودتا پھاندتا ہے اور کانٹا اور زیادہ مضبوطی سے چبھتا چلا جاتا ہے — یہاں ضرورت کسی عقل والے کی ہے جو اس کانٹے کو اس کے اندر سے نکال دے!

خرز بہر دفع خار از سوز و درد — جفتہ می انداخت صدجا زخم کرد

گدھا کانٹے کو نکالنے کے لئے مارے جلن اور درد کے۔ — دگڑوں پر رگڑے لگا کر سینکڑوں جگہ زخم پیدا کرلیتا ہے!

اور آج دنیا اسی حال میں مبتلا ہے۔ انسانیت کے جسم میں جو کانٹا چبھ گیا ہے۔ اس کانٹے کے نکالنے کا صحیح طریقہ جن بزرگوں کو معلوم ہے۔ اللہ کے ان پیغامبروں سے تو بغاوت اختیار کی گئی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سے بے تعلق رہ کر اس کانٹے کے نکالنے میں کامیابی حاصل کی جائے گی۔ لیکن مسکین گدھے کو کون سمجھائے کہ خار برآری کی اس کوشش میں بجائے نکلنے کے کانٹا اور اندر دھنستا چلا جائے گا۔ ہر وہ رگڑ جو اس کانٹے کو نکالنے کیلئے گدھا لگائے گا بیسیوں نئے زخم اپنے اندر پیدا کرے گا۔ بقول اکبر مرحوم ؎

جتنا پھڑ کو جال کے اندر جال گھسے گا کھال کے اندر

اور یہ تھے بسطی معیشت کی ذمہ داریوں سے انحراف کے وہ نتائج جن کا ظہور علاوہ اُخروی زندگی کے اسی معیشت اور زندگی میں از روئے قرآن و حدیث اسی دنیا میں ہوتا ہے۔

**قدری معیشت اور اس کی ذمہ داریوں سے انحراف کے نتائج**

اب میں چاہتا ہوں کہ قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کے ان نتائج کی تفصیل کروں جن کا ذکر اسلامی وثائق و نصوص میں کیا گیا ہے، تو بات یہ ہے کہ

| | |
|---|---|
| من اعرض عن ذکری | جو کترایا میری یاد سے پس اس کیلئے معیشت |
| فان له معیشة ضنکا ! | ہے ضیق اور تنگیوں سے بھری ہوئی ! |

کی قرآنی آیت میں جس جرم کی پاداش میں زندگی کو تلخ و پراگندہ بنا دینے کی دھمکی دی گئی ہے ظاہر ہے کہ جس طرح اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو بسطی پیمانے پر رزق پاتے ہیں، اسی طرح اس کے دائرے میں وہ بھی شریک ہیں جنہیں قدری پیمانے پر روزی مل رہی ہے۔ کیونکہ من کا لفظ عام ہے اور ہر اس شخص کو حاوی ہے جو ذکر اللہ سے ہٹ کر اور کٹ کر جینا چاہتا ہے۔ الغرض معیشت خواہ بسطی ہو یا قدری، جب معلوم ہو چکا کہ "الرزق" کا ہر حال خاص قسم کی خدائی ذمہ داریوں کا طالب ہے۔ تو جو ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا ان کے نتائج بھی ان کے سامنے آئیں گے اور جو ان سے لاپروائی اختیار کرے گا۔ قدرت کے انتقامی خمیازوں سے اپنے آپ کو وہ بچا نہیں سکتا۔ اسی طرح

| | |
|---|---|
| من یعش عن ذکر الرحمٰن | اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمٰن کی یاد سے |
| نقیض له شیطانا فهو | پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو پس |
| له قرین۔ | وہ ہو جاتا ہے اس کا ساتھی ! |

کا قانون جیسے بسطیوں کے لئے ہے اور ذکر الرحمٰن سے اعراض کی سزا شیطانی تسیط کی شکل میں جیسے انہیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اس جرم کا ارتکاب اگر قدری معیشت والوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے کی مار سے وہ اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بلکہ

الشیطان یعدکم الفقر — الشیطان دھمکاتا ہے تمہیں افلاس سے

ویامرکم بالفحشاء — اور حکم دیتا ہے بے حیائی کی باتوں کا!

کی آیت جب میری تلاوت میں گذرتی ہے، تو ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ جن بے چاروں کی آمدنی ٹھیک خرچ کے مطابق بالکل اس کے برابر ہوتی ہے۔ یعنی خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس کچھ پس ماندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسوں کے لئے معیشت کے اسی رنگ کو پیش کر کر کے ہر گذرنے والے دن کو دماغ سے نکال کر الشیطان آنے والے دن کی ضرورتوں کے اندیشوں کو پیدا کر کر کے ان کے کلیجوں کو مسلتا اور "فردا" کی فکر میں ڈال کر "امروز" کی لذتوں کو بھی ان غریبوں کے لئے تلخ بناتا چلا جاتا ہے۔ اور یہی مطلب ہے

الشیطان یعدکم الفقر — شیطان تمہیں محتاجی و ناداری کی دھمکی دیتا رہتا ہے

لیکن بسطی معیشت رکھنے والوں میں اس خیال سے ڈرانے کی گنجائش چونکہ نہیں پاتا۔ اس لئے عموماً "الفحشاء" (بے حیائیوں) پر الشیطان ان لوگوں کو اکساتا رہتا ہے، جو بسطی معیشت رکھتے ہیں۔ دیکھتا ہے کہ فقر کی دھمکی تو ان پر کارگر نہ ہوگی۔ تو آوارگی اور بدچلنی کی راہوں پر ان کو ڈالتا ہے عام طور پر نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا جو حال ہے کہ اپنی بسطی معیشت کی ابتلائی ذمہ داریوں سے جب وہ بے پروا ہو جاتے ہیں تو ان کی آمدنیوں کا بڑا مصرف بھی "الفحشاء" رہ جاتا ہے۔

بہرحال یہ تو اجمال ہے، قرآن میں اسی اجمال کی جو تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اب میں ان ہی کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ان تفصیلات کے ذکر سے پہلے پھر اسی مسئلہ پر تنبیہہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ جن کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ قدری معیشت والوں کو جن معاشی پریشانیوں میں عام طور پر مبتلا پایا جاتا ہے۔ ان کا ایک حصہ تو وہ ہے جن کی ذمہ داری بالکلیہ ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو بسطی معیشت رکھتے ہیں۔ لیکن اکل لم کے عارضہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے قدریوں کے ان جائز حقوق کو نہیں ادا کرتے، نہیں ادا کرنا چاہتے۔ جو دینے والے کی طرف سے ان کے سرمایہ

میں مقرر کیا گیا ہے۔

اور اکل لم کا استسقائی روگ ہے بھی ایسا ناپاک روگ کہ جن پر اس کا دَورہ پڑ جاتا ہے وہ صرف یہی نہیں کہ جو آچکا ہے اسی کو پوری طاقت سے اس طور پر پکڑے رہتے ہیں کہ ایک کھیل بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے مُنہ پر اُڑ کر نہ جانے پائے، بلکہ دوسروں کے مُنہ کے لقموں کو بھی چھین چھین کر چاہتے ہیں کہ نگلتے چلے جائیں۔ خود ان ہی کے مُلک، اُن ہی کی قوم، ان ہی لوگوں پر جن میں وہ رہتے سہتے ہیں کچھ بھی گذر جائے لیکن اکل لم کے ان روگیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ خصوصاً جن ممالک میں آئینی پشت پناہیاں بھی اکل لم کے ان آسیب زدوں کو میسّر آجاتی ہیں تو پھر ان کے بے پناہ مظالم کا کیا ٹھکانا ہے؟ آج جن کے تماشے ان ممالک میں نظر آ رہے ہیں جہاں دولت کا طوفان برپا ہے۔ فی کس "اوسط آمدنی" کی طلسمی تعبیروں کا جو کھیل جہاں ملک کے سادہ لوح عام باشندوں کو خوش کرنے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ سنایا جاتا ہے۔ اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف پیرایوں میں اعلان کرایا جاتا ہے کہ مثلاً ہمارے مُلک کی اوسط آمدنی فی کس

"گیارہ سو اسی روپے ہیں!"

اوسط نکالنے کے وقت تو اس آمدنی کو فی کس پر بٹھایا جاتا ہے۔ لیکن بجائے اوسط کے واقعی جو اوسط نہیں، بلکہ دولت ہے، ثروت ہے، اس کی تقسیم کا وقت جب آتا ہے تو اسی گیارہ سو اسی روپیہ فی کس آمدنی رکھنے والے ملک کے عام باشندوں کے متعلق یہ خبریں بھی معلوم ہوتی رہتی ہیں کہ

"ملک میں بیروزگاروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے"

یہ قارون کی زمین امریکہ کا حال ہے۔ (دیکھو رسالہ جامعہ دہلی۔ اپریل ۱۹۳۳ء)

اور خیر امریکہ تو ایک بّرِ اعظم ہے۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں دنیا کے آخری کنارے کا وہ جزیرہ، بلکہ جزیرچہ جس کے متعلق کہنے والے کہتے ہیں کہ صوبہ بنگال کے کسی بڑے ضلع کے رقبہ سے اس کا رقبہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن صنعت و حرفت، تجارت، سیاست و حکومت، بنکنگ اور اسی قسم کے جائز و ناجائز ذرائع سے کام لے کر دُنیا کے اکثر حصّوں کی پیداواروں کے سیلاب کا دہانہ اس وقت تقریباً اسی ملک کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔ یا بقول اسی ملک کے کسی باشندے کے دُنیا کی دولت کا اسپنج اس ملک والوں کو مل گیا ہے۔ بجائے پانی کے اسی اسپنج

میں سارے جہان کے کمانے والوں کی کمائیوں کو جذب کر کر کے لوگ لے جاتے ہیں۔ اور اسی ملک کے دریائے ٹیمز کے کنارے اسے نچوڑ دیتے ہیں، نچوڑنے کا یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں بلکہ صدیوں سے جاری ہے اسی لئے فی کس کا اوسط یہاں بھی امریکہ کے برابر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے!

میرا اشارہ جزیرہ برطانیہ اور اس کے باشندوں کی طرف ہے۔ فی کس اوسط کا حساب اور واقع میں فی کس اس مجموعی سرمایہ سے لوگوں کو کتنا مل رہا ہے، جو ہر سال اس میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے درحقیقت واقف[1] تو وہی حضرات ہو سکتے ہیں جن کا مشغلہ ہی اعداد و شمار کا یہی قصہ ہے۔ تاہم مجھ جیسے دُور افتادوں کی نظر بھی اس فن کے ماہرین ہی کے بعض بیانات پر کبھی کبھی پڑ جاتی ہے۔ ان ہی میں سے ایک رپورٹ یہ ہے یعنی

"جزیرہ برطانیہ کی آبادی جس زمانے میں بتائی جاتی تھی کہ چار کروڑ تیس لاکھ اور فی کس کے حساب سے اوسط نکالنے والے ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ فی کس کا اوسط نکالتے تھے، لیکن واقعہ میں دولت کی تقسیم اس ملک میں جس طریقہ سے ہوئی ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کی مردم شماری میں چار کروڑ تیس لاکھ کے باشندوں کے اس ملک میں ان لوگوں کی تعداد جو اپنی آمدنی کے اعتبار سے ملینز (لکھ پتی) کہلاتے

---

[1] دولت کی تقسیم اکل لم کے اس استحقاقی دور میں اعتدال کے نقطہ سے بتدریج مخفی طور پر اندر ہی اندر دُور ہٹتے ہوئے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ عوام تو عوام خواص کو بھی اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خوفناک نتائج بھیانک شکلوں میں سامنے نہیں آجاتے۔ ڈاکٹر الیف، ڈبلیو، ٹاسگ پی ایچ ڈی، ڈی لٹ وغیرہ جن کی کتاب اصول معاشیات کا ترجمہ دار الترجمہ سے شائع ہو چکا ہے۔ وہی لکھتے ہیں کہ یہ عدم مساوات کس حد تک ہے اور اسکے اسباب کیا ہیں۔ اس موضوع کے متعلق ہماری معلومات ابھی اس تک نہایت حیرت افزا طریقہ پر محدود تھیں ص ۲۵۲ اصول معاشیات ج ۲۔ جب ایسے ماہرین کے لئے اس سلسلے کی معلومات حیرت افزا طور پر محدود ہوں تو ہم جیسے ایک عامی آدمی پر اس فی کس اوسط آمدنی کے مغالطہ کا راز کیا واضح ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ٹاسگ نے ڈرتے ڈرتے انتہائی احتیاط جس میں مصلحت بھی شریک معلوم ہوتی ہے اپنی رپورٹ یہ دی ہے کہ برطانیہ کی فی کس اوسط آمدنی کی تقسیم جس شکل میں ہو رہی ہے اس کا حال یہ ہے کہ ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی میں برطانوی قوم کی مجموعی آمدنی کا نصف صرف پچاس لاکھ آدمیوں کے درمیان منحصر ہے اور باقی نصف تین کروڑ ۸۰ لاکھ انسانوں کے حصہ میں پڑتا ہے۔ دیکھیے اصول معاشیات ص ۳۵۶ ج ۲۔ اور اس ۵۰ لاکھ میں بھی نصف آمدنی جس نہج پر تقسیم ہوتی ہے اس کا اندازہ لکھ پتیوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

تھے۔ کروڑ، لاکھ، بلکہ ہزار بھی نہیں صرف پانچ سو تینتالیس تھی۔"

(المقتطف مصر نومبر ۱۹۳۵ء)

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ انگلستان میں ہر سال آمدنی کی اِن اَن گنت راہوں سے انسانوں کا کمایا ہوا روپیہ جو داخل ہوتا ہے۔ اس روپے میں سے تقریباً چودہ آنے" اکل لم" کے زور سے کل ان ہی پانچ ساڑھے پانچ سو آباد کاروں کی جیب میں گھوم گھوم کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی جیبوں سے چرنے اور چگنے کے لئے یہ ملک سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے بچوں، بچوں کے بچوں، پوتوں پر پوتوں کے ساتھ پھر ان ہی کی جیبوں میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں۔ یہی چکر ہے، صدہا صدسال سے اس ملک میں، جس کے اندر وہاں کی دولت گھوم رہی ہے، باقی ملک کی عام آبادی پر وہی فی کس والا اوسط جس طریقہ سے تقسیم ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی آپ کو اسی ملک کی معاشی روئیدادوں سے ہو سکتا ہے جنگِ عظیم اول سے پہلے جب ہر طرف امن و امان ہی کا دور دورہ تھا آمدنی ہی آمدنی تھی۔ آگ اور سمندر نے اس ملک کے رہنے والوں اور ان کی کمائیوں کو نگلنے کے لئے اپنا منہ نہیں کھولا تھا۔ اس وقت کا حال چھپوانے والوں نے اخبار میں یہ چھپوایا تھا۔

"آج ہمارے ملک انگلستان کی یہ حالت ہے کہ ہر تیس آدمیوں میں ایک آدمی ایسا ضرور ہے جو اپنی قوتِ بازو سے اپنی گذر بسر نہیں کر سکتا"

ایک کماتا ہے دس کھاتے ہیں۔ بدبخت ہندوستان اس عارضہ میں بدنام تھا۔ لیکن بدنام کرنیوالوں کی نیک نامی کیا اس سے کم ہے؟ اور یہ حال تو جنگِ عظیم اوّل سے پہلے کا ہے۔ جنگ کے بعد ۱۹۲۶ء میں گننے والوں نے اپنی گنتیوں کو ان الفاظ میں مشتہر کیا تھا۔

"آخری مردم شماری کے اعداد کے لحاظ سے ہمارے ملک انگلستان میں ایک کروڑ (یعنی تقریباً چوتھائی آبادی) ایسی ہے، جو ناداری میں بسر کر رہی ہے اور دوسرے ایک کروڑ کی تعداد ایسی ہے جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ جو آرام و آسائش کے نام سے بھی واقف نہیں اور جس کی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے۔"

جہاں کے عوام پر خود عوام کی حکومت ہے۔ جمہوریت کا سبق جو ملک سارے جہان کو پڑھاتا پھرتا اور دُنیا بھر میں اس کے برکات بانٹتا پھرتا ہے، اس کی نصف آبادی "سسکتی ہوئی زندگی"، جو

ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے" گذار رہی تھی۔ اس کے نتیجہ کا آخری فقرہ یہ تھا۔

"یعنی ہر چار آدمیوں میں ایک آدمی ایسی حالت میں گذار رہا ہے جس میں کوئی کاشتکار اپنے مویشی کو بھی رکھنا گوارا نہ کرے"

۲ مئی ۱۹۲۶ء اخبار "سچ" میں انگلستان ہی کے مختلف اخباروں سے یہ معلومات فراہم کرکے اس وقت شائع کئے گئے تھے۔ جب تک باہر کے دشمنوں نے اس جزیرے کے باشندوں پر بم برسائے تھے، نہ ان کے گھروں کو کھنڈر بنا کر خندقوں میں شب باشی پہ مجبور کیا تھا۔ اف، اس وقت بھی ہر چار آدمی میں خود ان ہی کا بیان ہے۔

"ہم میں ایک آدمی کا حال ایسا ہے کہ گویا کوئی دھوبی اپنے گدھے کو، کوئی تیلی اپنے کولہو کے بیل کو بھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا"

چار کروڑ انسانوں میں پانچ ساڑھے پانچ سو انسانوں کا لاکھ پتی ہونا اور اس کے بعد اسی چار کروڑ کی بقیہ آبادی میں ہر چار میں سے ایک کو مویشیوں، گائے، بیلوں، بھیڑوں اور بکریوں سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ باہر کے ببب افگنوں، اور آتش باروں نے؟ یا اندر کے پانچ ساڑھے پانچ سو لکھ پتیوں کے اَل لَم نے؟ کتنا دلچسپ ہے فی کس کے اوسط کا یہ افسانہ جسے سنا سنا کر غریب ہندوستان ہمیشہ اپنے لیڈروں کی زبانوں سے دھتکارا گیا اور ڈرایا گیا ہے! یا دیڑتا ہے، ان ہی دنوں میں عوام کے مطالبوں سے مجبور ہو کر انگلستان کی حکومت نے بھی اپنے بیت المال میں ایک حد تک "الفقراء والمساکین" کے حقوق کا جب اعتراف کیا۔ غریبوں کو کچھ امدادِ شاہی کہئے، یا سرمایہ داری کے خزانے سے ملنے لگی تو لقمہ دوختہ ہونٹوں کو دیکھ کر کسی مراسلہ نگار نے لکھا۔

"اب ملک میں افلاس کی وہ حالت نہیں ہے!"

"ڈیلی ہیرالڈ" نے جو ان ہی لقمہ دوختوں کا اخبار ہے، اس اعلان کی اشاعت پر پھیر کر لکھا تھا

"ہم دریافت کرتے ہیں کہ مراسلہ نگار کو کتنے گھروں کے اندر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسے کچھ بھی اندازہ ہے کہ اب بھی (تقسیم خیرات کے بعد بھی) کتنے گھرانے ایسے ہیں، جن کا گذر زیادہ تر محض روٹی اور چائے پہ ہے بجائے مکھن کے جو چربی پر بسر کرتے ہیں، جنہیں گوشت اور سبزی دیگر آلو کے کبھی دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی"

ڈیلی ہیرالڈ کا یہ بیان اس وقت کا نہیں ہے جب انگلستان میں راتب بندی کا نفاذ ہو چکا تھا۔ جنگ عظیم ثانی سے پہلے کا یہ قصہ ہارنے والے جرمنی کا نہیں، جیتنے والے، بلکہ مقبوضات بڑھانے والے انگلستان کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تین پیسے یا کچھ کم، اسی قسم کے چند پیسوں کی آمدنی رکھنے والے ہندوستان کو کس بُنیاد پر شرماتے، اور آن دلاتے تھے۔ جھونپڑیوں والا ہندوستان تُن لے کیتس اور پیتس والے انگلستان کا حال ایک یہ۔

• شہر گلاسگو میں چودہ ہزار مکانات ایسے ہیں جو صرف ایک کوٹھڑی پر مشتمل ہیں۔ اور ہر کوٹھڑی میں چار چار یا پانچ پانچ اور چھ چھ آدمی رہتے ہیں۔ تیس ہزار مکانات دو دو کوٹھڑیوں پر شامل ہیں اور ان میں سات سے بارہ تک آدمی گذر کرتے ہیں۔

یہ بیان دیا تھا جناب مسٹر لائیڈ جارج صاحب سابق وزیر اعظم دولتِ انگلشیہ نے، آکسفورڈ میں پہنچ کر، اس لئے یہ اعداد و شمار فراہم کئے تھے کہ دونوں کی تعداد میں اضافہ ان ہی اعداد کے پیش کرنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ اور گلاسگو تو بہر حال گلاسگو ہے۔ بلاد الدنیا کی ملکہ، لندن ہی کا حال جب یہ تھا۔ مسٹر لائیڈ جارج ہی کا بیان ہے۔

• اس شہر لندن کی کل آبادی کا ½ حصہ ڈربوں جیسے مکانوں میں بسر کرتا ہے۔

پھر لندن اور لندن والے جن ملکوں اور جن شہروں پر حکومت کرتے ہیں، اگر وہاں کے باشندوں کو رہنے کے لئے مرغی کے یہ ڈربے بھی نصیب نہ ہوں تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہے؟

ان ہی دنوں میں جب یہ خبریں ایک کالم میں شائع ہوتی تھیں تو دوسرے کالموں میں اس قسم کی خبروں کی بھی کبھی کمی محسوس نہیں کی گئی ہے، اور آج بھی یہ دونوں سلسلے ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے جاری و ساری ہیں۔ مثلاً انگلستان ہی کے متعلق

• چار ارب چوہتر کروڑ روپے کی صرف شراب لنڈھائی گئی۔

(سچ ۵ر فروری ۱۹۲۶ء)

اور امریکہ کے متعلق یہ۔

• عورتوں نے اپنے چہروں (صرف چہروں) کی آرائش کے لئے غازہ پوڈر وغیرہ پر ۳۴ کروڑ روپوں سے زائد خرچ کئے۔ (ویسٹ منسٹر گزٹ ۱۶ر اپریل ۲۶ء)

اور یہ ہیں :-

تاکلون التراث اکلا لمّا — کھاتے ہو موروثی سرمایہ کو اکلِ لَم کے ساتھ

کی وہ زندہ تفسیر میں جن کی بدولت چار کروڑ کی آبادی میں سے دو کروڑ انسانوں کو تو سسکتے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے مویشیوں کے مانند مرغیوں کے ڈربوں میں پایا گیا۔ لیکن اسی ملک میں لنڈھانے والے چوہتر کروڑ ہی نہیں، بلکہ چوہتر کروڑ چار ارب کی سالانہ شرابیں لنڈھا رہے تھے اللہ اللہ رے "اکل لم" کا زور کہ رخساروں پر چونتیس چونتیس کروڑ کی دولت مل مل کر ہر سال رکھ دی جائے لیکن لاکھوں اور کروڑوں باشندوں کے بھوکے پیٹ اور ننگے اجسام کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور اس پر بھی دنیا کے کان کو اس قسم کے دعووں، مسلسل دعووں سے بہرا بنایا جا رہا ہو کہ اشخاص سے چھین کر ملک کے عام باشندوں تک دولت اور حکومت کے پہنچانے میں ہم ہی نے پیش قدمی کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے جہاں بھی گذرے، جو بھی گذرے چور تھے۔ بٹ مار تھے۔ اپنے اور اپنے بال بچوں کے سوا ان کے خزانوں میں ملک کے عام باشندوں کے لئے کچھ نہ تھا۔ دنیا ہی انصاف کر سکتی ہے کہ جس ملک میں ایک طرف تو یہ حال ہو کہ پینے والوں نے سال بھر میں چار چار ارب اور چوہتر چوہتر کروڑ روپے کی شراب لنڈھا ڈالی ہو لیکن اسی ملک میں شراب ہی کے متعلق ندیدوں کے ایسے طبقات بھی پائے جاتے ہیں۔ وہی ۱۹۲۴ء جس میں شراب کے بجٹ میں یہ اعداد ہیں اسی سنہ چوبیس میں ڈیلی میل اخبار نے یہ خبر شائع کی تھی :-

> "گلاسگو میں وسکی کے تین مٹکے اتفاقاً شراب کی لاری سے لڑھک کر زمین پر گر پڑے۔ سڑک پر شراب بہنے لگی۔ ہزار کے اوپر عوام کا ہجوم تھا جو صراحیاں اور بوتلیں لئے ٹوٹ پڑا۔ اور بعض ترسی ہوئی روحوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ سڑک پر اوندھے لیٹ کر نالی میں بہتی ہوئی شراب کو پینا شروع کیا۔ اور بعضوں نے اس میں کپڑے ڈبو کر پھر انہیں بوتلوں میں نچوڑ لیا۔" (ذیج ۳۰ مئی ۱۹۲۷ء)

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے۔ لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کا جو ظالمانہ نظام آج یورپ و امریکہ میں قائم ہے۔ اسی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ممالک میں اسفلی معیشت رکھنے والوں نے قدری رزق والوں کو محرومی و مفلسی کے کس آخری نقطہ تک

پہنچا دیا ہے۔ گندی نالیوں میں بہنے والی شراب، جس کے پینے پر شاید کتا بھی بآسانی تیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے غریب افراد کتنی مسرت کے ساتھ اس نعمت غیر مترقبہ کو اوندھے ہو ہو کر نالیوں میں منہ ڈالے پی رہے تھے۔

اسی لئے قدرتی معیشت کی وہ دردناک حالت جو بسلسلی معیشت والوں کے "اکل لم" یا انتہائی خواری وخودنوشی کے جذبات کے تسلط کا نتیجہ ہے۔ اس کی اصلاح وتصحیح کے قصہ کو تو اسی قدرت کے حوالے کرنا چاہئے جس نے ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کے چنگلوں سے نجات دے دیکر تاریخ کے موجودہ دَور تک نسلِ انسانی کو پہنچایا ہے۔ قرآن کا دہی خدا جس نے اپنے متعلق

ان ربک لبالمرصاد — اور تیرا رب گھات میں ہے

کا اعلان کیا ہے اور بتایا ہے کہ قدرت کی مخفی نگرانی اندازہ کرتی رہتی ہے، تا آنکہ

فاکثروا فیہا الفساد — جب بگاڑ اور فساد کو بڑھا دیتے ہیں (سدھار اور اصلاح پر)

کے درجہ تک ظلم و تعدی کا یہ پارہ چڑھ کر جب پہنچ جاتا ہے، تو معاً اسی کے ساتھ

فصب علیہم ربک سوط — بس برسا دیتا ہے ان پر تیرا رب
عذاب — عذاب کا کوڑا۔

کا تجربہ کرۂ زمین کے باشندوں کو ہمیشہ کرنا پڑا ہے۔ اور آج بھی "معاشی توازن" کے جس قصہ کو ناہمواری کے جن حدود تک پہنچا دیا گیا ہے، "مرصاد" (گھات) والے ربّ کے "سوط عذاب" (تازیانۂ عذاب) کا لوگوں کو انتظار کرنا چاہئے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید قدرت کی اس مخفی بے آواز والی لاٹھی کی مار کے آثار کا ظہور شروع ہو چکا ہے۔ آخر قرآن ہی میں یہ جو فرمایا گیا ہے، یعنی

وذرنی والمکذبین اولی — چھوڑ دو مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو، جو
النعمۃ ومہلہم قلیلا ان — نعمت والے ہیں اور مہلت دو ان کو تھوڑی
لدینا انکالا وجحیما وطعاما — قطعاً ہمارے پاس ہیں بیڑیاں اور آگ کا ڈھیر
ذا غصۃ وعذابا الیما؛ — اور کھانا ایسا جو گلے میں اٹک جائے اور دکھ بھرا عذاب

نعمت کہئے یا "سرمایہ" اسی کو پانے کے بعد اپنی متعلقہ ذمہ داریوں کو جنہوں نے جھٹلایا تھا۔ کچھ دن کی ڈھیل کے بعد ان ہی کے حلقوم میں آج "اشتراکیت" "فاشسٹالیت" اور اسی قسم کے مختلف لقمے، جو اٹکے نظر آ رہے ہیں۔ ایسے لقمے، جنہیں نگلنے والے نہ نگل سکتے ہیں نہ اگلنے والے اُگل

سکتے ہیں یہ سرمایہ، محنت، مزدوری اور اسی قسم کے دوسرے معاشی مسائل کچھ ایسی بھیانک شکلوں میں جو دانت دکھا رہے ہیں، کہ موجودہ عہد کا ہر صاحب نعمت اپنی اپنی نعمتوں، یا انکے اپنے سرمایہ کے حساب سے بدخوابیوں میں مبتلا ہے۔ کیا ان کو دیکھ کر بھی اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ "مرصاد" والے رب کا "سوط عذاب" اور "غیبی کوڑا" غیب سے سر نکال کر شہادت میں رہنے والوں کی پیٹھوں پر نہیں برسنے لگا ہے؟

**اشتراکیت معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے**

بہرحال قدری معیشت کا یہ پہلو زبردستوں کی زیردستیوں کا چونکہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان زبردستوں کا مقابلہ تو وہی کر سکتا ہے۔ جس کا ہاتھ سب سے اونچا ہے اور آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے زیردستوں کو زبردستوں پر چڑھاتا رہا ہے۔ بڑے بڑے گھڑوں کو کنکریوں سے دیکھا گیا ہے کہ اس نے پھوڑ دیا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ توڑ پھوڑ کے اس سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ پھر جب آغاز ہو چکا ہے تو کسی نتیجہ تک بہرحال اس آغاز کا انجام پہنچ ہی کر رہے گا۔ غلطی میں مبتلا ہونے والوں کو غلطی جو کچھ بھی لگ رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "انتقام" کو وہ واقعی انسان کا کوئی "معاشی نظام" سمجھ رہے ہیں لیکن واقعات خود اس کی شہادت پیش کرتے چلے جائیں گے کہ انتقام صرف انتقام تھا۔ وہ دنیا کا کوئی واقعی نظام نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔ انتقام کے دن جب پورے ہو جائیں گے تب بنی آدم کی معیشت کا جو فطری نظام ہے وہ خود بخود قائم ہو جائے گا۔ یہی ہوتا رہا ہے اور دنیا کی عمر کی مدت اگر ابھی کچھ باقی ہے تو اللہ کی اسی سنت کا ظہور یقیناً ہو کر رہے گا۔ ولن تجد لسنة الله تبديلا۔

پس قدری معیشت کے اس پہلو کو چھوڑ کر میں اسی معیشت کی صرف اس شکل سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بنی آدم کے صفات و کمالات کے قدرتی تفاوت کا لازمی نتیجہ ہے اور قرآن میں جیسا کہ بار بار گذر چکا

| | |
|---|---|
| الله يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر۔ | اللہ ہی کشادہ کرتا ہے جس پر چاہتا ہے روزی کو۔ اور وہی نپی تلی کر دیتا ہے جس کی روزی کو چاہتا ہے! |

کے الفاظ میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ انسانی اعمال کی مصنوعی کوششوں کا نہیں، بلکہ معاشی مدارج و مراتب کا یہ اختلاف حق تعالیٰ کی قدرت قاہرہ اور ارادۂ باہرہ کا پیدا کیا ہوا قصداً وارادۃً پیدا کیا ہوا ہے۔ جس کے مٹانے کی کوشش میں کامیابی اسی وقت، صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسانوں کے

پیدا کرنے کا اختیار خود ہم انسانوں ہی کو مل جائے اور اس کے بعد آئندہ جتنے بچے بھی پیدا کئے جائیں وہ اپنے تمام اندرونی و بیرونی صفات کے لحاظ سے برابر کر کے پیدا کئے جائیں لیکن جب تک مختلف صلاحیتوں اور مناسبتوں کو لے لے کر لوگوں کے پیدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ معاشی طبقات کے تفاوت کے اس سلسلہ کو بھی کوئی روک نہیں سکتا[1]۔ بہرحال معیشت کی اس قدرتی کیفیت میں زندگی گذارنے کے قرآن میں جو چند گر بتائے گئے تھے۔ ان کا ذکر تو گذر چکا۔ اب دیکھئے کہ ان "قرآنی ہدایات" کو ٹھکرانے والوں کو جو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں، وہ کیا ہیں۔ ٹھیک بسلی معیشت کی ذمہ داریوں سے لاپروائی برتنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے پیچھے شیطان لگا دیا جاتا ہے۔ اور وہی شیطان آدمی کے صحیح احساسات کو زیر و زبر کر کے بالآخر "معیشت ضنک" اور تلخ زندگی کا انہیں شکار بنا دیتا ہے۔ یقین کیجئے کہ یہی حال ان لوگوں پر بھی طاری ہوتا ہے اور اسی کو طاری ہونا چاہئے۔ جو قدرتی معیشت میں مبتلا ہونے

---

[1] بلکہ بغیر کسی جد و جہد کے جیسے معاشی مراتب و مدارج کے اختلافات کا قصہ حیوانات وغیرہ میں ختم شدہ ہے۔ بنی نوع انسانی میں یہ جھگڑا بغیر کسی کوشش تقریر و تحریر، تحریک و انقلاب کے ختم ہو جائے گا۔ اب میں لوگوں کو کیا کہوں، اخباروں میں روز پڑھتے ہیں، اس قسم کی خبریں روز پڑھتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ ڈاکٹر رائے نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"علی پور (کلکتہ) کی عدالتوں کا محلہ کی بار میں اس وقت نو سو پچاس وکیل وکالت کر رہے ہیں جن میں صرف ۵ فی صدی ایسے ہیں جن کی آمدنی اوسط درجہ کی ہے اور بار یسال میں وکلاء کی آمدنی کا اوسط پندرہ بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں، اور نہ معلوم کتنے وکلاء وکالت کی ڈگریاں رکھنے والے ایسے ہیں جو ایک ایک دانہ کو ترستے ہیں۔" (سچ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء)

یہ اس زمانہ کی رپورٹ بنگال ہی کی ہے۔ جب اسی علی پور اسی کلکتہ اسی بنگال میں ہی آرداس جیسے وکلاء کی اوسط آمدنی اسی وکالت کی راہ سے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ تقریباً پچاس پچاس ہزار روپے تک پہنچ جاتی تھی۔

وکالت ظاہر ہے کہ ایک آزاد پیشہ ہے اس میں محروم رکھنے اور پیچھے دھکیلنے کا الزام افسرانِ بالادست پر بھی تو نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ کھلا ہوا قسمت آزمائی کا میدان ہے۔ ہر ایک ان میں گریجوایٹ ہی ہوتے ہیں۔ وکالت، اور قانون کی سند رکھتے ہیں۔ ان قدرتی صلاحیتوں کی کمی بیشی کے سوا آمدنی کے اس عظیم تفاوت کی توجیہ اور کیا ہو سکتی ہے جو باہم فطری طور پر افرادِ انسانی میں پائی جاتی ہیں اور بالآخر ان صلاحیتوں ہی کے تفاوت کا نتیجہ معاشی فرقِ مراتب کے نتائج کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ۱۲

کے بعد ان ہدایتوں سے استفادہ نہیں کرتے۔ جس کی طرف رزق کے اس خاص حال میں راہنمائی کی گئی ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ

| | |
|---|---|
| من اعرض عن ذکری | جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً اس کیلئے ہے |
| فان له معیشة ضنکا | معیشت زندگی، ضنک اور تنگی سے بھری ہوئی |

اور :۔

| | |
|---|---|
| من یعش عن ذکر الرحمٰن | اور جو آنکھیں چُراتا ہے الرحمٰن کی یاد سے |
| نقیض له شیطانا فهو | پیچھے لگادیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو! |
| له قرین! | پس ہو جاتا ہے وہ اس کا ساتھی! |

جیسا کہ بتا چکا ہوں، دونوں میں من (جو) کا لفظ عام ہے، جیسے بسطی معیشت والوں کو حاوی ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی یہی قاعدے منطبق ہوں گے۔ جو اپنی قدری معیشت میں خدائی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر زندگی گذارتے ہیں، باقی احساسات کے بگاڑنے کا یہ سلسلہ شیطان کس طرح شروع کرتا ہے۔ جہاں تک قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے ابتداء اس کی اس کیفیت سے ہوتی ہے جسے سورۃ الفجر ہی کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی :۔

| | |
|---|---|
| واما الانسان اذاما ابتلاه | اور انسان سو جب جانچتا ہے اسکو اس کا مالک |
| ربه فقدر علیه رزقه | پس نپی تلی کر دیتا ہے اس پر اسکی روزی کو، تو |
| فیقول ربی اهانن | کہتا ہے وہ کہ میرے مالک نے مجھے رسوا اور |
| | ذلیل کر دیا۔ |

جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی قدری زندگی کے متعلق بجائے یہ خیال کرنے کے، کہ یہ بھی ابتلائی اور امتحانی زندگی ہی کی ایک شکل ہے اور جو ذمہ داریاں ایسی حالت میں آدمی کے سپرد کی گئی ہیں ان کی تکمیل کی کوشش کرے۔ وہ یہ غلط خیال اپنے اندر قائم کر لیتا ہے کہ میرے پیدا کرنیوالے نے قدری معیشت کی اس حالت میں مجھے مبتلا کر کے ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اپنی قدری زندگی کے متعلق اہانت کا یہی خیال، یقین کیجئے کہ شیطان کا وہ پہلا عمل ہے جسے مسلّط ہونے کے بعد اپنے معمولوں پر وہ شروع کر دیتا ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ عام حالات میں اگر غور کیا جائے تو غربت کی زندگی یعنی قرآن کی اصطلاح میں جس کا قدری معیشت نام ہے، یہ خیال کرنا کہ میری رُسوائی اور ذلت

کی وجہ بنی ہوئی ہے۔ واقعہ سے بہت کم تعلق رکھتا ہے۔ آخر ہم میں ہر ایک کو سوچنا چاہئے کہ اس کے سامنے ہر وقت، ہر گلی کوچہ میں لاکھوں لاکھ تعداد میں غریب مرد عورت، جو گذرتے رہتے ہیں کیا محض اس لئے کہ وہ بے چارے غریب ہیں، یعنی ان کی آمدنی، ان کی حاجت و ضرورت کے مطابق ہے۔ صرف اس لئے کون کس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں حال تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات ہی میں مستغرق رہتا ہے، دوسروں کے سوچنے کا موقع ہی کسی کو کب ملتا ہے۔ اور اگر کسی کے حال کی طرف کسی وجہ سے توجہ بھی ہوتی ہے تو جہاں تک میں جانتا ہوں کسی کی قدری معیشت کا حال سن کر لوگ عموماً رحم ہی کھاتے ہیں۔ ان کے ذلیل و خوار ہونے کا خیال بھی کسی کو نہیں گذرتا۔ آخر غربت و فلاکت کی وجہ سے آدمی کا دوسروں کی نگاہوں میں رُسوا، اور ذلیل ہونا اگر ضروری ہوتا تو آج دُنیا کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں، یا علمی حلقوں کی سربرآوردہ ہستیاں، جن میں عموماً قدری معیشت رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہے ان کی عظمت و احترام سے لوگوں کے قلوب کیوں معمور ہوتے؟

اور بعض دماغوں میں غریبوں کے متعلق اگر اس قسم کا کوئی گندہ خیال پایا بھی جاتا ہو تو خود غریبوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ کسی پاکباز، عفت مآب خاتون کو کوئی بدنظر، اور خبیث الفطرت آدمی اگر بُری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو یہ گندگی دیکھنے والے کی ہے، یا اس عفیفہ خاتون کی، جسے بُری نگاہ سے دیکھا گیا؟ سعدی کا مشہور فقرہ

"الحمد للہ کہ بہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے!"

اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ افلاس و غربت اگر کوئی مصیبت بھی ہے، تو وہ صرف مصیبت ہے، کوئی معصیت یا کردار کی خرابی تو نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی ذلیل خیال کیا جائے۔ واقعہ تو یہی ہے کہ غریب آدمی کو ذلیل خیال کرنے والا علانیہ اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے نہیں کر سکتا اور نہیں کرتا کہ اسے یقین ہے کہ میرے اس خیال کو جو بھی سنے گا، بجائے غریبوں کے مجھ کو وہ ذلیل خیال کرے گا!

پس حقیقت تو جو کچھ ہے وہ یہی ہے۔ لیکن قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے جو منحرف ہو کر زندگی گذارتے ہیں۔ دیکھا یہی جاتا ہے کہ خواہ انہیں کوئی ذلیل خیال کرے یا نہ کرے لیکن وہ چوبیس گھنٹے اسی احساس اور خیال میں گھٹتے رہتے ہیں کہ میں اولادِ آدم کا ایک ذلیل ترین فرد ہوں۔ وہ بے چارا تو یہ خیال کرتا ہے کہ میرا یہ احساس خود میری طبیعت کا احساس

ہے اور ایک واقعہ کا احساس ہے۔ لیکن اب اس مسکین کو یہ کون بتائے کہ اس پر شیطان مسلّط ہوگیا ہے اور جو واقعہ نہیں ہے، بلاوجہ واقعہ کا رنگ دے کر اس کے سامنے وہ پیش کر رہا ہے۔ اور شیطان کا سب سے بڑا کرتب یہی تسویل و تزویر ہے۔ اور بات اسی نقطہ پر کب ختم ہوتی ہے۔ عزت و دولت، بلندی و پستی کا سارا معیار جس کے سامنے صرف روپیہ رہ گیا ہو۔ ایسا آدمی اگر ہر چیز سے الگ ہو کر صرف عزت و جلال کے اسی معیارِ وحید کے عشق میں ڈوب جائے تو جس غلط خیال کا وہ شکار ہوگیا ہے۔ اس کا تو یہ ایک لازمی نتیجہ ہے۔ بسطی و قدری معیشت دونوں کو ابتلائی حالات قرار دیتے ہوئے سورۃ الفجر کی آیتوں کے بعد آخر میں دو فقرے جو پائے جاتے ہیں۔ جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ یعنی:-

| | |
|---|---|
| وتاکلون التراث اکلا لما | اور کھاتے ہو التراث کو اکل لم کے ساتھ اور |
| وتحبون المال حبًا جمًا ! | چاہتے ہو مال کو حب جم کے ساتھ ! |

میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ جیسے پہلے فقرے یعنی تاکلون التراث اکلا لما کا تعلق بسطیوں سے ہے۔ اسی طرح اگر دوسرا فقرہ یعنی وتحبون المال حبا جما (اور چاہتے ہو مال کو حب جم کے ساتھ) کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کا تعلق قدریوں سے ہے تو جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظریۂ ابتلائیت کے انکار کے بعد جیسے بسطیوں کا گروہ پانے کے بعد چاہتا ہے کہ مال دولت کے جس حصہ پر اس کا اقتدار قائم ہوگیا ہے۔ وہ اس کے اور اس کے نسلی دائرہ سے باہر نکلنے نہ پائے۔ قرآن نے جس کی تعبیر "تاکلون التراث اکلا لما" سے کی ہے۔ اسی طرح جو لوگ بسط کی اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، یعنی قدری رزق پاتے ہیں بقدر ضرورت حیات میں صرف ہو جانے کے بعد جو سرمایہ کے کسی جز کو پس انداز نہیں کر سکتے ان کا مال و دولت سے وہی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو درد فراق، غم ہجر میں مبتلا ہونے والے عاشق ہجر زدہ مسکین کو اپنے بچھڑے ہوئے معشوق سے ہوتا ہے۔ ایامِ ہجر میں عشق کا جذبہ، جیسے عاشقِ ہجور کو ہر چیز کو توڑ کر صرف ؎

بیٹھے رہیں، تصورِ جاناں کئے ہوئے

کے مشغلہ میں غرق کر دیتا ہے۔ چونکہ "حب جم" کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی ہر چیز سے الگ ہو کر کسی شے کے ساتھ لو لگانا بھی اس کے لغوی معنی ہیں۔ عربی محاورہ ہے کہ ہر طرف سے سمٹ کر جب

پانی کسی گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ جم الماریا تالاب وغیرہ کے کسی ایسے حصہ میں جو سب سے زیادہ گہرا ہوا اور اسی میں تالاب کا سارا پانی آخر میں جمع ہو جاتا ہو، تو اس کو جمۃ الماء اسی وجہ سے کہتے ہیں پس قرآن کی یہ بیان کردہ کیفیت کہ ”چاہتے ہو تم مال کو حب جم کی چاہ کے ساتھ“ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وہی کیفیت ہے جس میں عموماً قدری معیشت رکھنے والے اس وقت مبتلا ہو جاتے ہیں جب بجائے امتحان وابتلاء کے وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دار ومدار روپے ہی پر ہے۔ وہی باعزت ہے جو روپیہ والا ہے اور بے عزت وہی ہے جو روپے سے خالی ہو۔ مشہور فارسی شعر ؎

خوک باش وخرس باش ویا سگِ مردار باش
ہرچہ باشی باش، لیکن اند کے زردار باش

کی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم اور ملک پر مسلط ہو جاتی ہے تو ”اند کے زردار باش“ کے مشورہ کی تعمیل کا موقعہ جن لوگوں کو نہیں ملتا۔ قدرتی طور پر ہر چیز سے الگ ہو کر اسی ”زرداریاشی“ کو وہ اپنے وجود کا آخری نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ٹھیک آج موجودہ مغربی تمدن نے جس حال کو دُنیا میں پیدا کیا ہے۔ ایسا حال کہ شاید تاریخ میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ ”عشقِ مال وسرمایہ“ اگرچہ کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ قدری معیشت کو جس زمانہ میں بھی محسوس کرنے والوں نے اپنی اہانت کا ذریعہ محسوس کیا ہے۔ قدرتاً اس عشق کی آگ ان کو اپنے قلوب میں سلگانی اور بھڑکانی ہی پڑی ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں دل کی اس کیفیت کے اظہار کی عموماً لوگوں کو جرات نہیں ہوتی تھی۔ یا ہوتی بھی تھی، تو کچھ چھپے دبے الفاظ میں ہوتی تھی۔ آدمی صرف مال اندوزی، یا زر آفرینی کا آلہ ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یا دوسری لفظوں میں اسی کی تعبیر آج کرنے والے ان الفاظ میں جو کر رہے ہیں کہ آدمی صرف پیٹ ہے، یا فقط وہ روٹی ہے۔ پیٹ ہی کے لئے وہ جیتا ہے اور پیٹ ہی کے لئے مرتا ہے۔ روٹی ہی کے لئے قدرت نے انسانی نسل کو پیدا کیا ہے۔ اسی کا حاصل کرنا اور اسی کو حاصل کرتے ہوئے اپنی آخری سانس پوری کرنی۔ یہی فقط یہی اس کے وجود کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔

جن بلند آہنگیوں کے ساتھ بغیر کسی شرم وحیا کے آج یہ سب کچھ بہ بانگِ دہل نہیں بہ بانگ ریڈیو یا میکروفون جو کیا جا رہا ہے۔ تقریروں میں، تحریروں میں چیخنے والے صرف ان ہی آوازوں کے ساتھ جو چیخ رہے ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر جو چلا رہے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ کا

کوئی محدث، کسی قوم، کسی ملک کے کسی دور کا مؤرخ کیا بتا سکتا ہے کہ زمین کے کرہ پر بنی آدم کے گھرانوں میں اتنی ڈھٹائیوں اور انتہائی بے حیائیوں کے ساتھ کانوں کو کبھی پہلے بھی سُنانے والوں نے یہ سنایا تھا، یا زبانوں پر اس قسم کے الفاظ آئے تھے۔ شاید یہ قرآنی الفاظ ؎۔

تحبون المال حبًا جمًا ؛ اور چاہتے ہو مال کو تم جی جم کے ساتھ

کی علانیہ تفسیر ہے۔ اسی لئے ان حالات میں جو کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی تھی، زبانوں سے بھی اس کا اقرار کرا دیا گیا۔ اور اس طور پر اقرار کرایا گیا۔ کہ آج ان الفاظ کے انکار کرنے والوں کو ہی ملعون ٹھہرایا جا رہا ہے۔ وہی دُردرائے اور دھتکارے جا رہے ہیں، جو انسان جیسی بلند ہستی کو اتنا پست قرار دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔

بہرحال انسانیت کی بلندی و پستی کا یہ قصہ بجائے خود ایک الگ قصہ ہے، جو خوک (سور) خرس (ریچھ)، یا سگ مردار بنا کر نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کو انہی چرندوں، یا درندوں کے مقام تک اتارنے کی کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے یہ بحث نہیں ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت جو کچھ بھی ہے وہ صرف یہی ہے کہ قرآن کے نظریۂ ابتلار کا انکار کیجئے یا خدا کی ذمہ داریوں سے انکار کیجئے۔ اس انکار کے بعد انسانی احساسات میں قدری معیشت کے متعلق جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن کی روشنی میں اسے ان لوگوں کے آگے رکھ دوں، جو قرآن کو سمجھنا اور سمجھ کر اسی کی روشنی میں چلنا چاہتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ پہلی افتاد انسانی فہم پر اس سلسلہ میں جو پڑتی ہے وہ یہ ہے، کہ قدری معیشت کو لوگ اپنی اہانت و ذلت کا ذریعہ یقین کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد قدرتاً خواری و ذلت کی اس حالت سے نکلنے کے لئے مال اور سرمایہ کے اس حب شدید یا عشق مفرط کی آگ اپنے اندر بھڑکا لیتے ہیں۔ جس کی تعبیر قرآن نے "حب جم" سے کی ہے۔ گویا بسطی معیشت والے جیسے نظریۂ ابتلائیت کے انکار کے بعد سرمایہ کے متعلق "اکل لم" میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدری معیشت والوں کو مال کے حب جم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی قرآن سے بھی سمجھا جاتا ہے اور واقعات بھی اسی کی توثیق و تائید کر رہے ہیں۔ لیکن بات کیا اسی منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے؟ اگر ختم بھی ہو جاتی، تو جنہیں اپنی انسانیت اور اس کی قدرتی بلندیوں پر ناز ہے۔ ان کا ایک معمولی ذہنی انقلاب کے ہاتھوں اتنا نیچے گر جانا، یا گرانے والے کا ان کو اتنا نیچے گرا دینا درحقیقت کچھ کم سزا نہ تھی، لیکن کہنے والے کہہ سکتے تھے، بلکہ کہہ

رہے ہیں کہ اپنی بلندی و برتری کا یہ خیال انسانوں کا خود ساختہ ایک وہمی خیال ہے۔ زمین پر چرنے والے سوروں، جنگلوں میں گھوم گھوم کر شکار کرتے والے ریچھوں، گلیوں اور کوچوں میں دربدر مارے پھرنے والے کتوں سے آخر آدم کے بچوں کو بلند و بالا کیوں خیال کیا جائے۔ کیوں سمجھا جائے کہ کھانا پینا، مرجانا اس حیوانی نصب العین سے زیادہ انسانی وجود اپنے ساتھ کوئی اور اونچا نصب العین بھی رکھتا ہے؟ جیسا کہ قاعدہ ہے کہ قرآنی حجۃ ہمیشہ "بالغہ" یعنی آخری دروازے تک پہنچانے والی حجت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی کم از کم میرے نزدیک یہی طرزِ عمل اس نے اختیار کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ "مال کے حب جم" اور سرمایہ کا "عشقِ مفرط" جب ان طبقات پر مسلط ہو جاتا ہے جنہیں قدرتی پیمانے پر یہاں روزی مل رہی ہے، تو پھر ؎

اے عشق مجھے لے چل، اے عشق کہیں لے چل

کے دوروں سے ان بے چاروں کو کون بچا سکتا ہے؟ جو اپنے آخری محبوب کے وصال کی تمناؤں میں تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں۔ قدرتی معیشت کی دشواریوں کو آسان بنانے کے وہ سارے ذرائع جن کی مذاہب نے تعلیم دی ہے۔ عشق کی اس آگ میں جل بھن کر بھسم ہو جاتے ہیں اور وہی پرانا معاشی سپوڑا

ان نفعل فی اموالنا ما نشاء — اپنے اموال اور سرمایوں کو جو ہم چاہیں کریں

کا دماغوں میں نمودار ہوتا ہے، صلوات کہیے یا مذہب و دین ایمان و دھرم کا "معاشی جدوجہد" کی راہوں سے رشتہ توڑ دیا جاتا ہے۔ مد کا قانون، عقد و الاحکم، صبر و توکل، دعا، النظر الی الادنیٰ، ترک مالا یعنی، الغرض وہ ساری ذمہ داریاں جو قدرتی معیشت میں الرحمن کی طرف سے عائد کی گئی ہیں، وہ بھلا دی جاتی ہیں۔ اپنے عشقی مطالبات کی تکمیل میں بے روک ٹوک لوگ مشغول ہو جاتے ہیں۔ بے آئینی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹ پڑے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، معاشی مسائل کے متعلق حضرت شعیب علیہ السلام کی تمثیلی قوم جس نے اپنے اندر مال کے اسی حب جم کو پیدا کیا تھا، اسی قوم کو خطاب کر کے اللہ کے منادی حضرت شعیب علیہ السلام کے جو اس قسم کے الفاظ قرآن میں محفوظ کئے گئے ہیں۔

ولا تقعدوا بکل صراط توعدون۔ — اور بیٹھتے ہو تم ہر راہ پر دھمکاتے ہو لوگوں کو!

یا فرماتے ؛۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ اور نہ بگاڑ پیدا کرو زمین میں اس کی سدھار کے بعد۔

"تعمیری مواعظ" کے ان فقرات کی تفسیر اگر کوئی پڑھنا چاہے تو ان ممالک میں جا کر پڑھ سکتا ہے۔ جو کہنے کی حد تک تو سب سے بڑے آئینی ممالک ہیں۔ بلکہ آج تو دنیا کی "آئین گری" اور "آئین سازی" کا کام وہی کر رہے ہیں اور انسانی اخلاق کی تصحیح کا وہ بے خطا نسخہ جس کے متعلق یاد پڑتا ہے کہ جاہل ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے سرونستائن چرچل نے لکھا تھا ؛۔

"میکالے جیسے مدبر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم چونکہ بدامنی اور قانون شکنی کا بہترین اور یقینی علاج ہے۔ اس لئے انگریزی گورنمنٹ کے لئے قطعی ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کے ذہنی خلاصی کی کوشش کرے۔"

بدامنی اور قانون شکنی کا یہی بہترین اور یقینی علاج تعلیم سے بھی جن ممالک کے کوچہ و برزن پٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اور تو اور آئینیت اور تعلیمیت کے سب سے بڑے مرکز امریکہ میں تمدنی معیشت رکھنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، ہر راہ پر بیٹھ کر "مال کے حب جم" کے تقاضوں کی تکمیل میں جن جن ہتھکنڈوں سے وہ کام لے رہے ہیں۔ کس دن کے اخبارات میں اس کی خبریں نہیں چھپتی ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اسے تو جانے دیجئے۔ جب امن کے دن تھے، عافیت کا دور دورہ تھا۔ اخبار "پائنیر" نے صرف امریکہ کے متعلق لکھا تھا کہ ؛۔

"امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے ہیں، پانچ لاکھ کے قریب چوریوں کی تعداد ہے" (پائنیر۔ الہ آباد۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۰ء)

یہ ۱۹۳۰ء کی رپورٹ ہے۔ اس کے بعد

"۱۹۳۱ء میں دیکر شم کمیشن نے جو رپورٹ امریکہ کے متعلق حکومت کے آگے پیش کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ چوریوں، نقب زنیوں جعلسازیوں، غبن وغیرہ جرائم کی تحقیقات کے سلسلہ میں حکومت پونے تین ارب روپے خرچ کرتی ہے" (سچ ۲ر اکتوبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ تو خیر ایک ملک کا حال ہے۔ اسی اخبار "سچ" میں ملک نہیں، صرف ایک شہر الموسوم بہ لندن کے متعلق یہ روئداد شائع ہوئی تھی ؛۔

"کھلے بندوں اس شہر (لندن) میں جو ڈاکے پڑے ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد ساٹھ اور ۱۹۳۰ء میں ستتر (۷۷) تھی۔ اور ۱۹۲۹ء میں نقب زنی کے ذریعے سے دو ہزار پنتالیس اور ۱۹۳۰ء میں اسی طریقہ کو کام میں لاکر دو ہزار آٹھ سو پینسٹھ آدمیوں نے چوری کی۔ راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر جن لوگوں نے شہر لندن میں روپے وصول کئے ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد بیس اور ۱۹۳۰ء ۴۳ تھی" (سچ۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ وہ واقعات ہیں جن کا سراغ پولیس نے لگا لیا۔ ورنہ پولیس کے دائرہ اطلاع سے باہر جو حوادث اس سلسلہ میں پیش آئے ہوں گے۔ ان کو اسی پر قیاس کیجئے اور سچ تو یہ ہے کہ جس تمدن اور تہذیب نے مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں تک کو اتنا جری بنا دیا ہو، جیسا کہ امریکہ کے ایک اخبار" ایوننگ گریفک" نے لکھا تھا۔

"سارے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک تعلیم یافتہ حسین لڑکیوں نے قزاقی اور راہزنی کا پیشہ شروع کر دیا ہے۔ روز روشن میں یہ حسین ڈاکو ریوالور، بندوق سے مسلح ہو کر موٹروں پر بیٹھ کر بنکوں کو لوٹنے لگی ہیں"

(اخبار" سچ" ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء)

بہرحال قرآنی آیت

وتقعدون بکل صراط توعدون — اور بیٹھتے ہو، ہر راہ پر دھمکاتے ہو!

کی تفسیر جن نت نئی بلکہ بعض ناقابلِ تصوّر شکلوں میں آج دنیا کے ان ممالک میں ہو رہی ہے۔ جہاں کے قدری معیشت رکھنے والوں میں" مال کا حبّ جم" خود ان ہی کے راہنماؤں اور حرص و طمع، زر طلبی کے اپدیشکوں نے پیدا کر دیا تھا۔ انہیں کون گن سکتا ہے معصوم بچوں کو اڑا اڑا کر لے بھاگنا اور ان کی ماؤں اور باپوں سے یہ دھمکی دے کر بڑی بڑی رقمیں طلب کرنا کہ اگر روپیہ نہ دیا جائیگا تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر جن بدقسمت ماں باپوں نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ بجائے زندہ بچے کے اپنی آنکھوں سے بچے کی سر کٹی لاش انہیں دیکھنی پڑی۔ آئے دن جہاں یہ واقعات شہروں اور قصبوں کے لئے اب نہیں رہے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے پائیگاہی امیر نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے اپنے سفرنامہ امریکہ ویورپ میں لکھا ہے کہ چکاگو کے میئر بلدیہ نے خصوصیت کے ساتھ بلا کر ان پر یہ اصرار کیا کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے چاہئے کہ کسی خفیہ آدمی کو مقرر کر لیں

ورنہ امریکہ کے ڈاکوؤں سے ممکن ہے کہ ان کو گزند پہنچ جائے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے سیاحوں کے لئے ایسا کرنا اپنی جان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین و قانون کی تعلیم رکھنے والے اس ملک کی کیا حالت ہو چکی ہے۔ سالانہ اربوں کی رقم خرچ کرنے کے باوجود اس ملک کی حکومت لوگوں کی جان و مال کی حفاظت سے معذور ہو چکی ہے۔ اور تعلیم، جسے آئین شکنی کے انسداد کا یقینی نسخہ باور کرایا گیا تھا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اور خبروں سے معلوم ہوتا ہے۔ رہی تعلیم بد امنی اور قانون شکنی میں امداد پہنچا رہی ہے۔ ناولوں، افسانوں کے ذریعہ لوگ نت نئے جرائم کی تدبیروں کے نقشے پیش کر رہے ہیں۔ سینماؤں اور متحرک تصاویر کی راہ سے ان ہی جرائم کو کر کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اور جو باتیں سوچی بھی نہیں جا سکتیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ آدمی چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے۔ فریب دہی کے سائنٹفک طریقوں کا رواج اس ملک میں بڑھ رہا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جن ملکوں کے اہلِ قلم اربابِ تصنیف و تالیف تک کے متعلق ایسی باتیں سنی جاتی ہوں۔ اگرچہ واقعہ تو جزئی ہے۔ لیکن جزئیات ہی سے کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے لندن کے اخبار "نیوز آف ورلڈ" میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ چارلس گارڈن نامی ایک صاحب جن کا شمار انگلستان کے ممتاز مصنفین میں ہے۔ متعدد مقبولِ عام کتابوں کے مؤلف ہیں، اپنی کتابوں سے ہزارہا روپے دو تین سال کے عرصہ میں انہوں نے اکٹھا کر لیا تھا۔ ان ہی مصنف صاحب کے متعلق یہ واقعہ چھپا تھا۔ کہ ایک دن جب سڑک پر سناٹا تھا۔ انگلستان کا یہ مصنف تعلیم یافتہ گھر سے باہر نکلا۔ قسمت کی ماری میم صاحبہ سڑک سے گذر رہی تھیں۔ گلے میں ان کے ایک ہار پڑا ہوا تھا۔ جس کی قیمت پندرہ سولہ ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ اس قیمتی ہار والی میم صاحبہ کو تنہا پا کر جناب مصنف صاحب نے ہار پر ایک جھپٹا مارا۔ غریب عورت کیا کر سکتی تھی، وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور ہار کو گلے سے اتار، مصنف صاحب یہ جا وہ جا۔ گلیوں میں غائب ہو گئے۔ لیکن میم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ "چور، چور! اچکا، اچکا!!" کہتے ہوئے وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگی۔ سامنے راہ گیر چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اس تعلیم یافتہ مصنف چور کو پکڑ لیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی چور گرفتار ہو گیا۔ اچک کر لے بھاگنے کے جرم میں ڈیڑھ سال کی سزا اس چور مصنف کو بھگتنی پڑی

(ماخوذ از "سچ" بحوالہ نیوز آف ورلڈ۔ دسمبر ۱۹۳۱ء)

بدقسمتی سے یہ چور مصنف صاحب پکڑے گئے۔ اس لئے بات کھل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانتا ہے کہ مال

کے حبّ جرم کے عاشقوں سے بھرے ہوئے اس ملک میں آئین شکنی کا لے خطا اور یقینی علاج کن کن نتائج کو پیدا کر رہا ہے۔

اور یہ حال تو ان کا ہے جن میں جرائم کی ان راہوں پر بیٹھنے اور قسمت آزمائی کی ہمت پائی جاتی ہے۔ لیکن قدری معیشت رکھنے والوں میں ناکام عاشقوں کا وہ گروہ، جو کرنا تو سب کچھ چاہتا ہے، لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ اس کے درد کا افسانہ کون سن سکتا ہے۔ کہتے ہیں، اور کہتے کیا ہیں خود قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ محض معاشی دشواریوں پر غالب آنے، اور مال کے محبّ جرم کے جذبہ کی تسکین کے لئے وہاں کے باشندے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی ذبح کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے[1]۔ قرآن کو اس رواج بد کے انسداد کے لئے ایک سے زائد مقام پر

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔ | اور نہ گردن ارد اپنی اولاد کی، افلاس کے اندیشے سے!

کا حکم نافذ کرنا پڑا۔ اور جہاں تک عرب کی تاریخ کا تعلق ہے۔ قرآنی حکم کے بعد سنگدلی اور قساوتِ قلبی کے اس جانگداز فعل کو اس ملک میں اب تک تو دہرایا نہیں گیا ہے۔ لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا۔ آج تعلیم یافتہ یورپ و امریکہ میں پیدا ہونے کے بعد نہ سہی پیدا ہونے سے پیشتر ہی بچوں کے گلے ماؤں کے پیٹ ہی میں برتھ کنٹرول وغیرہ کی مختلف تدبیروں

---

[1] عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ جاہلیت میں عرب والے صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور اس لئے کر دیتے تھے کہ اپنی لڑکی کو کسی اجنبی مرد کی جورو بننے پر ان کی غیرت اور جاہلی حمیت آمادہ نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم اسی وجہ سے روا رکھا گیا ہو۔ گو اس کا کوئی تاریخی ثبوت اب تک مجھے نہیں ملا ہے۔ لیکن لڑکیوں کے سوا لڑکوں یا عام اولاد، لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ان کے قتل کے جاہلی دستور کا ذکر تو خود قرآن میں ایک سے زائد جگہ پر کیا گیا ہے۔ جہاں اس کا ذکر ہے وہیں قتلِ اولاد میں اس سفاکانہ رسم کی وجہ بھی اور صرف وہی بیان کی گئی ہے۔ جیسے آج برتھ کنٹرول کے جواز بلکہ وجوب کے سلسلہ میں عموماً پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی معاشی دشواریوں کے حل کا ایک ذریعہ قتلِ اولاد عرب کے جاہل اسی طریقہ سے قرار دیئے ہوئے تھے۔ جیسے آج ضبطِ تولید کے رسم کو بھی دشواریوں کی اسی قسم کے حل کا ذریعہ ٹھہرایا جا رہا ہے۔ پڑھئے قرآن میں پڑھئے، قتلِ اولاد کی ممانعت کا جہاں بھی ذکر ہے وہاں اسی کے ساتھ من خشیة املاق (افلاس کے اندیشہ) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۱۲

سے جوگھونٹے جا رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ دوسروں سے چھیننے کی ہمت جو اپنے اندر نہیں رکھتے "مالی حب جم" کے ان عاشقوں نے اپنے قدری سرمایہ کو بچانے کی یہ تدبیر پیدا کی ہے کہ قدری معیشت کی پریشانیوں میں، جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے، اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

اور قصہ کیا یہیں ختم ہو جاتا ہے! آج نہیں، کہ آج تو دشمن کشی" کے مشاغل میں یہ ممالک مشغول ہیں۔ لیکن ان ہی دنوں میں جب تک "دشمن کشی" کا یہ قصہ نہیں چھڑا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ "قدری معیشت" ہی کے متعلق ان ممالک کے باشندوں کے غلط احساسات نے ان کیلئے "اولاد کشی" ہی نہیں کہ "اولاد" پھر بھی غیر ہی ہوتی ہے، بلکہ "خودکشی" کے فعل کو بھی ان کا ایک محبوب فعل بنا دیا تھا۔ ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کن سے پوشیدہ ہیں کہ بعض علاقوں میں خودکشی" کو آسان بنانے کے لئے باضابطہ انجمنیں اور کلب قائم تھے۔ رسالے نکلتے تھے جن میں لوگوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ بہ سہولت تمام اپنی زندگی کے قصہ کو وہ کس طرح ختم کر سکتے ہیں۔ پولینڈ، آسٹریا وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں سب سے آگے تھا۔

۷ مارچ ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں سنڈے ایکسپرس اخبار میں بریگیڈ ہیری گارڈن کا ایک بیان "خودکشی کے واردات" کے متعلق شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ:۔

"ان کی رائے میں خودکشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں۔" (دیج ۱۱ اپریل ۱۹۲۷ء)

چونکہ ہیری گارڈن کے مطالعہ کا خاص مضمون خودکشی کے واردات ہی تھے۔ اس لئے ان کے بیان کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس بیان میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ

"ہر ہفتہ اوسطاً آٹھ آدمی زبانی یا تحریراً مجھے اپنے ارادۂ خودکشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جو خودکشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے۔ ان کی تعداد انگلستان میں ہر سال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔" (اخبار مذکور)

دیکھا آپ نے نظریۂ ابتلائیت کا انکار، قدری معیشت میں بھی بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے

---

لہ اس کا خیال کتاب پڑھنے والوں کو رکھنا چاہئے کہ کتاب جس وقت لکھی جا رہی تھی اس وقت یورپ دوسری جنگ عظیم میں مبتلا تھا

کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی قدری زندگی کا رشتہ جب خدا سے توڑا، تو اس رشتے کے توڑنے کے جو لازمی نتائج ہیں، ان سے اپنے آپ کو وہ کیسے بچا سکتے تھے۔ یہی لوگ ہیں، جن کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| ومن یظن ان لن ینصرہ | اور جو خیال کرتا ہے کہ نہیں مدد کرے گا |
| اللہ فی الدنیا والاخرۃ | اللہ اس کی دنیا میں اور آخرت میں، تو تانے |
| فلیمدد بسبب الی السماء | وہ ڈوری کسی بلندی میں، پھر پھانسی لگا کر |
| ثم لیقطع فلینظر ھل | اس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ یہ اس چال پر |
| یذھبن کیدہ ما یغیظ؟ | کیا اپنے دل کے غم و غصہ کا ازالہ کر پایا؟ |

اس موقعہ پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شاید اس قرآنی اشارے کے سمجھنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مولینا عبد الماجد دریا آبادی نے ایک "مغربی خاتون" جس کا نام مسز کینتس تھا۔ اسی کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ

> "یہ ایک حسین عورت تھی۔ ۲۹ سال کی جوان عمر، شوہر موجود تھا۔ اولاد بھی ہو چکی تھی، موجود تھی۔ شادی پر صرف پانچ سال گذرے تھے۔"

مولینا کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی اور عنفوانِ شباب کے زمانہ میں "فلم اسٹار" بننے کا موقعہ بھی مل چکا تھا۔ لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک کی ہو رہنے کا اُس نے فیصلہ کیا تھا۔ اب اسباب کیا تھے؟ لیکن جیسا کہ دستور ہے۔ رزق جس پیمانہ پر اس کے لئے مقدر ہُوا تھا وہ قدر کا پیمانہ تھا۔ سینمائی زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد قدری معیشت کا یہ حال اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن گیا۔ جس تمدن و تہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خدا اور اسکی نصرتوں سے مایوس تمدن اور مایوس تہذیب تھی۔ ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا۔ اُسی کو پیش کرنا میرا مقصود ہے۔ اس کی خود نوشتہ تحریر کا ترجمہ ہے ؎

> "میں مالی مشکلات سے، جن کا کوئی حل نہیں، مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں، میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری، اور میری بچی کی گذر ہو سکے۔ شوہر سے میرا افتراق ہو چکا ہے۔ میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے۔ میرے دوست و احباب

ایسے موجود ہیں، جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں۔ لیکن اس
کے بعد اُن کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی"

اس تحریری فیصلہ کے بعد الٰہی اعانتوں اور خدائی نصرتوں سے اس مایوس تمدن میں پیدا ہونیوالی اس عورت نے کیسی عجیب بات ہے کہ جس کا قرآن میں اشارہ کیا گیا تھا۔ یعنی "فلیمدد بسبب الی السماء" (چاہئے کہ چھت میں رسی لٹکائے)، "ثم لیقطع" (پھر اسے کاٹ دے) گویا اسی حکم کی تعمیل اور تجربہ کی راہ بتاتے ہوئے اپنا اور اپنی بچی کا اس نے خاتمہ کر دیا۔ لیکن جیسا کہ قرآن میں پوچھا گیا ہے :-

فلینظر ھل یذھبن کیدہ | پھر دیکھے کہ کیا اس چال نے بھی اس کے
ما یغیظ ؟ | دل کے غم و غصہ کا ازالہ کیا ؟

اس کے دل میں بھی اس کا خیال آیا۔ مردہ ضمیروں میں زندگی کے بعض جراثیم موجود ہوتے ہیں، خصوصاً موت کے وقت کسی نہ کسی حد تک ان زندہ جراثیم کی حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی احساس کو دبانے کے لئے اس عورت نے یہ بھی لکھا تھا :-

"میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کئے دیتی ہوں۔ اس لئے بھی
ختم کرتی ہوں کہ اگر وہ حسین نہ نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین
نہیں ہے تو کوئی اُسے پوچھے گا بھی نہیں۔ میں ہی اس بچی کو
وجود میں لائی تھی اور میں ہی اس کو ختم بھی کر دیتی ہوں"

جو خیالات اس کے دل میں امڈ رہے تھے۔ "معاذیرہ" کے ان ہی پردوں کو ان پر ڈال رہی تھی[1] آخر میں اس نے یہ بھی لکھا تھا :-

"مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اور اپنی بچی کی جان لینے میں حق بجانب
ہوں۔ اخباروں میں چھپتا رہتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں
کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ خیر اس زیادتی سے بقدر دو عورتوں
کے تو کمی ہو ہی جائے گی !"

---

[1] اشارہ قرآن کی مشہور آیت کی طرف ہے یعنی بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ (بلکہ آدمی اپنے آپ کا دیکھنے والا ہے۔ خواہ اس پر عذروں کے پردے ہی کیوں نہ اڑھاتا چلا جائے"

لیکن ظاہر ہے کہ دم نکلنے کے بعد اس کی یہ ساری چالیں اور اس کا کید قطعاً اس کے لئے نفع بخش نہ ہوا، نہ ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ موت سے پہلے کی زندگی جو الرحمٰن کے ذکر سے الگ ہو کر گذر رہی تھی، اس کے متعلق اس نے لکھا تھا۔

"میں نے زندگی کو اپنے حق میں ایک مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہ گذرا، میں نے مُردوں کو درندہ پایا۔ کوئی مرد اپنی غرض کے بغیر مجھے پوچھتا بھی نہیں۔ اس لئے اس بچی کو میں اس مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔"

| | |
|---|---|
| من اعراض عن ذکری | اور جو کترایا میری یاد سے اس کیلئے ہی |
| فان له معیشة ضنکا ! | معیشت ضیق اور تنگیوں سے بھری ہوئی۔ |

حقیقت تو یہی ہے کہ بجائے ابتلاء و امتحان کے موجودہ زندگی اور اسی کی راحتوں اور نعمتوں کو اول و آخر مان کر خدائی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر جو جیتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ بھی جیتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ ہر وقت موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایک جوان اور حسین عورت کو جوانی اور بہار کے دن جس نے ہر قسم کی قیود سے آزاد ہو کر گذارے۔ سینما کے افق پر ستارہ بن بن کر چمکتی رہی۔ لیکن وہی اقرار کرتی ہے کہ

"میں نے زندگی کو اپنے حق میں مصیبت پایا۔ میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہیں گذرا۔"

"کوئی حصہ" کا لفظ قابلِ غور ہے۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ کسبی اور قدری معیشت کے دونوں حالات میں معیشت ضنک اور تلخ زندگی ہی وہ گذارتی رہی۔ یہی اس کا اعتراف ہے اور اس کی زندگی کے دونوں کے تجربہ کا یہ آخری نتیجہ ہے۔ آخر دلوں کو دنیاوی دولت و ثروت کے ساتھ جب اس طرح جوڑ دیا جائے کہ وہی سب کچھ بن کر رہ جائے، نہ ہونے کی صورت میں ہونے کے ولولے اور جذبات اور نہ ہونے کی صورت میں زوالِ نعمت کے اندیشے اور خطرات اس قسم کے نفوس کے لئے جس طرح سوہانِ رُوح بنے رہتے ہیں۔ ان کا اندازہ بہ نسبت دُوسروں کے خود ان ہی کو زیادہ ہو سکتا ہے۔ اخبار "سچ" ہی میں ایک دفعہ دنیا کے سب سے بڑے ہنسوڑ خود ہنسنے اور دُوسروں کو ہنسانے والے نقال چارلی چپلن کے متعلق یہ خبر امریکن ڈیویژن اخبارات کے حوالے سے چھپی تھی۔ مولینا عبدالماجد صاحب نے لکھا تھا۔

"پچھلے دنوں انگلستان و امریکہ کے جتنے اخبار موصول ہوئے، سب میں غم کا یہ افسانہ موجود تھا۔ یعنی چارلی چیپلن کی لیڈی صاحبہ مسز چیپلن نے اپنے شوہرِ نامدار پر دعویٰ دائر کر دیا۔ جو ہر طرح کے ناگفتہ الزامات پر شامل ہے۔ اور جس کی بنا پر چارلی چیپلن کی برسوں کی کمائی۔ لکھوکھا روپیہ کی جائداد خطرے میں ہے۔"

مولانا نے اس کے بعد جو بات لکھی تھی، وہ ہی مستحق ہے کہ ذرا دیدۂ عبرت و بصیرت سے اسے پڑھا جائے۔ لکھا تھا:۔

"ان راویوں کے بیان کے بموجب اب چارلی کے جسم پر پُر تکلف لباس کی جگہ چیتھڑے لگے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، صورت پر دحشت برسنے لگی ہے۔ پیرانہ سالی کے آثار اس پر طاری ہو گئے۔ صورت اتنی بدل گئی کہ پہچاننا دُشوار ہے۔"

آخر میں "نیوز آف دی ورلڈ" لندن کے حوالے سے مولانا نے نقل کیا تھا۔

"کل جو دُنیا کا زندہ ترین دل تھا، وہ آج دنیا کا مُردہ ترین شخص ہے۔" (سچ ۱۴ر مارچ ۱۹۲۷ء)

اللہ اللہ جو اپنے چہرے اور اس کی کیفیات کو دل کے حالات سے جدا رکھنے کی عمر بھر مشق کرتا رہا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مال کے حبِ جم" اور سرمایہ کے "عشقِ مفرط" نے ان کو کتنا متاثر کیا تھا؟ کہ مصنوعی حالات کے طاری کرنے کی بھی ساری مہارت غائب ہو گئی۔ اور جو آگ اس کے دل میں بھری ہوئی تھی اسی کے شعلوں نے چہرے کی ساری مصنوعی بشاشتوں کو جلا کر خاک سیاہ بنا دیا۔ اور یہ قدری معیشت میں مبتلا ہو جانے کے خطرے، صرف خطرے کے احساس کا اثر تھا۔ پھر اسی سے اندازہ کیجئے ان مسکینوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا، جو واقعی ان ممالک میں قدری زندگی گذار رہے ہیں۔ اور گذارنے پر مجبور ہیں۔ نظریۂ ابتلائیت کا انکار کر کے ان کے مفکرین اور راہنماؤں نے جن ذہنی اور فکری انگاروں، دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ معاذ اللہ اس کی سوزش و تپش کا کوئی ٹھکانہ ہو سکتا ہے؟

باہر کی دوزخ کا انکار یقین کیجئے کہ ایسوں کے لئے خود ان کے اندر دوزخ بن کر بھڑک اٹھتا ہے۔ بنانے والے نے آدمی کی فطرت یوں ہی بنائی ہے۔ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ بنائی ہے

قدری معیشت کا وہ حال، جس میں انسان کا خدا اور خدا کی مشیت خدائی رحمت و نصرت سے رشتہ توڑ دیا گیا ہو۔ قدری زندگی کو بزور کسبی زندگی سے بدل دینے کا سارا اقتدار و اختیار جہاں خود انسان ہی کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ وہی جس کی تعبیر اس زمانے میں یہ کی جاتی ہے کہ اپنی تقدیر کا معمار ہر شخص بذاتِ خود ہے۔ کامرانوں کو تو اس وقت جانے دیجئے میں ذکر ان لوگوں کا کر رہا ہوں جو یہ سب کچھ سیکھ کر، سکھا کر پھر بھی اپنی تقدیر کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں۔ اور حالات ان کو ناکام رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہی جن کے قلبی انگاروں اور باطنی جہنم کو ٹھنڈی کرنے کے لئے آج اشتراکیت کا جھنڈا اڑایا گیا ہے، سرمایہ داری اور سرمایہ بیزاری کی اس کش مکش کا انجام کیا ہوگا ابھی تو وہ سامنے نہیں ہے۔ لیکن سوال ان سے ہے جو اس وقت جل رہے ہیں۔ اور ان سے پہلے جل جل کر جن بے چاروں نے اپنی قدری زندگیوں کو دوزخ بنا بنا کر گذارا ہے۔ ان کے ساتھ یقیناً یہی کیا گیا کہ دماغ سے دوزخ کا خیال نکال کر ان کے دلوں میں دوزخ بھر دی گئی۔ اس وقت تک بھری ہوئی ہے۔

حالانکہ میں سچ کہتا ہوں، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہی قدری معیشت جو انسانیت کیلئے آج جہنم بنی ہوئی ہے۔ ابتلائی نظریہ کی راہ نمائی میں اسی زندگی کو جنہوں نے گذارا ہے اور آج بھی خدا کے فضل سے ایک بڑی تعداد زمین کے اس کرہ پر اسی زندگی کو گذار رہی ہے۔ بخوشی و سکون گذار رہی ہے۔ اگر اپنی زندگی کو وہ جنت کی زندگی نہیں بنا سکے ہیں تو اتنی بات یقینی ہے کہ اس جہنم میں بھی انہیں جلنا نہیں پڑا ہے۔ جس میں جہنم کے انکار کرنے والوں کو آج جلتے بھنتے، کڑھتے اور کراہتے، دانت پیستے دیکھا جا رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو جس جنت کو آج خیال اور صرف خیال ٹھہرایا جا رہا ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس جنت کے خیال نے بھی ان بہتوں کی زندگی کو جنت بنا دیا ہے۔ انسانی آبادیوں میں آج بھی ڈھونڈھا جائے تو گو ان کی تعداد گھٹ چکی ہے اور گھٹائی چلی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو ایسے افراد ان ہی انسانوں میں مل جائیں گے، جن کی زندگی کو جنت کے اسی خیال، ہاں صرف خیال نے جنت بنا رکھا ہے۔ دوسروں کو اختیار ہے خواہ وہ کچھ ہی سمجھیں۔ لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں، اور ان لوگوں کو جب کبھی دیکھا ہے تو ہمیشہ یہی اثر دل میں پیدا ہوا ہے کہ جس کا خیال بھی جنتی زندگی بنانے کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے اسی جنت کی واقعی حقیقت اپنے اندر مسرت و نشاط کے کن سمندروں کو سمیٹے گی؟

لوگوں نے سمجھا نہیں، ورنہ وہی الدین یا مذہب کا، اور جس کے نتائج کا براہِ راست

تعلق الآخرۃ سے سمجھا جاتا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ مذہب اور مذہبی کاروبار کے نتائج کا حقیقی تعلق ہے۔ بھی آخرت ہی کے ساتھ، لیکن اصلاً نہ سہی، ذیلی طور پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دُنیا کی زندگی میں بھی دین یقیناً انقلاب پیدا کرتا ہے، یہ دیکھا جا رہا ہے۔ انقلاب، اور کیسا انقلاب! تجربہ شاہد ہے کہ دین کی دوزخ کا خوف، جس حد تک جس کی زندگی پر مسلط ہوتا چلا گیا ہے۔ اسی حد تک دُنیا کی دوزخوں کا دُکھ بھی اس کے لئے سُکھ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کا یہ فقرہ:۔

من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا!

اے پروردگار! اضافہ فرمائیے میرے یقین کی قوت میں، جس کے ذریعہ سے دُنیا کی مصیبتیں ہلکی پڑتی چلی جاتی ہیں!

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی مطلب ہے اور بجنسہٖ یہی حال دین کی جنت کا بھی ہے کہ جس کا جتنا زیادہ اعتماد دین کی اس جنت پر بڑھتا چلا گیا ہے، دُنیا ہی میں اُس پر جنت کے دروازے کھلتے چلے گئے ہیں۔

اب لوگوں کو کیا کہیئے، وہ آدم کی اولاد سے نیکی اور نیک کرداری کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کو جو امانت بھی سپرد کی جائے، بغیر کسی خیانت کے، امانت کے فرائض کو وہ انجام دیتا چلا جائے۔ ان غریبوں پر پیشانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ جو حکومت کے محکموں میں رشوتیں لیتے ہیں۔ رعایا کو بھی لوٹتے ہیں اور جس حکومت کے ملازم ہوتے ہیں، موقعہ ملنے پر اس کی آمدنیوں کو بھی نفع اٹھاتے ہیں۔ ان مسکینوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہے۔ جو تجارت میں دھوکے دیتے ہیں، صنعتی دستکاریوں میں فریب سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لئے قانون پر قانون بنائے جا رہے ہیں۔ تعزیری دفعات ڈھالے جا رہے ہیں، جیلوں کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، سوسائٹی میں ان کو رسوا کیا جاتا ہے۔ لعنتوں اور ملامتوں سے ان کے قلوب کو لوگ چھلنی بنائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ جہنم کا خوف جن کے دلوں سے نکال دیا گیا ہے اور نکال دینے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ کتابوں میں، اسکولوں میں، تصنیفوں میں، اخباروں میں، رسالوں میں، سینماؤں میں اور تماشا گاہوں میں، مجلسوں میں اور کلبوں میں، اور کچھ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، لیکن یہ بات کہ مرنے کے بعد بھی سزا یا جزا سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے گا، اس کا مضحکہ ہر جگہ اڑایا جاتا ہے

یہ مذہب کا ڈھکوسلہ ہے، ہر ایک کی قدر مشترک کوشش اسی کے باور کرانے پر مرتکز ہوگئی ہے پھر جو آنے والی زندگی کی سزاؤں سے نڈر بنائے گئے ہیں۔ جہاں ڈر نہ ہو، پولیس کا ڈر نہ ہو، عدالت کا ڈر نہ ہو، وہاں ان افعال کے ارتکاب سے آپ ہی بتائیے کہ وہ کیوں ڈریں، جن سے ڈرنے کا آپ ان سے خواہ مخواہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ رشوت کی آمدنی سے وہ کیوں دستبردار ہوں جس کی اطلاع حکومت کے دسترس سے باہر ہے۔ وہ دھوکے کیوں نہ دیں۔ جب جانتے ہوں کہ جسے دھوکہ دیا جا رہا ہے وہ دھوکہ کھا سکتا ہے۔ آخر لوگوں کو آپ یہ بھی سکھا رہے ہیں، آپ کے اساتذہ سکھا رہے ہیں۔ آپ کے ارباب تصنیف و تالیف سکھا رہے ہیں۔ شعراء گا رہے ہیں مقررین سنا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بازی گروں تک کو دیکھا جا رہا ہے کہ باور کرا رہے ہیں، کہ جو کچھ یہاں اور اس زندگی میں کھویا جاتا ہے، پھر وہ کہیں پایا نہیں جاتا۔ صرف اسی کو ملا، جسے یہاں اور اس زندگی میں ملا، اس کے بعد نہ زندگی ہی دہرا کر کسی کو ملتی ہے۔ اور نہ وہ چیزیں ملتی ہیں۔ جن کی زندگی کو ضرورت ہے۔ آپ یہ بھی منواتے جاتے ہیں۔ اب میں آپ کو اور آپ کی عقل کو کیا کہوں کہ اسی کے ساتھ یہ بھی بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ اس روپے کو ہاتھ مت لگانا۔ جس کے لینے کی قانون اجازت نہیں دیتا۔ کیا قانون کے رد کیے ہوئے روپے کو چھوڑ دینے سے قانون پھر اس رقم کو مجھ تک پہنچا سکتا ہے؟ آپ نے انسان کی فطرت کا مطالعہ اگر کیا ہے تو کیا کیا ہے جس پر بغیر کسی خطرے کے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ ان پیسوں کو کوئی کیوں چھوڑے، جب تک یہ نہ باور کرایا جائے کہ ان پیسوں کو چھوڑنے والوں کو روپیہ دیا جائے گا۔ لیکن روپیہ تو روپیہ، ان چھوڑے ہوئے پیسوں کے معاوضہ میں کوڑی دینے کے لئے بھی آپ تیار نہیں!

پھر یہ کتنا غیر فطری مطالبہ ہے کہ ان پیسوں کو چھوڑ دیا جائے۔ انہیں حرام سمجھا جائے صرف رشوت، چوری، خیانت، بددیانتی وغیرہ کے مذہبی الفاظ، فقط الفاظ سے آپ کب تک فائدہ اٹھائیں گے۔ جب خود اپنے ہاتھوں اس دیوار کو ڈھا رہے ہیں، جس پر ان الفاظ کے زور کی بنیاد قائم ہے۔ مولینا رومی نے سچ فرمایا ہے ؎

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست      او پیاز گندہ را ندہد ز دست!

اور کودک یا بچوں کی فطرت کا جو حال ہے۔ کہ سڑی پیاز کو ہاتھ سے اسی وقت چھوڑ سکتے ہیں جب اس کی جگہ سیب انہیں پکڑا دیا جائے۔ یہی فطرت جوانوں اور بوڑھوں میں بھی عمل کرتی رہتی ہے۔ تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے، باہر ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن "اندر" ہر حال میں سب کا ایک ہی

رہتا ہے۔ قرآن مجید کی آیت :-

اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب و لھو و زینۃ و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد۔

جانو اس بات کو، کچھ نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن لعب (کھیل) اور لہو (غفلت) اور زینت (بناؤ سنگار) اور باہمی تفاخر (ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا)، اور اموال (سرمایہ)، اولاد کی کثرت میں مقابلہ!

میں آدمی کی موجودہ پست، دنیاوی زندگی کو بظاہر پانچ ادوار میں جو تقسیم کیا گیا ہے۔ مشاہدہ سے بھی جس کی تصدیق ہو رہی ہے۔ یعنی پیدا ہونے کے بعد آدمی پر پہلا حال جو طاری ہوتا ہے اسکی تعبیر لعب سے کی گئی ہے۔ لعب کھیل کود کا نام ہے۔ بالفاظِ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کسی نتیجہ کو نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی، خاک دھول کے گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ نہ ان گھروندوں میں کوئی رہ سکتا ہے۔ نہ ان سے اور کسی قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکتا ہے۔ اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی ہی میں کرتا ہے۔ اس وقت تک کرتا رہتا ہے۔ جب تک اس میں دنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور گذر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے۔ شاید اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی لیکن

جب یہ دور گذر جاتا ہے، تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، شاید اس کی نوعیت یہ نہیں

ہوتی۔ ایامِ طفولیت کے کسی دور کے گذرنے کے بعد جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں۔ پہلے ان کی فہرست مرتب کر لینی چاہیئے۔ تب معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عام خیال میں حقیقت کا حصہ کتنا شریک ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور لعب والے کے گذرنے کے بعد یہ چار دور آدمی پر اور آتے ہیں :-

(۱) لہو، دور کے معنی غفلت کے ہیں۔ طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب شبابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے، وہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے۔ یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے۔ ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں جن کا تقاضا جوانی کے ان دنوں میں زور پکڑتا ہے۔

(۲) پھر اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی کے پیچھے پیچھے بننے اور سنورنے کا جذبہ آدمی پر مسلط ہوتا ہے۔ صورت شکل کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو۔ لیکن جسے بھی دیکھئے، نظر آتا ہے کہ اپنے بالوں

کے ساتھ کھیل رہا ہے، سنڈ اڑ می" ،بچہ کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے۔ لباس میں، چال میں، ڈھال میں۔ الغرض اپنی اپنی بساط کے مطابق زیب و زینت میں عموماً لوگ مشغول ہو جاتے ہیں اسی کا نام قرآن نے، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں" زینت" رکھا ہے۔ یہ فیشن اور بناؤ سنگار کا دور ہوتا ہے۔

(۳) یہ دَور بھی تدریج گذر جاتا ہے۔ گذرتا رہتا ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں بعض بعض کو اپنا مقابل بنا کر اس کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان مشغلوں میں مصروف ہیں، جن کا قرآن نے تفاخر نام رکھا ہے۔ اپنے نسب پر، اپنے کمالات وصفات پر، شکل وصورت پر نظر آتا ہر کہ ہر ایک ناز کر رہا ہے اور کیسا ناز ؟ کہ گویا اس کے مقابلہ میں دُوسرا کچھ نہیں ہے۔

(۴) ان سب کے بعد آخری میدان، جس میں بہر حال ہر ایک کو بالآخر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ وہی ہے، جس کا نام لوگوں نے" عمل کا میدان" رکھا ہے۔ دراصل" عائلی زندگی" یا گھر گرہستی کی زندگی ہی کا نام عمل کا میدان رکھا گیا ہے اور زندگی کا یہی دَور سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس دَور میں داخل ہو کر کرنے والے جو کچھ کرتے رہتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو وہی بات حقیقت معلوم ہو گی۔ جیسے قرآن میں

تکاثر فی الاموال والاولاد — الاموال اور الاولاد کی کثرت میں باہمی مقابلہ کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وہی بات، یعنی ہر دائرے والے چند خاص افراد کو سامنے رکھ کر مقابلہ کا بازار گرم کرتے ہیں۔ عملی میدان کی اس زندگی میں پہلے تو دولت وثروت کا مقابلہ لڑا جاتا ہے۔ تنخواہیں ناپی جاتی ہیں، آمدنیوں کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دُوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکروں اور کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ "الاموال" کے بعد پھر" الاولاد" کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں۔ اور موقعہ مل جاتا ہے تو مقابلہ کے اس میدان کو پوتوں اور پڑپوتوں، نبیروں اور نواسوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔

• الاولاد و الاموال" کے تکاثر کا یہی مشغلہ عموماً ہم میں اکثروں کی زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے۔ دم توڑ دینے والے اسی نقطہ پر پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں، مشرق ہو یا مغرب، قدیم دُنیا ہو یا جدید، ہر جگہ یہی تماشا ہے، جو بنی آدم کے گھرانوں میں کھیلا اور دیکھا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے ان پانچ ادوار میں سے طفولیت کے پہلے دَور کے مشاغل

کی نوعیت اگر لعب (کھیل کود) کی تھی۔ یعنی کرنے والے زندگی کے اس ابتدائی دور میں جو کچھ بھی کرتے ہیں، کرتے رہتے ہیں، وہ لاحاصل اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے نگاہوں میں ان اعمال وافعال کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

تو چار دور، جو اس کے بعد آتے ہیں، یعنی لہویت، زینت، تفاخر، الاموال والاولاد میں تکاثر، ان ادوار میں جو مشاغل انجام دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے جانچا جائے، یعنی سوچا جائے، کہ کوئی حاصل، کوئی نتیجہ اس کا بھی ہے یا نہیں، تو میں نہیں جانتا، کہ فرق پیدا کرنے والے لعبی دور کے طفلانہ اعمال اور باقی چارگانہ ادوار کے اعمال وافعال میں کیا فرق پیدا کر سکتے ہیں؟ پھر سب کچھ کر کرانے کے بعد غور کرنے والوں کو ایسا کونسا نتیجہ اور حاصل ہاتھ آتا ہے، جسے واقعی حاصل اور نتیجہ قرار دیا جا سکے؟ اسی کے بعد قرآن ہی میں جو مثال بیان کی گئی ہے۔ یعنی:۔

| | |
|---|---|
| کمثل غیث اعجب الکفار | مانند بارش کے، کہ مسرور کرتی ہے کسانوں کو |
| نباته ثم یهیج فتراه | اس کی روئیدگی، پھر لہرانے لگتی ہیں وہی روئیدگیاں |
| مصفرا ثم یکون حطاما | پھر دیکھتے ہو کہ پیلی پڑ گئیں وہی۔ پھر ہو جاتی ہیں وہی چورا چورا (یعنی بیلوں سے روند کر ان کو بھوسا وغیرہ بنا لیتے ہیں) |

جس کا حاصل یہی ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے زمین پر آتا ہے، روئیدگیوں کو یہی بارش اُگاتی ہے ہریالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں۔ پھر وہ زرد پڑنے لگتی ہیں۔ بالآخر گھاس بھوسہ بن کر ختم ہو جاتی ہیں، جیسے یہ سارا تماشا بارش کا ہوتا ہے۔ یوں ہی زندگی کی نمائش انسانی اجساد میں سے کسی جسد میں ہوتی ہے، زندگی اسی جسد کو طفولیت، شباب اور شیخوخت (پیرانہ سالی) کے ادوار سے گزارتے ہوئے اس نقطہ پر پہنچا دیتی ہے۔ جس پر زندگی کی اس نمائش کا خاتمہ ہو جاتا ہے سوال یہ ہے کہ بارش کے اس تماشے سے خود بارش کو جیسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، انسانی جسد میں نمایاں ہو کر مختلف ادوار سے گذرنے والی زندگی ان تمام ادوار، اور ان کی تمام نمائشوں سے خود اپنے لئے کس نتیجہ کو حاصل کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بارش اور نباتی شکلوں میں بارش کی نمائشوں سے بارش کا پانی جیسے کسی نتیجہ کو حاصل نہیں کرتا، بجنسہٖ یہی حال اس زندگی اور الحیٰوۃ الدنیا کا ہے، جس کا ظہور انسانی جسد میں ہوتا ہے اور ادوار پنجگانہ سے گذر کر موت پر جس کا خاتمہ

ہوتا ہے۔ بجائے بارش کے بارش کی نباتی نمائشوں سے الکفار (کسان)، لذت گیر ہوتے ہیں، کچھ یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم میں ہر ایک کی زندگی اور زندگی کے ادوار دوسروں کے لئے ایک تماشا بنے ہوئے ہیں۔ لیکن خود زندگی والے کو اپنی زندگی اور اس کے ان ادوار سے کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا۔ یوں ہی لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ بچے بنتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بوڑھے بنتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ مرتے چلے جارہے ہیں۔ اور کاش! بات اسی پر ختم ہوجاتی یعنی الحیٰوۃ الدنیا اور اس کی مختلف نمائشیں بے نتیجہ اور لاحاصل ہو ہو کر یوں ہی ختم ہوتی چلی جائیں جیسے بارش اور اس کی نمائشیں خود بارش کے لحاظ سے بے نتیجہ ختم ہی چلی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن میں آگے جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| وفی الاٰخرۃ عذاب شدید | (اور اس پہلے تماشے حیٰوۃ الدنیا کے بعد پچھلی |
| ومغفرۃ من اللہ ورضوان | زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت بھی اللہ کی |
| (الحدید ۹ پ ۲۷) | طرف سے اور رضامندی بھی (اللہ کی طرف سے) |

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اپنی ان نمائشوں کو ختم کر کے انسانی زندگی ختم نہیں ہوجاتی۔ یعنی اس طور پر ختم نہیں ہوجاتی جیسے بارش کی نباتی نمائشیں ختم ہوجاتی ہیں۔ بلکہ بجائے ختم ہونے کے آدمی کی زندگی کو دو باتوں، یعنی عذابِ شدید (سخت مار) سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یا اس کے سامنے مغفرت کا وہ چشمہ آتا ہے جس میں غوطہ لگانے والے ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہو کر اپنے احساسات وجذبات کے مطابق دائرۂ وجود کی اس مرکزی طاقت کو پالیتے ہیں۔ جس کی کوئی حد اور تھاہ نہیں ہے۔ قرآنی اصطلاح میں جس کا نام "رضوان" اور "رضوان اللہ" ہے۔

الحیٰوۃ الدنیا کی پست زندگی اپنے ادوار کے ساتھ جب ختم ہوجاتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نفیاً یا اثباتاً جز اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ نہ ان کے حواس دے سکتے ہیں، اور نہ ان کی عقل دے سکتی ہے۔ وہ اپنے اس جہل سے ظاہر ہے کہ اس علم کا مقابلہ نہیں کرسکتے، جو پیغمبروں کو غیب وشہادت کے جاننے والے نے عطا کیا ہے۔ پس پیغامبروں کو واقعی خدا کے پیغامبر جو لوگ مان چکے ہیں، وہ یہ جاننے پر مجبور ہیں کہ اس پست زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ان دو واقعات میں سے کسی ایک کے روبرو ان کو بہرحال ہونا پڑے گا اور جب واقعہ یہی ہے تو پھر ان ہولناک ابدی، نہ ختم ہونے والے نتائج کے مقابلہ میں ہماری موجودہ "الحیٰوۃ الدنیا" اور یہ سارے بے حاصل ادوار، اس کے سوا اور کیا رہ جاتے ہیں۔ جو مذکورہ بالا آیات کے آخر

میں فرمایا گیا ہے کہ :-

ما الحیٰوۃ الدنیا اِلّا متاع — ور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف

الغرور — فریب کا ایک سرمایہ !

آئندہ پیش آنے والے اتنے اہم الاہم نتائج سے غافل بنا کر جس بے نتیجہ زندگی نے اپنے ان لاحاصل ادوار میں آدمی کو الجھالیا ہو خود ہی سوچنا چاہیے کہ "سرمایۂ فریب" یا متاع الغرور کے سوا اس کا نام اور کیا رکھا جائے۔

خیر یہ تو ان آیات کا مطلب ہوا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لاحاصلی اور بے نتیجگی کی وجہ سے الحیٰوۃ الدنیا کا ابتدائی دور اگر بعد میں دور ہے۔ طفولیت اور طفولیت کے سارے مشاغل اگر صرف کھیل کود ہیں، تو اس کے بعد آنے والے ادوار جار گانہ سوچنے والوں کی نگاہوں میں خواہ جتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں لیکن اپنی بے ثمری اور لاحاصلی کی وجہ سے ان کو بھی لعب یا کھیل کود کے سوا اور کوئی دوسری بات آخر کیوں سمجھی جائے؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کبھی پوری الحیوٰۃ الدنیا ہی کو لہو و لعب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ مشاغل اور کاروبار کے لحاظ سے زندگی کے مختلف ادوار میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں، وہ صرف باہر ہی ہوتی ہیں ورنہ "اندر" کا نقطۂ نظر ہر حال میں جوانی میں بھی، بڑھاپے میں بھی لوگوں کا وہی رہتا ہے جو بچپن میں ہوتا ہے۔ یعنی نتیجہ سے بے پروا ہو کر صرف لذت و مسرت کے وقتی تقاضے کو سب ہی پورا کرتے ہیں۔ اور کرتے رہتے ہیں، اِلّا یہ کہ اپنی الدنیا کا رشتہ پیغمبروں کی راہ نمائی میں جن لوگوں نے الدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دین سے رشتہ پیدا کرنے کے بعد دنیا بھی بدل جاتی ہے۔ اس میں بھی انقلاب اور عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ سلجھانے والے دنیا کو بھی سلجھا نہیں سکتے۔ قطعاً سلجھا نہیں سکتے۔ جب تک وہ انسانیت کے دین کو سلجھانے میں کامیابی نہ حاصل کر لیں گے، دین کے بگاڑنے والوں کو آج نہیں محسوس ہوا ہے تو کل ماننا پڑے گا کہ انہوں نے انسان، غریب انسان کے دین کو بگاڑ کر اس کی دنیا بھی بگاڑ دی ہے۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس بگاڑ کے ظہور کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اور جو شروع ہو چکا ہے، وہ بہر حال ختم ہو کر ہی رہے گا۔ تجربات یہی ثابت کرتے چلے جائیں گے مشاہدات یہی بتاتے چلے جائیں گے۔ ہم ہوں گے یا نہ ہوں گے، لیکن اس وقت جو بھی ہوں گے۔ ان کی آنکھیں دیکھیں گی، یقیناً دیکھیں گی، وہ سب کچھ دیکھیں گی جو اس وقت کہا جا رہا ہے۔

اللہ اللہ، یہ سارے معاشی جھگڑے، معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گذر کر اقوام تک کو میدان میں لے آئے ہیں۔ زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ آسمان آگ برسا رہا ہے۔ فتنہ اور فساد کے دھوئیں سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے۔ چیخنے والے چیخ رہے ہیں، چلّانے والے چلّا رہے ہیں۔ ازالہ کی ساری کوششیں جو ان جھگڑوں، لاحاصل اور بے نتیجہ جھگڑوں کے ختم کرنے کی راہوں میں ممکن تھیں۔ تجربہ ہر راہ کی ناکامی کا اعلان کر چکا ہے۔ لیکن عقول ازالہ کی جن کوششوں میں تھک تھک کر درماندہ ہو چکے ہیں۔ اگر سوچا جائے، انصاف کے ساتھ، ہر قسم کی تنگ نظریوں سے الگ ہو کر سوچا جائے تو الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر بجائے ازالہ کے صرف امالہ کی یہ ہلکی سی تدبیر، کہ مقابلہ کے سارے جذبات کا رُخ "الحیٰوۃ الدنیا" اور اس پست زندگی سے ہٹا کر "الحیٰوۃ الاخریٰ" کی بلند و دوامی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے اور امالہ کی اسی تدبیر پر زور دیا جائے، اسی قدر زور دیا جائے، جتنا کہ اب تک ازالہ کی لاحاصل سعی میں دیا جا چکا ہے۔ اور بجائے الدنیا کے الآخرۃ کو سامنے رکھ کر نسلِ انسانی کو دعوت دی جائے، جیسا کہ قرآن نے اسی طریقۂ عمل کو اختیار کر کے

| | |
|---|---|
| وفی ذٰلک فلیتنافس | بس چاہئے کہ مقابلہ کریں، اسی میں |
| المتنافسون ؛ | مقابلہ کرنے والے ؛ |

کی دعوت دی ہے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ ازالہ کی کوششوں کی راہوں سے جن مقاصد کے حصول میں دنیا ناکام، قطعاً ناکام ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ہی مقاصد میں امالہ کی اس معمولی تدبیر سے کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ امالہ ہی پر آمادہ نہ ہوں، یا زبان سے اقرار کر کے دل کے رُخ کو ادھر نہ پھیریں، جس طرف پھیرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن منوا لینے کے بعد تو ان مقاصد میں کامیابی اصولِ امالہ کی تسلیم کا ایک ایسا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے، جس میں تخلف کا امکان ہی نہیں ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ امالہ کے اس اصول پر اعتماد اسی حد تک بڑھتا جائے گا، جس حد تک مذہب پر انسانیت کے اعتماد کو آپ بڑھائیں گے۔ لیکن مذہبی اعتماد کے اضمحلال کا جب تک وہ حال ہے جس میں دُنیا کو آج مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ امالہ کی اس تدبیر کا ذکر مضحکہ کے سوا اور کیا ہے؟

اور یہ تھے اسلامی معاشیات کے وہ "اصولی کلیات" جن کا قرآن میں اب تک میری جستجو نے سراغ لگایا ہے۔ اس وقت تک تو جو باتیں سمجھ میں آئی ہیں، وہ یہی ہیں۔ آئندہ اور چیزیں

بھی جو بٹتی چلی جائیں گی۔ انشاء اللہ ان کا اضافہ کیا جائے گا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی نمونوں کو دیکھ کر دوسرے ارباب فکر و نظر قرآن ہی سے دوسری چیزوں بھی نکال سکتے ہیں۔ جن پر اب تک میری نظر نہیں پہنچ سکی ہے۔

البتہ آخر میں ایک چیز قرآن ہی کی ایسی ہے کہ اس کا تذکرہ اگر نہ کر دیا جائے گا، تو قرآن پڑھنے والے ممکن ہے کہ بعض وسوسوں میں مبتلا رہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ معاشی مدارج کے جس اختلاف کی تعبیر قرآنی اصطلاح کی رُو سے میں نے بسطی و قدری معیشت سے کی ہے۔ جیسا کہ بہ تفصیل بتا چکا ہوں کہ عام حالات میں معیشت کی یہ دونوں شکلیں ابتلائی رنگ ہی کی ہوتی ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ عمل کے نتیجہ کے طور پر رزق کی تقسیم ان دو پیمانوں پر نہیں ہوتی۔ بلکہ الرزق کے یہ دونوں پیمانے امتحان اور ابتلاء کی دو شکلیں ہیں اور چونکہ دونوں امتحان ہیں۔ یعنی ہر پیمانہ اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے — ان ہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی ان میں ہر ایک کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ پھر جیسے ہر امتحان کا قاعدہ ہے کہ اس میں شریک ہونے والوں میں بعض کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکام۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو معیشت کے ان دو مختلف پیمانوں پر روزی پا رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ چکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس موجودہ پست زندگی (الحیٰوۃ الدنیا) میں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے، کیا ہمیشہ ابتلائی حیثیت سے دیا جاتا ہے؟ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں اور ان کو جاننا ہی چاہیئے کہ اجتماعی طور پر اقوام و امم کی خوش حالیوں، اور بدحالیوں کو مکافات اور مجازات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا جتنا حصہ قرآن میں محفوظ ہے، وہ یہی بتانے کے لئے محفوظ کیا گیا ہے۔ کہ خدا اور اسکی مرضیات پر چلنے والوں سے خدا بھی راضی رہا اور خدا کے قوانین نے بھی ان سے ہم نوائی کی۔ اور قدرت کے مقررہ قوانین پر چلنے سے جنہوں نے بغاوت کی۔ یعنی شرعی قوانین سے تصادم کی راہ جن قوموں نے اختیار کی۔ ان سے خدا اور خدا کے تکوینی قوانین متصادم ہونے لگے اور اسی تصادم کے بعد ان کے عروج و زوال سے ترقی کو تنزل سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ قرآن پڑھنے والوں کے لئے قرآن کا یہ دستور کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ بلکہ چند کلیات، جن کے محور پر قرآنی تعلیمات گردش کرتی ہے۔ ان میں سے قوموں کی حیات و ممات کا یہ ایک مسلّم اور بدیہی کلیہ ہے، جس کے شواہد و نظائر کے بھی پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ نظریۂ ابتلائیت

یعنی معیشت کے بسطی وقدری پیمانوں کو قرآن میں ابتلاء امتحان کی جو دو شکلیں قرار دی گئی ہیں تو اس کا تعلق اقوام وامم کے اجتماعی حالات سے نہیں ہے۔ بلکہ اشخاص کی شخصی زندگیوں کا یہ قانون ہے یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طور پر عروج کی حالت میں کوئی قوم ہو، یا زوال کی لیکن انفرادی حیثیت سے افراد میں روزی کی تقسیم کرنے کا یہ سلسلہ دونوں پیمانوں پر جاری رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اجتماعی اور قومی نقطۂ نظر سے ان کا حال کچھ بھی ہو، مگر کسی نہ کسی رنگ میں بعض افراد ان کے امیر بھی نظر آتے ہیں۔ اور بعض غریب بھی۔ یعنی بعضوں کی آمدنی قدر حاجت وضرورت کے برابر اور اس کے ساتھ نپی تلی ہوتی ہے اور بعضوں کو اس کا موقعہ مل جاتا ہے کہ ضرورت وحاجت پر خرچ کرنے کے بعد وہ پس ماندہ بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ الغرض قدر وبسط کے ان دونوں پیمانوں پر افراد میں پھر بھی روزی تقسیم ہی ہوتی رہتی ہے۔ کم از کم انسانیت کی جو تاریخ اس وقت تک کی موجود ہے اور قوموں کو اس زمانہ میں بھی جن حالات میں پایا جاتا ہے ان کے افراد کی معیشت کی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ عروج یافتہ قوموں میں جیسے یہ نہیں دیکھا گیا کہ ان میں ہر ایک شخص بسطی رزق والا بن جاتا ہے، یعنی سب امیر ہی نہیں ہو جاتے بلکہ باوجود قومی عروج کے افراد کی بڑی اکثریت عین عروج وارتقاء کے ان ہی دنوں میں قدری پیمانے پر بھی روزی پاتی ہے اسی طرح زوال وانحطاط کے دنوں میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد اسی نکبت زدہ قوم کے بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں۔

اور یہ پہلی بات تھی جو اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا تھا، یعنی اقوام وافراد میں جو فرق قرآن میں کیا گیا ہے اس پر لوگوں کو متنبہ کر دوں۔

دوسری بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ انفرادی معیشتوں کا ابتلاء وامتحان پر مبنی ہونا اگرچہ معیشت کا عام قرآنی قانون یہی معلوم ہوتا ہے۔ بسط ہو یا قدر، جس پیمانے پر بھی یہاں افراد کو جو کچھ مل رہا ہے۔ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان میں سے ہر ہر پیمانے کی جو ذمہ داریاں ہیں، موجودہ زندگی میں ان ذمہ داریوں کی تکمیل یہی آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ نتائج کے سمجھنے یا خمیازوں کے بھگتنے کا وقت اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی میں آئے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابتلاء امتحان کے سوا معیشت کی ان دونوں شکلوں میں اور کچھ نہیں ہوتا۔ سمجھنے والوں نے اگر ایسا سمجھ لیا ہے تو جو کچھ میں عرض کرتا چلا آیا ہوں، غالباً صحیح طور پر اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ میں نے بسطی اور قدری معیشت کے ان دونوں پیمانوں کی ذمہ داریوں کو بیان

کرتے ہوئے ان نتائج پر بھی جو متنبہ کرتا چلا آیا ہوں۔ جن سے موجودہ زندگی ہی میں آدمی کو قرآن کے بیان کے بموجب دوچار ہونا پڑتا ہے، تو اس کا مقصد یہی تھا کہ موجودہ زندگی کے اعمال کی جزاء اور سزا کا حقیقی مظہر اگرچہ مجازات و مکافات کی آئندہ زندگی ہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض اعمال و افعال ایسے بھی ہیں جن کی سزا و جزاء کا ظہور موجودہ زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے اور معاشی ذمہ داریوں کے متعلقہ اعمال و افعال بھی، جیسا کہ قرآن کے حوالہ سے مسلسل دکھاتا چلا آرہا ہوں، مجھے اس قبیلہ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ الرزق یا معیشت کے یہ دونوں پیمانے ابتلائی بھی ہیں۔ اور ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مجازاتی و مکافاتی بھی ہوتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں جو چیزیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان کو پھر پڑھیے تو آپ کو یہی نظر آئے گا مثلاً قرآن کی آیت ہے:۔

| | |
|---|---|
| فاما من اعطی واتقیٰ | پس جس نے دیا، اور ڈرا، اور اچھی |
| وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ | باتوں کی تصدیق کی۔ تو ہم قریب ہے |
| للیسریٰ۔ | کہ آسان بنائیں گے اس پر آسان زندگی کو |

میں اعطا (داد و دہش) جو تقویٰ اور الحسنیٰ کی تصدیق پر مبنی ہو۔ فرمایا گیا ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے لئے "الیسریٰ" کو آسان کر دیا جائے۔ "الیسریٰ" (آسان زندگی) ایک عام اور مطلق لفظ ہے۔ جو ہر قسم کی زندگی کو عام ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھایا بھی گیا ہے۔ کہ موجودہ زندگی ایسوں پر آسان کر دی جاتی ہے، تو اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ قرآنی آیات اور حدیثوں کے حوالہ سے یہ بات جو گذر چکی ہے کہ مثلاً صدقہ سے ردِّ بلا ہوتا ہے یا اسی قسم کی دوسری آسانیاں میسّر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہے۔ بخاری کے حوالے سے میں نے کئی جگہ بتایا تھا، کہ چٹان کے ڈھنک جانے کی وجہ سے جو لوگ غار میں بند ہو گئے تھے۔ اپنے عمل کے بدلہ سے انہوں نے اسی زندگی میں نفع اٹھایا تھا۔ یا باغ کی آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آبپاشی کے جو فوائد حاصل کرتا تھا۔ ان ساری روایتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے۔ کہ خیر و خیرات وصدقات و مبرات وغیرہ کے نتائج سے موجودہ زندگی میں بھی کرنیوالے کے لئے قدرت سہولت مہیا کرتی ہے۔ یعنی الیسریٰ کو آسان کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل قرآن سے سورۂ نٓ میں باغ والوں کا جو مشہور تمثیلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ مسکینوں اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چاہا تھا کہ پھلوں کو صبح سویرے تڑکے توڑ کر نکل جائیں۔ لیکن قبل اس

کے کہ وہ باغ پہنچیں قدرت کی طرف سے ان کا باغ اور اس کے پھل برباد ہو چکے تھے. تو اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے. کہ جیسے نیکی کے بدلہ کا ظہور اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے. اسی طرح معاشی سرمایہ کی بربادی پر بدی اور بد نیتی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے احسن القصص (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام) حضرت والا کی مختلف آزمائشوں کے تذکرے کے بعد جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ مصر نے خزائن الارض (زمین کی آمدنیوں) کو ان کے سپرد کر کے سرزمین مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی تھی۔ تو یہ ارشاد فرمانے کے بعد، یعنی

| | |
|---|---|
| کذلک مکنا لیوسف | یوں ہی اقتدار بخشا ہم نے یوسف کو زمین |
| فی الارض یتبوء منھا | (مصر) پر، ٹھکانہ بناتے تھے وہ (یوسف |
| حیث یشاء. | علیہ السلام) جہاں چاہتے تھے! |

حق تعالیٰ نے عمومی رنگ میں جو یہ اعلان کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| نصیب برحمتنا من نشاء | پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت، جسے چاہتے ہیں |
| ولا نضیع اجر المحسنین! | اور نہیں ضائع کرتے ہیں ہم مزدوری، ان |
| | لوگوں کی جو بھلائی کرنیوالے ہیں! |

ظاہر ہے کہ اس آیۃ کریمہ قدسیہ میں اسی دولت و ثروت، اقتدار و اختیار کو، جو زمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مل گیا تھا "رحمتنا" (یعنی ہماری رحمت اور مہربانی) کے لفظ سے اسکی تعبیر کی گئی ہے۔ جس کے یہی معنیٰ ہیں، کہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا ظہور کبھی دنیاوی دولت و ثروت کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ اور آگے یہ فرما کر ہم محسنوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتے اس سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کو دنیاوی نعمت و عزت، جو مصر میں ملی تھی۔ یہ ان کے احسانی اعمال و افعال کا بدلہ و اجر تھا۔ خود یوسف علیہ السّلام کی زبانِ مبارک کا یہ فقرہ قرآن ہی میں جو محفوظ ہے۔ یعنی مصر میں خدا نے اُن پر جو نوازشیں فرمائیں اور ان کا بچھڑا ہوا خاندان وطن سے چل کر مصر میں ان کے پاس جب آگیا تو آپ نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| قد من اللہ علینا انہ | ہم پر بڑا کرم کیا اللہ تعالیٰ نے جو ڈرتا ہے |
| من یتق ویصبر فان اللہ | اور صبر سے کام لیتا ہے تو قطعاً اللہ تعالیٰ بھلائی |
| لا یضیع اجر المحسنین! | کرنیوالوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ |

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کا صلہ ان آسانیوں اور سہولتوں کو قرار دے رہے تھے۔ جو اس وقت ان کو مصر میں میسر آئی تھیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے اور یہی بات میرے اس مضمون کی سب سے زیادہ قابلِ توجہ بلکہ غالباً دل ہلا دینے والی بات ہے کہ الحیٰوۃ الدنیا کی یہی سہولتیں، یہی آسانیاں، جنہیں ہم بسطیِ معیشت بھی کہہ سکتے ہیں۔ زندگی کی یہی شکل اقوام کے لئے بھی، اور کہہ سکتا ہوں کہ افراد کے لئے بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی عصیان و تمرّد کا قدرتی انتقام بھی اختیار کر لیتا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہی انتقام، صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود دینے والے کا بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک، انتہائی خطرناک شکل ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اسی عجیب و غریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو چونکانے کے لئے جب پیغمبر اور رسل بھیجے جاتے ہیں۔ تو ابتداً انکار و سرکشی اختیار کرنے والوں کو البأسا، (جنگ وغیرہ کی سختیوں) اور الضراء (قحط و وبائی مصیبتوں) میں مبتلا کر کے جھنجھوڑا جاتا ہے۔ لیکن جن کے دل سخت، سینے سیاہ ہوتے ہیں، وہ قدرت کی ان تنبیہوں کو مختلف تاویلوں کی راہ سے یہ قرار دیتے ہیں، کہ یہ تنبیہ نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے عام حوادث و واقعات ہیں۔ انسانی اخلاق و کردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لئے انہیں ڈھیل دی جاتی ہے۔ ڈھیل ہی نہیں، بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں، مثلاً سورۂ الانعام میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء۔ | جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن کے چونکائے گئے تھے۔ وہ تو کھول دیا ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے! |

یا سورۃ الاعراف میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا۔ | پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی کو بدل دیا تا اینکہ وہ لوگ خوب بڑھ گئے |

وغیرہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ حالات سے بھی زیادہ آسانیوں کے دروازے ان پر کھولے جاتے ہیں۔ اور "کل شیء" یعنی ہر قسم کی چیزوں کے، اور زندگی کے تمام شعبوں کے دروازے

ان پر وا ہو جاتے ہیں۔ السیۂ (برائیوں) کو الحسنۃ (بھلائیوں) سے بدل دیا جاتا ہے۔ گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی چلی جاتی ہے۔ وہ بڑھتے ہیں۔ بڑھائے جاتے ہیں بڑھائے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ عفو کے یہی معنی ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی و عروج، ارتقا، و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد یہ فرما کر جیسا کہ الانعام کی آیت کے آخر میں ہے۔

| | |
|---|---|
| حتیٰ اذا فرحوا بما اوتوا | جب اترا گئے اس چیز سے، جو دیا گیا ان کو، تو |
| اخذناھم بغتۃ فاذا | پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک۔ تب وہ ایسی حالت میں |
| ھم مبلسون فقطع | رہ جاتے ہیں مایوس ہو کر، بس کاٹ دی گئی جڑ ان |
| دابر القوم الذین ظلموا | لوگوں کی جنہوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا |
| والحمد للہ رب العلمین | اور ستائش (رہ گئی) صرف اللہ سارے |
| | جہان کے پالنے والے کی! |

یا الاعراف کی آیت کے آخر میں ہے۔

| | |
|---|---|
| حتیٰ عفوا وقالوا قدمس | جب وہ بڑھ گئے تو بولے کہ ہماری گذشتہ |
| آباءنا الضراء والسراء | نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ نے چھوا تھا |
| فاخذناھم بغتۃ وھم | پس پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک اس طور پہ |
| لایشعرون. | کہ ان کو اس کا شعور بھی نہ ہوا۔ |

جس کا حاصل یہی ہے، کہ ان ساری ترقیوں، اولو العزمیوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طور پر پکڑ لیتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ان کے آخری انجام کا مآل ہے۔ لیکن سرکش و طاغی اقوام کے ساتھ قدرت کا یہ انتقامی برتاؤ، جو بظاہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے بڑا صبر آزما، اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے۔ جنہیں انجام سے پہلے، انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ اور جو حال اقوام کا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد کے ساتھ بھی قدرت کبھی اس قسم کا سلوک کرتی ہے۔ یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو سزا و انتقاماً، ان کی غفلتوں، بھرمار غفلتوں پر، تاکہ غفلتوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے مقصود بسلسلہ معیشت کی اس لوٹ کے اڑھانے سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اندھے بنائے جاتے

ہیں۔ اور دولت و ثروت کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اسی لئے ٹھونسی جاتی ہیں۔ تاکہ پھر نیکی کی راہوں پر اب ان کی نظر نہ پڑے اور بھلائیوں کے سننے سے یہ بہرے بن جائیں۔ لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہی قدرت کے پیارے اور ان لوگوں میں ہیں جنہیں پیدا ہی کیا گیا ہے خدائی نعمتوں سے استفادہ کے لئے، قرآن میں ایسی آیتیں مثلاً۔

فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوٰۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کافرون۔

پس حیرت میں نہ ڈالے تجھے ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد اس کے سوا اور کوئی دوسری بات نہیں ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کو عذاب دے ان ہی چیزوں سے (یعنی اموال و اولاد کی کثرت سے) اس پست زندگی میں، اور فرسودہ ہو کر نکلے انکی جان اس حال میں۔ وہ ناشکرے ہیں!

"بسطی معیشت" کی اسی مغالطی قالب کے متعلق تنبیہہ کی گئی ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے، صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ "الاموال" اور "الاولاد" کی یہ وہی قسم ہے جس سے قدرت ان لوگوں کو سزا کرتی ہے۔ اور اس سے غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں بدن سے ان کی جان فرسودہ ہو کر نکل جائے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا پھر ان کو موقعہ نہ ملے۔

قوموں کی حد تک تو شاید بسطی معیشت کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچاننے والے بآسانی پہچان نہیں سکتے۔ آخر دنیا کی ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسولوں کی تعلیم کی بغاوت، صرف بغاوت پر مبنی ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو لا رہی ہو، جن میں دیکھا جا رہا ہو کہ کسی نہ کسی خیر کا دروازہ ان پر کھولا گیا، اپنی ان ہی طغیانیوں میں وہ جس حد تک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی حد تک ابواب کل شئی (ہر چیز کے دروازوں) کے کھلنے کا سلسلہ بھی زور باندھتا چلا جا رہا ہو۔ ایسوں کے متعلق ان لوگوں کی منطق جو اللہ اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، مذاہب و دیانات کے نظام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ اور خود بافیدہ نظام نہیں سمجھتے، بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور ان کے نزدیک مذہب ہے۔ ان کی منطق اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ایسی بات جس کے سوا کوئی دوسری بات سمجھی ہی نہیں جا سکتی۔ اگر قرآن وہی سمجھاتا ہے، تو ظاہر ہے، کہ

قرآن کے کسی ایسے مسئلہ کے سمجھنے میں کسی کو کیا دُشواری پیش آسکتی ہے۔ البتہ اگر دُشواری کچھ ہے تو ان کے لئے ہے، یعنی مسکینوں، عقل کے مسکینوں کا جو طبقہ ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے، اس کے رسُولوں کو بھی سراہتا ہے لیکن اللہ کے باغیوں اور رسُولوں کے دُشمنوں پر ابواب کل شئی کے فتح کا جو انتقامی سلسلہ شروع ہوا۔ اور ان کی السیئۃ (بُری حالت) جب الحسنۃ (بھلی حالتوں) سے بدل گئی تو اس انتقام کو وہ انعام اور اس سزا کو وہ باور کرنے لگے کہ یہ ان کے عمل کی جزاء اور ان کے کرتوتوں کا یہ صلہ ہے۔ اس قسم کے دماغوں کی ذہنی وسعتوں کے سمجھنے سے کم از کم میں تو قطعاً قاصر ہوں، یہ ہو سکتا تھا کہ ان باغیوں کے ساتھ یہ بھی مذہب سے بغاوت کا اعلان کر دیتے۔ جیسے وہ مرتد ہیں۔ ارتداد کے اس اصول کو یہ بھی تسلیم کر لیتے تو جو کچھ کہا جا رہا ہے، اگر اس وقت کہتے تو خیر اس کی گنجائش تھی۔ لیکن جس تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہے، میں تو اس کی توجیہہ سے قطعاً عاجز ہوں اور دُنیا کے اس عجیب و غریب گروہ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جہاں تک میں جانتا ہوں عام حالات میں لوگ وہی مان بھی رہے ہیں جو قرآن اُن سے منوانا چاہتا ہے۔ یا سرے سے انہوں نے بھی مذہب اور مذہبی زندگی کی واقعیت اور نتیجہ خیزی کا اسی طرح انکار کر دیا ہے جیسے خود اس قسم کی سزا یافتہ قومیں اس کی منکر اور اس اصول سے باغی ہیں۔ مگر تماشے کی ذہنیت ان کی ہے، جو نہ مذہب ہی سے منحرف ہو کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں کہ باغی، مذہب سے باغی اقوام کا یہ حال قدرت کا انتقام اور قدرتی عذاب ہی کی یہ ایک شکل ہے۔

بہر حال قوموں کی حد تک جیسا کہ میں نے عرض کیا کم از کم میرے نزدیک اس مسئلہ میں کوئی دُشواری نہیں ہے۔ البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ لیکن اس میں بھی دُشواری جو کچھ ہے وہ دُوسروں کے اعتبار سے ہے۔ دوسروں کو دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں، دُور سے دیکھتے ہیں یا باہر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن خود اپنے حالات و خیالات، اعمال و افعال، ظاہر ہے کہ دُوسروں پر نہیں تو خود اپنے آپ پر تو پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ خود آگاہی کے اسی نفسیاتی قانون کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ | بلکہ آدمی اپنے نفس کے حالات سے خود |
| ولو القیٰ معاذیرہ | واقف ہے اگرچہ ان پر (نامعقول اعذروں |
| (القیامۃ) | کا پردہ) ہی کیوں نہ ڈالے! |

پس ان لوگوں کو جو بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں، یہ دیکھنا چاہئے کہ خدا اور خدا کے مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ اگر ایسا حال ہے کہ جس حد تک خدا سے خدا کی مرضیات سے وہ ٹکراتے ہیں۔ اسی حد تک معیشت کے اس بسطی پیمانہ میں کشادگی پیدا ہوتی جاتی ہو تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں ان کا قدم جتنا آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اُسی حد تک دُنیا اور دُنیاوی نعمتیں بھی ان کے قدم چُومتی چلی جاتی ہیں۔ تو ایسی حالت میں (العیاذ باللہ) انہیں یہ یقین کرنا چاہئے۔ کہ بسطی نعمت و معیشت کی یہ ٹوپی اُن کے سر پر اسی لئے نڑھی گئی ہے۔ تاکہ وہ اندھے ہی ہو کر جئیں اور اندھے ہی بنے ہوئے وہ مرجائیں۔ "الاموال" اور "الاولاد" کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ اور ایسا انتقام کہ چھوٹنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں، خدانخواستہ باوجود مسلم و مؤمن ہونے کے کوئی سزا کے اس حال میں اگر گرفتار ہو گیا ہو تو چاہئے کہ آیت کریمہ قرآنیہ

| | |
|---|---|
| ولا تعجبک اموالہم | اور نہ حیرت میں ڈالیں تجھے ان کے اموال |
| واولادھم انما یرید اللہ | اور اولاد اس کے سوا اور کوئی بات نہیں |
| ان یعذبھم بھا فی الدنیا | ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ سزا دے ان کو ان ہی |
| وتزھق انفسہم وھم | (اموال و اولاد سے) اور فرسودہ ہو کر نکلے گی |
| کافرون۔ | جان اس حال میں وہ ناشکرے تھے! |

کے وِرد میں مشغول ہو، یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ایک نو وارد غریب کابلی مبتلا ہو گیا تھا۔ زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے حلوائی کی دوکان سے مٹھائی اٹھا کر قیمت ادا کئے بغیر کھا گیا۔ پولیس نے گرفتار کر کے اس کی سزا یہ تجویز کی کہ سر منڈا کر گدھے پر سوار کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے۔ یہی کیا گیا، شہر کے لڑکے گدھے پر سوار اس کابلی کے پیچھے تالیاں پیٹتے جاتے تھے اسی شکل میں وہ شہر کے باہر ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب کابلی اپنے وطن پہنچا، پوچھنے والوں نے پوچھا

"آقا! در ہندوستان رفتہ بودی، چہ دیدی؟"

جواب میں اس نے جو بات کہی اس سے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے قرآن کی مذکورہ بالا آیت کے سمجھانے میں ایک دفعہ امداد حاصل کی تھی۔ کابلی نے جواب میں اپنے اربابِ وطن کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی۔

"ہندوستان خوب ملک است، بگوہ خوردن مفت ست، موتراشیدن

مفت ست، سواریٔ خر مفت است، دف دفِ طفلاں مفت
است، ہندوستان خوب ملک است!"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تحقیر و توہین، بے عزتی و رسوائی کے سارے اسباب و علامات کو جیسے اس جاہل کابلی کی ذہنیت نے اپنے اعزاز و اکرام کا ذریعہ باور کر لیا تھا۔ اسی طرح بسطی نعمت رکھنے والوں کا باغی گروہ بھی آج اپنی سزا کو جزا، اور قدرت کے انتقام کو انعام سمجھ رہا ہے۔ لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں پہنچ کر اس پر واضح ہوگا کہ ان میں ایک چیز بھی مفت نہ تھی۔ جیسے مغالطہ خوردہ کابلی کی طرح اس نے مفت سمجھ لیا تھا۔ ایسی سزا، جو مسلسل دوسری سزاؤں کے سزاپانے کو مستحق بناتی چلی جاتی ہو، سزا کی عام قسموں میں بدترین سزا ہو سکتی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین عنہا!

لیکن بسطی پیمانہ پر رزق پانے والوں کا حال اگر یہ نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ ابتلائی نعمت ہوگی۔ یا ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت بھی ہوگی۔ خصوصاً بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی تکمیل کی راہ میں اگر اس کی وجہ سے رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوتی چلی جائے تو یقیناً یہ نشانی ہے اس بات کی کہ اس کی یہ بسطی معیشت و امارت و ریاست و دولت سراسر رحمت ہے۔ وہی حال، جس کی نشاندہی حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کی زندگیوں میں قرآن مجید نے کی ہے۔ وہی مصر، جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کا سبب بنتی رہی اور آج تک اس کا یہی حال ہے۔ لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو خدا کا یہ بندہ دینے والے کے قدموں پر سر جھکا کر آرزو کرتا ہے تو یہ کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| رب قد اٰتیتنی من الملک | میرے مالک! مجھے آپ نے ملک (حکومت) |
| وعلمتنی من تاویل الاحادیث | عطا کی اور باتوں کو ٹھیک اسکے ٹھکانے پر |
| فاطر السمٰوٰت والارض | پہنچانے کا سلیقہ عطا کیا۔ آپ ہی ہیں آسمانوں |
| انت ولی فی الدنیا والاٰخرۃ | کے پیدا کرنیوالے اور زمین کے۔ آپ ہی میری |
| توفنی مسلماً والحقنی | پشت پناہ اور والی ہیں، دُنیا میں بھی اور آخرۃ |
| بالصالحین! | میں بھی۔ اٹھائیے گا (دنیا سے) مجھے مسلمان۔ |
| | اور ملا دیجئے گا مجھے نیکوں سے! |

اور یہی چیزیں آپ کو داؤد وسلیمان علیہما السلام کے تذکروں میں نظر آئیں گی۔ جن کا ایک حصہ قرآن میں محفوظ ہو گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کہ مذہبی دعوت[1] کو بنی آدم کے لئے آخری ٹھوس دعوت بنانے کے لئے ابتداء ہی سے سیاسی قوت کا زور جب اس کی بنیادوں میں بھرا گیا اور اس کی وجہ سے بہتوں کو بسطی معیشت گذارنے کا موقعہ تاریخ میں مسلسل ملتا رہا تو صرف ابتدا ہی میں نہیں، بلکہ زمانے کے مختلف ادوار وقرون میں ایسی ہستیاں معرض شہود پر برابر آتی رہیں، جن کی بسطی معیشت ان کے لئے رحمت بنی رہی۔ اس کے لئے تاریخ اسلام کی ورق گردانی کی ضرورت ہے۔ میرے لئے یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں، بلکہ قرآن کی سورۂ کہف میں ذو القرنین کے نام سے جس تمثیلی قصہ کا ذکر ہے میرے نزدیک اس قصہ کے متعلق یہ سوال کہ ذو القرنین کون تھے، کہاں تھے، کب تھے؟ بجائے ان غیر ضروری امور کی تحقیق کے، اگر سوچا جاتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول وعرض پر اقتدار بخشا گیا۔ کہ گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک وہ پہنچ گئی تھی اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کو حکومت بخشی گئی تھی۔ جن کی بولی کو ان کی زبان سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ لوہے کی اینٹیں بنا بنا کر بجائے گارے کے رانگ کو پگھلا کر۔ ان ہی اینٹوں کو ان سے جوڑ کر دیوار بناتے تھے۔ جس کے یہی معنیٰ ہوئے کہ ایسی ایجادات واختراعات پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی۔ جسے سائنس وکیمیا کے اس عہد میں بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائنٹی فک دیوار کی تعمیر سے جب وہ فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر وناز، تبختر وغرور کے، جس میں عموماً ان حالتوں میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں اسی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بندگی اور دینے والے کی خدائی کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا۔

ھذا رحمۃ من ربی
فاذا جاء وعد ربی
جعلہ دکاء وکان وعد
ربی حقا!

یہ ہے میرے مالک کی مہربانی۔ پھر جب آئیگا
فرمان میرے مالک کا، تو ہو جائے گی
یہ ٹکڑے ٹکڑے، اور ہے وعدہ میرے
مالک کا سچا!

حالانکہ اسی کے بالمقابل اسی سورۃ میں اس شخص کی دماغی کیفیت جسے دو باغ اور ان کے درمیان

---

[1] مراد اسلام کی اس دعوت سے ہے جسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو سب سے آخر میں دی گئی ۱۲

کھیتیاں وغیرہ دی گئی تھیں۔ اور درمیان میں بہنے والی نہروں سے جن کی سیرابی ہوتی تھی، وہی اپنے باغ میں داخل ہونے کے بعد بڑبڑاتا تھا تو یہ بڑبڑاتا تھا۔

| | |
|---|---|
| ما اظن ان تبید ھذہ ابدا! | میں نہیں خیال کرتا، ہمارے یہ باغ کبھی بھی برباد ہو سکتے ہیں! |

جبلی معیشت اور اس کی مختلف شکلوں کو جیسے ان شکلوں کی خصوصیات و علامات سے پہچانا جا سکتا ہے۔ قدری معیشت میں بھی اسی قاعدے سے ہم کام لے سکتے ہیں۔ یعنی دوسروں کو اندازہ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ لیکن جن پر گذرتی ہے وہ چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان کی معیشت کا قدری پیمانہ خدا نخواستہ دینے والے کے ساتھ کسی شوخی اور گستاخی کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ وہی قرآن کی سورۂ نون میں اور سورۂ کہف کے قصہ یعنی باغ والوں کے باغ پر جو تباہی آئی تھی اور ان کی جبلی معیشت نے اچانک قدری رنگ جو اختیار کر لیا تھا۔ یعنی قدری معیشت کی وہ عتابی شکل تھی۔ سورۂ کہف میں بھی ہے کہ باغ کی تباہی و بربادی کے بعد وہی گستاخ امیر خود اپنے اندر یہ احساس رکھتا تھا۔ اور اس احساس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا تھا۔ قرآن ہی میں وہ منقول ہیں۔

| | |
|---|---|
| واحیط بثمرہ فاصبح | اور احاطہ کر لیا گیا اس کے باغ کی |
| یقلب کفیہ علیٰ ما انفق | پیداواروں کا (یعنی تباہ کر دی گئیں) تو وہ |
| فیھا وھی خاویۃ علیٰ | ملتا تھا اپنی ہتھیلیوں کو ان مصارف کو |
| عروشھا ویقول یالیتنی | یاد کر کے جو باغ میں اس نے خرچ کئے تھے |
| لم اشرک بربی احدا ۱؎! | اور باغ جو تھے، وہ اپنی ٹٹروں اور چھپروں |

پر اوندھے پڑے تھے۔ کہتا تھا کہ اے کاش! ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بناتے!

---

۱؎ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کا جو قصہ قرآن میں اوپر بیان کیا گیا ہے اس میں کوئی جز ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ شرک کا ارتکاب اس عام معنی کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ جسے عموماً لوگ شرک سمجھتے ہیں۔ یعنی خالق کے ساتھ کسی مخلوق کو اس نے اپنا معبود بنا لیا تھا اور خدا کے ساتھ خدا کی کسی مخلوق کو بھی وہ پوجتا تھا۔ پھر سوال یہی ہے کہ کاش! اپنے مالک کے ساتھ ہم کسی کو شریک نہ بناتا؟ ان الفاظ میں وہ اپنے کس جرم کی طرف اشارہ دیتا ہے (باقی حاشیہ آئندہ)

اس طرح سورۂ نٓ میں جن باغ والوں کا ذکر ہے۔ باغ کی تباہی اور اس کے متعلق بھائیوں میں جو گفتگو ہوئی۔ اس کو نقل کرنے کے بعد خود ان ہی کی زبانوں سے قرآن نے اعترافِ جرم کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ۔

| | |
|---|---|
| فاقبل بعضهم علی بعض | پھر ان میں بعض بعض کی طرف ملامت |
| یتلاومون قالوا یاویلنا | کرتے ہوئے متوجہ ہوئے اور بولے کہ افسوس |
| انا کنا طاغین! | ہے ہم پر، ہم ہی لوگ سرکش تھے! |

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر گذرتی ہے وہ قدری معیشت کی اس انتقامی اور عتابی شکل کو خود پہچان لیتے ہیں۔ اور ہوتا بھی ہے۔ قدری معیشت کی اس شکل کا ظہور کچھ ایسے طریقہ سے کہ گرفت کے شعور کا دبانا مبتلا ہونے والوں کے لئے مشکل ہی ہوتا ہے۔ عہدِ بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا جو قصہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری و مسلم جیسی صحیح حدیثوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے جن میں ایک اندھا، ایک مبروص اور ایک گنجا تھا۔ تینوں کے امراض کا ازالہ بھی کیا گیا اور غربت و افلاس کی جس قدری معیشت میں وہ گرفتار تھے۔ ان سے بھی نجات عطا کی گئی۔ اور جس قسم کا مال جو چاہتا تھا، ہر ایک کو دیا گیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ پھر ان میں ہر ایک کے پاس اسی شکل میں، جس شکل میں وہ پہلے تھے، فقیر کا بھیس بنا کر خدا کا فرشتہ آیا۔ یعنی اندھے کے پاس اندھا، مبروص کے پاس مبروص، اور گنجے کے پاس گنجے کی شکل بنا کر فرشتہ آیا۔ اور ان میں ہر ایک سے اس نے دستگیری کی التجا کی۔

---

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ کر رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ شرک کی یہ تو بالکل بھونڈی اور بھدی شکل ہے جسے عام حالات میں لوگ شرک کہتے ہیں ممکن ہے اس شرک میں وہ مبتلا نہ ہو۔ لیکن باغ میں داخل ہونے کے بعد اس کا یہ دعویٰ کہ اب یہ باغ اور اس کی کاشت کبھی تباہ نہیں ہو سکتے، دراصل یہ ان اسباب اور باغبانی و کشت کاری کے ان سامانوں کی طرف اشارہ تھا جن پر اعتماد کر کے مستقبل کے متعلق اتنا بڑا بول وہ بول رہا تھا اور ان چیزوں کو وہ اپنی دانائی و فرزانگی، چستی و چالاکی اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں کا نتیجہ یقین کرتا تھا۔ جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ خدا کے ساتھ فعلی معیشت کے ان مظاہر کی فراہمی میں وہ خود اپنے آپ کو بھی شریک کر رہا تھا۔ اور اس کا یہی دعویٰ شرک کا مزدعوئے تھا۔ خود اس کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس مشرکانہ دعویٰ کے جرم میں وہ پکڑا گیا اور اس کی فعلی معیشت قدری معیشت سے بدل گئی ہے۔ افسوس! کہ موحد ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود شرک کے اس خطرناک قرآنی جرم کی مسلمان بھی پروا نہیں کرتے ۱۲

جس کے جواب میں دونے (یعنی ابرص اور گنجے نے) تو جواب میں وہی بات کہی جو عموماً مانگنے والے کو نہ دینے والا طبقہ ایسے مواقع میں کہا کرتا ہے۔ یعنی دونے کہا۔

المحقوق کثیرۃ — مجھ پر بہت لوگوں کے حقوق ہیں (تمہیں کہاں سے دوں)

روایت میں ہے کہ تب مانگنے والے نے ابرص سے کہا۔

کانی اعرفک الم تکن — شاید میں تو تجھے پہچانتا ہوں۔ کیا تو وہی
ابرص یقذرک الناس — کوڑھی آدمی نہ تھا کہ گھن آتی تھی لوگوں کو تجھ کو
فقیرا فاعطاک اللہ! — اور تھا تو ایک ننگا محتاج۔ پھر دیا اللہ تعالیٰ نے تجھی

اور یہی بات اس نے گنجے کو بھی یاد دلائی۔ یہ سن کر دونوں نے جواب میں کہا تھا۔

انما ورثت ھذا المال — نہیں! یہ دولت و ثروت تو مجھے اپنے بڑوں
کابرا عن کابر — سے ملی اور بڑوں کو بڑوں سے (یعنی پشتینی دولت ہے)

حدیث میں ہے کہ تب فرشتے نے دونوں کو یہ بددعا دی کہ ہ

ان کنت کاذبا فصیرک — اگر تو جھوٹا ہے تو جیسا تھا ویسا ہی ہو جائیگا
اللہ الی ما کنت۔ — (روایت میں ہے کہ وہی ہو گیا)

اور یہی مجھے کہنا تھا کہ ایسے مواقع پر اگر دونوں کی بسطی معیشت قدری معیشت سے بدل گئی یہی ایک یہ کھلی ہوئی دلیل ہوگی۔ اس بات کی کہ اس کی قدری معیشت قدرت کے انتقام اور عتاب کی شکل تھی۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کا بسطی رنگ عام طور سے کبر و غرور کے بھپارے پیدا کر کر کے اگر بسطیوں کو طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرے تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں ہے۔ قوت کا احساس اور اقتدار و اختیار کے دائرہ کی وسعت قدرتاً دلوں میں فرح و استکبار کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے۔ اتراتے اور اکڑتے ہوئے اگر ان کو دیکھا جائے تو حالات کے لحاظ سے یہ بعید نہیں لیکن قدری پیمانے پر روزی پلنے والوں کو بھی جب ان حالات میں مبتلا پایا جائے تو یقیناً بغاوت کی یہ کیفیت اس کی دلیل ہو گی کہ الیوں کی قدری معیشت اسی قسم کی قدرتی سزا ہے جو سزا یا فتوں کو دوسری سزاؤں کی مستحق بناتی چلی جاتی ہے۔ وہی جو حال بسطی معیشت کی سزائی قالب کا تھا۔ سمجھنا چاہئے کہ قدری معیشت کی یہ حالت بھی سزا ہی کا ایک قالب ہے۔ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے دن جن سے حق تعالیٰ نہ خطاب فرمائیں گے اور نہ ان کا تزکیہ کیا جائے گا اور حق تعالے

کی نظرِ شفقت وکرم سے جو محروم رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ وہ حسبِ ذیل لوگ ہوں گے۔:-

| | |
|---|---|
| شیخ زان وملک کذاب | بڈھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور محتاج |
| وعائل مستکبر! | اکڑفوں دکھانے والا! |

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، لیکن جن کی قدری معیشت ان حالات سے دوچار نہیں ہے۔ عام حالات میں سمجھنا چاہئے کہ بہر وہ امتحان ہی کی ایک شکل اسی طریقہ سے ہے۔ جیسے عام حالات میں معیشت کا بسطی رنگ بھی عموماً ابتلا اور امتحان ہی کا ایک قدرتی اسلوب ہے۔ البتہ قدری معیشت کا ایک پاکیزہ ترین قدسی رنگ وہ ہے جس سے سرفرازی کا استحقاق ہر بوالہوس کی قسمت میں نہیں ہوتا، اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ معیشت کے اس قدری رنگ کو اختیار کرنے والے مختلف اغراض ووجوہ سے خود اختیار کرتے ہیں، سید الانبیاء والرسل علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی طرف

| | |
|---|---|
| الفقر فخری | فقر ہی میرے لئے باعث فخر ہے! |

کے جس فقرہ کو منسوب کیا جاتا ہے، محدثانہ تنقید کے معیار پر ممکن ہے بجنسہ ان الفاظ کے انتساب کی صحت میں شک کیا جائے۔ لیکن پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے کی زندگی، بلکہ پیغمبر کے جانشینوں نے عموماً معیشت کے جس نقشہ کو دنیا میں پیش کیا، سب سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ بالا فقرہ کا مفاد ہے۔ بلکہ صحاح کی ایسی حدیثیں، مثلاً

| | |
|---|---|
| قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ | میرے سامنے مکہ کی سنگریزوں والی سرزمین |
| وسلم عرض علی ربی لیجعل لی | پیش کی گئی کہ اسے سونا بنا دیا جائے تو میں نے |
| بطحاء مکۃ ذھبا فقلت لا | عرض کیا، نہیں میرے رب! میں ایک دن سیر |
| یا رب ولکن اشبع یوما واجوع | رہوں اور ایک دن بھوکا رہوں یہ چاہتا ہوں |
| یوما فاذا جعت تضرعت الیک | تاکہ جب بھوکا رہوں تو گڑگڑاؤں آپ |
| وذکرتک واذا شبعت حمدتک | کے آگے اور یاد کروں آپ کو، اور جب |
| وشکرتک۔ | سیر رہوں تو شکر کروں آپ کا! |

(رواہ الترمذی واحمد وابن ماجہ ومشکوٰۃ)

اور اس حدیث میں تو صرف بسطی معیشت سے ہی انکار فرمایا گیا ہے۔ اسی مشکوٰۃ میں ترمذی اور بیہقی وغیرہ کے حوالے سے یہ مشہور حدیث بھی مروی ہے۔ جس میں قدری معیشت کی اپنے پیغمبرؐ نے

دعا فرمائی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال، اللّٰھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین!

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھئے اور مسکین ہی موت دیجئے! اور قیامت کے دن اٹھائیے مسکینوں کے گروہ میں!

نہ صرف اپنے لئے بلکہ پہلے بھی کہیں ذکر گذر چکا ہے کہ اپنے گھرانے اور آل کے لئے بھی آپؐ یہی دعا فرماتے تھے :۔

اللّٰھم اجعل رزق آل محمد قوتا!

اے پروردگار! محمدؐ کے گھرانے والوں کو روزی صرف قوت (یعنی خوراک) بھر دیجئے!

اور قدری معیشت کا یہ وہ قالب ہے جس کی روح تک نہ ہر شخص کی نظر پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کوتاہ آستینوں کا وہ گروہ کر سکتا ہے جس کے تنگ سینوں، تنگ نگاہوں میں انسانی زندگی کی وہ وسعتیں سما سکتی ہیں، جن کے اندر کائنات کا موجودہ محسوس نظام اور جو کچھ اس میں ہے، چند حقیر تنکوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہائے! ترمذی کی مشہور حدیث نبویؐ یعنی اللہ تعالیٰ نے (پیغمبرؐ) سے فرمایا :۔

اغبط اولیائی عندی لمؤمن خفیف الحاذ ذو حظ من الصلوٰۃ احسن عبادۃ ربہ واطاعہ فی السر وکان غامضا فی الناس لا یشار الیہ بالاصابع وکان رزقہ کفافا فصبر علیٰ ذالک!

قابل رشک دوست میرا وہ مومن بندہ ہے جو کم مایہ قلیل المعاش ہے لیکن نماز میں اسے حصہ ملا ہے، اپنے رب کی پوجا خوبصورتی سے کرتا ہے اور (علانیہ ہی نہیں)، پوشیدہ حالات میں اس کی اطاعت کرتا ہے اور لوگوں میں گمنام سا رہا (یعنی اپنے آپ کو نمایاں نہ کیا)، اس کی طرف انگلیاں نہیں اٹھائی جائیں، روزی اس کی بس ضرورت کے مطابق ہے اور اس پر صبر کئے رہا!

اللہ کے بعد اللہ کے وہی رسول جو تلاش کرنے والوں کو اپنا پتہ بتاتے ہوئے کبھی فرماتے :۔

ابغونی فی ضعفاءکم (ابو داؤد)

ڈھونڈا کرو مجھے ضعیفوں اور کمزوروں میں جا

آخر میں اسی خفیف الحاد (کم مایۂ جزر معاش) والے مومن کی طرف اپنی مبارک انگلیوں سے یہ اشارہ فرماتے ہوئے کہ بے چارہ کچھ دن دنیا میں جیا اور پھر آہ کہ

| | |
|---|---|
| عجلت منیته قلت بواکیه | پھر جلدی آگئی موت اس کی! بہت کم تھیں |
| قل تراثه! | اس پر رونے والیاں ترکہ بھی چھوڑا اس نے |
| | کم بچا! |

قابل رشک زندگی کے اس بلند مینار سے پر وہی قدم جما سکتا ہے جس پر آدم اور آدم کی اولاد کی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو، کہ ؎

ظاہرش را پشۂ آرد بہ چرخ　　باطنش باشد محیط ہفت چرخ

وہی یہ کہہ سکتا ہے اور اسی نے کہا بھی۔

| | |
|---|---|
| مالی وللدنیا ما انا والدنیا | میرا اور دنیا سے کیا تعلق، میرا حال اور دنیا |
| الا کراکب استظل تحت | کا حال تو ایسا ہے جیسے ایک سوار ہو چھاؤں |
| شجرۃ ثم راح وترکھا! | میں کھڑا ہوا کسی درخت کے، پھر درخت اور |
| (الترمذی فی جامعہ) | اس کی چھاؤں کو چھوڑ کر چل دیا! |

صدق مولینا العزیز!

| | |
|---|---|
| ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان | اور پچھلا گھر ہی ہے زندگی کا گھر! |

# اِسلامی معاشیات

حصّہ دوم

# اسلامی معاشیات

## کے

# قانونی ابواب!

اس وقت تک آپ کے سامنے اسلام کے معاشی کلیات جو زیادہ تر قرآن مجید کی آیات ہی سے ماخوذ ہیں، پہلی جلد کی شکل میں پیش ہوئے ہیں۔ اب ان ہی کلیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام میں جو قوانین نافذ کئے ہیں فقہائے اسلام نے قرآن اور سنت کی روشنی میں جن جزئیات کو پیدا کیا ہے ان کی تفصیل اس حصہ میں آپ کو ملے گی!

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

# قانونی ابواب

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اس وقت تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے، جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہو لیں۔ ان ہی چار گانہ سوالات میں ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہوگا کہ:۔

| | |
|---|---|
| عن ماله من این اکتسبه | آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال سے یعنی |
| وفیما انفقه: | اس مال کو کن ذرائع سے اس نے حاصل کیا |
| | اور کن راہوں پر خرچ کیا! |

سچ پوچھئے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق ان ہی دو باتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں خیال کیجئے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانوں کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اس کی تفصیل پیش ہو گی۔ دولتِ عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی سیاسی و معاشی کتاب "کتاب الخراج" جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی قاضی صاحب نے تمہیدِ کلام میں اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اس معاشی ضابطہ کے اساسی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر فقہاءِ اسلام رحمہم اللہ اجمعین نے جزئیات کے متعلق دفتر کے دفتر جو تیار کر دیئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں ان سب کا احاطہ نا ممکن ہے۔ تاہم کوشش کروں گا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آئندہ کام کرنے والے اس پر اور اضافہ کریں۔

# معاشیات کے دو اسکول

**پہلا اسکول** واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربے کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا گیا ہے جو مالیات یا تحصیل دولت و صرف دولت دونوں کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے "کمانا چاہیے" خواہ کسی ذریعہ سے ہو "اڑانا چاہیے" خواہ خرچ کی جو راہیں بھی ہوں!

اس سلسلہ میں یہاں تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے۔ یعنی نماز روزہ، ورد و وظائف، حج و قربانی، ان تمام امور کے، وہ پابند ہوتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ، جو اس قسم کی مذہبی پابندیوں کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں۔ مالیات کے مسئلہ میں ہر قسم کی بے قیدیوں کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہیں۔ اس مکتب خیال، یا مسلک عمل کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر میں کیا ہے۔ یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیوں کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ:-

قالوا یا شعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آباءنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء!

(سورۂ ہود ع ۹)

انہوں نے کہا، شعیب! کیا تمہاری نمازیں یہ حکم کرتی ہیں کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے انہیں ہم چھوڑ بیٹھیں اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق جو چاہیں کریں (اس میں یہ روکاوٹ پیدا کرتی ہیں)

صرف یہی نہیں، بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرز عمل پر اظہار تعجب کیا اور ان کی عقل و فہم، جس کا ایک مدت سے تجربہ تھا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالوں نے طنزیہ لہجہ میں کہا کہ:-

انک لانت الحلیم الرشید

(سورۂ ہود)

تم تو بڑے بھاری بردبار، باوقار سوجھ بوجھ کے آدمی ہو!

بہرحال معاشیات کا تو یہ ایک آزاد مکتب خیال ہے۔ تحصیل دولت کے ذرائع پر بغیر

ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سُوجھ بُوجھ، عقل و دانائی کے خلاف ہے، بلکہ جس کو جس وقت، جس ذریعہ سے بھی حصولِ دولت کا موقع ملے، یہ عقلی ہوگی کہ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے یا روپیہ رہتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو، آدمی پُوری نہ کرے۔ قرآن نے جن الفاظ میں ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگوں کے خیال میں پُوجا پاٹ یا "صلوٰۃ" میں منحصر ہے۔ معاشی کاروبار میں اس کی دخل اندازیوں کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ تمہاری نمازیں کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہیں کریں؟

**دُوسرا مکتب خیال** اسی کے مقابلہ میں معاشیات ہی کا ایک دُوسرا اسکول بھی ہے جو دُوسرے پہلوؤں کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود میں رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی وہی بات جو حدیث میں آئی کہ

من این اکتسبہ وفی ما انفقہ؟

(کہاں سے کمایا اور کس راہ میں خرچ کیا ہے؟)

دونوں پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے میں اس طبقہ کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ عملی طور پر خواہ اس اسکول کے ماننے والوں کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو، لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم ازکم زبان سے اس نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے۔ اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائٹیوں میں ہمیشہ بُری نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ غالباً اسی بنا پر دُنیا کی ہر قوم اور ہر ملک میں حدبندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہیں، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے۔ اور اس وقت میں انہیں پابندیوں کی کلی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ جو ان دونوں امور یعنی من این اکتسبہ یا دُوسرے لفظوں میں "دخل" اور "فیما انفقہ" یا "خرچ" پر اسلام نے عائد کئے ہیں۔ دونوں سوالوں پر دو مستقل عنوانوں کے نیچے بحث کی جائے گی۔

## دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عائد کئے ہیں۔ اس کی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہئے کہ اجمالاً پہلے دنیا کی چیزوں کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے

جو معاشی حقیقت سے اسلام میں اختیار کی گئی ہے۔

**اسلام میں اشیاء کی معاشی تقسیم**

واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل میں منتشر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر منطقی طریقہ سے چاہیں تو ہم ان کو یوں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ان چیزوں کا بنی آدم میں کوئی مالک ہے یا نہیں؟ اگر مالک نہیں ہے، تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی ان کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں اسی طرح جن چیزوں کا کوئی مالک ہے، ان کی بھی دو صورتیں ہیں، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسروں کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتیں ہیں۔ اور نہیں دیتا ہے تو پھر ان چیزوں کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہیں؟ اور اسلام ان قانونی پابندیوں کو ان چیزوں کے مالک ہونے کے لئے کیوں ضروری قرار دیتا ہے۔ چونکہ ان تمام منطقی شقوں کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزیں داخل ہیں۔ اس لئے میں ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہوں۔

• ایسی چیزیں جن کا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی مالک نہیں ہے: ہدایہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| الانتفاع بماء البحر | سمندر دریا کے پانی سے استفادہ کی نوعیت |
| کالانتفاع بالشمس والقمر | وہی ہے جو آفتاب، ماہتاب اور ہوا سے |
| والھواء | استفادہ کا حکم ہے (یعنی ہر شخص کو ان سے |
| (کتاب الشرب ج ۴) | استفادہ کا عام حق حاصل ہے۔ |

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر، دریا وغیرہ اور ان کا پانی اور آفتاب، ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اسی طرح ہوا کے پرندے، جنگل کے جانور، سمندر کے حیوانات ان سب کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی مالک ہے اور نہ ان کے پھلوں کا، بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعاً مباح اور جائز ہیں۔ قاضی ابو یوسف "کتاب الخراج" میں اخروٹ، بادام وغیرہ کے خود رو جنگلی درختوں اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| اذا کان فی المفاوز | جب یہ چیزیں صحرا اور پہاڑوں میں درختوں |
| والجبال علی الاشجار او فی | میں، یا پہاڑ کے غار میں ہوں تو ان پر کچھ نہیں |
| الکھوف فلاشیٔ فیہ وھو | (یعنی حکومت ان پر کوئی محصول عائد نہیں کر |
| بمنزلۃ الثمار تکون فی | سکتی) اور ان کا حال ان پھلوں کا سا ہے |

الجبال والاودیۃ ۔ جو پہاڑوں اور وادیوں میں ہوں!

باقی اراضی، یعنی زمین کی بھی اسلام میں چند قسمیں ہیں۔ صاحب بدائع نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| والارض فی الاصل نوعان | زمین کی دراصل دو قسمیں ہیں، زمین جو کسی کی |
| مملوکۃ والارض مباحۃ | ملک ہو، ایک قسم، دوسری قسم مباح یعنی کسی کی |
| غیر مملوکۃ والمملوکۃ نوعان | ملکیت میں نہ ہو، پھر جو زمین کسی کی ملک ہے |
| عامرۃ وخراب والمباحۃ | اس کی بھی دو قسمیں ہیں آباد اور غیر آباد۔ اسی |
| ایضاً نوعان نوع ھو من | طرح غیر مملوکہ مباح زمین کی بھی دو قسمیں ہیں |
| مرافق البلد ومحتطبا لھم | ایک وہ جس کا شمار بلدہ (آبادی) کی سہولت |
| ومرعی لمواشیھم ونوع | آفرینیوں سے ہو، مثلاً لکڑی حاصل کرنے کی جگہ |
| لیس من مرافقہا وھو | ہو، مویشیوں کی چراگاہ ہو، اور دوسری وہ |
| المسمّی بالموات! | جس کا شمار مرافق سہولت آفرین خطہ سے نہ ہو |
| | اسی کا نام "الموات" ہے! |

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمیں غیر مملوک بھی ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ نہیں تو ان کے مملوک ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ سوال اس کے بعد ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے تملیک کی کیا شکل ہے۔ عام طور سے ان چیزوں کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے جو عموماً دنیا میں مروّج ہے۔ ابوداؤد میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:۔

| | |
|---|---|
| من سبق الی مالم یسبق | جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ نہ ہو، جو پہلی دفعہ |
| الیہ مسلم فھو احق بہ | قبضہ کرے گا وہی اس کا زیادہ حقدار ہے! |

فقہانے اس حدیث کی بنا پر یہ قانون پیدا کیا۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| من سبقت یدہ الیہ | پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا، وہی |
| ملکہ۔ | اس کا مالک ہو جائے! |

مثلاً کہتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| من احتطب احتطب فی | جنگل میں جو لکڑی کاٹ لے اور شکار کو |
| مغازۃ فھو لہ ومن | جو شکار کرلے وہ اسی کا ہوگا! |

استطرادمیدآ فہولہ؛

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزیں ایسی ہیں، جن کو اسلام میں بعض خاص شرائط کے ساتھ اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں، جن پر کسی کا قبضہ ہی نہیں ہو سکتا اور ان کو وہ اپنی حفاظت میں نہیں لے سکتا۔ مثلاً آفتاب و مہتاب، ہوا وغیرہ، ان کا تو ظاہر ہی ہر کہ آدمی مالک نہیں ہو سکتا۔ ہدایہ میں ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| الانتفاع بالشمس والقمر والھواء فلا یمنع من الانتفاع بہ علی ای وجہ شاء۔ | آفتاب، ماہتاب، ہوا سے فائدہ اٹھانے سے کوئی روکا نہیں جا سکتا جس طرح چاہے ان سے استفادہ کر سکتا ہے! |

اسی بنا پر فقہا، کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کوئی اگر مالک ہوا اور اوپر والی منزل کا کوئی اور، پھر اوپر والی منزل اگر گر جائے تو اس فضا یا ہوا کو جس میں یہ اوپر والی منزل تھی اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا۔ ابنِ ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہے کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا، وہ:-

| | |
|---|---|
| حق متعلق بالھواء ولیس الھواء مالا یباع۔ | ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم ہے، اور ہوا کوئی مال نہیں ہے جسے بیچا جائے! |
| (۲۲، مطبوعہ مصر ج ۵) | |

**اشتراکی سرمایہ پانی، آگ، گھاس**

لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں، جن پر خواہ کسی کا قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر قانوناً کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہیں عام پبلک پراپرٹی قرار دینا چاہتا ہے اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یعنی مشہور حدیث ہے:-

| | |
|---|---|
| الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار۔ | لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساجھی اور شریک ہیں۔ الماء (پانی)، الکلاء (گھاس) النار (آگ) |
| (صحاح) | |

اسی حدیث کی بنا پر پانی، گھاس، آگ میں "الناس" یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے۔

**اشتراکی سرمایہ کے ملحقات**

لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملک قرار

دینے کی صورت میں اندیشہ ہے، کہ :-

ملکه احد بالاحتجار ملک منعه فضاق على الناس فان اخذ العوض عنه اغلاه فخرج عن الموضع الذى وضعه الله من تعميم ذوى الحوائج من غير كلفة !

"المغنی"

(ص ۱۵۵ ج ٦)

اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک بن جائے گا تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام ضیق تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے گراں دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو جو مقام عطا کیا تھا وہاں سے وہ چیز ہٹ جائے گی یعنی عام حاجت مندوں کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری ہو، یہ بات رہ جاتی ہے!

اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے، جو اس سلسلہ میں حسب ذیل چیزوں کا اضافہ کیا ہے :-

المعادن الظاهرة وهى التى يوصل مافيها من غير مؤنة ينتابها الناس وينتفعون بها كالملح والماء والكبريت والقير والموميا والنفت والكحل والياقوت ومقاطع الطين وما شباه ذالك ۔

ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں، جن تک بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل ہو سکے، لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں، مثلاً نمک، گندھک، پیچ ڈولس، مومیائی، نفت (مٹی کا تیل)، سرمہ یاقوت، یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو!

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ چیزیں :-

لا تملك بالاحياء ولا يجوز اقطاعها لاحد من الناس ولا احتجار دون المسلمين لان فيه ضرر بالمسلمين وتضيقا عليهم

نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر ملنے کی وجہ سے ان امور کا کوئی مالک ہو سکتا ہے اور نہ گھیرا جا سکتا ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی!

فقہانے اس قانون کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے۔ جو ابو داؤد، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر مآرب (یمن) کے ایک کھارے چشمے کو بطور جاگیر کے عطا فرما دیا لیکن سند لے کر جب وہ روانہ ہوئے تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ نے خیال نہیں فرمایا کہ اس شخص کو جاگیر میں کیا چیز عطا فرمادی گئی؟ وہ تو ایک نہ ختم ہونے والا جاری چشمہ ہے!

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا "فلا اذن" یعنی جب وہ ایسا چشمہ ہے تو پھر وہ جاگیر میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے فقہانے یہ طے کر دیا ہے کہ حکومت اس قسم کی چیزیں کسی کو جاگیر میں دے، جب بھی وہ کسی کی جاگیر نہیں بنے گی۔ اور وہ ہر حال میں پبلک جائداد ہی رہے گی۔

علاوہ ان معادن کے فقہاء نے انہیں مصالح کی بناء پر لکھا ہے کہ:-

لیس للامام ان یقطع مالا
غنی للمسلمین عنہ یعنی
اذا کانت اجمۃ او
غیضۃ او مجرّیشربون
منہ او محلۃ لاھل بلدۃ
فلیس للامام ان یقطع
ذٰلک لاحد.
(عنایہ برحاشیہ ہدایہ ص ۳۰۲ ج ۴)

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے مثلاً اجمہ (آبی نیستان) ہو، یا جنگل ہو یا دریا ہو، جس سے پانی پیتے ہوں یا منگ بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو جائے تو نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے دے

اسی طرح آبادی کی چراگاہیں، یا اردگرد کی جھاڑیوں، جن سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں، یا آبادی کے اطراف کی ایسی زمین جن پر کھلیان وغیرہ لگاتے ہیں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو، تو فقہا نے لکھا ہے

ما کان خارج البلد من
مرافقہا و محتطبا لاھلہا
او مرعی لھم لا یکون
مواتا حتی لا یملک الامام
اقطاعہا.

آبادی سے باہر جو سہولت کی چیزیں ہوں اور باشندوں کی لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہو تو یہ ساری چیزیں نہ موات (ایسی زمین جس کو آباد کر کے کوئی ذاتی ملکیت بنالے) اور نہ امام (حکومت) کسی کو جاگیر میں یہ چیزیں دے سکتی ہے!

زیلعی نے اس دفعہ کو نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ :۔

| | |
|---|---|
| فناء العامر فینتفعون | آبادی کے اطراف واکناف کی زمین کا |
| به لانهم محتاجون | بھی یہی حکم ہے کہ عام لوگ اس سے |
| الیه لرعی مواشیهم | نفع اٹھاتے ہیں۔ لوگ اپنے مویشیوں کے |
| وطرح حصائدهم | چرنے کیلئے کھلیان لگانے کے لئے اس |
| فلم یکن انتفاعهم منقطعا | کے محتاج ہیں اور اس وجہ سے استفادہ کا جو |
| عنه ظاهرا فلا یکون | حق ہے وہ اس قسم کی زمینوں سے منقطع نہیں ہو |
| مواتا! | سکتا۔ اس لئے اس کا شمار الموات (آباد کر |
| (زیلعی برہدایہ ص ۳۸۰ ج ۴) | کے آدمی جس کا مالک ہو سکتا ہو) میں شمار نہیں ہو سکتا |

اسلام نے جب ان چیزوں میں انفرادی ملک کو ناجائز ٹھہرایا ہے تو ظاہر ہے۔ کہ شاہراہ عام یا عام آبپاشی کے ذرائع جنہیں یوں بھی پبلک کی ملک خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں انفرادی ملک کو کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جس طرح مندرجہ بالا امور کو حکومت کسی کی انفرادی ملک نہیں قرار دے سکتی اسی طرح

| | |
|---|---|
| لا اقطاعه کمشارع الماء | جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں |
| وطرقات المسلمین! | کی عام شاہراہوں کو حکومت کسی کی جاگیر |
| (ابن قدامہ ص ۱۵۸ ج ۶) | میں دے دے! |

نہ حکومت دے سکتی ہے اور نہ آبادی کے باشندے ان پر قبضہ کر کے اپنی ملک بنا سکتے ہیں۔ کفایہ شرح ہدایہ میں ہے :۔

| | |
|---|---|
| وکذا لا یجوز احیاء ما | یوں ہی آباد کر کے قبضہ کرنے کی اجازت |
| تعلق به حق العامة | ان چیزوں کے متعلق بھی نہیں دی جا سکتی |
| کما فی النهر والطریق! | جن کے ساتھ عوام کا حق متعلق ہو مثلاً نہر |
| (ص ۳۸۲ ج ۴) | اور راستہ کا جو حکم ہے۔ |

خلاصہ یہ ہے۔ کہ پانی، آگ، گھاس، اور ایسے معادن جن کی پیداوار کے حاصل کرنے میں کسی محنت و مشقت، جدوجہد اور معاوضہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور عام لوگوں کی ضرورت کی چیزیں ان سے برآمد ہوتی ہوں، آبادی کی چراگاہیں، جنگل جھاڑ، بن کا کوئی مالک نہ ہو، آبادی

کے اطراف کی وہ زمین جس میں آبادکار اپنے زرعی کاروبار کرتے ہوں۔ مثلاً کھلیان، ونیرہ لگاتے ہوں۔ یا شوارع عام (عام راستے) یا آبپاشی کے عام نالے وغیرہ۔ ایسی چیزیں نہ حکومت کسی کو انفرادی طور پر ان کا مالک بنا سکتی ہے اور نہ قبضہ کر کے خود کوئی ان کو اپنی انفرادی ملک بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی قبضہ بھی کرے گا تو قانوناً غلط ہوگا اور ہمیشہ یہ پبلک جائداد ہی سمجھی جائیگی گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اسلام ان امور کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اشتراکی رکھتا ہے۔ اجمالی طور پر تو ان امور کا یہی حال ہے۔ لیکن فقہاء نے ان کی مختلف قسموں پہ غور کیا ہے۔ اور بعض چیزوں کو اشتراک کے اس حکم سے مستثنیٰ بھی کیا ہے۔ مثلاً پانی کی انہوں نے چار قسمیں قرار دی ہیں۔

## پانی کی مختلف قسمیں اور ان کے مختلف احکام

صاحبِ بدائع لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| المیاہ اربعۃ انواع | پانی کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم پانی کی |
| الاول الماء الذی یکون | وہ ہے جو برتنوں اور ظروف میں ہو |
| فی الاوانی والظروف | دوسری قسم وہ ہے جو کنوؤں اور حوضوں |
| والثانی الذی یکون فی الآبار | اور چشموں میں ہو۔ تیسری قسم وہ ہے |
| والحیاض والعیون الثالث | جو ان چھوٹے دریاؤں اور ندیوں |
| ماء الانہار الصغار التی | میں ہو جن کا تعلق خاص قوموں |
| تکون لاقوام مخصوصین | سے ہو، چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے |
| والرابع ماء الانہار العظام | بڑے دریا جیسے جیحون اور سیحون |
| کجیحون وسیحون ودجلہ | دجلہ وفرات وغیرہ میں ہو! |
| والفرات۔ | |

## بڑے بڑے دریا کا پانی

پانی کی ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے کہ جو پانی بڑے بڑے دریا، مثلاً جیحون وسیحون یا ہندوستان میں گنگا، جمنا، کرشنا، گوداوری کا ہے، یہ ملک کے تمام باشندوں کا پانی ہے۔ ہر شخص کو اس سے خود پینے کا، جانوروں کو پلانے کا اور کھیتوں باغوں کو سینچنے کا قانونی حق ہے۔ صاحبِ بدائع لکھتے ہیں۔

الانهار العظام کجیحون
وسیحون ودجلة الفرات
ونحوها ملا ملك لاحد
فيها ولا في رقبة
النهر ولا لاحد حق
خاص فيها ولا في الشرب
بل هو حق عامة المسلمين
فلكل احد ان ينتفع
بهذه الانهار بالشفة
والسقي.

بڑے بڑے دریا مثلاً سیحون اور جیحون
دجلہ و فرات اور اسی قسم کے جو دریا
ہیں یہ کسی کی ذاتی ملک نہیں بن سکتے، نہ
ان کے پانی کا کوئی ذاتی مالک ہو سکتا
ہے اور نہ اس رقبہ زمین کا جس میں ان
دریاؤں کا پانی بہتا ہے اور نہ کسی خاص
شخص کا ان کے ساتھ کوئی ذاتی حق
متعلق ہو سکتا ہے۔ نہ آبپاشی کا ذاتی حق
ان دریاؤں کے متعلق کسی خاص شخص کو
حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ عام مسلمانوں
کا حق ہے۔ اسی لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ کہ ان دریاؤں سے وہ نوشیدنی اور سیرابی
دونوں قسم کے منافع حاصل کر سکتا ہے۔

## بڑے دریاؤں سے نہروں کا نکالنا

صرف یہی نہیں بلکہ ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین میں لائے اور کسی دوسرے کی زمین اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچتا ہو تو کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے، حتیٰ کہ حکومت بھی یہ نہیں کر سکتی۔
بدائع میں ہے:-

له ان يشق اليها نهرا
من هذه الانهار وليس
للامام ولا لاحد منعه
عنه لعدم بهم اولم
يضر

اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ کہ اپنی
زمین تک ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر لے
جائے اور نہ امام (حکومت) ہی کو اس کا حق
ہے اور نہ کسی اور کو کہ اس فعل سے اس کو روکے
بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہنچے

## ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ چلانا یا موٹ چرس ان پر قائم کرنا

اسی طرح ہر باشندہ ملک کو اس کا بھی حق ہے کہ اس قسم کے دریاؤں اور ندیوں پر:-

ان ينصب عليه رحى

کہ ان پر پن چکی، اور رہٹ موٹ

والدالية والسانية (ہدایہ) وغیرہ قائم کرے!

البتہ حکومت اور پبلک دونوں کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہر یا دریا کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کی نگرانی کریں۔ بدائع ہی میں ہے :۔

| | |
|---|---|
| کل واحد بسبيل من | اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل |
| الانتفاع لكن بشريطة | ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا |
| عدم الضرر بالنهر | کچھ نقصان نہ ہوتا ہو یہی حکم اس کا بھی |
| كالانتفاع لطريق العامه | ہے جو عام شاہراہوں کا ہے لیکن اگر اس |
| وان اضر بالنهر فلكل | سے نہر کو نقصان پہنچتا ہو تو ہر مسلمان کو حق |
| واحد من المسلمين منعه | ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے۔ |

## دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام

اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد کی زمین میں جو نہریں ہوتی ہیں، یا مملوکہ زمینوں کے تالاب اور کنوؤں کا پانی۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ :۔

| | |
|---|---|
| حق الشفة ثابت | نوشیدنی کا ہر حق پبلک کے ہر فرد کو |
| | اس میں حاصل ہے۔ |

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے۔ البتہ چونکہ مملوکہ زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے۔ اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہدایہ میں ہے :۔

| | |
|---|---|
| فان اراد رجل ان يسقى | اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس |
| بذلك ارضا احياها | قسم کے پانی سے سینچنا چاہے، تو نہر |
| كان لاهل النهر ان | والوں کو حق ہے کہ اس کو روک |
| يمنعوه عنه اضر بهم | دیں، خواہ نقصان ہو یا نہ ہو! |
| اولم يضر۔ | |

(ہدایہ ص ۳۸۶ ج ۴)

## نہروں، کنوؤں، تالابوں کے پانی کی فروخت کا حکم

مگر باایں ہمہ اس قسم کے پانی کے بیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت نہیں ہے۔ فقہا اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں :۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع نقع البیر

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنوؤں کے سوتے کے پانی کو کوئی فروخت کرے۔

"نقع البیر" کا ترجمہ صاحب بدائع نے "فضل مائہا" یعنی کنوؤں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے۔ بہرحال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا باؤلیوں سے آبپاشی کی عام اجازت دے دی جائے گی تو جیسا کہ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

کل احد یتبادر الیہ فیسقی منہ زرعہ واشجارہ فیبطل حقہ اصلا

ہر شخص پیشقدمی کر کے اس پانی سے نفع اٹھانا چاہے گا اور اس سے اپنے کھیت اور باغ کو سیراب کرے گا۔ پس نہر والوں کا حق مارا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف "حق الشفۃ" یعنی نوشیدنی تک محدود ہے۔ پھر فقہاء نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین میں آنے سے روکے اور کہے کہ قانوناً پانی پر تمہارا حق ہے لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں، تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا۔ اگر نوشیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے تو جھگڑنے کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوؤں کے مالک کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ لوگوں کو اپنے کنوئیں سے پانی لینے دے ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگوں تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے۔ یعنی ان کے اور ان کے جانوروں تک پانی پہنچ جائے۔ اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونوں باتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے جنگ کریں اور اپنا حق حاصل کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا۔

ہلا وضعتم فیہم السلاح؟ (بدائع)

تم نے لوگوں کے درمیان ہتھیار کیوں نہ ڈالا؟

## پانی کی وہ قسم، جو بک سکتی ہے!

یعنی پانی کی چوتھی قسم، یعنی جب برتنوں یا مشکوں میں پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی میں انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں کہ اب اس پانی کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ:۔

| | |
|---|---|
| کما استولی علی الحطب | کوئی اگر جنگل کی لکڑیوں اور گھاس اور شکار |
| والحشیش والصید۔ | پر قابو پالے (تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے) |

کہ ان چیزوں سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کو حاصل ہے۔ لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا، تو قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہیں، اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے:۔

### فیجوز بیعہ!

اور ایسی صورت میں (مشک برتن وغیرہ) کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے!

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| السقاؤن یبیعون المیاہ | برتنوں میں جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو |
| المحروزۃ فی الظروف بہ | اس کو بہشتیوں کی جماعت ہمیشہ بیچتی رہی |
| جرت العادۃ فی الامصار | ہے، تمام شہروں اور ملکوں میں اس کا |
| فی سائر الاعصار من | عام رواج ہے اور کسی نے اس پر |
| غیر تکبیر (بدائع) | اعتراض نہیں کیا۔ |

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| فلم یحل لاحد ان یاخذ | جائز نہ ہوگا کہ پانی کے مالک کی اجازت |
| منہ فیشرب من غیر اذنہ | کے بغیر کوئی اس کو لے اور پئے! |

البتہ ایسی صورت میں کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے اور دوسرے کے برتن میں زائد ضرورت پانی ہو تو غیر مسلح لڑائی کر کے بھی پانی زبردستی چھین کر پی سکتا ہے۔

### شدید ضرورت کی چیزوں میں اشتراکیت کا نقطہ نظر

اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہلاکت کے اندیشے کی صورت میں زائد

ورت بجیز دوسرے سے آدمی زبردستی چھین کر استعمال کر سکتا ہے خواہ کھانا ہو، یا اسی کی دوسری چیز۔ ہدایہ میں ہے کہ۔

| | |
|---|---|
| وکذا الطعام عند اصابة المخمصة۔ (ص ۲۰۲ ج ۴) | یہی حکم کھانے کا بھی ہے، شدت بھوک میں۔ |

## مملوکہ پانی میں بھی اشتراکیت کا اثر

لیکن پانی برتن والا ہی کیوں نہ ہو، حدیث میں چونکہ (الماء) مطلق پانی میں عام لوگوں کو ب قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے فقہائے اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلا ضرورت اگر کسی کی مشک ن سے آدمی پانی چرا لے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ لگایا جائے گا خواہ پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو۔ جس کے چرانے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ ہدایہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| لو سرقه انسان فی موضع یعز وجوده وهو یساوی نصابا لم تقطع یده (کتاب الشرب جلد ۴ ص ۳۸۶) | اگر کسی ایسے مقام میں جہاں پانی مشکل سے میسر آتا ہو اور کوئی (برتن سے) پانی کو چرا لے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا خواہ پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس پر کہ ہاتھ کٹتا ہے |

، بہرحال ایک گونہ شرکت کا شبہ اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور شبہ سے اس قسم کی سزائیں اتی ہیں۔

## مچھلیوں کا حکم

پانی ہی کے ذیل میں مچھلیوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح ہوا ندوں کا کوئی مالک نہیں ہے اور جو ان پر قبضہ کر لے گا وہی مالک ہو جاتا ہے محض اس کسی تالاب یا باغ، یا کھیت میں یہ پرندے چرتے چگتے ہیں۔ یا رہتے ہیں کوئی ان کو ت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ حکومت کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے۔ کہ اس قسم کی خشکی یا کے جانوروں کو کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| الامام لا یملک ان یخص واحدا دون واحد بذلک حتی لو امر واحدا ان یاخذ شیئا صیدا بعینه | (امام حکومت) کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ کسی خاص شخص کو ان امور کی خصوصی ملکیت عطا کرے تاآنکہ اگر کسی کو امام حکم دے کہ فلاں خاص شکار کو پکڑے، خواہ |

من براد بھولا یملک المامور | خشکی کا ہو یا دریا کا۔ تو جسے حکم دیا گیا ہو
قبل الاخذ والاصطیاد! | وہ شکار پکڑنے سے پہلے اس شکار کا مالک
(ہدایہ ص ۳۰۰ ج ۴) | نہیں ہو سکتا!

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانوروں کا یہ حکم ہے۔ تو مچھلیاں، جن کی حیثیت پانی میں وہی ہے جو ان وحشی پرندوں کی ہوا میں ہے۔ ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہیں؟

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک خاص باب اس مسئلہ میں باندھا ہے خود اُن کا اور امام ابو حنیفہؒ کا خیال یہی ہے۔ کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ غیر مملوک شئی کی بیع ہے۔ بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ خریدار کے متعلق دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے۔ کہ پانی کے اندر کا حال اس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے یہ فتوےٰ قاضی صاحب نے نقل کیا ہے:۔

لا تبیعوا السمک فی الماء | مچھلی کو پانی کے اندر نہ بیچا کرو کہ اس
فانہ غرر! | میں دھوکہ ہے!

اسی قسم کے الفاظ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے اسی کتاب الخراج میں یہ بھی مروی ہے۔ برس نامی مقام میں جو یمن میں واقع ہے:۔

انہ ومنع علی اجمۃ برس | برس نامی مقام کے آجمہ (آبی نیستان) پر
اربعۃ الاف درھم | حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے چار ہزار درہم مشخص
وکتب لھم کتابا فی | فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کو
قطعۃ آدم! | اس کا پٹہ لکھ کر دیا۔ (اجمہ کے لفظ کی
(کتاب الخراج ص ۹۵) | تحقیق آگے آرہی ہے)

صرف یہی نہیں کہ حکومت نے اس خزانۂ آب کو چار ہزار درہم میں بندوبست کیا۔ بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی اس کتاب میں مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمٰن نے، جو اُن کے صوبہ دار تھے۔ اُنہوں نے:۔

یسئلہ عن بیع صید | آجام (آبی نیستانوں) کے شکار کے متعلق
الآجام | دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے؟

جواب میں عمر بن عبدالعزیز نے فرمان بھیجا۔

| | |
|---|---|
| ان لا باس به فسماه | اس کے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں |
| الحبس (کتاب الخراج ص ۱۱۱) | ہے اور اس کا نام انہوں نے الحبس رکھا۔ |

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیوں کے متعلق ابتدا سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے۔ خود قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایسے گڑھے میں مچھلی ہو جو بغیر شکاری تدبیروں کے ہاتھ آجائے، تو اس کے بیچنے میں حرج نہیں، بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہیں:

| | |
|---|---|
| ومثله اذا كان يوخذ | ایسا ہی حال ان مچھلیوں کا ہے جو بغیر |
| بغير صيد كمثل سمك في | شکاری تدبیروں کے پکڑی جاتی ہوں جیسا |
| الجب | کہ ان مچھلیوں کا بیچنا جائز ہے جو کنویں |
| (کتاب الخراج ص ۱۱۱) | میں ہوں۔ |

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمندروں، دریاؤں ندیوں وغیرہ کی مچھلیاں۔ جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں۔ ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی اور بیچ سکتا ہے۔ بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے، ملک کے ہر باشندے کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہے۔ البتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتوے کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ خصوصاً ایسی مچھلیاں جنہیں اس زمانہ میں لوگ اپنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں، یعنی ان کے بچے، جنہیں زیرہ کہتے ہیں خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن آبادیوں کے اطراف و جوانب کے تالابوں یا جوہڑوں میں جو قدرتی خود زائیدہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اگر زمیندار اور جاگیردار ان کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کر لینے کی بغیر کسی معاوضہ کے اجازت دے دیا کریں تو کم از کم سنی مذہب کی رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہوں گے۔

## مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں کا حکم

مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا بھی سوال اسلامی

قعر میں اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے امام ابوحنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ جس قسم کی چیز بھی ہو اس کی کتنی ہی قیمت ہو مثلاً عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے۔ یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے۔ جس کا جی چاہے انہیں نکال سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے، حکومت تک کو اس سے کسی قسم کا محصول لینے کا حق نہیں ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اس کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور لکھا ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| قد کان ابو حنیفة و ابن ابی لیلیٰ یقولان لیس فی شیٔ من ذالك شیٔ لانه بمنزلة السمك۔ | اور حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی وغیرہ) میں سے کسی پر کوئی محصول یا ان کی قیمت وصول نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے |

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے خود یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزیں جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں (مثلاً موتی، مرجان، عنبر وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| فی ذالك خمس واربعة اخماسه لمن اخرجه۔ | حکومت ان پیداواروں سے پانچواں حصہ وصول کریگی اور باقی چار پنجے (خمس) اس شخص کے ہوں گے جس نے اسے نکالا۔ |

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزوں کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے، جو امام کا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| اما فی غیرها فلا شیٔ فیه، | جو چیزیں بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں ان کے سوا سمندر کی اور چیزوں پر کچھ نہیں ہے۔ |

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے انہوں نے حلیہ اور عنبر کو مستثنیٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یعلی ابن امیہ کو حضرت عمرؓ نے بحر (سمندر) کے علاقوں یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ یعلی نے بارگاہ خلافت میں لکھ کر پوچھا۔

| | |
|---|---|
| عنبرة وجد لا رجل بساحله | عنبر (مچھلی جس سے عنبر نکلتا ہے) ایک شخص کو ملی |

| | |
|---|---|
| منها وعما فيها ! | ہے۔ وہ اس میں اور جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا اس کے متعلق پوچھتا ہے۔ |

جواب میں یہ فرمایا گیا:۔

| | |
|---|---|
| فیما اخرج الله جل شانه من البحر الخمس (کتاب الخراج) | سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو برآمد کرتے ہیں ان میں پانچواں حصہ (خمس) حکومت کا حق ہے! |

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں۔ خود بھی فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وذالک رائی | اور میری بھی یہی رائے ہے! |

بہر حال یہ سارے مباحث تو البحار (پانی) کے تھے۔ جس میں آں حضرتؐ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے۔ گذشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراکی نظریہ کی تفصیل تھی۔

## سیّال معدنیات کے احکام

پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیّال "معادن" کو فقہائے اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے۔ حتیٰ کہ قاضی ابو یوسف نے تو کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھ دیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| لیس فی النفط والقیر والزیبق والمومیا ان کان یشئی من ذالک عین فی الارض شئی تعلمه کان فی ارض عشر او فی ارض خراج | جہاں تک میں جانتا ہوں مٹی کے تیل (نفط) اور قیر (تارکول) مومیائی میں کچھ نہیں ہے بشرطیکہ زمین سے ان کا کوئی چشمہ ابلتا ہو خواہ یہ چشمے عشری زمین میں ہوں۔ یا خراجی زمین میں! |

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے۔ ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے۔ ان معدنی چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ گنجائش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آ چکا ہے۔ لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| لا تملک المعادن الظاهرة کالملح والقار والکحل | ایسے معادن جنہیں معادن ظاہرہ کہتے ہیں مثلاً نمک اور قار (تارکول) سرمہ |

والجص والنفط بالاحیاء ولیس للامام اقطاعہ (ج ۶)

نفط ـ مٹی کا تیل ـ وغیرہ کے بعض معدن کا کوئی شخص ذاتی طور پر مالک نہیں ہو سکتا ـ نہ احیاء اور آباد کر کے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت کو حق ہے کہ کسی خاص شخص کی جاگیر میں ان چیزوں کو دے ۔

یہ تو متن کی عبارت ہے ـ شرح اس کی یہ کی گئی ہے، کہ :-

المعادن الظاهرة وهی التی یوصل الی ما فیها من غیر مؤنة ینتابها الناس وینتفعون بها کالملح والکبریت والقیر والمومیا والنفط والکحل والیاقوت ومقاطع الطین واشباه ذالك لا یملك بالاحیاء ولا یجوز لاحد من الناس ولا احتجازه دون المسلمین لان فیه ضرر المسلمین وتضییقا علیهم ـ (المغنی لابن قدامہ ص ۱۵۷)

ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے ہیں، جن کی تعریف یہ ہے کہ (۱) ان تک بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی ہو (۲) لوگوں کو اس پہ آمد و رفت جاری ہو (۳) اور اس سے عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں ـ مثلاً نمک، گندھک، تارکول، مومیائی مٹی کا تیل، سرمہ، یاقوت، مٹی نکالنے کی جگہ وغیرہ، اور اسی قسم کی چیزیں آباد کر کے بھی کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کو ان سے استفادہ سے روکا جائے کیونکہ مسلمانوں کا نقصان ہے اور ان پر تنگی و تنگی عائد کرنا ہے ـ

## نمک کا مسئلہ

گذشتہ بالا عبارتوں سے جہاں اور باتیں ثابت ہو رہی ہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے ـ نہ وہ انفرادی ملکیت بن سکتی ہے اور نہ حکومت اس پر کوئی محصول عائد کر سکتی ہے ـ اور اس بنا پر بعض علماء نے ہندوستان میں پچھلے دنوں یہ عام فتویٰ دے دیا کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگوں کو روکنا جائز نہیں ہے ـ مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہیں ـ لیکن

علماء کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے۔ کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کی تفصیلات کے ساتھ پبلک میں پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضاء ہونا چاہیے۔ نمک کی ایسی کانیں جن میں مندرجہ بالا صفات پائی جاتی ہوں (۱) لوگوں کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگوں کی آمد و رفت اس کان تک لگی ہوئی ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھا رہے ہوں۔ بلاشبہ نمک کی ایسی کانوں کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر دیا ہے۔ لیکن اگر بجائے اس کے صورت حال یہ ہو کہ

| | |
|---|---|
| کان لقراب الساحل | سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو، جب |
| موضع اذا حصل فیه | سمندر کا پانی اس میں آکر جمع ہو جائے |
| الماء صار ملحا. | تو نمک بن جاتا ہو! |

تو اس کے متعلق فقہاء کا عام فتویٰ یہ ہے، کہ:-

| | |
|---|---|
| ملك بالاحیاء وللامام | تو اس کا کوئی مالک ہو جاتا ہے، آبادی |
| اقطاعه. | کے ذریعہ سے بھی اور حکومت اس کو افراد |
| | کی جاگیر میں بھی دے سکتی ہے! |

اس قسم کی زمینوں کی "احیاء" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| تهیئته لما یصلح له من | جس کام کی اس میں صلاحیت ہو اس کے |
| حفر ترابه وتمهید ه وفتح | لئے اس کو تیار کرنا یعنی اس کی مٹی کھودنی |
| قناة الیها تصب الماء الیه! | اس کو کشادہ کرنا، سمندر سے نالی نکال |

کر اس گڑھے تک لانا، تاکہ سمندر کا پانی اس میں آکر گرے۔

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے، اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ

| | |
|---|---|
| لانه لا یضیق علی المسلمین | کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے کارخانے |
| باحداثه بل یحدث | کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں کوئی تنگی پیدا |
| نفعه بفعله فلم یمنع | نہیں ہوتی، بلکہ اس زمین کا نفع آباد کرنے |
| منه کیفیة الموات! | والے کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ اس |
| (المغنی ص ۵۰۱ ج ۶) | کو اس عمل سے نہیں روکا جائے گا جیسے |

موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے سے وہ نہیں روکا جا سکتا!

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ یہی صورت تھی۔

## عام معدنیات کا حکم!

اور صرف نمک ہی نہیں بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانوں کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزوں تک محدود ہیں جو خود بخود باہر آ گئی ہوں۔ اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں۔ اور نہ ایسے معادن، جن کو فقہی اصطلاح میں معادنِ باطنہ کہتے ہیں اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| ھی التی لا یوصل الیھا | یہ ان کانوں کو کہتے ہیں جن کی پیداوار وں |
| الا بالعمل والمؤنۃ۔ | تک رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت |
| (ص ۱۵۷ ج ۶) | کے نہیں ہو سکتی! |

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

| | |
|---|---|
| لم تکن ظاھرۃ فحصرھا | یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا |
| انسان واظھرھا۔ | ہر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور ظاہر کیا۔ |

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| کمعادن الذھب والفضۃ | جیسا کہ سونے چاندی، سیسہ، بلّور وغیرہ |
| والرصاص والبلور۔ | کی کانوں کا حال ہے۔ |

بہرحال ایسے معادن۔ جن سے انتفاع بغیر عملی جد و جہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، اگرچہ بعض فقہا۔ ان میں بھی انفرادی ملک کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا مذہب ہے کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔ لیکن صاحبِ مغنی نے لکھا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| والصحیح جواز ذالک | درست یہی ہے کہ ان کانوں کا بندوبست |
| | کرنا جائز ہے! |

یعنی "انفرادی ملکیت" یہ بن سکتی ہے اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے "جواز" کے ثبوت میں ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن |

اقطع بلال بن حارث معادن القبلیة جلسیها وغوریها!

حارث کو قبیلہ کے معادن خواہ پست علاقوں میں ہوں یا بلند قطعات میں بطور جاگیر کے عطا فرمایا۔

اور اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیال معادن مثلاً پارہ، پٹرول، تارکول وغیرہ ایسے معادن، جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہو وہ انفرادی ملکیت بن سکتے ہیں۔ اور حکومت ان کو بند و بست کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے؟ یا بغیر کسی ڈیوٹی کے ملک کے باشندے ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب تو آئندہ حکومت کی آمدنی کی ذیل میں دیا جائے گا۔ لیکن اسلامی معاشیات کی وسعتِ نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ جو فقہ کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن ہمام "فتح القدیر" میں لکھتے ہیں۔

اعلم ان ما یستخرج من المعدن ثلاثة انواع جامد یذوب وینطبع کالنقدین والحدید وجامد لا ینطبع کالجص والنورة والکحل والزرنیخ وسائر الاحجار کالیاقوت والملح ومالیس بجامد کالماء والقیر والنفط!

(فتح القدیر ج ۱)

کانوں سے جو چیز نکلتی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے۔ ایسی جامد چیزیں جو پگھل سکتی ہوں اور چھاپ قبول کر سکتی ہوں، مثلاً سونے، چاندی، لوہے وغیرہ کا جو حال ہو۔ دوسری قسم وہ ہے جو جامد اور سیال تو ہو لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو۔ مثلاً گچ، چونا، سرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل میں کیا جاتا ہے مثلاً یاقوت، نمک، تیسری قسم وہ ہے، جو جامد نہ ہو بلکہ سیال ہو۔ مثلاً پانی، تارکول، مٹی کا تیل!

ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد آئندہ جو چیز انہوں نے لکھی ہے۔ دنیا کی حکومتوں کی شاید اس سے آنکھیں کھل جائیں اور موجودہ حکومتوں کی رعایا میں کسی حکومت کے اس نقطۂ نظر کو سن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات متلاطم ہونے لگیں۔ ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ

لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک

لا یجب الخمس الا فی — خمس (پیداوار کا پانچواں حصہ) صرف پہلی قسم
الاول! — سے حکومت وصول کر سکتی ہے

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اول کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہیں اور یہ تو امام ابو حنیفہ رح کا خیال ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے:۔

وعند الشافعی لا یجب — بجز سونے چاندی کے اور کسی پر خمس
الا فی النقدین۔ — واجب نہیں ہے!

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات ہیں جن پر بحث کا یہاں موقع نہیں بالفعل اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے۔

حدیث "الناس شرکاء" میں جن جن چیزوں کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے، اب تک اس کے پہلے جز "الماء" اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی۔ باقی دو جز، اور رہ گئے۔ یعنی "الکلاء" اور "النار" اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کی جاتی ہے

## الکلاء (گھاس) کے مسائل کی تفصیل

حدیث میں چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہیے کہ الکلاء کے لغوی معنی کیا ہیں۔ صاحب مغرب نے اپنی کتاب فقہی لغات میں اس لفظ کو لیا ہے اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے۔ امام محمدؒ کا قول تو یہ نقل کیا ہے کہ:۔

الکلاء ما لیس لہ ساق — "الکلاء" ایسی نباتی چیز کا نام ہے جو تنہ
وما قام علی ساق لیس — پر قائم نہ ہو، اور جو تنہ پر قائم ہو وہ
بکلاء — کلاء نہیں ہے۔

"ساق" اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں ان کی مثال میں "عوسج" اور غرقند وغیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے۔ لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے:۔

والظاہر انہ یقع علی — بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلاء کا اطلاق
ساق وغیرہ — تنے والے اور بے تنہ دونوں قسم کے نباتات
پر ہوتا ہے!

سے یہ بیان کی ہے کہ فقہاء "الکلاء" کی شرح میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ:۔

لما ترعاہ الدواب — جنہیں عموماً چوپائے چرتے ہوں خواہ

رطبا کان او یابسا! — خشک حالت میں یا تر!

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھاسوں کو بھی چرتے ہیں اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً: ببول، عوسج، غرقد وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں۔ اس سے "الکلاء" کو بجائے گھاس کے، ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہیئے۔ جسے جانور چرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ابو عبید کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دُوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہیے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجائش دے اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ "الکلاء" کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے جنہیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں۔ نیز ایک مشہور حدیث "حمی" (رکھت) کے باب میں ہے۔ کہ ابیہ بن حمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا کہ اس کو حمیٰ (رکھت) یعنی اپنے اونٹوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کر سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مالم تنلہ اخفاف الابل — ہاں! اگر اونٹوں کے قدم وہاں نہ پہنچتے ہوں تو جائز ہے!

ابو عبید نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم پیلو کے اُن درختوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔ جو کسی کی مملوکہ اراضی میں ہوں۔ یعنی مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی محض اپنے مویشیوں کے لئے کوئی مخصوص نہیں کر سکتا، کیونکہ غیر مملوکہ زمین کے پیلو کو "حمیٰ" بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار ہے، خواہ وہ دُور کے ہوں یا قریب کے ہوں، اونٹوں کی دسترس سے باہر ہوں یا نہ ہوں بس مطلب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی رفاہت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہیئے اور اس سے یہ ثابت ہُوا کہ "الکلاء" کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چری جانے والی روئیدگیوں کو عام ہے۔ اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقصود مویشیوں کی چرائی میں سہولت پیدا کرنا ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو حتی الوسع پبلک کا عام مشترک سرمایہ قرار دیا جائے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں چراگاہوں کی چند

مثالیں بیان کی ہیں :-

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤں یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگلی جھاڑ اور گاؤں کا کوئی خاص باشندہ اس زمین کا مالک نہیں ہے، بلکہ

قد عرف انها لهم فهی لهم علی حالها!

عموماً یہ مشہور و معروف ہو کہ فلاں چراگاہ (یا جنگلی جھاڑیاں) فلاں گاؤں والوں کی ہیں، بس وہ انہی لوگوں کی اپنے حال پر رہیں گی!

اور گاؤں والوں کی اس زمین میں اجمالی ملک ثابت ہوگی۔ اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤں کے باشندوں کی مویشیوں وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کنچھ، رمنہ وغیرہ ہے یا نہیں اگر ہے، تو ایسی صورت میں :-

لیس لهم ان یمنعوا الکلاء والماء ولاصحاب المواشی ان یرعوا تلك المروج ویستقوا من تلك المیاه

گاؤں والوں کو اس کا حق نہ ہوگا کہ عام مویشی والوں کو اس قسم کی چراگاہوں اور منهل میں چرائی سے روکیں، اسی طرح مویشی والوں کو اس کا بھی حق ہے کہ یہاں جو پانی ہو اس سے استفادہ کریں۔

لیکن اگر یہ شکل نہیں ہے، بلکہ

لم یکن لاهل هذا القریة الذین لهم هذا المروج وفی ملکهم موضع مسرح ومراعی لدوابهم ومواشیهم غیر هذا المروج۔

اس گاؤں والوں کے لئے جن کی یہ چراگاہیں ہیں، ان کے لئے بجز ان کے چرائی کی کوئی دوسری جگہ نہ ہو اور نہ کوئی دوسری چراگاہ ہو جس میں ان کے جانور اور مویشی چر سکتے ہوں۔

اور اس کے ساتھ صورتِ حال یہ ہو کہ :-

متی اذنوا الناس فی رعی تلك المروج والاحتطاب منها اضر ذالك بهم

اگر عام لوگوں کو ان زمینوں اور چراگاہوں میں چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی اجازت دے دیں گے تو یہ بات ان کے لئے اور

ولمواشیھم ودوابھم — ان کے مویشیوں چوپایوں کیلئے نقصان دہ ہو

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت میں یہ فتویٰ ہے کہ:۔

کان لھم ان یمنعوا کل من اراد ان یرعیٰ فیھا او یحتطب منھا! — اس قسم کے گاؤں کے باشندوں کو اس کا حق ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہوں میں چرانے سے روکیں اور اس سے منع کریں کہ کوئی اسکی جھاڑیوں سے لکڑی کاٹے۔

بہر حال حدیث نے "الکلا" کو جب پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں انفرادی ملکیت تو اس پر طاری نہیں ہو سکتی۔ لیکن "اشتراک" میں کچھ حد بندی اس وقت ہو سکتی ہے۔ جب دُوسرے گاؤں والوں کی شرکت سے خود اس گاؤں والوں کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے۔ اور یہ حال تو ان چراگاہوں کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت میں نہیں ہے، بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہیں ہے۔ یا سارے گاؤں کی وہ ملکیت مشترکہ ہے۔ لیکن اگر کسی شخص اور انفرادی ملکیت والی زمین میں "الکلا" ہو، تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے "الکلا" کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے۔ بدائع میں ہے،۔

اما الکلاء الذی ینبت فی ارض مملوکۃ فھو مباح غیر مملوکۃ۔ — الکلا، (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں ہو (اس سے استفادہ کا ہر شخص کو حق ہے) یعنی مباح وجائز ہے۔ اس الکلار کا کوئی مالک نہیں ہے۔

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے۔ کہ اگر اس "الکلار" کے سوا لوگوں کو اپنے مویشیوں کے لئے چرائی نہ میسّر آسکتی ہو تو پبلک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے، یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالے کر دے۔ اور دونوں شکلوں پر اگر وہ راضی نہ ہو تو بہ زور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں۔

یہ حکم تو الکلار کا اُس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہُوا ہے۔ لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کرلے گا وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بدائع میں مرقوم ہے،۔

اذا قطعه صاحب الارض | جب اس کا مالک الکلاء کو کاٹ لے اور نکال
واخرجه فی ملکه۔ | تو پھر اس کا مالک وہ ہو جاتا ہے۔

"صاحب الارض" (مالکِ زمین) کی قید اتفاقی ہے۔ بلکہ جو بھی کاٹ کر اس پر قبضہ کرے گا۔ مالک ہو جائے گا۔ اور اب اس کو وہ اسی طرح بیچ سکتا ہے۔ جیسے برتن اور مشک کے پانی کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ فقہ کا عام مسئلہ تو یہی ہے۔ لیکن حنفی فقہاء نے بعد کو اس میں کچھ تفصیل بھی کی ہے۔ یعنی دیکھنا چاہئے کہ "الکلاء" قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے۔ یا مالکِ زمین نے مصنوعی تدبیروں سے اس کو اگایا ہے۔ دوسری صورت میں ان کا خیال ہے کہ

اذا استقاه علیه | اگر زمیندار (صاحب الارض) نے اس الکلاء
ملکه (بدائع) | کو سینچا ہے۔ تو ایسی صورت میں اس کی
| ملکیت قائم ہو جائے گی۔

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

الصحیح جواب ظاهر الروایة | ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب دیا گیا
لان الاصل فیه هو الا | ہے وہی درست ہے کیونکہ اصل تو یہی ہے
باحة! | کہ "الکلاء" سے استفادہ کا عام حق دیا گیا ہے!

اس سلسلہ میں فقہاء ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مرج" کا ہے۔ جس کی جمع "مروج" ہے۔ یہ اردو کے "رمنہ" یا "کنچہ" کے ہم معنی ہے۔ غالباً فارسی کا "مرغزار" "مرجذار" ہی کی صورت ہے۔ لیکن ایک اور لفظ "اجمہ" کا ہے جس کی جمع آجام ہے۔ علامہ مطرزی "مغرب" میں اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں :- الاجمة الشجر الملتف۔ یعنی (گھنے درختوں) کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ لغوی معنی ہوئے۔ پھر فقہاء جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے متعلق کہتے ہیں :-

وقولهم بیع السمک | مچھلیوں کا آجام میں بیچنا یہ جو فقہاء لکھتے
فی الاجام یریدون البطیحة | ہیں تو آجام سے سنگریزہ والی زمین مراد ہے
التی منبت القصب والیراع | جو نرسل یا کلک کے اُگنے کی جگہ ہے!

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگریزوں والی ریتیلی زمینوں کے گہرے حصوں میں برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا اور اس کے اردگرد یا خود اس میں "نیستان" بن جاتا تھا۔ اس کو آجام کہتے ہیں۔ چونکہ

پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا۔ اس لئے اس میں مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آجام در اصل آبی نیستان کو کہتے ہیں۔

فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے، کیا ان کا شمار بھی "مروج" اور کنجوں کے ذیل میں ہوگا؟ اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے یا نہیں؟ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس کا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہئے، جس میں اجمہ ہے۔ اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں ہے تو نیستان (اجمہ) ہی کیا، تمام غیر مملوکہ زمینوں کا حکم یہ ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| فان لم تکن فی تملک | اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں |
| لاحد ملک فلا باس | ہے تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر قسم |
| ان یحتطب منه جمیع | کے لوگ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر لیجائیں |
| الناس کالشمار فی الجبال | جیسے پہاڑوں، مرغزاروں، رمنوں، وادیوں |
| والمروج والاودیة | اور ندیوں وغیرہ کے درختوں اور ان کے |
| والشجر مالم یغرسه | پھلوں کا حال ہے کہ جب تک کسی خاص |
| الناس ولاباس بان | شخص نے ان کو نہ لگایا ہو، ہر شخص کو ان |
| یاکل من ثمارها ویتزود | سے استفادہ کا حق ہے۔ اور اس میں بھی کوئی |
| مالم یعلم ان ذلک فی | حرج نہیں ہے اگر اس قسم کے درختوں کے |
| ملک انسان وکذالک العسل | پھلوں کو آدمی کھائے یا توڑ کر گھر لیجائے |
| یوجد فی الجبال والغیاض | عام استفادہ کا یہ حق اسی وقت تک ہے |
| (الخراج) | جب تک ان جنگلی درختوں کے متعلق معلوم |

نہ ہوا ہو کہ کسی خاص شخص کی ملکیت میں ہیں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں جو شہد پایا جاتا ہے ان کا بھی یہی حال ہے!

لیکن اگر زمین کسی کی مملوکہ ہے تو پھر "الکلاء" کے سوا اس کی اور پیداواروں میں تصرف کرنے کا حق مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا۔ خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو، یا خود رو ہو۔ بدائع میں ہے:-

| | |
|---|---|
| لیس لاحد ان یحتطب | ایسا اجمہ (نیستان) جو کسی خاص شخص کی |
| من اجمة رجل الا | ملک میں ہو اس کے متعلق کسی کو اس کا حق |

باذنه لان الحطب والقصب مملوکان لصاحب الاجمة ینبتان علی ملکه وان لم یوجد منه الانبات اصلا۔

نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اسکی لکڑی کاٹے۔ کیونکہ لکڑی اور نئے کے ڈنٹھل یہ دونوں اجمہ کے مالک کی ملک ہے۔ وہ زمین سے پیدا ہی ہوتی ہیں۔ مالک زمین کی ملک ہیں اگرچہ ان کے اگانے میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو، یعنی خودرو ہوں، جب بھی اسی کی ملک قرار پائیں گے۔

بہرحال اس باب میں کلیہ وہی ہے، جو صاحب بدائع نے لکھا ہے :۔

الاصل ان یکون من المملوك مملوکا الا ان الاباحه فی بعض الاشیاء ثبت علی مخالفة الاصل بالشرع والشرع ورد بها فی اشیاء مخصوصه فیقتصر بها!

اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہوگی وہ بھی مملوک ہی ہوگی۔ لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دے دیا ہے لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ محدود ہے اس لئے حکم بھی ان ہی تک محدود رہے گا!

## تیسرے اشتراکی سرمایہ آگ کے احکام!

اب تیسرا جزء النار کا رہ گیا ہے۔ جسے حدیث میں عام پبلک کی مشترک چیز قرار دیا گیا ہے فقہاء نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں :۔

النار اسم الجوهر مضی دائم محرکة علوا۔

آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے!

اور اسی بناء پر فقہاء کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ :۔

فلیس لمن اوقدها ان یمنع غیره من الاصطلاء بها لان النبی صلی الله علیه وسلم اثبت الشرکة فیها۔

پس جس نے آگ سلگائی ہو اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں "شرکت" ثابت فرمائی ہے!

اور اصطلاء یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے ورنہ مقصد یہ ہے کہ حرارت ہو یا روشنی

یا اسی قسم کا کوئی کام، استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے۔ مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں، بلکہ اس لکڑی یا بتی یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کی جاتی ہے کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا؟ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| فاما الجمر فلیس بنار | لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے پس جس کا وہ |
| وھو مملوک لصاحبہ | ہے وہ اس کا مالک ہے اسی دوسروں کو روکنے |
| فلہ حق المنع کسائر | کا حق اسے حاصل ہے جیسے دوسرے مملوکات |
| املاکہ۔ | میں یہی حق اس کو دیا گیا ہے! |

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے۔ لیکن اس باب میں اسلام کے جو کلی نقاط نظر تھے ایک حد تک ان کی بحث ختم ہو گئی۔ اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے۔ یعنی "شوارع عام"!

## عام شوارع اور راستوں کے احکام

جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں، بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستور میں آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے۔ اسلامی مقننین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ۔

| | |
|---|---|
| ما کان من الشوارع | راستے، کوچے، شہر کے میدان، چوک جو |
| والطرقات والرحاب | آبادیوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان |
| بین العمران فلیس لاحد | کے متعلق کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ |
| احیاءہ۔ | ان کو آباد کرے۔ |

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کر کے ان کو اپنی ملکیت بنائے، مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے۔ مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف سڑکوں اور کوچوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ "الرحاب" یعنی شہروں کے بیچ بیچ میں جو میدان مختلف ضرورتوں کیلئے مثلاً کھیل کود کے لئے، یا اس زمانے میں جو سیرگاہیں بنا دی جاتی ہیں یہ بھی پبلک کے مشترکہ مفاد میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان میں بھی کسی شخصِ واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے

اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ حکم صرف ان ہی سڑکوں یا گلیوں، یا میدانوں تک محدود نہیں ہے، جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو، بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو، زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گذرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکی ہے۔ سب کے لئے یہ حکم عام ہے۔ ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں :-

| | |
|---|---|
| سواء کان واسعا او ضیقا | خواہ کشادہ ہوں یا تنگ، اور خواہ اس |
| وسواء ضیق علی الناس | میں تصرف کرنے سے لوگوں پر تنگی پیدا ہوتی ہو |
| او لم یضیق ! | یا نہ ہوتی ہو ! |

مسلمانوں میں شاہراہوں اور شہر کے ان مقامات میں عام باشندوں کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحبِ مغنی لکھتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| لان ذالك مشترك فیه | کیونکہ عام مسلمانوں میں یہ چیزیں مشترک ہیں |
| المسلمون ومتعلق بہ مصلحتہم | اور ان کی مصلحتیں ان سے متعلق ہیں، تو |
| فاشبہ مساجدھم۔ | گویا مسلمانوں کی مسجدوں کی مانند ان کا حال ہے |

## عام راستوں کا اسلام میں احترام

مندرجہ بالا فقرہ میں فاشبہ مساجدھم کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانوں نے کتنا احترام کیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اماطہ الاذی عن الطریق یعنی راستوں سے ان چیزوں کا ہٹانا جو راہ گیروں کے لئے باعثِ تکلیف ہوں اس فعل کو من الایمان یعنی (ایمان کا جزء) قرار دیا ہے اور اس بناء پر مشہور حدیث

الطہور شطر الایمان

(پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے)

میں دوسری چیزوں کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانوں اور سڑکوں کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہئے۔ جب راستوں کی صفائی کی صحیح حدیثوں میں اتنی اہمیت ہے تو فقہاء نے شوارع و طرق کو مسلمانوں کے حقوق کے اعتبار سے اگر الشبہ بالمساجد قرار دیا ہے، تو اس پر قطعاً تعجب نہ ہونا چاہئے اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول و

قوانینِ جدید مغربی تمدن کے نتائج ہیں[1]۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں گفتگو ان فقہی احکام کے متعلق کر رہا تھا۔ جو شہروں اور آبادیوں کی عام گذرگاہوں وغیرہ کے متعلق ہیں کہ ان میں کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ البتہ اس قسم کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں۔ فقہاء نے اس کے متعلق لکھا ہے :-

ان کان مجالس یضیق علی المارۃ لم یحل له الجلوس فیه ولا یحل الامام تمکنة بعوض ولا غیر.

(المغنی)

ان گذرگاہوں کی ان نشست گاہوں کی وجہ سے آمد و رفت کرنیوالوں کو تنگی محسوس ہو تو یہاں ان میں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگا اور نہ حکومت کیلئے جائز ہے کہ ایسے مقامات پر کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر دے۔

لیکن سڑک اتنی کشادہ ہے کہ راہ گیروں کو کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی۔ تو ایسی صورت میں :-

یجوز الارتفاق بالقعود فی الواسع من ذلک البیع والشراء علیٰ وجه لا یضیق علیٰ احد ولا یضر المارۃ!

ان گذرگاہوں میں جو کشادہ اور وسیع مقامات ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کی آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے جب آنے جانے والوں کی راہ میں تنگی نہ پیدا ہوتی ہو، نہ کسی اور کو!

اس قسم کا استفادہ سڑکوں سے شہر کے عام باشندے خود بھی کر سکتے ہیں۔ اور حکومت کو بھی ایسی صورت میں (یعنی جن میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو) اختیار ہے کہ سڑکوں، بلکہ مسجدوں کے احاطہ وغیرہ میں، جسے رحاب المساجد کہتے ہیں۔ اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دے سکتی ہے۔

ابن قدامہ نے الطرق الواسعة اور رحاب المساجد کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ :-

للامام اقطاعها لمن یجلس فیها.

امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والوں کے لئے مخصوص کر سکتی ہے!

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق محکمۂ صفائی، یا آرائش وغیرہ سے ہے، اسلامی فقہاء نے ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنی کتابوں میں بحث کی ہے، جاننا چاہیئے کہ فقہ کی کتابوں سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے ۱۲۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| ولا یملکھا المنقطع بذلك | لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص |
| بل یکون احق بالجلوس | کرے وہ اس کا مالک نہ ہوگا صرف دوسروں |
| فیھا من غیرہ۔ | کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ حقدار ہوگا۔ |

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو:۔

| | |
|---|---|
| السابق احق بہ مادام | جس نے آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا ہو تو |
| فیہ فان ترك متاعہ | وہی اس کا حقدار ہوگا جب تک اس پر قابض |
| فیہ لم یجز لغیرہ ازالتہ | رہے گا۔ اگر اس قسم کے مقامات میں اپنے |
| لان ید الاول علیہ وان | سامان کو چھوڑ کر چلا جائے تو کسی دوسرے |
| نقل متاعہ کان لغیرہ | کو اس کا حق نہ ہوگا کہ اس کے سامان کو |
| ان یقعد فیہ لان یدہ | اس جگہ سے ہٹالے۔ کیونکہ ابھی پہلے آدمی |
| قد زالت۔ | کا اس پر قبضہ باقی ہے اور اگر اپنے سامان |

کو وہاں سے ہٹالے تو پھر اب دوسرے کو یہ حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے کیونکہ پہلے آدمی کا قبضہ اس سے اٹھ گیا!

بہرحال مشہور حدیث منی[لہ] مناخ کی بنا پر ایسی صورت میں جس نے پہلے قبضہ کر لیا۔ اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں کوئی دوکان کیلئے کیا، مکان و چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے؟ ابن قدامہ لکھتے ہیں، کہ:۔

| | |
|---|---|
| لیس لہ البناء لا دکۃ | کسی کو ان مقامات میں کسی قسم کی تعمیر کا |
| ولا غیرھا لانہ یضیق | حق نہیں ہے حتی کہ چبوترہ یا چبوترہ کے |
| علی الناس و یعشتر بہ | سوا بھی کوئی چیز نہیں بنا سکتا کیونکہ اس |
| المارۃ بالیل والضرار | قسم کی چیزوں سے عام لوگ تنگی میں مبتلا |
| باللیل والنھار ویبقی | ہو جائیں گے اور گذرنے والوں کے لئے |

---

لہ منیٰ کے میدان میں جو جہاں اپنے اونٹ کو پہلے بٹھادے گا وہی اس جگہ کا حقدار ہوگا ۱۲

علی الدوام فربما ادعی ملکه بسبب ذالک!

خطرہ ہے کہ رات کے وقت اس سے ٹھوکر کھائیں اور پھسل کر گریں، اسی طرح شب و روز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے۔ اور چونکہ ایسی چیزیں دوامی ہوتی ہیں۔ اسی لئے اس کا بھی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اس کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے۔

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ :-

لہ ان یظل علیٰ نفسہ بما لا ضرر فیہ من باریۃ وتابوت وکساء ونحوہ لان الحاجۃ تدعوا الیہ من غیر مضرۃ فیہ!

ان مقامات پر بیٹھ کر خرید و فروخت کرنے والوں کو اس کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر کوئی سایہ کی چیز کھڑی کریں جس میں کسی کو ضرر نہ پہنچے، مثلاً چٹائی یا ٹاٹ، یا کمبل یا اسی قسم کی چیزوں سے سایہ کریں اور یہ اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس کا وہ حاجت مند ہے۔ اور دوسروں کا اس میں ضرر نہیں!

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام، یا عام گذرگاہوں وغیرہ سے ہے۔ لیکن خاص راستے اور کوچے، جنہیں صرف کسی خاص مکان یا چند مکانوں کے رہنے والے ہی اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہوں، ان کے احکام عام راستوں سے مختلف ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ایسی غیر مملوکہ چیزیں، جن میں قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی ممکنہ حد تک تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کر کے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سننے چاہئیں۔ جن میں قبضہ کے بعد انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

## بنجر غیر آباد زمینوں کی ملکیت کے قوانین

اسلامی قانون میں ممالک محروسہ کی ایسی غیر آباد زمین اور علاقے، جن کا کوئی مالک نہ ہو، خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہوں، یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران ہو گئی ہوں کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام (موات) یا مُردہ بنجر زمین ہے۔ بظاہر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کی مالک حکومت ہے اور اس لئے حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور سے دنیا میں یہی دستور مروج ہے کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینوں، پہاڑوں، جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس

باب میں بالکل مختلف ہے۔ وہ اس قسم کی تمام زمینوں کو بھی ملک کے عام باشندوں کا مشترک سرمایہ قرار دیتا ہے۔ اور بجز ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معادن کے جن کا ذکر گذشتہ فصل میں بہ تفصیل ہو چکا ہے۔ رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائلٹی) ادا کئے قبضہ کر کے اپنی ملک بنالے۔ اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں۔ مثلاً امام مالکؒ، امام ترمذیؒ، ابوداؤد، وغیرہ۔ سب کی کتابوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے، کہ

| | |
|---|---|
| من احیا ارضا میتۃ | کسی مردہ غیر آباد زمین کو، جو آباد کرلے گا |
| فہی لہ۔ | یہ زمین اسی کی ہوگی۔ |

اسی بناء پر علامہ مقدسی نے مغنی میں تمام ائمہ اسلام کا یہ اجتماع نقل کیا ہے، کہ:۔

| | |
|---|---|
| عامۃ فقہاء الامصار | فقہاء امصار کا عامۃ اس پر اتفاق ہے، کہ |
| علی ان الموات یملک بالاحیاء | آباد کرنے (احیا) کی وجہ سے وہ آباد کرنے |
| (ج ٦ ص ١٤٧) | والے کی ملک بن جاتی ہے۔ |

خواہ یہ "ارضِ موات" ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی مملوک نہ ہوئی ہو اور اس کے آباد ہونے کی نوبت نہ آئی ہو، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں۔ ایسی زمین کہ:۔

| | |
|---|---|
| مالم یجر علیہ ملک احد | کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو۔ اور اس |
| ولم یوجد فیہ اثر عمارۃ | میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی ہو |
| فہٰذا یملک بالاحیاء لغیر | تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے آدمی |
| خلاف بین القائلین بالاحیاء | اس کا مالک ہو جاتا ہے اس میں کسی کا اختلاف |
| | نہیں ہے، جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں! |

اسی طرح ایسی اراضی:۔

| | |
|---|---|
| ما یوجد فیہ آثار | جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں پائی |
| ملک قدیم جاھلی | جاتی ہوں مثلاً روم کے آثار اور قوم ثمود |
| کآثار الروم ومساکن | کے مسکن کا حال ہے، جو ایسے مقامات |
| ثمود ونحوھم فہٰذا | ہوں تو آباد کرنے سے ان کا بھی آدمی |
| یملک بالاحیاء۔ | مالک ہو جاتا ہے۔ |

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی بھی لیکن بنی آدم کی مملوکہ چیزوں میں ہو چکی تھی، اس لئے شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان میں اس کی بھی تصریح فرما دی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| عادی الارض للہ ورسولہ ثم هو بعد لکم۔ | عادی اراضی (اقوام قدیمہ کے کھنڈر یا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے)، یہ اللہ اور اس کے رسول کی ملک ہیں۔ پھر اس کے بعد اے مسلمانو! یہ تمہاری ملکیت ہے! |

یعنی اس قسم کی زمین کو جب اس کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہوں۔ اور اسلامی حکومت کے زیر نگرانی آگئیں تو اب وہ اپنے پرانے مالکوں کی ملک سے نکل کر اللہ اور رسول کی ملک میں داخل ہو گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانوں کے حوالے فرما دیا البتہ ارض موات کی ایک قسم اور رہ جاتی ہے جو اسلامی عہد میں کسی خاص شخص کی ملکیت تھی لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے لاپتہ ہو گیا۔ ایسی زمینوں کے متعلق اگرچہ بعض ائمہ اسلام کی رائے مختلف ہے، مگر امام ابو حنیفہ، امام مالک وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتویٰ ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| انما تملک بالاحیاء وھو مذھب ابی حنیفہ ومالک (مغنی) | آباد کرنے سے وہ بھی مملوکہ بن جاتی ہیں۔ یہی ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔ |

بہرحال اس قسم کی تمام "اراضی" جن کا فقہ کی اصطلاح میں "موات" نام ہے۔ دراصل یہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ جائیداد ہے اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی قانون کی رو سے دو صورتیں ہیں۔

## اقطاع یا جاگیروں کا حکم!

ایک کو اقطاع کہتے ہیں یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ بندوبست کر دے اور یہ امام کے صوابدید پر ہے کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کر دے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| اقطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لبلال بن الحارث | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک جاگیر |

المزنی مابین البحر والعمر! | میں دے دیا تھا!
--- | ---

(یہ اصطلاح تھی۔ ساحلِ سمندر سے کسی خاص سلسلۂ کوہ تک کی درمیانی ارض کی۔ ہندوستان میں جیسے "از گنگ تا سنگ" کا لفظ بعض علاقوں میں بولتے ہیں)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" میں اس قسم کے قطائع (جاگیریں) جو بارگاہِ رسالت اور سریر خلافت سے مختلف لوگوں کو عطا ہوتے رہے ہیں، ذکر کیا ہے۔ میں نے خاص کر بلال بن حارث کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ بڑے سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنی صوابدید سے جاگیر میں عطا کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ "احیاء" کر کے اس پر قبضہ نہ کر لے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| فان اقطعه الامام شیئا | اگر "موات" زمین کو امام (حکومت) کسی کی |
| من الموات لم یملک بذالک | جاگیر میں دے تو محض اس سے وہ اس |
| لکن یصیر احق به . | زمین کا مالک نہیں ہو جاتا۔ البتہ بہ نسبت |
| (مغنی) | دوسروں کے وہ اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔ |

اپنے اس دعویٰ کی انہوں نے دلیل بھی یہ پیش کی کہ "عقیق" میں جو جاگیر انہی بلال کے نام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی۔ چونکہ احیاء پر قادر نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| لو ملکه لم یجز | اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہو جاتے تو حضرت |
| استرجاعه . | عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہو سکتی تھی۔ |

## اسلامی جاگیروں کا مطلب

یہاں جاگیر کا یہ مطلب نہیں ہے، جیسا کہ ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ لاخراج کر دی جاتی ہے۔ بلکہ "موات" کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر "عشر" یا "خراج" بھی لگایا جا سکتا ہے اور اس معاملہ میں مختلف زمینوں کا حکم مختلف ہے۔ جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

خراج کے باب میں صرف امام (بادشاہِ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے۔ کہ ملک و رعایا کے مصالح کی بنا پر، مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیردار سے حاصل کی جائے گی یا از قبیل کوئی اور مصلحت ہو تو جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے:۔

| | |
|---|---|
| یکون الامام قدرای الصلاح | اگر امام اسی میں مصلحت دیکھے کہ زمین کا |

فی تفویض خراج ارض صاحب الارض فیجوز لہ یسعہ ان یقبلہ۔ — خراج جاگیردار کو عطا کر دیا جائے، تو امام ایسا کر سکتا ہے اور جاگیردار کو بھی اجازت ہے کہ وہ اس عطیہ کو قبول کرے!

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدہ دار کو، خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، خراج کی معافی، بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی۔ جاگیروں کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود تھا۔ ورنہ اس کے تفصیلی مسائل تو بہت سے ہیں، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں، اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ "اراضی موات" میں انفرادی ملکیت ایک تو اس احیار، (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو اقطاع کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو اور عام طور سے غیر آباد زمینوں کے بندوبست کرنے کا دنیا میں یہی طریقہ مروّج ہے۔ اگرچہ مختلف حکومتوں کا طرزِ عمل بندوبست کے شرائط اور نتائج میں مختلف ہے۔ لیکن اراضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام میں ہے، دوسری حکومتوں کی رعایا کے لئے شاید وہ عجیب ہو۔

## ملک کی غیر آباد زمینوں کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ

میرا مطلب یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان، یعنی:۔

من احیا ارض موات فھی لہ۔ — موات اراضی کو جو آباد کرے گا۔ اسی کی وہ ہو جاتی ہے۔

کی بنا، پر فقہار امت کی اکثریت کا یہ فتوےٰ ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمینوں اور علاقوں (اراضی موات) سے جتنا حصہ بغیر کسی معاوضہ اور رائلٹی کے چاہے۔ احیار کر کے اسے اپنی ملک اور جاگیر بنا لے۔ صرف امام ابوحنیفہ اس مسئلہ میں متفرد ہیں کہ حکومت سے بھی اجازت "احیار" کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن عام فقہار اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ امام صاحبؒ کے شاگردِ رشید قاضی ابو یوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورہ بالا نبوی وثیقہ کی بنا پر لکھا ہے:۔

انّ اذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جائز الی یوم القیٰمۃ! — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت قیامِ قیامت تک نافذ رہے گی!

یعنی جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان فھی لہ (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہے تو اس میں اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیئے۔ کہ اس سے "مفادِ عامہ" کو کوئی ضرر تو نہیں پہنچا قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں لیس لعرق ظالم حق کے الفاظ سے اسی ضرر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین میں، (یعنی موات) میں اگر کوئی درخت نصب کرے، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے، تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا۔

عام فقہاء اسلام سے امام صاحب کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابو یوسف سے پوچھا گیا تھا کہ اس صحیح و صریح "نبوی وثیقہ" کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحب نے کیوں بڑھائی؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا جواب امام صاحب کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| ھو بیت مال المسلمین! | یعنی اس کے مالک مسلمان ہیں! |

اور باوجود اس کے امام بیت المال کا مالک نہیں ہے۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| للامام تعین مصارفہ وترتیبہ۔ | امام کو بیت المال کے رقوم کے مصارف کی تعین و ترتیب کا حق ہے! |

اسی طرح زمین کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب میں بھی دخل دینا چاہیئے۔ ورنہ رعایا میں باہمی کشمکش کی توثیق کے بعد جھگڑے کا خطرہ نہ رہے گا۔ لیکن لوگوں نے امام صاحب کی اس توجیہہ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ پوچھا گیا ہے کہ کیا ہوا کہ ہر پرندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے؟ آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانوں کے لئے مباح قرار دیا، اور سند دے دی کہ جو اس کو آباد کرے گا اسی کی وہ زمین ہو جائے گی۔ اس کے بعد حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے!

بہرحال یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ موات کی اراضی کو احیاء کے ذریعہ سے اپنی مملوکہ جاگیر بنا لینے کا اختیار صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے مسلم ہو یا غیر مسلم، اور یہ میرا صرف قیاسی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ فقہ کی کتابوں میں ہمیشہ اس کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں:۔

لا فرق بین المسلم والذمی فی الاحیاء وبہ قال ابوحنیفۃ :

موات زمین کو آباد کر کے اپنی ملک بنا لینے میں مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے!

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی۔ جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ، جنگل ہو یا بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے۔ موات اراضی میں سے آباد کر کے ان کو اپنی مملوکہ جاگیر مفت بنا سکتا ہے! قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہیں :-

کل ما عالج فی اجمۃ او من بحر او من بر بعید ان لا یکون فیہ ملک لانسان فاستخرجہ رجل وعمرہ فھو لہ بمنزلۃ الموات.

اجمہ (نیستان) ہو یا تری کا علاقہ ہو، یا خشکی کا، اگر کسی خاص انسان کی ملک میں وہ نہیں ہے اور محنت مشقت کر کے جس نے اس کو اوپر کیا اور آباد کیا تو اس کا وہی مالک ہو جائیگا جیسے موات اراضی کا حال ہے!

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤں میں عموماً بڑی بڑی زمینیں باہر نکل آتی ہیں۔ اگر ان کے آباد کرنے میں کسی کا نقصان نہ ہوتا ہو تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے۔

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہو جائے گا۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے، کہ "احیاء" یا آباد کرنے کا لفظ جو اس سلسلہ میں برابر استعمال ہو رہا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ محض کھیتی کرنا یا باغ لگانا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے :-

احیاء کل واحدۃ من ذلک تھیئتھا للانتفاع الذی اریدت بہ.

ان میں ہر چیز کی احیاء کا مطلب یہ ہے کہ جو نفع اس سے مقصود ہو اس کے لئے اس کو تیار کیا جائے۔

یعنی "آبادی" صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہیں ہے، مکان بنا کر یا دوا لگاہ (مویشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزوں کو رکھنے کی جگہ بنانا یہ سب احیاء میں داخل ہے۔ علامہ مقدسی نے بطور مثال کے چند چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں :-

فاما الدار فبان یبنی حیطانھا بما جرت بہ العادۃ وتسقیفھا لانھا

گھر کے احیاء کا مطلب یہ ہے کہ اسکی دیواریں کھڑی کی جائیں یعنی جس طرح اس ملک میں دیواروں کے بنانے کا طریقہ ہو ویسی دیوار

لا تكون مسكنى الابذلك
واما الحظيرة فاحياء
ها بحائط جرت به
عادة مثلها ليس من
شرطها التسقيف لان
العادة ذلك من غير
تسقيف معاء ارا د
حظيرة المواشي او
للخشب۔

کھڑی کر دی گئی ہو اور اس کی چھت
پاٹ دی گئی ہو۔ کیونکہ رہنے کے قابل
بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، اسی طرح حظیرہ
(احاطہ) کی احیاء کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم
کی دیوار گھیر کر احاطہ بندی کا طریقہ اس ملک میں
جاری ہو، یعنی چھت پاٹنے کی ضرورت اسکی
احیاء میں نہیں ہے کیونکہ عام طریقہ یہی ہے
کہ ان احاطوں کیلئے چھت نہیں پاٹتے خواہ
مویشی کیلئے احاطہ بنایا جائے یا لکڑی کا گودام۔

الغرض، آباد کرنے کی جو غرض ہے، اس کا سامان مہیا کرنا، یہی اس کی احیاء ہے۔ مثلاً کھیتی ہے، تو اس کا جوتنا سیرابی کا انتظام کرنا۔ یہی اس کی احیاء ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ زراعت کی احیاء کی صورت یہ ہے کہ:۔

ان يسوق اليها ماء من
نهر او بئر وان كانت
مما لا يمكن زرعها
لكثرة احجارها كارض
الحجاز فبان يقلع احجارها
وينقيها حتى يصلح
للزرع وان كانت غياضا
واشجارا كارض الشعرى
فبان يقلع اشجارها
ويزيل عروقها اللتى
تمنع الزرع

کہ آدمی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوئیں سے
پانی لے جائیں اور اگر زمین ایسی ہو جس
میں کھیتی نہ ہو سکتی ہو، مثلاً کثرت سے اس میں
پتھر ہوں، جیسا کہ حجاز کی زمینوں کا حال
ہے تو اس کی احیاء کے معنی یہ ہوں گے کہ
پتھروں کو زمین سے باہر نکالا جائے، اور
زمین صاف کی جائے اور اگر بنجر زمین یا
جنگل جھاڑ ہو، درخت ہوں جیسا کہ الشعری
کی زمین کا حال ہے تو اسکی احیاء کے معنی
یہ ہیں کہ درخت اکھاڑے جائیں اور ان جڑوں
کو کھود کھود کر نکال دیا جائے جن سے کھیتی
میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو!

بہرحال ہر چیز اور ہر ضرورت کی احیاء خود اس ضرورت کے حسب حال ہوتی ہے اور جیسا کہ علامہ مقدسی

نے لکھا ہے کہ اس باب میں اعتبار زیادہ عرفِ عام اور رواج کا ہے۔ آباد کرنے کا اطلاق جس کاروبار پر کیا جاتا ہو، وہی اس کی احیاء ہے۔

## رعایا کی اسلام میں تملیکی قوت!

اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بندوبست کی ہوئی) جاگیر ہو، یا خود کسی نے ارضِ موات پر قبضہ کر کے احیاء کر لیا ہو۔ یہ آباد کرنے والے کی انفرادی ملک بن جاتی ہے۔ اقطاعی جاگیرات کا حکم احیاء کے بعد جو ہوتا ہے۔ قاضی ابویوسف لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| فلا یحل لمن یاتی من | بعد کو جو خلفاء رہوں ان کیلئے جائز نہ ہوگا |
| بعدھم من الخلفاء ان | کہ (کسی امام کی عطا کی ہوئی جاگیر کو) اس |
| یرد ذالک و لا یخرجہ | شخص سے واپس لیں جس کے قبضہ میں وہ |
| من ید من ھو فی یدہ | جاگیر خواہ بطور وراثت کے ہو یا خریداری |
| وارثا او مشتریا (ص ۴۴) | کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہو! |

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو، خود اس کے یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثۃً ملی ہو، یا آباد کرنے والے سے کسی نے خرید کی ہو۔ کسی سے بھی حکومت اس کی یہ مملوکہ زمین چھین نہیں سکتی۔ انہوں نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| فاما ما یاخذ الولاۃ من | اور حکومت کے ولاۃ (صوبہ داروں گورنروں) |
| ید واحد ارضا اقطعھا | وغیرہ کا جو یہ طریقہ ہے کہ جاگیر کو ایک شخص |
| آخر فھذا بمنزلۃ الغاصب | کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو جاگیر میں |
| غصب واحد او اعطی | دے دیتے ہیں تو اس کی صورت وہی ہے |
| آخر (کتاب الخراج ۴۴) | جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں کی ہوتی |

ہے یعنی ایک شخص سے اس کی مملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے!

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| اما من اخذ من واحد | اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسرے |
| اقطاع آخر فھذا بمنزلۃ | کی جاگیر میں دی جاتی ہے تو اس کی حیثیت |
| مال غصبۃ من واحد | اس مال کی ہے جو ایک شخص سے چھین کر |
| واعطی واحد (ص ۴۳) | دوسرے کو دے |

اسی طرح اراضیٔ موات کو احیاء کر کے جس نے اپنی مملوکہ جاگیر بنالی ہے، اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ولیس للامام ان یخرج شیئًا من ید احد (ص ۳۵) | امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے، |

اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| فلا یحل الامام ولا یسعه ان یقطع من الناس حق مسلم ولا معاهد ولا یخرج من ید احد من ذالک شیئًا۔ | حکومت کیلئے جائز نہیں ہے اور نہ قانوناً اس کیلئے اس کی گنجائش ہے کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے معاہدہ کیا ہو کہ اس کے حق کو اس سے منقطع کرے اور نہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے۔ |

## دوامی بندوبست

یعنی یہ حکم حکومت کی غیر مسلم اور مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے، گویا ان زمینوں کی حیثیت بندوبست دوام کی ہو جاتی ہے اور جاگیر دار کو اختیار ہے کہ خواہ وہ خود اس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرائے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| فمن احیاء ما هی کذلک فهی له ویزرعها ویزارعها ویواجرها ویکری منها الانهار ویعمرها بما فیه مصلحتها (ص ۳۷) | جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو، اور وہ اسی حال میں ہو تو اس زمین کا مالک اس کا آباد کرنے والا ہوگا۔ اسے حق ہے کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے کاشت کرائے یا کسی کو کرایہ پر دے، اسے اس کا بھی حق ہے کہ اپنی زمین میں نہر کھودے اور اس کا بھی، کہ جس قسم کی عمارت اور آبادی، جس میں مصلحت ہو، اپنی زمین میں قائم کرے! |

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگذاری عائد کی گئی ہو صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے۔

| | |
|---|---|
| فان کانت فی ارض العشر ادی عنها العشر وان کانت فی ارض الخراج ادی عنها الخراج۔ | اگر اس کی یہ زمین عشری زمین ہو، تو اس سے عشر ادا کرے گا۔ اور اگر خراجی زمین ہو تو اس سے خراج ادا کرے گا! |

## تحجیر کا مطلب اور حکم!

عشر و خراج کی عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود میں صرف پتھر نصب کر کے یا کانٹوں وغیرہ سے گھیر کر اسکو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ فقہاء میں اس عمل کا نام تحجیر ہے۔ چونکہ یہ زمین کا احیاء نہیں ہے۔ اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہوگی۔ البتہ بہ نسبت دوسروں کے اس کے حق کو گونہ ترجیح ہوگی۔ مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا کی معاشی سہولتوں کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ آج جبکہ دنیا میں کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلا معاوضہ مفت قبضہ نہیں کر سکتا اس سے اُس وقت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ اور اسی لئے میں نے اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل سے کام لیا۔ کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہو گیا ہے۔ لوگ ان واقعات کو بھول گئے ہیں۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ ہندوستان تک میں حکومتِ مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اس قسم کی معاشی سہولتیں آبادکاروں کو حاصل تھیں۔

بہرحال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور سے متعلق تھے۔ اب بحث ان چیزوں پر کرنی چاہیئے۔ جو کسی کی ملک میں داخل ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ پھر ایسی مملوکہ چیزیں جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کر کے ان کو اپنا مملوک بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی بھی اسلام میں دو شکلیں ہیں۔

## مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا!

(۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلوں میں اس پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے۔ ایک کی فقہی تعبیر لقطہ ہے۔

### لقطہ کا مطلب

یعنی گرا پڑا مال اگر کسی کا مل جائے۔ تو بعض صورتوں میں یہ جائز ہے کہ آدمی ان پر قبضہ کر لے اور خاص شروط و حالات میں ان کو اپنے تصرف میں بھی لا سکتا ہے۔ لیکن جب کبھی

اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔ چوں کہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہیں ہے، کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے۔ اس لئے اس کی تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں۔

## قانون شُفعہ

دوسری شکل شفعہ کی ہے۔ یعنی مالکانہ شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ آدمی دُوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کر کے اپنی ملک بنالے، مثلاً کسی مکان یا زمین میں دو آدمی، یعنی زید و عمر شریک ہیں۔ اگر عمر کے حصّہ کو خالد خریدے تو زید کا یہ قانونی حق ہے کہ جس دام میں خالد نے اس کے شریک کے حصّہ کو خریدا ہے، ادا کر کے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو خریدلے۔ قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا۔ معلوم نہیں اس باب میں دُنیا کے اور قوانین کا کیا حال ہے۔ لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دوکانوں، کھیتوں، باغوں وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیاں بہم پہنچتی ہیں۔ اور پہنچ سکتی ہیں۔ اس کا اندازہ تجربہ سے ہوسکتا ہے۔ خصوصاً حنفی مذہب میں اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ، ذرائع آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے۔ میرے لئے اس سلسلہ میں صرف اتنا بیان ہی کافی ہوسکتا ہے۔

## غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کیساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات

(۲) غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں۔ اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ[۱] اگر ان کا قبضہ ہوجائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہوجاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانونِ جنگ سے ہے۔ اسی سلسلہ میں غنیمت،

---

[۱] العیاذ باللہ کا لفظ میں نے اپنے فقہاء کی تقلید میں لکھا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانوں پر ایک وہ وقت بھی گذرا ہے جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابلِ برداشت تصور کرتے تھے۔ پھر آسمان نے رُخ بدلا اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا اسے دیکھنا پڑا۔ اور کیسا دیکھنا؟

نئی، متعلقاتِ فئی وغیرہ کی آمدنیاں ہیں۔ علاوہ ان عطایا و وظائف وغیرہ کے، جو اسلامی فوجوں کو حکومت سے ملتے تھے۔ چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان اور قیمتی ذریعہ تھا۔ اور انکی معاشی فراغ بالیوں پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا۔ چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہیں ہے، بلکہ اس کی اکثر شکلوں کا تعلق حکومت سے ہے۔ اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہاں حاجت نہیں۔ البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے مباح اور جائز ہے، یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خرید ے تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا!

## غنیمت و فئی کی حلت کی وجہ

پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا بھی مال مباح و جائز ہے، یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں۔ غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگوں سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فئی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے) ان دونوں قسم کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لئے مباح اور جائز قرار دیا ہے!

## غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم!

اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہو گیا۔ یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رُو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے، مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا ازیں قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے، تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں؟

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے، اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے۔ مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا، اس پرندہ کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے

حنفی فقہ کی عام کتابوں میں:۔

لا ربوا بین الحربی والمسلم        الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) اور

المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) میں ربوا (سود) نہیں ہے!

کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ بین الاقوامی قانون کا ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشار سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے، تو ہر جگہ، ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہیئے۔ "حربی" یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنیٰ! مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اسے اپنی ملک بنانا ہے۔ اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابوں میں عموماً کیا جاتا ہے۔ کہ

لا ربوا بین العبد والمولیٰ!

(درمیانِ غلام اور اس کے آقا کے ربوا (سود) کا معاملہ سود کا معاملہ نہیں)

یعنی شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا تو وہ ربوا نہ ہوگا۔ یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ بھلا اس کا حق ایک مجتہد کو کیا ہے۔ بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا مال ہے۔ پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا، وہ اس کا مال نہیں، اپنا مال لیا۔ اور اپنا مال کسی پر کیوں حرام ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی کے مختلف مدوں کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لے لیتا ہے۔ فرض کیجیئے کہ اگر اس قرض میں وہ کچھ سود بھی لگا کر اس مد میں جمع کر دیا کرے، جس سے اس نے قرض لیا تھا تو کیا واقعی بلحاظ سود سے وہ سود ہو جائے گا؟

اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال میں ملایا ہے، خواہ کسی نام سے ملائے۔ قانوناً شرعاً کوئی اس کو سود نہیں کہہ سکتا۔

## ہندوستان میں مسئلہ ربوا (سود) کا حکم!

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان[1]، جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، یہاں

[1] یہ کتاب قیام پاکستان سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس لئے مصنف نے یہ بطور امر واقعی بیان کیا ہے ۱۲

کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علماء[1] سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ بعض غیر قانونی دماغوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بناء اس پر ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے تو پھر اس ملک میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہیں کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا؟

حالانکہ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے۔ وہیں دوسرا فقرہ "من غیر غدر" یعنی خلافِ معاہدہ لین دین نہ ہو" کی قید بھی بڑھائی ہوئی ہے۔ کہ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے۔ اس کے قانون میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدے کے ساتھ ہی آباد ہیں، کہ حکومتِ وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ اب اگر چوری، ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہے۔ بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے پس یہ حکومتِ وقت کے ساتھ غدر نہیں ہے۔ اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو معاً قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطہ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ[2]؟

اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی

---

[1] جس میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ میں یہ فتویٰ ایک سے زیادہ مقام میں موجود ہے۔ یہاں یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے جب لال قلعہ میں تیموری سلاطین نام نہاد شاہِ ہند کے نام سے موجود تھے۔ لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی، اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند میں کر دیا تھا۔"

[2] اسی لئے ان لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع، قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں، تو پیش کریں۔"

نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ ورنہ ادھر سو ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے۔ غالباً صورتِ حال یہ نہ ہوتی، ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ لیتا رہا اور دُوسرا طبقہ صرف دیتا رہا۔ اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں، بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورتِ حال کا علاج موجود تھا، لیکن انہوں نے ایک جزو پر عمل کیا اور دُوسرے کو ترک کر دیا۔ اور اب تو شاید مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر چاہئے تو تھا کہ میں سود کے باب میں کرتا، جیسا کہ عموماً فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ربٰوا کے باب سے نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ اسی لئے یہاں یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے بخلاف اس باب کے جہاں خود مسلمانوں کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کی جاتی ہے غیر موزوں مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحب کا صحیح نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے نہیں آتا

بہر کیف مذکورۂ بالا چند استثنائی صورتوں کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم ۔ باہمی رضامندی سے لین دین ہو!

پر مبنی کیا ہے۔ یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا۔ اسی اصُول کو پیشِ نظر رکھ کر فقہاء اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں باہمی مراضاۃ " کی شرط تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین میں مسلّم ہے۔ چوری ڈاکہ، فریب، دھوکا، غبن وغیرہ کو جُرم اسی بناء پر قرار دیا گیا ہے۔ کہ ان تمام شکلوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے۔

لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا " مالی معاملات " اور مال کے لین دین کے متعلق چند اور امور کا اضافہ بھی کیا ہے جن میں پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں :-

لا تاکلوا اموالکم بینکم ۔ "باطل" طریقے سے باہم ایکدوسرے کا

بالباطل ۔ مال نہ کھایا کرو!

کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور دُوسری اصل قرآن ہی میں :-

لا تَظلمون و لا تُظلمون ۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے!

کے دو مختصر لفظوں میں مذکور ہے۔ ہم اس وقت ان ہی دو اصول اور ان کے نتائج پر بحث کرنا

چاہتے ہیں کہ "اسلامی معاشیات" کی تصحیح وارتقاء میں ان دو قاعدوں کو میرے خیال میں بہت زیادہ دخل ہے۔

## اکل بالباطل کا مطلب!

پہلی بات، یعنی باہم ایک دوسرے کا مال بالباطل نہ کھایا جائے۔ پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لینا چاہئے۔ مثال سے اس کو یوں ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کا کوئی کام کر کے یا آپ کو اپنی کوئی چیز دے کر یا اپنی چیز سے آپ کو نفع اٹھانے کا موقع دے کر اگر آپ سے آپ کا مال لیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آپ پر اپنا ایک حق قائم کرنے کے بعد اس کے معاوضہ میں آپ کا مال لے رہا ہے۔ یہ تو الفاظ کا مطلب ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں کاروبار کی ساری سرگرمیاں اس لیے پر مبنی ہیں کہ ہر شخص ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کر رہا ہے اگر اسی شکل کو یک طرفہ کر دیا جائے۔ یعنی دینے والوں کو لینے والوں سے کچھ نہ ملے، تو نہ زراعت چل سکتی ہے، نہ تجارت نہ حرفت نہ صنعت۔ جب معاوضہ ادا کئے بغیر لوگوں کو زندگی کی ضروریات ملنے لگیں گی، تو پھر خواہ مخواہ معاوضہ کے مہیا کرنے کی فکر میں کوئی کیوں مشغول ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا، کہ ملک کے باشندوں کی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ دُنیا میں آ آ کر اپنی قیمت حاصل کئے بغیر قبروں میں دفن ہوتا چلا جائے گا۔ نیز ان کے دل ودماغ اور عملی جد وجہد سے ملک کو اپنے معاشی ارتقاء میں جو مدد مل سکتی تھی، اس سے وہ محروم ہو جائے گا۔

## گداگری کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر!

یہی وہ بنیاد ہے کہ گو دُنیا کے اکثر حصوں میں گداگروں اور سائلوں کو صرف یہی نہیں، کہ مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض علاقوں، مثلاً ہندوستان میں عظمت واحترام کی آخری بلندیوں پر یہ لوگ قابض تھے۔ اور اب تک ہیں۔ جن کا گذارا بھکشا اور دان پُن پر ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نیکی اور پُن کی بات ہے لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کہ کھاتے پیتوں کے لئے سوال کو جرم قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| من سال الناس عن ظهر غنی فانما یستکثر من جمر جهنم! (صحاح) | باوجود غنی ہونے کے جو لوگوں سے بھیک مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے جمع کرتا ہے! |

یعنی باوجود "غنا و استطاعت" کے جو بھیک مانگتا ہے۔ وہ جہنم کے انگاروں کو اکٹھا کر رہا ہے اور غنا سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ کافی دولت و ثروت رکھتا ہو۔ بلکہ اسی حدیث میں ہے کہ پوچھنے والے نے دریافت کیا۔

یا رسول اللہ! ماظھر غنی؟ — اے رسول اللہ کے! غنی کا کیا مطلب ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے۔ ارشاد ہوا:۔

ان یعلم ان عند اھلہ مایغذیھم و مایعشیھم! — جو یہ جانتا ہے کہ اس کے گھر میں اتنا سرمایہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے صبح و شام کی غذا مہیا ہو سکتی ہے!

خواہ وہ کسی شکل میں مہیا ہو سکتی ہو، مثلاً جو یا جواری، باجرہ کی روٹی ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال اتنے معمولی سرمایہ رکھنے والے کے لئے بھی اسلام نے سوال کو قطعاً حرام کر دیا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس مالی سرمایہ نہ ہو، لیکن ہاتھ پاؤں کا سرمایہ اور اتنی قوت رکھتا ہو کہ کما کر کھا سکے۔ اس کے متعلق بھی ارشاد ہے، کہ:۔

لا تحل الصدقۃ لغنی ولا لذی مرۃ سوی۔ — صدقہ حلال نہیں ہے، صاحب غنا کے لئے اور نہ مضبوط، ہٹے کٹے کے لئے۔

اور یہ:۔

لاحق فیھا للغنی ولا لقوی مکتسب۔ — صدقہ میں حق نہ کسی غنی کا ہے اور نہ کمانے والے توانا آدمی کیلئے اس (صدقہ) میں حصہ ہے!

بہرحال بجز چند مخصوص صورتوں کے، جن کی فقہاء نے تصریح کر دی ہے۔ ملک کے ہر باشندے پر جس میں کسی قسم کی بھی، مالی یا بدنی صلاحیت ہو، عموماً اسلام نے سوال کو حرام کر دیا ہے اور اس سے یہی غرض ہے کہ اس قسم کی تمام قوتیں ملک کے معاشی ارتقاء میں اپنی اپنی وسعت کی حد تک ہاتھ بٹائیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کو کون کہہ سکتا ہے۔

## تندرست و توانا آدمی کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے

ان کو شاید معلوم نہیں کہ اسلام میں لینے والوں ہی پر عموماً بھیک حرام نہیں ہے، بلکہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا صفات یعنی کم از کم مالی یا بدنی صلاحیت رکھنے

والوں کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفی نے "الاشباہ والنظائر" میں مذکورہ بالا صورتوں کے متعلق لکھا ہے۔

| | |
|---|---|
| ان السائل والمعطی اثمان۔ | بھیک مانگنے والے اور بھیک دینے والے دونوں مجرم ہیں۔ |

سائل اور گداگر کے مجرم ہونے کی وجہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن دینے والوں کو مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے لکھی ہے۔

| | |
|---|---|
| فلکونہ معینا علی الحرام | اس نے ایک جرم میں مجرم کی مدد کی! |

اگرچہ بعض علماء کو اس سے اختلاف ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ۔

| | |
|---|---|
| لو علم المعطی ان السائل لا یتخذہ کسبا فلا آثم علیہ ولو علم انہ یتخذہ کسبا ویعتاد السوال فھو آثم۔[1] (العرف الشذی ۲۹۱) | اگر دینے والا یہ جانتا ہو کہ سوال کرنے والا اس کو اپنا پیشہ نہ بنائے گا تو ایسے دینے والے کو گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ جانتا ہو کہ بھیک کو اپنا پیشہ بنائے گا تو دینے والا بھی گنہگار ہوگا۔ |

## قمار اور اس کی مختلف صورتوں کی حرمت

اکل مال بالباطل ہی کی ایک شکل وہ ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ میری مراد قمار اور اس کی مختلف شکلوں سے ہے۔ جس کا رواج اس وقت تک دنیا کے ان علاقوں میں بھی موجود ہے جو کسی معاشی قوت کو بیکار چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ آخر جوئے میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے۔ اس کے معاوضہ میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے؟ صرف یہی نہیں کہ یہ اکل مال بالباطل ہے۔ بلکہ گو لفظاً ہر ہارنے والا اپنی مانی ہوئی شرط کی بناء پر ہارتا ہے اور اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ رضامندی سے اس نے اپنا مال جیتنے والوں کو دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ، اتنا غیظ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر بھی ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری جاتا

---

[1] گداگری کے متعلقہ مسائل کی تھوڑی اور تفصیل آئندہ بھی اپنے مقام پر آنے والی ہے ۱۲

ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جُوَا (قمار) کے متعلق یہ ارقام فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| لانه اختطاف لاموال | کیونکہ وہ جُوئے میں، لوگوں کے اموال کو اس |
| الناس عنهم معتمد على | طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت |
| اتباع جهل وحرص و | حرص اور جُوٹی آرزؤں کے ہاتھوں آدمی |
| منية باطلة وركوب غير | گرفتار ہوتا ہے۔ اور دھوکہ پر سوار ہو کر اس |
| رتبعثه على هذه الشروط | میدان میں کودتا ہے۔ اور حرص غلط آرزو |
| وليس له دخل في التمدن | وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر |
| والتعاون فان سكت | آمادہ کر دیتی ہے، جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر |
| المغبون سكت على غيظ | اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے۔ ہارنے والا |
| وخيبة وان خاصم خاصم | اگر ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو اسکی |
| فيما التزمه بنفسه اقتحمه | یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی ونامرادی کی |
| بقصده والغابن يستلذ | چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں وہ اپنے |
| ما هو قليلة الى كثيره | قصد و ارادہ سے گھسا تھا۔ یوں ہی جیتنے والا |
| ولا يدعه حرصه ان | اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کا ذہاد |
| يقلع عنه وعما قليل | کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے |
| يكون الترة عليه. | اور اس کی حرص اجازت نہیں دیتی کہ اس |

فعل سے باز آئے، بالآخر کچھ ہی دن کے بعد اس کا تاوان خود ہی اسکے سر پر مسلط ہو جاتا ہے!

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس بدعت کا رواج ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ ہے۔

| | |
|---|---|
| افساد للاموال ومناقشات | ملک کی دولتِ عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا |
| طويلة واهمال الارتفاقات | ہو جاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں کے |
| المطلوبة واعراض عن | سلسلے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اور حصولِ معاش |
| التعاون المبني عليه | کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے |
| التمدن! | دروازے بند ہونے لگتے ہیں، لوگ اس |

باہمی امداد و اعانت سے لاپروائی برتنے لگتے ہیں، جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے!

فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| المعاينة يغنيك عن الخبر هل رأيت من اهل القمار الا ما ذكرنا؟ | دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ اس باب میں تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا۔ کبھی بھی کسی اور چیز کا مشاہدہ کیا ہے؟ |

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶)

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں، بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا ان کو ممنوع قرار دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی بعض صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہہ سکتے ہیں۔ اور متمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ (کپڑے کو پھینک دیا جاتا جس پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا) ملامسہ (جس کپڑے پر مثلاً ہاتھ پڑ گیا۔ جبراً خریداری اس کی ضروری تھی) از یں قبیل اور صورتیں بھی تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کر دی گئیں۔ مقصود یہی ہے کہ ہر شخص ملک اور ملک کے باشندوں کی کچھ خدمت کر کے کھائے اور کمائے۔ تاکہ ملک کی دولتِ عامہ کی پیدائش میں ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو اور یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کا استعمال مختلف دینی، اخلاقی، اجتماعی اغراض سے اسلام نے اپنے ماننے والوں پر حرام کر دی ہیں ــ ان چیزوں کی تجارت بھی اس نے ممنوع قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان الله اذا حرم شيئاً حرم ثمنه۔ | حق تعالیٰ نے جب کسی چیز کے استعمال کو حرام قرار دیا، تو پھر اس کے دام کو بھی حرام قرار دیا |

کیونکہ ایسی چیزوں کے لینے والے جب اس سے نفع ہی نہیں اٹھا سکتے تو ان کا جو مال ان چیزوں کے معاوضہ میں لیا گیا وہ بالباطل ہی لیا گیا۔ اس ذیل میں فقہاء اسلام نے بعض چیزوں کی تجارت ممنوع قرار دی ہے۔ تاہم انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں نفع کا پہلو کسی راہ سے بھی پیدا ہو سکتا ہے ان کے استثناء کی بھی راہ نکالی جائے۔ مثلاً میتہ (مردار) حرام ہے۔ لیکن باوجود اس کے، مردہ جانوروں کی کھال دباغت کے بعد، بلکہ ان کی ہڈیاں اون، کھر، سینگ، پٹھوں

وغیرہ کی تجارت جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمادات و نباتات، حیوانات، بلکہ ہر وہ چیز جس میں انتفاع کی کوئی صورت نکل سکتی ہو، فقہاء نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی معاشی سہولتوں کے لئے ان کی تجارت کی اجازت دی جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بجز چند چیزوں کے، جن کی حرمت قطعی ہے۔ یا جو نجس العین ہیں۔ یا صراحتہً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیع کی ممانعت فرمادی ہے۔ عموماً عام چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اور تقریباً تجارت اور لین دین کے وہ تمام طریقے، جو دنیا میں مروج ہیں اگر اکل بالباطل" اور "لا تظلمون ولا تظلمون" کی زد میں نہ آتے ہوں، اسلام نے ان کی اجازت دے رکھی ہے۔ مثلاً نقد دے کر ضرورت کی چیزیں خریدنی۔ چیز دے کر چیز لے لینا، یا دام بعد کو دینا، جسے نسئہ (ادھار) کہتے ہیں یا دام پہلے دینا اور چیز بعد کو لینا[1] جسے سلم کہتے ہیں (بعض خاص شروط، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی پر ظلم ہوجاتا تھا) سلم کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء اسلام نے اسلامی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہر شکل کے احکام اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔ پھر اس لئے تاکہ خرید و فروخت کرنے والوں کو سوچنے، غور کرنے کا اور دیکھنے بھالنے کا موقعہ ملے، یا عیب و نقص کی وجہ کر واپسی کا امکان پیدا ہو، تجارت میں خیار[2] کا قانون بھی رکھا گیا ہے۔ الغرض ممکن سے ممکن آسانیاں جو ہو سکتی ہیں، سب فراہم کر دی گئی ہیں اور قرآن میں۔

احل اللہ البیع — تجارت کو خدا نے حلال فرمایا ہے!

کے ذریعہ سے گویا مذکورہ بالا صورتوں کی حلت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں لین دین کی ایک خاص شکل، جس کا نام ربوا یا سود ہے، اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے معاشی اس کے متعلق حیران ہیں۔ اس کے جواز و عدم جواز کی بحث تقریباً تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چھڑی ہوئی ہے اسلام نے فیصلہ کر دیا کہ اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو

---

[1] البتہ اس کی چوتھی عقلی شق، یعنی دام بھی نہ دیئے جائیں اور چیز بھی نہ خریدی جائے، دونوں کی دونوں اُدھار ہوں، عربی میں اس کو بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں۔ یہ بیع کی ناجائز صورت ہے کہ دونوں کے نامعلوم و مجہول ہونے سے ادائیگی کے وقت بے شمار جھگڑوں کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ صحیح حدیثوں میں اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔۱۲

[2] خیار یعنی اختیار، مطلب یہ ہے کہ خریدار کو بھی اور بیچنے والوں کو بھی چند خاص شروط کے ساتھ اس کا اختیار ہے کہ معاملہ کریں، یا نہ کریں۔۱۲

اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ کہ اسلام میں یوں تو اخلاقی اجتماعی، ملی یا کسی اور نقطہ نظر سے جرائم کی ایک تفصیلی فہرست پائی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف ایک اسی معاشی جرم پہ قرآن نے بجائے کسی ایک سزا کے چار چار سزاؤں کی دھمکیاں دی ہیں، یعنی

(۱) سود خوار آسیب زدہ مخبط کی شکل میں کھڑا ہو گا!

(۲) اس کی دولت کا وہ حصہ جو سُود کے ذریعہ حاصل ہو گا۔ مُحق اور برباد کر دیا جائے گا۔

(۳) وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا!

(۴) اور آخر میں سود خوار کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ۔ یا وہ اس معاشی جرم سے باز آئے ورنہ اللہ اور اُس کے رسُول کو اعلانِ جنگ دے دے!

یہ بات کہ اسلام نے تجارت کے اس طریقہ کو کیوں مجرم قرار دیا ہے۔ اس کی توجیہہ آسان نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات یہی ہے کہ اگر سُود کی خرابیاں اتنی واضح اور جلی ہوتیں تو قرآن میں غالباً اس کا ذکر بھی نہ ہوتا، یا ہوتا تو جیسے اور جرائم مثلاً چوری، ڈاکہ، فریب، جھوٹ وغیرہ کا ذکر ہے اس کا بھی اسی نوعیت سے تذکرہ کیا جاتا۔ لیکن اتنی اہمیت جو اس کو دی گئی ہے اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام کیا، بلکہ انسانوں کے خاص عقول کی بھی رسائی اس کے دُور رس نازک خطرناک نتائج تک نہیں ہو سکتی۔ ہزارہا ہزار سال سے عقلی معاشیات والے سُود کے افادہ و افساد پر بحث کر رہے ہیں، لیکن آج تک کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں انسان کو عقل سے بھی کسی بالاتر ذریعہ سے اس کے متعلق آخری فیصلہ واضح لفظوں میں سنا دیا جاتا۔ اور یہی قرآن نے کیا۔

## حرمتِ سود کی وجہ

تاہم اگر اکل بالباطل اور "لا تظلمون ولا تظلمون" قرآن کے ان دونوں معاشی بنیادوں کو ہم سامنے رکھ لیں، تو شاید کچھ اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں تک ایک حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ مثال سے اس کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ دُنیا کے سارے کاروبار، لین دین میں معاملہ کے فریقین میں ہر ایک دُوسرے کے لئے کچھ نہ کچھ قربان کرتا ہے۔ مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے خریدار روپیہ ادا کرتا ہے۔ کرایہ کی شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو جس وقت

تک کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ موٹر کے تمام کل پرزے اپنی صفات کارکردگی کو تبدریج کھوتے رہتے ہیں۔ یا سال بھر کے بعد مکان کو جب کرایہ دار واپس کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر و اجزاء اپنی اس حیثیت پر باقی نہیں رہتے، جو کرایہ دینے کے وقت ان کی تھی۔ الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اصل چیز، یعنی موٹر، مکان وغیرہ مالک کو واپس ہو جاتی ہے۔ لیکن صفات کی قربانی ان میں بھی ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں، جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپے قرض لئے اور دس سال بعد واپس

---

لے زراعت کا مطالعہ جنہوں نے سائنس اور کیمیائی معلومات کی روشنی میں نہیں کیا ہے۔ ان کو زمین کے متعلق بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی کھیتی کرنے کیلئے کرایہ پر کسی کی زمین لے اور چند سال اس میں کاشت کرنے کے بعد اگر واپس کر دے تو جس حال میں اس نے زمین لی تھی اسی حال میں واپس کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ واقعات سے جہل کا نتیجہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ بھی جس زمین سے پیداوار حاصل کی جاتی ہے تو اس کے بہت سے کیمیائی مفید اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے سائنٹی فک کاشتکاری میں ہر سال کھاد وغیرہ کا دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے، ہندوستان کے جاہل کسان اس راز سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آج جاپان اور یورپ و امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسٹر مسانی کی کتاب "ہمارا ہندوستان" ایک بڑی دلچسپ کتاب ہے، اردو میں بھی عصمت اللہ بیگ صاحب نے اس کو منتقل کیا ہے۔ اسی کتاب میں "زمین کے کھار" کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ

"کھاد جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں، جب زمین کے کسی خاص حصہ میں یہ خاص کھار (نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس، لائم) کافی مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں پیداوار خوب تیزی سے ہوتی ہے اور وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے، مگر جہاں ان میں سے چند یا سب کے سب تمام کھار غائب ہوں تو ایسی زمین کو بنجر کہتے ہیں؛"

آگے اسی میں ہے کہ "دوسری تمام اچھی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قدرتی کھاد کا ذخیرہ کم و بیش محدود ہوتا ہے ابتداء میں یہ کھار خاصی مقدار میں ہوتے ہیں اور گو ان کی کمی قدرتی طور پر تھوڑی پوری ہوتی رہتی ہے، لیکن جب کاشت ہونے لگے تو وہ برابر کم ہوتے جاتے ہیں" چنانچہ ایک ایکڑ زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن سال بھر خرچ ہوتی ہے۔ اور ایک "کھار" نائٹروجن کا حساب ایک ایکڑ کے لحاظ سے ہے۔ اس پر اب دوسرے کھاروں کو قیاس کر لیجئے۔ اسی کتاب میں ہے "جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھار پودوں اور اناج کا جزو بن کر نکلتا رہتا ہے اتنی ہی مقدار میں زمین کے اندر اس کی کمی ہوتی جاتی ہے" (ہمارا ہندوستان)

کئے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپیوں کو اسی طرح ٹھونک بجا کر لیں گے جس طرح آج سے دس سال پہلے دیئے گئے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں روپے کی صفات پر کہنگی اور فرسودگی طاری ہو گئی اور اس کی وجہ روپیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر روپیہ دوسرے روپیہ کی کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے۔ جس کے معنیٰ یہی ہوئے کہ قرض دینے والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے اور نہ مال کے صفات کی۔ اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا اس کے معاوضہ میں آپ ہر مہینے اس کا کرایہ اگر وصول کریں گے تو سوال یہی ہے، کہ آپ کی طرف سے کیا قربانی ہوئی۔ نہ روپیہ کے ذات کی، نہ صفات کی، خلاصہ یہ ہے کہ قرض دینے والے کی پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتی ہے۔ بخلاف لینے والے کے، کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سُود یا کرایہ اس طور پر دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی، اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے لیا تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں۔ لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی ذات وصفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دن دونی آمدنی بھی۔

ایسا شخص، جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان، کیا اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں، اور صرف نفع، اور کیسا نفع؟ اضعافاً مضاعفہ (دو گنے چو گنے) کے حساب سے منافع کے دروازے جس پر کھلے ہوئے ہیں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے۔ جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار رہتا ہے پس چند دنوں میں تو شاید نہیں، لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یکطرفہ گردش، دولت کی جب کبھی ہوئی ہے۔ تو دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ، یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ ہو رہی ہو، اور ان کے پاس قدرِ حاجت سے بچ کر پس انداز بھی ہوتا ہو، جو عموماً ہر ملک وقوم میں تھوڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنے روپیہ کو سُود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں، تو ان کے یہی روپے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں اور شخصوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بات اسی حد پر آکر رک نہیں جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی

اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آکر ان سود خوار دوں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہوجاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے۔ سلطنتیں تباہ ہوجاتی۔ امن وامان غارت ہوجاتا ہے، غربا بھوکے، غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولتمندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں تاریخ ان نتائج کو آج یورپ میں دہرا رہی ہے، یا دُہرانے والی ہے۔ اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے یہی، کہ معاشی کاروبار میں اکل بالباطل، یعنی (بغیر کچھ دیئے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور لاتظلمون ولا تظلمون، کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| فلیزد الحال علی المحتاج | محتاج (مقروض) پر مالی بار زیادتی کیساتھ |
| من غیر نفع یحصل له | بڑھ جاتا ہے۔ اور اس طور پر بڑھتا ہے کہ خود |
| ویزید مال من غیر نفع یحصل | اس مال کا نفع اسے نہیں ملتا اور قرض دینے |
| منه لاخیه فیاکل مال | والے) سود خوار کے مال میں اضافہ اس طور |
| اخیه بالباطل۔ | پر ہوتا ہے کہ اس سے اس کے بھائی (مقروض) |
| (ص ۴۰۰) | کو کچھ نفع نہیں پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سود میں |

آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر کسی وجہ کے باطل طور پر کھاتا ہے!

آخر سود خوار کو جب اس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی و صفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہٖ واپس ہو جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرضخواہوں سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے۔

"تمہارے روپے کیا بچے دیتے ہیں؟"

ارسطو کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے۔ جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دی جائے گی اور اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوگی تو آمدنی کے پس انداز کرنے والوں کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے آپ کو، یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے لیکن وہی ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچا رہا ہے۔ اس قسم کے کاروبار ان ہی ممالک میں فروغ پا سکتے ہیں جن کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لئے یا اپنے خاندان ہی کے لئے سمجھتے ہوں۔ اور اپنے ملک، یا شہر یا گاؤں کے دوسرے افراد سے انہیں کچھ بحث نہ ہو۔ آخر یہ سارا روپیہ، جو اُن کی پس انداز زائد از ضرورت رقم نے بشکل سود ان کے گھر پہنچائی ہے۔ وہ عموماً اسی ملک اسی شہر، اسی گاؤں، اسی محلے کے باشندوں کی جیبوں ہی سے تو وصول ہوتی ہے، جن میں وہ رہتے

سہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور نیشنلزم کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علمبردار کہتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خواروں ہی کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہو۔ بلکہ بنکنگ سسٹم کو جاری کر کے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے اس بات کا، کہ جس پس انداز کرنے والوں کو سُود خواری کی فرصت نہ تھی۔ وہ بھی اب بآسانی سود خواروں کی کمیٹی میں شریک ہو کر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہیں۔ اور اس لئے مغربی سود خواری نے اپنے ردِ عمل کو دنیا پر بہت جلد ظاہر کیا۔ یہ ایک حیثیت سے اچھا ہُوا۔ ہلکے بخار سے تیز بخار کا اسیر کر آجانا مریض کو جو نکلنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ آج یورپ اشتراکی حیوانوں بلکہ شیطانوں کے تھپیڑوں سے مضبوط ہو رہا ہے۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان دیا، چیلنج قبول کیا گیا۔ اسی سود کے بل بُوتے پر جنگ لڑی جا رہی ہے، جس کی نظیر نہ دُنیا کی آنکھوں نے پہلے دیکھی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ دیکھے گی؟ ماہرین کا بیان ہے کہ سُود پر با معانی حکومتوں کو روپیہ قرض اگر نہ ملتا تو یومیہ کروڑہا کروڑ روپے کی رقم موجودہ جنگوں میں جو صرف ہو رہی ہے۔ اتنی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سود ہی اعلانِ جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہُوا ہے جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مفقود ہے۔ اور پھر اسی جنگ کے ذریعہ سے انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ فضائی ہواؤں میں، اور کچھ جہاز، تارپیڈو اور خدا جانے کیا کیا بن بن کر سمندر کے پانیوں میں عمیق و فرسودہ ہو ہو کر برباد ہو رہی ہے۔ آئندہ زندگی میں، تو جو کچھ ہو گا وہ تو اسی وقت دیکھا جائے گا۔ لیکن شہر کے جن ڈاکٹروں، وکیلوں، تاجروں، اور ہر پیشہ وروں نے سود خواری کی انجمن (بنک) میں شرکت کی تھی۔ میدانِ جنگ بلکہ اپنے اپنے محل سراؤں اور کوٹھیوں میں، بنگلوں میں برستی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں، نہ گھر کے اندر چین ہے اور نہ گھر کے باہر جائے پناہ۔ خدا سے جنگ کرنے کے بعد لوگ پناہ کہاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ سود خوار کو جن جن عذابوں کی قرآن نے دھمکی دی تھی۔ جن کی آنکھیں ہیں، وہ دیکھیں، اور جن کے کان ہیں وہ سُنیں، اور جن کے دل ہیں وہ پچھتائیں، ان کو کہا گیا تھا کہ نہ دوسروں پر ظلم کرو اور نہ اپنے اوپر ظلم کراؤ۔ لیکن انہوں نے دوسروں پر بھی ظلم کیا۔ اور خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا۔ وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون

اور یہ تو ربوا (سود) کی عام صورت تھی۔ جس کے خطرناک نتائج پر اسلام سے پہلے بھی مختلف مذاہب میں تنبیہہ کی گئی تھی۔ بلکہ بعض عقلی معاشیوں نے بھی اس معاملہ کی شدت کو مخالفت کی تھی۔ لیکن اسلام نے صرف ربوا کی مروجہ شکل ہی کو اکبرالکبائر اور بدترین جرائم میں شریک نہیں کیا، بلکہ اگر کوئی شخص، کسی کو دس روپے دے کر کچھ دن کے بعد اس معاوضہ میں بیس روپے لے اور بجائے اس کے کہ اس کو سُودی قرض کا معاملہ قرار دیتا یوں کہئے کہ میں نے اس دس روپے سے تمہارے بیس روپے خرید ے ہیں۔ یا کسی تاجر نے دس روپے کے کپڑے ایک ماہ کے لئے کسی کے ہاتھ اس شرط سے ادھار بیچے کہ ایک ماہ کے بعد دام ادا نہ کرسکا، تو تاجر اس سے یوں کہے کہ میں ایک ماہ کی مہلت اس شرط سے دیتا ہوں، کہ تم بجائے دس کے بارہ ادا کرنا۔ ظاہر ہے، کہ ان تمام شکلوں میں صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ ورنہ حاصل وہی ہے جو سُودی قرض کا حاصل ہے۔ اس لئے اسلام نے قرض کے سُودی کاروبار کے ساتھ بیع اور خرید و فروخت کی ان شکلوں کو بھی سود اور ربوا قرار دیا۔ نیز جو حالت روپے کی ہے۔ بجنسہٖ یہی کیفیت اور بھی چند چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک من گیہوں قرض دے کر، دو مہینہ بعد کوئی شخص بجائے ایک من کے مزید ایک من گیہوں کا اضافہ کرکے دو من لیتا ہے تو اس میں اور اس شخص میں، جس نے دس روپے دے کر دو مہینے بعد بیس روپے لئے، کیا فرق ہے؟

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق معاشی نگاہ اس دقیق نکتہ تک پہنچی اور اسی بنا پر آپ نے اعلان فرمادیا کہ سود یا ربوا صرف روپے کے لین دین ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ربوا کے ذیل میں اور بھی چند چیزیں شریک ہیں۔ اور ٹھیک، جیسا کہ میں نے قمار میں عرض کیا تھا کہ جن جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا۔ اسلام نے قمار کی جڑ کاٹنے کے لئے ان کی بھی ممانعت کردی۔ اسی طرح ربوا کی مندرجہ بالا شکلوں کے سوا، جن میں دینے کے کچھ دن بعد بطورِ کرایہ کے زیادتی وصول کی جاتی ہے۔ جسے اصطلاحاً ربوالنسئہ (اُدھار کے معاملہ کا سود) کہتے ہیں۔ اسلام نے ان صورتوں کو بھی، جن میں اُدھار نہیں، بلکہ نقد، مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر کوئی دو تولہ چاندی یا نقد ایک من گیہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گیہوں دے اس کو بھی ناجائز ٹھہرادیا۔

اور مشہور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کی ان تمام چھوٹی بڑی واضح وغیر واضح شکلوں کی ممانعت فرمادی۔ یعنی:۔

| | |
|---|---|
| الذهب بالذهب والفضة | سونے کا معاملہ سونے سے، چاندی کا چاندی |
| بالفضة والبر بالبر | سے، گیہوں کا گیہوں سے، جَو کا جَو سے، کھجور |
| والشعیر بالشعیر والتمر | کا کھجور سے، نمک کا نمک سے (ہمیشہ) |
| بالتمر والملح بالملح مثلاً | برابر برابر اور اس ہاتھ سے اس ہاتھ دے |
| بمثل یداً بید فمن زاد | (یعنی نقداً) ہونا چاہئے پھر جو بڑھ جائے |
| واستزاد فقد اربیٰ | یا بڑھوائے اس نے سود (ربا) کا معاملہ |
| الاٰخذ والمعطی فیہ | کیا لینے والا اور کیا دینے والا، دونوں |
| سواء (صحاح ستہ) | اس میں برابر ہیں۔ |

حدیث میں تو صرف یہی چیزیں اموالِ ربویہ یعنی ایسے اموال قرار دیئے گئے ہیں جن کا باہمی تبادلہ زیادتی کے ساتھ نہ اُدھار جائز ہے نہ نقد، خواہ یہ تبادلہ قرض کے الفاظ سے ہو، یا بیع کے لفظ کے ساتھ ہو، بظاہر ربوٰا کے تحت میں ان شکلوں کو اسلام نے غالباً پہلی دفعہ داخل کیا ہے، ورنہ اس سے پہلے عموماً سُود اور ربوٰا روپیہ اور اشرفی، یعنی سکہ کے سُودی کاروبار ہی تک شاید محدود تھا۔ پھر بعد کو فقہاء اسلام نے اس حدیث پر غور کیا تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں کی تھیں، اور دُوسری چیزوں میں بھی انہیں محسوس ہوئیں، اسی لئے انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کو ایک توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو بھی اموال ربویہ یا ربائی مالوں میں شریک کردیا جن میں ان کی نگاہ میں وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

امام شافعیؒ اور قریب قریب امام مالکؒ نے بھی سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا کہ مراد اس سے ہر وہ چیز ہے جو لین دین میں قیمت کا کام دیتی ہے۔ اب خواہ وہ سونا چاندی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز۔

اسی طرح گیہوں اور جَو، نمک، کھجور کو دیکھ کر ان بزرگوں نے خیال فرمایا کہ مراد ہر وہ چیز ہے جو کھانے پینے میں کام آتی ہو۔ یا جن سے خورد و نوش کی چیزوں کی اصلاح کی جاتی ہو جیسے نمک۔ لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت کہ ہر فرد، دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان نتائج کی ذمہ دار ہے جو سودی کاروبار میں پیش آتے ہیں، اس نکتہ پر نظر صرف امام ابوحنیفہؒ کی پہنچی۔ انہوں نے خیال کیا کہ یہ خصوصیت کن کن چیزوں میں پائی جاسکتی ہے

چونکہ ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے ہوتی ہے ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی۔ اس لئے امامؒ نے بجائے ان خاص چیزوں کے ہر اس چیز کو، جو پیمانہ، یا تول کے ذریعہ سے بکتی ہو، اموال ربوی قرار دیا اور ان کے باہمی تبادلہ میں ربحا (ذیلتی) کو انہوں نے ناجائز ٹھہرایا۔

ان اجتہادی دقیقہ سنجیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ربٰو، جو اب تک دنیا میں صرف روپے کے قرض کے کاروبار کی ایک شکل تھی، اب ہزارہا چیزوں تک پھیل گیا۔ خصوصاً حنفی مذہب جو اسلام کے تشریحی مکاتب خیال میں سب سے زیادہ محتاط اسکول ہے۔ اس میں تو سُود کی اتنی گوناگوں شکلیں پیدا ہو گئیں کہ اب ان کا سمیٹنا دشوار ہو گیا ہے۔ فقہار نے تفصیلات میں دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں، لیکن اصلی بحث کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے جو عرض کیا گیا۔ عموماً فقہ کی کتابوں میں سُود کے مباحث کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ عوام، جسے سُود کہتے ہیں۔ اس کا تو اس میں گویا ذکر ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اسی بنا پر عوام ہی کو نہیں بلکہ بعض اچھے اچھے پڑھے لکھوں تک کو سمجھے، یوں یہ مغالطہ ہو گیا کہ اسلام نے جس سُود کو حرام کیا ہے۔ وہ قرض والا موجودہ سود نہیں ہے، بلکہ بیع اور خرید و فروخت کی چند نادر شکلیں تھیں جو ایامِ جاہلیت میں مروّج تھیں۔ اور اس ہی کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا۔

مگر ظاہر ہے کہ اسلام نے اس سود کو اگر منع نہیں کیا تو پھر اس نے منع کس چیز کو کیا ہے؟ آخر پر اس نے مذاہب بدھ مت، عیسائیت حتیٰ کہ ہندو مت تک میں جس سُود کو حرام یا گوہ کھانے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ یا ارسطو نے جس سُود کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ تمہارے روپے بچے نہیں دیتے، یہ قرض والا سُود نہیں تو اور کیا ہے؟

کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس "معاشی سرطان" کی تشخیص ارسطو تک نے کر لی تھی۔ اسی کے متعلق کہا جائے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس زہریلے گھاؤ پر نہ پڑی۔ اور پڑی بھی تو کس چیز پر، جس کا نہ اب دُنیا میں رواج ہے اور نہ کسی کو ان کا تجربہ ہے۔ خیر، یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ بھلا ایسے لوگوں سے کون بحث کر سکتا ہے۔ جو قرآن کے خنزیر کو عرب کا کوئی چوپایا اور قرآن کے خمر کو عرب کے کسی درخت کا خاص رس قرار دے کر واقعی جو خنزیر و خمر ہے اس کی حلت کا فتویٰ دے دیں!

بہر حال فقہائے اسلام کی ان احتیاطی موشگافیوں کی وجہ سے ایک دقت اور یہ

پیدا ہوئی۔ کہ ربوٰا کے بعض مسائل جن کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں کرتے ہیں، بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اس مسئلہ کی بنا پر کہ سونے کا سونے سے۔ چاندی کا چاندی سے تبادلہ کسی شکل میں ہو جید ہو یا ردّی، زیور کی شکل میں ہو یا سکّہ کی، بہر حال جب ان کا تبادلہ کیا جائے، تو دونوں کو وزناً برابر ہونا چاہیے۔ سوال ہوتا ہے کہ چاندی کے کسی زیور یا برتن کو کوئی ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کیوں دینے لگا، گویا زرگر کی کاریگری اور برتن بنانے کی محنت کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں؟ اسی طرح سوال ہوتا ہے کہ سونے چاندی کے تبادلہ میں یہ قید لگادی گئی ہے کہ لینے اور دینے والے کے ہاتھ میں دونوں بیک وقت آئیں۔ ورنہ خالی ہاتھ کے مقابلہ میں بھرے ہاتھ والا گویا ایک قسم کی زیادتی یا ربوٰا کا مستحق ہو رہا ہے۔ خواہ یہ زیادتی غیر محسوس اور غیر مادّی ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی بعض اور حیرت انگیز صورتیں بھی نقد میں پیدا ہوتی ہیں، پہلے مسئلہ کے متعلق تو حنفی فقہاء بے چارے یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ واقعہ تو یہی ہے کہ ایک تولہ چاندی کا زیور، ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کوئی نہ دے گا۔ لیکن ہم کیا کریں مذہب کا حکم یہی ہے۔ پس حکم کی تعمیل کرنے والے کو چاہیئے کہ ایسی صورتوں میں چاندی کے زیور کو سونے کے سکوں سے اور سونے کے زیورات کو چاندی کے سکوں سے خریدے۔ لیکن حنبلی فقہاء نے ایک صورت یہ نکالی کہ زیور بیچنے والے سے خریدار یوں کہے کہ تمہارے زیور کی چاندی جو ایک تولہ ہے۔ اس کے معاوضہ میں تو میں یہ ایک تولہ کا سکّہ دیتا ہوں۔ باقی زیور کی گھڑائی کی اُجرت مثلاً ایک روپیہ یہ الگ دیتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملہ یوں کیا جائے، تو درست ہو جائے گا۔

مقدسی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ان قال الصائغ صغ لی خاتما وزنه درهم واعطیك مثل وزنه و اجرتك درهما فليس هذا بيع دراهم بدرهمين قال اصحابنا للصائغ اخذ الدرهمين احدهما في | اگر سنار سے (زیور کا خریدار) یوں کہے کہ میرے لئے یہ انگوٹھی بنا دو، جس کا وزن ایک درہم کے مساوی ہو اور میں تمہیں اس چاندی کے معاوضہ میں اس قدر چاندی دیتا ہوں (یعنی ایک درہم) اور تمہاری مزدوری ایک درہم الگ ہوئی تو یہ ایک درہم کو دو درہم سے بیچنا قرار پائے گا ہمارے بزرگوں (فقہائے حنابلہ) |

مقابلۃ الخاتم والثانی اجرۃ له (۱۴۰۔ المغنی ج ۴) فرماتے ہیں کہ سنار کے لئے ان دو درہموں کا لینا جائز ہوگا جن میں ایک درہم تو انگوٹھی کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم سنار کی مزدوری ہوگی!

لیکن سچی بات ہے کہ ربوا کے باب میں اس قسم کے بعض مسائل کا جو ذکر کر دیا جاتا ہے، جن میں بظاہر عملی دشواریاں نظر آتی ہیں، اُن کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اسلام چونکہ قطعی طور پر ربوا کی بنیاد انسانی معاشیات سے اکھاڑ کر نکال دینا چاہتا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں اس کی باریک رگ اور ریشے نظر آتے ہیں۔ انہیں بھی فوراً نوچ کر پھینک دیتا ہے۔ اور ایک ایسے خطرناک ہلاک معاشی جرثومہ کے نکالنے کے لئے مسلمانوں کو اگر کچھ عملی دشواریاں پیش آجاتی ہیں تو چاہئے کہ اپنے نقطۂ نظر کے استحکام کے لئے اسے بخوشی برداشت کر لیا جائے، کچھ مذہب ہی کی راہ میں نہیں، بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنے آئیڈیل کی حفاظت کے لئے لوگ اس سے بھی زیادہ دشواریاں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

ماسوا اس کے ایک قصہ اور بھی ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق اگر ایک طرف ربوا سے ہے۔ تو اسی کے ساتھ اسلام کے بعض دوسرے اصول بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں، چونکہ ان مسائل کا عموماً ذکر ربوا ہی کے باب میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ صرف اسی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے سامنے ان مؤثرات کو بھی واضح کر دیا جائے، تو شاید دشواری جتنی محسوس کی جاتی ہے، وہ باقی نہ رہے۔

مثلاً یہی سونے چاندی کے ظروف اور زیورات وغیرہ کے خرید و فروخت کا مسئلہ ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات اور تقابض (یعنی دست بدست) لینے کی دونوں قیدوں نے ان کی خرید و فروخت میں ضرور دشواری پیدا کر دی ہے۔ لیکن یہ دشواری اس میں کیوں پیدا کی گئی، کیا صرف ربوا سے بچنے کے لئے؟ بظاہر یہی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کاش! اسی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے اس نقطۂ نظر کا بھی علم ہوتا۔ جو سونے چاندی کے ظروف اور زیورات کے متعلق وہ رکھتا ہے۔ دنیا نے پہلے سمجھا ہو، یا نہ سمجھا ہو، لیکن اب تو یہ مسئلہ تقریباً بداہت کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ کہ سونا اور چاندی جو بنی آدم کا ایک بین الاقوامی پیمانۂ قیمت ہے، ان کو مالی معاملات کا واسطہ بنانے کی جگہ مقصود بالذات بنا کر زیوروں اور برتنوں کی شکل میں مقید کر دینا ملک کی معاشی ارتقاء میں بدترین سنگِ راہ کو حائل کرنا ہے۔ ایک ہندوستانی

معاشی اپنے مفلس ملک کا نوحہ ان الفاظ میں کرتا ہے ۔

"ہندوستان کی قدامت پسندی اور جہالت بھی اس ملک کی غربت کی بہت کافی حد تک ذمہ دار ہے ۔ ہندوستان میں جس قدر بھی دولت موجود ہے، اس ملک کے باشندے اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے ۔ ان کی دولت یا تو زیورات کی شکل میں ان کی عورتوں کے گلے کا ہار بن گئی ہے، یا دفینوں کی صورت میں زمین کے نیچے پڑی ہوئی ہے ۔"

پھر اس غریب ملک میں "زیور" اور "ظروف" نے معاشی آب حیات کے اس بحرِ رواں کو جس مقدار میں منجمد کر کے بیکار کر دیا ہے ۔ اس کی رپورٹ دیتے ہیں ۔

"اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۴۸ روپے فی کس اس وقت ہندوستان میں بالکل بیکار موجود ہیں ۔"

جس ملک میں فی کس تین پیسے بھی آمدنی کا اوسط مشکل سے ہے، اس ملک پر اس معاشی فالج کا کیسا سخت اور شدید ترین حملہ ہے کہ فی کس ۴۸ روپے زیوروں اور برتنوں یا دفینوں کی شکل میں اس طرح قید ہو، کہ

ایں طرفہ تماشا ہیں لب تشنہ بر آب اندر

کا تماشا پیش کر رہے ہیں ۔ وہی بے چارا معاشی لکھتا ہے :۔

"ہمارے ملک والوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ دولت کا صحیح مصرف اسے کاروبار میں لگانا ہے ۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ دوسرے لوگ ہم سے کس قدر آگے بڑھ چکے ہیں ۔ کیونکہ وہ اپنا ایک پیسہ تک بیکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے پاس جو رقم بھی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچتی ہے ۔ اسے سرمایہ کی صورت میں اپنے کاروبار میں لگا دیتے ہیں ۔ اس کے برعکس ہمارے بھائیوں کے پاس جب کبھی ایک اُدھ پیسہ بچ جاتا ہے تو اس کا زیور بنوا کر اپنی عورتوں اور بچوں کو اس میں جکڑ دیتے ہیں ۔"

گویا سونے چاندی کو زیورات، یا برتنوں وغیرہ کی شکل میں مقید کرنا، ملک کی دولت کو بیکار

کرنا ہے اور معاشی مذہب میں ایک پیسہ تک کو بے کار رکھنا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ سونے چاندی کی ایک رتی کا بھی زیور یا ظروف وغیرہ کی شکل میں رکھنا معاشی نقطہ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ لیکن دُنیا کے معاشیوں کو تو شاید اس کا علم اب ہوا ہے۔ مگر دینی معاشیات کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ صدی پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے

| | |
|---|---|
| لا تشربوا فی آنیة | سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو |
| الذھب والفضة ولا | اور نہ ان کے بادیوں میں کھانا کھایا |
| تاکلوا فی صحافھا۔ (صحاح ستہ) | کرو! |

صرف ممانعت ہی پر کفایت نہیں فرمائی گئی بلکہ ملک کے اس معاشی مجرم کے متعلق یہاں تک ارشاد ہوا۔

| | |
|---|---|
| الذی یاکل ویشرب | چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے |
| فی آنیة الفضة انه | جہنم کی آگ ہی اس کے پیٹ میں |
| یجرجر فی بطنه نار جہنم | وہ گھولے گا۔ (بخاری) |

اور اس لئے بالاتفاق تمام فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال ہر مسلمان مرد عورت کے لئے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے، مردوں کی حد تک قریب قریب یہی حکم زیورات کا بھی ہے۔ یعنی بجز خاتم (انگوٹھی) کے، کہ اس کے متعلق فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ہر قسم کے زیور، سونے کے ہوں یا چاندی کے، مردوں پر حرام ہیں اور گو عورتوں کے خاص جذبات کے لحاظ سے ان کو ایک گونہ اجازت دی گئی ہے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس باب میں جو ارشادات ہیں اور مختلف اوقات میں آپ نے عورتوں کے زیور کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اس سے منشاء مبارک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو اپنے گلے کا طوق، ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر تھا۔

| | |
|---|---|
| یالیت امتی لم تحل | کاش! میری امت ہی (مرد ہو یا عورت) |
| الذھب (مسند احمد) | سونے کا زیور نہ پہنتی! |

یہ آپ کی مشہور حدیث ہے، جس میں مردوں ہی کے متعلق نہیں، بلکہ اُمتی جس میں عورتیں بھی داخل ہیں، تمنا کی گئی ہے کہ سونے کا زیور استعمال نہ کریں تو اچھا ہے۔ قطع نظر اس روایت کے جس میں ایک صحابیہ ام عطیہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے

لئے سونے کے زیور کی اجازت چاہی گئی، تو :-

فَاَبیٰ علیہ — آپؐ نے انکار فرمایا!

ایک اور عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے مختلف زیوروں کا نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا، کہ کیا اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟ لیکن ہر ایک کے جواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم "نار" (آگ کا زیور) ہے فرماتے رہے۔ عورت پھر بھی عورت تھیں فطری جذبہ پر اتنی سخت چوٹ برداشت نہ ہو سکی اور بولیں :-

| | |
|---|---|
| ان المراۃ اذا لم تتزین | عورت جب اپنے شوہر کیلئے بناؤ سنگھار |
| لزوجھا صلفت عندہ | نہیں کرتی تو اس کی نگاہوں سے اتر جاتی ہے |

لیکن اس پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاتون صاحبہ کو جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا :-

| | |
|---|---|
| ما یمنع احداکن ان تصنع | تم عورتوں کو کس چیز نے اس سے روکا ہے |
| قرطین من فضۃ ثم | کہ چاندی کی دو بالیاں اپنے کان میں ڈالیں |
| تصفرہ بزعفران او | اور ان کو زعفران یا عبیر سے رنگ دیں |
| بعبیر | (تاکہ سونے کی زردی کی جھلک پیدا ہو جائے) |

اور یہ حال تو سونے کے زیورات کا ہے۔ چاندی کے زیوروں پر اگرچہ عام عورتوں کے متعلق زیادہ سختی نہیں فرمائی گئی۔ لیکن آپ کے منشاء مبارک کا اظہار اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا جیسی چہیتی بیٹی کے گھر میں بھی آپ نے چاندی کے زیوروں کا دیکھنا بھی پسند نہ فرمایا۔ اور حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ :-

| | |
|---|---|
| یا ثوبان اشتر لفاطمۃ | اے ثوبان! فاطمہ کے لئے تم پٹھوں کا |
| قلادۃ من عصب وسوارین | ایک ہار، اور فیل دندان کے دو کنگن |
| من عاج۔ | خرید کر لے آؤ! |

بہر حال اگرچہ فقہاء اسلام نے قانونی طور پر طلائی و نقرئی زیورات کی حرمت کو صرف مردوں تک محدود رکھا ہے۔ لیکن بجائے قانون کے اگر مسلمان اپنے پیغمبر کے منشاء اور آرزو کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جاتے، تو عورتوں سے بھی زیور کا قصہ تمام ہو جاتا۔ مگر افسوس، ایسا نہیں ہوا تاہم اسلام نے صراحتہً عورتوں کے لئے اگر سونے چاندی کے زیور کو ممنوع نہیں کیا ہے۔ لیکن سونے چاندی کے سکہ کے سوا جو چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں، خواہ وہ زیور ہوں یا برتن

ہوں، یا کچھ اور ہوں، ان کے خرید و فروخت کی شکلوں میں ایسی دشواریاں پیدا کر دی ہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت رکھنے والی قوم میں آسانی کے ساتھ ان کا چلن نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا چند فقہی صورتیں جن میں قیمتی سے قیمتی زیور کی نازک ترین صناعیاں بالکل بے قیمت ہو جاتی ہیں۔ جس کا حاصل بالآخر یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا پہننا ہی رک جائے گا اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ دشواریاں جو بظاہر صرف سونے چاندی کے تبادلے ہی میں نظر آتی ہیں، وہ پیدا ہوئی نہیں ہیں، بلکہ میرے خیال میں قصداً پیدا کی گئی ہیں۔ جس کی بنا ربوا سے زیادہ معاشی رگوں کے اس خونِ حیات کے انجماد پر ہے۔ اور گو بظاہر نظر میں دشواریاں ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ان ہی دشواریوں میں در اصل عظیم الشان معاشی آسانیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح ربوا کی بعض دوسری شکلوں میں بھی جو کچھ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا تعلق بھی ربوا سے زیادہ اسلامی تعلقات کے دوسرے ابواب سے ہے اگر ان مسائل پر غور کرتے ہوئے ان ابواب کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باریک چاول ایک من ہیں، وہ موٹے چاولوں کے دو من سے اسے بدلنا چاہتا ہے۔ لیکن وہی برابر ہونا چاہئیے کہ حکم کے تحت وہ مجبور ہے کہ ایک من باریک چاول کے عوض ایک ہی من موٹے چاول لے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کون شخص ہو گا جو اپنا ایک من باریک چاول دے کر خواہ مخواہ کسی سے موٹے چاول ایک من لے گا اسی قسم کی ایک صورت کھجور کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب پیش آئی تو آپ نے حکم دیا کہ بجائے بدلنے کے یہ کرنا چاہئیے کہ ادنیٰ قسم کے کھجور بیچ دیئے جائیں اور پھر اس کے پیسے سے عمدہ کھجور لے لیا جائے۔ بظاہر اس میں بھی ایک طول عمل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی جنس کی دو درجہ کی چیزوں کا باہمی تبادلہ بزیادتی کی اجازت دے دی جاتی، تو پھر دو چاندیوں تک میں آدمی فرق بآسانی نکال سکتا ہے۔ کہ میری چاندی چونکہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے ایک تولہ سے دو تولہ لینے میں کیا حرج ہے۔ بلکہ شاید دو روپوں میں بھی حیلہ جو جاہیں گے تو اسی قسم کی نمبر اندازی کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ایک جنس کی دو چیزوں میں نمبر کے فرق کو سود کے معاملہ میں ناقابلِ لحاظ قرار دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ:

جیدھا وردیھا سواء (بخاری)

ان کی عمدہ اور ردی قسمیں دونوں برابر ہیں!

جس سے یہ غرض نہیں ہے۔ کہ واقع میں ان چیزوں کے اقسام میں نمبروں کا تفاوت نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر اس فرق کی بناء پر زیادتی کی اجازت دے دی جائے گی تو لوگوں کے لئے سُود خواری کی راہ کُھل جائے گی۔ اور اسلام اس کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو سخت ترین ڈاٹوں سے بند کرنا چاہتا ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشورہ۔

بع التمر بیعا آخر ثم اشتر بہ۔ — کھجور (جوادنیٰ قسم کا ہو) اسے بیچ دو پھر اس کی قیمت سے اچھے کھجور خرید و!

اس میں اگرچہ ایک گونہ دُشواری ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے۔ اس میں ضمناً معاشیات کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی لوگوں کی توجہ دلائی جا رہی تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عموماً ایسے ممالک جن کا تمدن وحضارت سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا ان میں چیزوں کو بجائے سکّوں کے خریدنے کے چیز ہی سے چیز کے لین دین کا دستور عموماً جاری رہتا ہے۔ ابن قیّم کا بیان ہے۔

لاسیما اھل العمود والبوادی — خصوصاً خیمہ میں رہنے والے اور
فانما یتبایعون الطعام بالطعام — صحرا کے باشندے وے لوگ غلّہ
(اعلام صفحہ ۲۰۲ جلد ۱) — کو عموماً غلّوں سے بدلتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں میں بھی عام طور پر چیز ہی سے چیز خریدنے، یعنی بطریقہ BARTER یا فقہ کی اصطلاح میں "مقائضہ" کا دستور تھا۔ اسلام ان ذرائع سے بتدریج اس رواج کو بھی گھٹانا چاہتا تھا۔ علماء معاشیات جانتے ہیں کہ معاشی ارتقاء میں تبادلہ EXCHANGE کے اس طریقہ کے بدل دینے میں کتنا دخل ہے۔

چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور سونے کا مبادلہ سونے سے برابر برابر ہو۔ اس معاشی نظریہ کا جہاں انسداد ربوٰا اور دولت کے انجماد سے تعلق ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے ایک اور بات بھی مقصود تھی۔ جس کی طرف افسوس ہے کہ دُنیا نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حکومتوں کے مختلف سکّوں میں عدم مساوات کی وجہ سے بٹاون کا جو دستور پایا جاتا ہے۔ مثلاً حکومتِ آصفیہ کے سکّہ سے اگر کوئی انگریزی سکّہ کو خریدنا چاہے تو سو روپے انگریزی سکّہ کے معاوضہ میں سولہ روپے مزید علاوہ سو روپے کے دینے پڑتے ہیں۔ اور بٹاون کا بھاؤ ایک حال پر بھی باقی نہیں رہتا۔ کبھی کبھی بجائے سولہ روپے کے سترہ سترہ، اٹھارہ اٹھارہ روپے تک زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ کبھی گھٹ کر بٹاون کا یہ قصہ پندرہ اور چودہ روپے تک

بھی اُترآتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بٹاون کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف اس چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں ہے جو دو مختلف حکومتوں کے دو مختلف سکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے۔ دو حکومتوں کے ایسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے، مختلف اسباب کے زیر اثر ان میں بھی ایکسچینج (تبادلہ) کے وقت بسا اوقات بٹاون ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کے قلمرو سے دوسری حکومت کے قلمرو میں آمدورفت رکھنے والوں کو بھی بٹاون کے ان جھگڑوں کی وجہ سے شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی حکومت کے ایسے دو علاقے جہاں دو مختلف قسم کے سکے مروج ہیں۔ وہاں بھی بٹاون اور ایکسچینج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ مدت ہوئی، یعنی ۱۹۲۵ء میں مصر کے مشہور علمی مجلہ "الہلال" (عربی) نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ مضمون نگار نے جنیوا کی مرحوم لیگ آف نیشن (انجمن اقوام) کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ:۔

| | |
|---|---|
| یمکن ایجاد اتفاق لتوحید النقد الاساسی عند الامم۔ | (انجمن اقوام) کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا کی قوموں کا اتفاق ہو جائے اور سارے جہان کے باشندے اس پر متفق ہو جائیں! |

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو "اساسی سکہ" مان لیا جائے۔ رسالہ مذکور (عربی) نے لکھا تھا:۔

| | |
|---|---|
| لکی یمنع التلاعب من حیث العیار یجب ان یسکعہ الدولار سکۃ ولعتق فی مصنع واحد حتی یبقی عیارہ واحدا عند الامم۔ | سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اس کے انسداد کی یہی شکل ہے کہ ڈالر کو ایک ہی سکہ جو ایک ہی ٹکسال میں ڈھالا جائے، بنا دیا جائے تا کہ دنیا کی ساری قوموں میں ایک ہی معیار کے سکہ کا چلن ہو جائے! |

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے کہ:۔

لایدری ما یاتی الغد — قطعاً یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا؟

یعنی بازار میں کس ملک کے سکہ کا بھاؤ کل کیا باقی رہے گا۔ اس کا جاننا بہت دشوار ہے یثال سے یوں سمجھایا ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| قد یشتری الیوم احد | ایک شخص کوئی مال فرانس میں مول لیتا |
| السلع فرنسا ویحسب حال | ہے اور فرانک (سکۂ فرانس) وڈالر (سکۂ |
| الفرنک والدولار فیجد انه | امریکہ) دونوں کا حساب کر کے خیال |
| قد ربح لانه لم یشترها | کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہیگا۔ کیونکہ مال |
| من امریکا مثلاً فلا یکاد | اس نے امریکہ میں نہیں خریدا ہے۔ لیکن ایک |
| یمضی علی تاریخ شرائه | ہفتہ بھی اس مال کی خریداری پر گذرنے |
| اسبوع حتی یحسب حسابه | نہیں پاتا کہ اب جو دوسری دفعہ حساب کرتا |
| ثانیا و یجد انه اخطاء | ہے تو پاتا ہے کہ اس نے سخت غلطی کی |
| کل الخطاء لاعتماده علی | ہے۔ کہ بجائے امریکی بازار کے فرانسی |
| السوق الفرنسیه بدلا | بازار پر اس نے اعتماد کیا! |
| من الامریکه! | |

بہرحال سکوں کے اس اختلاف کی وجہ سے دُنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا علاج جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن و معیار سب ایک کر دیا جائے۔ اپنی اس تجویز کا نام اس نے "نظریۂ توحید نقد اساسی" رکھا ہے۔ آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ "نقد اساسی کی توحید" کے نظریہ پر اگر اقوامِ عالم کا اتفاق ہو جائے تو:-

| | |
|---|---|
| وحدت فی العالم طریقة | دنیا میں لین دین اور کاروبار کا طریقہ |
| التعامل وتسهلت بذلك | سارے عالم میں ایک ہو جائے گا اور اس |
| التجارة وزوال کثیر من | کی وجہ سے تجارت میں بڑی آسانیاں |
| الخسائر التی یتحملها | پیدا ہو جائیں گی اور بہت سے خسارے جو |
| التجار وسائر الناس فی | بیچارے تاجروں کو صرافہ کے دلالوں کی وجہ |
| غش السماسرة فی تحویل | سے برداشت کرنے پڑتے ہیں، اس سے |

النقود وشوائبها وبيعها۔ دنیا محفوظ ہوجائے گی!

کیا یہ سارا مشورہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارک:۔

الذہب بالذہب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثلاً بمثل

کا ترجمہ نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "الہلال" مصر ماہ فروری ۱۹۲۵ء

اس کے سوا بھی سکوں کے ایکسچینج سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ میں حاکم اقوام نے محکوم قوموں کے ساتھ جو مظالم جنگِ عظیم کے بعد تلافیٔ مافات کے لئے توڑے تھے۔ ہندوستان کے بیوپاریوں اور ساہوکاروں سے درد کے اس افسانہ کی داستان سُننی چاہئے۔ لاکھ دو لاکھ نہیں صرف ایکسچینج کے مغالطہ نے کروڑوں، بلکہ مبالغہ نہ ہوگا، اربوں کا وارا نیارا کیا ہے۔ جن کی تفصیلات شاید علماء معاشیات بتا سکتے ہیں۔

حالانکہ بنی آدم کے تمام افراد، ایک ہی آفتاب، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی، ایک ہی مٹی سے نفع اٹھانے میں شترک ہیں۔ اسی طرح چاندی سونے سے استفادہ کے حق کو بھی اگر عالمگیر کر دیا جائے تو اس میں دنیا کا کیا بگڑتا ہے؟ حکومتوں کا اپنے اپنے سکوں پر مخصوص علامات کی نمائش کے جذبہ کی اگر تسکین بھی مقصود ہو، حالانکہ بجز ایک ذہنی ہوسناکی کے شاید چنداں مادی نفع اس کا کیا ہے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ کہ ہر حکومت اپنے امتیازی نشان کو سکوں میں قائم رکھتے ہوئے ان کے اوزان اور جو کھوٹ ملایا جاتا ہے اس کو مساوی کردے۔ کسی زمانے میں، اگر یہ تجویز کچھ ناقابلِ عمل نظر آتی ہو تو شاید اس کے کچھ اسباب بھی تھے۔ لیکن اب جبکہ زمین کی طنابوں کو قدرتی قوانین کے چند نئے انکشافات نے کھینچ کھینچ کر اس طرح ملا دیا ہے، کہ اب ایک ملک ہی نہیں، بلکہ کرۂ زمین کے تمام ممالک تقریباً ایک بستی، یا زیادہ سے زیادہ ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ رات کو جو واقعہ واشنگٹن میں پیش آتا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے پوری دنیا میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ اور اب تو بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے کچھ چھ مہینے میں آج سے سو سال پہلے جو راستہ طے ہوتا تھا، چند گھنٹوں کا فاصلہ بن کر رہ گیا ہے۔ گویا ایسی صورت میں سکوں کے ہم وزن ہونے پر اگر حکومتیں بین الاقوامی معاہدہ کے طور پر اتفاق کرلیں تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی شہر کے چند امیر محلوں یا شہر کے محلے کے چند امیروں نے کس مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے۔ مواصلات کے موجودہ ذرائع سے جب دُنیا محروم تھی پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ نے جب اس وقت یہ تجویز دُنیا میں پیش فرمائی تو اس وقت تو اس تجویز کو

عملی لباس پہنانا پہلے کی نسبت آسان، بلکہ آسان تر ہو چکا ہے۔ لیکن ہیومنٹی (عام انسانیت) کی خدمت آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ یا اسی قسم کے بلند بانگ دعووں کے بلند کرنے والوں کی زبانوں پر جو کچھ ہے۔ کاش! وہ دلوں میں بھی ہوتا۔ جو اپنے کو سب کے لیے کہتے ہیں لیکن سب کو جو اپنے لئے سمجھتے ہیں۔ ان کے فاسد اغراض کیسے پورے ہو سکتے ہیں! جب ایکسچینج کے مغالطہ دینے کی یہ چال اُن کے ہاتھوں سے چھن جائے گی۔ ان کا فائدہ تو اسی میں ہے، اسی راہ سے تو ان بڑی مچھلیوں کو چھوٹی مچھلیوں کے نگلنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور ان بڑے درختوں کو چھوٹے پودوں کے چبانے کی آسانیاں فراہم ہو رہی ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو دوسروں کے بھی اسی طرح پیغمبر ہیں جیسے ہمارے لئے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کی عام فلاح و بہبود کی ایک تجویز پیش کر دی ہے۔ آدم کے بچوں میں ہمت ہو تو وہ اس تجویز کو مان کر تبادلہ (ایکسچینج) کے گرداب سے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری نسلِ انسانی کو نجات دلا سکتے ہیں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا ہ

**شغلِ اصل** اب اس سلسلہ میں ایک آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام نے سودی کاروبار کو جب اپنے معاشیاتی نظام سے قطعاً خارج کر دیا ہے، تو سوال ہوتا ہے کہ ملک کے جن افراد کے مصارف سے آمدنی کی جو رقم پس انداز ہو جاتی ہے۔ آخر وہ اس کا صحیح استعمال کیا پیدا کریں؟ ماسوا اس کے یہ بھی مسلّم ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ کی قارونی مصارف والی کیمیائی اور سائنسی جنگوں کی ذمہ داری اگر ان سہولتوں پر عائد ہوتی ہے جو سود کی وجہ سے فراہمی سرمایہ میں پیدا ہو گئی ہیں، تو اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دُنیا کی ساری صنعتی ترقیاں جو بڑے پیمانے کی پیداواروں پر مبنی ہیں بہت کچھ ان ہی آمدنیوں کی رہینِ منت ہیں، جو سود کی بدولت آج دُنیا کو حاصل ہیں۔ سودی کاروبار کو یک قلم بند کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ساری میکانیکی اور صنعتی چہل پہل کا بازار لیکا یک سرد پڑ جائے اور دنیا پھر اس عہدِ تاریک کی طرف واپس ہو جائے، جس میں بجائے بجلی کے قمقموں کے مٹی کا دیا اور بجائے طیاروں اور سیاروں کے بیل گاڑیوں پر آدمی راستہ طے کرتا تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں سوالات قابلِ غور ہیں۔ اگر اسلام کا معاشی نظام راہبانہ نظام ہوتا، تو بآسانی کہہ دیا جا سکتا تھا کہ باسی بچانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کتوں کے کھانے کی فکر کرنا پڑے یعنی مصارف کا پس انداز کرنے کا اصول ہی غلط ہے۔ یا دنیا کو ریل و موٹر

برق و گیس ہی کی کیا حاجت ہے۔ اور بعض جو گیانہ فطرتوں کو یہ کہتے ہوئے پایا بھی گیا ہے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آئندہ دخل کے صرف یا خرچ کا باب جب آئے گا اس میں بھی بتایا جائے گا کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف ہوگا۔ حقوق و مطالبات کے ادا کرنے کے بعد۔ اسلام مال کے جمع کرنے یا رقم کے پس انداز کرنے کا مخالف نہیں ہے بلکہ آئندہ معلوم ہو گا کہ وہ ایک حد تک اس کا ایک معاشی مشیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی غلط ترجمانی ہو گی۔ اگر کائناتی اشیا، اور قدرت کے نت نئے قوانین سے استفادہ کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ جس دین کے پیغمبر نے غیر قوموں کی ایک سائنس کو، یعنی جنگی ضرورت کے لئے خندق کھودنے کو اپنی اور اپنے اصحاب کی سنت قرار دی ہے، جس نے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کو عرب میں رواج دیا ہو، بجائے بے سلی لنگی (ازار) کے ایران کے سراویل (پائجامہ) کو پسند کیا ہو اور جس نے کفن اور قبر تک میں حسن کاری کی تعلیم دی ہو۔ اُس کو جدید صنعتی ترقیوں کا مخالف آخر کس بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ربوٰا کے حرام کرنے والے اسلام کے پیش نظر یہ دونوں سوالات تھے اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، ان دونوں کا جواب اسلامی معاشیات میں موجود ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے مصارف سے بچے ہوئے یا بچائے ہوئے سرمایہ کو جو لوگ سود پر چلاتے ہیں، عموماً وہ یہی تو کرتے ہیں کہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس طور پر حوالہ کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کے منافع میں تو وہ اپنے کو شریک رکھتے ہیں، لیکن نقصان کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کہ ان کا سرمایہ بھی جوں کا توں اپنی تمام ذاتی و صفاتی خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے۔ اور جنہیں یہ سرمایہ حوالے کیا جاتا ہے۔ ان کو نفع ہو یا نقصان، اس سے بالکل بے تعلق ہو کر اپنے مشروط منافع کو بھی قانون کے زور سے اتنے استوار اور مضبوط طریقہ سے اس طرح پر جکڑے رہتے ہیں کہ ان کے نفع کا ایک پیسہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ بلکہ سود در سود کی شکلوں میں تو صرف اصل سرمایہ کے منافع ہی نہیں بلکہ ان کے نفع کا بھی ہر دھیلہ پیسہ اور ہر پیسہ روپیہ، روپیہ اشرفیاں مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بنتا چلا جاتا ہے۔ جن کے حیرت انگیز ریاضیاتی نتائج پر دُنیا نے اکثر سر دُھنا ہے۔ سو سو روپے کے معاوضہ میں بذریعۂ سود در سود بعض اوقات لاکھ لاکھ روپے

تک لوگوں نے وصول کئے ہیں۔ عدالتی رپورٹوں میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی ملک، ایک ہی قوم، بلکہ ایک ہی شہر میں بلکہ لمبا او حقات ایک ہی محلہ اور ایک ہی گھرانے کے چند افراد کے مصارف سے بچی ہوئی رقم کی حفاظت کا تو قانون اتنا زبردست انتظام کرتا ہے کہ صرف اصل رقم ہی نہیں بلکہ اس رقم کے منافع اور منافع کے منافع تک پر توپ و تفنگ کے بھروسہ پر اتنی کڑی نگرانی رکھی جائے۔ لیکن اسی ملک اسی قوم، اسی شہر، اسی محلہ میں اسی گھرانے کے جب آدمی نے اس رقم کو ضرورت میں لگایا۔ شب و روز کی مسلسل محنتوں سے اس کے ذریعہ سے کچھ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس غریب کو یہی قانون اتنا لاوارث اور بے کسی کے حال میں چھوڑ دیتا ہے۔ کہ خواہ اس پر آسمان ٹوٹے، پہاڑ گرے کچھ بھی گذر جائے۔ لیکن اصل رقم کے ایک ایک پیسہ اور اس کے منافع در منافع کے ایک ایک چھدام کا اسے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہ جہاں سے ہو، جس طرح سے ہو، اپنے مصارف سے جن لوگوں نے یہ زائد رقم پس انداز کی تھی، ان تک دام دام پہنچاتا چلا جائے۔

دُنیا کے قانون نے اگر اس ظالمانہ بے جا طرفداری کو جائز رکھا ہو تو ظالم کو اس دنیا میں ہر ظلم کے اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے۔ لیکن اسلام سے اس یک طرفہ، یک چشمی جنبہ داری کی توقع فضول ہے۔ اس لئے اس نے اس راہ کو تو مسدود کر دیا لیکن اسی کے ساتھ اپنے مصارف سے ملک کے جو باشندے کچھ سرمایہ پس انداز کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے اگر محض اس راہ سے اپنے سرمایہ سے استفادہ کے طریقہ کو اس نے قانوناً جرم اور ظلم قرار دیا ہے تو کون کہتا ہے کہ پھر اس سرمایہ کے استعمال اور اس استعمال سے استفادہ کی کوئی دُوسری صورت بھی باقی نہیں رہی۔ اسلامی معاشیات کے نظام نامہ کو پڑھیے اور دیکھیے۔ اس نے ایک نہیں بلکہ بیسیوں راہیں اور کھول دی ہیں۔ جن کے ذریعہ سے اس پس انداز سرمایہ کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے شرکت ہی کے ایک باب کو فقہ میں اٹھا کر دیکھئے۔ تو ایک نہیں، متعدد شکلیں مختلف حالات کے لحاظ سے فقہاء نے بتائی ہیں۔ کہ ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس سرمایہ کو مختلف کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے (۱) شرکت عنان (۲) شرکت مفاوضہ (۳) شرکت وجوہ (۴) شرکت تقبل، ان کے سوا بیسیوں اور شکلیں ہیں، جن میں اپنی اپنی سہولتوں کا اندازہ کر کے آدمی اس پس انداز سرمایہ کو لگا سکتا ہے۔ شرکت ہی کی ایک شکل مضاربت یا قراض ہے یعنی ملک کے بے سرمایہ افراد کو سرمایہ دار لوگ سرمایہ دے کر کاروبار کرائیں اور باہم منافع

کو تقسیم کر لیا کریں۔ سرمایہ دار کو سرمایہ کا، اور بے سرمایہ والے شریک کو محنت کا نفع ملے گا۔ چونکہ یہ فقہ کے مطول ابواب ہیں۔ اس لئے تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ لیکن قدرِ مشترک ان تمام معاملات میں وہی بات ہے۔ کہ جب سرمایہ لگانے والے منافع میں شریک ہیں، تو نقصان میں بھی ان کو شریک رہنا پڑے گا۔ اور چونکہ شرکت کا معاملہ بھی ایک سے زیادہ آدمی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بے سرمایہ آدمی ایک سے زائد سرمایہ والوں سے سرمایہ لیکر کاروبار کر سکتا ہے۔ جس کے قیود و شروط فقہ کی کتابوں میں تفصیلاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیمانۂ کبیر کی پیداواروں کی بھی کافی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس ذریعہ سے بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑے کاروبار کا امکان ہے اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں میں یہ معاملات کروڑہا کروڑ روپے کے سرمایہ سے جاری تھے۔ جن کے متعلق تاریخ سے بڑا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ سود کے روک دینے سے ملک کے پس انداز سرمایہ سے استفادہ کی کوئی دوسری ضرورت باقی نہیں رہتی، یا پیدائش پر پیمانۂ کبیر کے امکانات کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے قطعاً غلط ہے۔

ماسوا اس کے، ملک کی ایسی ضرورتیں جن کی تکمیل " پیدائش بر پیمانۂ کبیر " ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق اسلام نے خود حکومت کو بھی متوجہ کیا ہے۔ کہ رعایا کی سہولت کے لئے اس قسم کے کاموں کو خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور بیت المال کی مد خراج و عشر وغیرہ سے ان کی بجا آوری کی جائے۔ مثلاً دریاؤں سے نہروں کا نکالنا، سڑکیں بنانا، پل باندھنا وغیرہ۔ جس کا ذکر حکومت کی آمدنی کے سلسلے میں آئے گا۔

بہرحال پس انداز سرمایہ سے جو مادی نفع اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے تو اسلام میں مذکورۂ بالا صورتیں رکھی گئی ہیں۔ لیکن ایسے لوگ، جن کے نزدیک نفع صرف وہی نہیں ہے جو مادی شکل میں اسی زندگی میں آدمی کو مل جائے، بلکہ ان کی نگاہیں بلند ہیں اور اس زندگی کے سوا زندگی کے دوسرے اطوار و ادوار میں جو نفع آدمی کو پہنچ سکتا ہے اسے بھی وہ نفع ہی سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی دوسری رعایا سے نہیں، تو مسلمانوں کے ہر فرد سے تو یقیناً اسی کی توقع کرنی چاہئے۔ ایسے لوگوں کے لئے پس انداز سرمایہ کے استعمال کی اسلام نے ایک اور صورت بھی نکالی ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اس سرمایہ کو خیرات کر دیں اور لوگوں میں اس پس انداز

سرمایہ کو بانٹ دیں۔ یہ تو خیر ایک عام شکل ہے۔ اور اس کے لئے کسی خاص مشورے کی کیا حاجت ہے۔ بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اقوال جو کبھی کبھی آپ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ کہ:۔

| | |
|---|---|
| یاتی احدکم بجمیع ما یملک فیقول ھذہ صدقۃ ثم یقعد یستکف الناس۔ (ابوداؤد) | تم میں کا ایک آدمی وہ سب کچھ جس کا وہ مالک ہے لے کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے! |

اس میں تو مصارف سے بچے ہوئے کل سرمایہ کے خیرات کر دینے کی مخالفت فرمائی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلام نے خیرات کرنے کے سوا ایک اور صورت ایسی نکالی ہے۔ کہ مصارف سے بچا ہوا سرمایہ لوگوں کا محفوظ بھی رہ جائے اور چاہیں تو باوجود اس کے اس سے زندگی کے دُوسرے مقامات و حالات میں نفع بھی اٹھا سکتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ جس طرح خرید و فروخت، کرایہ، اجارہ وغیرہ یہ سارے کاروبار دُنیاوی معاملات ہیں۔ اور ان کا شمار خیرات و صدقات کے ذیل میں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سمجھا جاتا ہے، کہ قرض کا لین دین بھی ایک خالص دُنیاوی کاروبار ہے۔ اس لئے قرض دینے والے کو جب کہا جاتا ہے کہ تم اس پر سُود نہ لو تو وہ بے چارہ پوچھتا ہے۔ کہ آخر اس روپے پر مجھے نفع کیا ملا؟ جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کر آیا ہوں کہ قرض کے کاروبار میں دینے والے کی طرف سے کسی قسم کی کوئی قربانی نہیں ہوتی۔ اتنی بھی نہیں جو ایک جھٹکہ (اکّہ) ہکانے والے کی طرف سے کرایہ پر چڑھنے والوں کی راہ میں ہوتی ہے۔ کہ جتنی دیر بھی اس کا اِکّہ چلتا ہے۔ اس عرصہ میں اس کے پہیے، نیز تمام پُرزوں کے صفات کی وہ حالت قطعاً باقی نہیں رہتی جو چلنے سے پیشتر تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دُنیا میں کبھی کوئی اِکّہ نہ پرانا ہوتا اور نہ خراب ہوتا، یقیناً مسلسل ان ہی مخفی فرسودگیوں کا چند سال کے بعد آخر میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اِکّے کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

مگر قرض کا روپیہ اگر دس سال بعد بھی واپس ہو تو اسی حال میں واپس ہوتا ہے جس حال میں دیا گیا تھا۔ اور روپیہ کی اس خصوصیت کو وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں، جو کسی نہ کسی طرح جواز سود کے لئے اور اس کو ظلم کے دائرہ سے نکالنے کے لئے کوشاں ہیں۔ دماغوں پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ان لوگوں نے ایک مفہوم پیدا کیا ہے۔ جس کی تعبیر "انتظار کشی" کے لفظ

سے کرتے ہیں۔ یعنی بغیر موجودہ خواہشوں کے ملتوی کئے زمانہ آئندہ کے لئے کوئی اپنی آمدنی سے پس انداز نہیں کرسکتا ہے۔ اب اگر آئندہ زمانے میں بھی اس غریب کو کچھ نفع اس پس انداز والی رقم سے نہ ملا، تو اتنے دن تک جو اپنی خواہش کے سینہ پر اس نے پتھر رکھا اور انتظار کرتا رہا اس کا صلہ اس کو کیا ملا؟ گویا التوائے خواہش اور آئندہ کے توقعات کے انتظار کی جو زحمت اس کو ہوئی، یہی سُود کی قیمت ہے۔ مادّی منافع کی ٹوہ میں عمریں بسر کرنے والوں کی طرف سے سُود کی یہ سراسر غیر مادّی اور جذباتی مبہم، مجہول قیمت پیش کرنی خود ان کے دعویٰ کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن اگر واقعی انتظار کشی کوئی چیز ہے اور اسی کی قیمت قرض دینے والا سُود کی شکل میں چاہتا ہے تو اسلام نے اس قیمت کی پابجائی کا نظم کیا ہے۔ کہ قرض جو اب تک ایک خالص دنیوی اور مادّی کاروبار سمجھا جاتا ہے۔ دنیوی معاملات سے اس کو نکال کر قرآن نے نیکی اور تبرع، خیر و خیرات کی طویل فہرست کی کوئی معمولی چیز نہیں۔ بلکہ اہم ترین جزء کی حیثیت سے شریک کردیا۔ شاید آسمانی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی دینی کتاب ہے جو

من ذا الّذی یقرض اللہ — وہ کون ہے جو خدا کو اچھا

قرضاً حسناً! — قرض دیتا ہے؟

کی آواز سے گونج رہی ہے۔ مصارف سے رقم بچانے والوں کے سامنے قرض خواہوں کو ہٹا کر خود حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے کو لاکر کھڑا کردیا۔ اور اعلانِ عام کردیا گیا کہ انتظار کشی کی اُجرت طلب کرنے والوں کو اُجرت دینے کے لئے خود ان کا مالک

فیضاعفہ اضعافاً — اللہ تعالیٰ (اس انتظار کشی کے صلہ میں) دونا

کثیراً! — دوں منافع اسے عطا فرمائے گا!

کے وثیقہ کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن نے خیرات کی یہ ایک نئی قسم نکالی کہ خیرات میں دی جانے والی رقم بالکلیہ محفوظ رہتے ہوئے بھی اس پر خیرات کے منافع کی توقع کی جاسکتی ہے اور توقع کیا، جب قرضداروں کی طرف سے "دونا دوں" منافع کا اعلان خود خدا کر رہا ہے۔ تو اب اس سے زیادہ یقینی ربح اور نفع کی ضمانت اور کیا دی جاسکتی ہے؟

اسلام کی یہ ایک عجیب معاشی دقیقہ سنجی ہے، کہ قرض کو اس نے صرف خیرات اور نیکی کی مدہی میں شامل نہیں کیا ہے، بلکہ قرآن کی مذکورۂ بالا آیت جس کا ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہ میں کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ حدیثوں میں اس کی تصریح بھی آتی ہے، کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

| | |
|---|---|
| رأیت لیلۃ اسری بی علی باب الجنۃ مکتوبا الصدقۃ بعشر امثالھا والقرض ثمانیۃ عشر۔ (ابن ماجہ) | جس رات میں مجھے معراج ہوئی میں نے جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا بدلہ دس گنا، اور قرض کا اٹھارہ گنا ملے گا! |

اسی بناء پر بعض صحابہؓ فرمایا کرتے :-

| | |
|---|---|
| لان اقرض دینارین ثم یردان ثم اقرضھما احب الی من ان اتصدق بھما! (مغنی) | میں دو دینار قرض میں دوں، پھر مجھے واپس مل جائیں اور میں اسے پھر قرض میں دوں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان دونوں کو خیرات کر دوں۔ |

صرف یہی نہیں کہ صدقہ کو قرض سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے، کہ خیرات میں جو ایک پہلو اس کا تھا جس کا سوال کی بحث میں ذکر گذر چکا ہے۔ یعنی خیرات لینے اور بھیک پر زندگی گذارنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ لیکن قرض کو باوجود خیرات کی مد میں شمار کرنے کے خیرات کے اس مکروہ پہلو سے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اور اس طور پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ صرف زبان سے نہیں، بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے خود اپنے لئے اور قیامت تک آنے والی اپنی نسل کے لئے صدقہ کو حرام فرما دیا ہے۔ اسی ذات مبارک نے خود عمل کر کے اس میں بے عزتی یا کراہت کا جو اندیشہ تھا اس کو مٹا دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :-

| | |
|---|---|
| لیس القرض بسیئۃ وذلک لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یستقرض ولو کان مکروھا کان ابعد الناس منہ۔ (مغنی صفحہ ۳۵۲) | قرض لینا یہ بھیک مانگنا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود قرض لیا کرتے تھے، اگر قرض لینا مکروہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب سے زیادہ اس سے دور رہتی۔ |

خلاصہ یہ ہے کہ مصارف سے بچا کر ملک میں جن لوگوں کے پاس لیس انداز سرمایہ ہے اگر وہ اس سے مادی نفع اٹھانا چاہتے ہیں، تو نفع کے ساتھ نقصان میں بھی اپنے کو شریک کر کے وہ ایسا کر سکتے

ہیں۔ اور اسلام میں اس کی متعدد راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور اگر نقصان میں شریک ہونے سے ڈرتے ہیں تو ان کے سرمایہ کو محفوظ کر کے انتظار کشی کے صلہ میں اسلام نے بجائے مادی نفع کے خیراتی منافع کے کمانے کا وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔ قومیت اور وطنیت کے نشہ میں سرشاری کا ادعا رکھتے ہوئے جو یہ کہتے ہیں کہ اپنی انتظار کشی کا صلہ غیر مادی منافع کی صورت میں لینے پر کتنے آدمی تیار ہو سکتے ہیں۔ بالکل عجیب ہے۔ آخر جو رقم ضروریات سے بچ گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خود دلیل ہے کہ تمہاری ضرورت سے زیادہ تھی۔ ورنہ بچتی کیسے؟ اپنی خواہشوں کو ملتوی کر کے پس انداز کرنا او لاً یہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ دُنیا میں ایسے دولت مندوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس ہر قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی لاکھوں اور کروڑوں کی رقم آمدنی سے پس انداز ہو جاتی ہے۔ ماسوا اس کے اگر خواہشوں کو ملتوی کر کے جو پس انداز کرتے ہیں۔ تو عموماً یہ NECESSARY ضروری خواہش قطعاً نہیں ہوتیں۔ بلکہ تعیشات کی خواہشوں تک یہ التوا محدود ہو سکتا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ بہرحال کسی وجہ سے بھی ہو، اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رقم بچ گئی ہو تو اس میں اس کا کیا بگڑتا ہے؟ کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ضرورت مندوں کو دے کر، یا بے کاروں کو کاروبار میں لگا کر اپنی رقم جوں کی توں واپس بھی لے لے۔ اور اس حسن سلوک کا خدا کے یہاں سے صلہ کی اُمید اس دُنیا میں یا آئندہ زندگی میں کرے۔ آخر سوال ہوتا ہے کہ قرض نہیں، بلکہ مطلق خیرات اور چیریٹی میں جو لوگ آج بھی، اور ہر زمانہ، ہر ملک میں لاکھوں، کروڑوں کی رقم دے ڈالتے ہیں، ان کا تو سرمایہ اور سرمایہ کے منافع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ آخر وہ کس بات کی توقع پر ایسا کرتے ہیں۔ لیکن جب ان ہی لوگوں کو بجائے خیرات کے سَو دو سَو روپے غیر سودی قرض دینے کے لئے کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ میرا کیا نفع ہوگا؟ خیرات، جس میں نفع ہی نہیں، اصل سرمایہ بھی چلا گیا۔ اس میں تو سوال نفع کا نہیں پیدا ہوتا لیکن غیر سودی قرض میں اس سوال کو اٹھانا اس تناقض ذہنیت کا آخر کیا جواب ہو سکتا ہے، میرا تو خیال ہے کہ یہ محض ایک رواجی بات ہے خیرات میں روپے کے لینے دینے کا چونکہ رواج ہے۔ اس لئے لاکھوں اور کروڑوں کے دینے سے بھی لوگ دریغ نہیں کرتے۔ لیکن غیر سودی قرض کے لین دین کا خیرات سمجھ کر چونکہ عام طور سے رواج نہیں ہے۔ اس لئے دس بیس پر بھی لوگ مادی نفع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً جن ممالک میں نیشنلزم اور قومیت و وطنیت کا سودا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مُنہ پر تو یہ سوال

کسی طرح نہیں چھپتا۔

الحاصل، اسلامی معاشیات سے سُودی کاروبار کو خارج کر دینے کے بعد ملک کے پس انداز سرمایہ کے استعمال اور دنیوی و دینی منافع کے حاصل کرنے کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں۔ اور جس طرح لین دین کے سلسلہ سود اور سود کی مختلف چھوٹی بڑی شکلوں کو روک کر اسلام نے ملک کی اکثریت کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات عطا کی ہے۔

اسی طرح لین دین کے دوسرے ابواب میں بھی جہاں معاشی مظالم نظر آئے اُن کے سدباب کی بھی اس نے کوشش کی ہے۔ ظلم و فریب، دھوکہ، جھگڑے، رگڑے کا انسداد اس نے صرف کلی قوانین ہی کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے۔ بلکہ بعض اہم جزئی شکلوں کو بھی قانون کی بندش میں لا کر ان کی جڑ کاٹ دی ہے۔ میرا مضمون اتنا طویل ہوتا جا رہا ہے کہ سب کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے۔ اس لئے مختصر اشارے کرتا ہُوا اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں

## حکومت اور قیمتیں!

"معاشیات" کا مشہور مسئلہ ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی بنیاد طلب و رسد کی باہمی مناسبتوں پر مبنی ہے۔ طلب اور رسد میں ایک نسبت تو وہ پیدا ہوتی ہے جس میں بجائے قدرتی ذرائع کے بعض لوگوں کے اختیار کو دخل ہوتا ہے۔ مثلاً حکومتیں درآمد اور برآمد پر ڈیوٹی لگا کر قیمت کے معیار کو گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہیں۔ اور دُوسری صُورت وہ ہوتی ہے، جس میں قدرتی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ آپؐ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ قیمت کے مسئلہ کو اختیاری تصرفات سے متأثر کیا جائے۔ آپؐ سے ایک دفعہ درخواست کی گئی کہ چیزوں کا بھاؤ حکومت کی جانب سے مقرر فرما دیا جائے۔ لیکن جواب میں ارشاد ہوا۔۔۔

| | |
|---|---|
| ان اللّٰہ ھو المسعر ھو | بھاؤ کا مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے |
| القابض الباسط الرزاق انی | وہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی، وہی |
| لارجوان القی اللّٰہ تعالیٰ | روزی پہنچانے والا ہے۔ میں امیدوار ہوں |
| ولیس احد یطلبنی بظلمۃ فی | کہ حق تعالیٰ سے ملوں اور مجھ سے کسی کا مطالبہ |
| دم ولا مال! (ترمذی) | خون اور مال کے مظالم کا نہ ہو! |

جس سے معلوم ہُوا کہ قیمت کے مسئلہ میں حکومت کی دراندازیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ظلم قرار دیا۔ خواہ یہ ظلم پبلک پر ہو، یا تاجروں پر، اور حکومت کا پنجہ تو آہنی پنجہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی زبردستیوں کے نتائج تو بہت سنگین ہوتے ہیں۔ لیکن ملک کے عام باشندوں تک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ کہ "بازار" کے مسئلہ کو اور قیمت کے معیار کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ عرب میں دستور تھا کہ مال لے کر جو قافلہ اونٹوں کا کسی بازار کی طرف آتا، تو چند لوگ جو پہلے سے اس کی ٹوہ میں رہتے۔ خبر پاتے ہی سودوسو میل آگے نکل کر مال پر قبضہ کر لیتے اور تاجروں سے کچھ بات طے کر لیتے۔ یا جیسے اس زمانہ میں کسی بازار کی "سول ایجنسی" کوئی لے لیتا ہے، یہ شکل اختیار کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان دیا کہ۔

| | |
|---|---|
| لا تلقوا الرکبان ولا یبیع حاضر لباد۔ | شتر سواروں کے قافلے کو آگے نکل کر کوئی ان سے نہ ملا کرے اور باہر کے تاجر سے بازار کا کوئی آدمی بیع کا معاملہ نہ کرے۔ |

پھر اس فرمان کی غرض بھی بیان کر دی گئی ۔

| | |
|---|---|
| دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم بعض ۔ | لوگوں کو چھوڑ دو، یوں ہی اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے روزی پہنچاتا ہے! |

منشائے مبارک ان تمام ہدایتوں سے یہی تھا۔ کہ تجارتی کاروبار میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل اندازی کر کے خواہ مخواہ قیمتوں کے مسئلہ کو قبل از وقت ہاتھ میں نہ لیا جائے۔ یہاں تک اصرار تھا کہ جیسا کہ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔

| | |
|---|---|
| نھی ان تتلقی السلع حتی یھبط بھا الاسواق ۔ | تجارتی سامان پر آگے بڑھ کر قبضہ کرنے سے حضور نے منع فرمایا، تاکہ مال منڈی میں گر نہ جائے۔ |

کہاں یہ حکم کہ منڈی میں گرنے سے پہلے کوئی تجارتی مال کے متعلق کسی قسم کی کاروائی نہ کرے کہ بازار میں گرنے کے بعد ہی طلب اور رسد کا قدرتی تناسب واضح ہو سکتا ہے اور کہاں یہ حال ہے کہ موجودہ زمانے کی حکومتیں درآمد و برآمد دونوں پر من مانے طور پر جس قسم کے تصرفات چاہتی ہیں، کرتی ہیں۔ اور غریب پبلک کچھ نہیں بول سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چیزیں بغیر ان قیود کے محض تجارتی اصول پر جس قیمت پر بکتیں۔ اس سے سو گنا قیمت لوگوں کو ادا کرنی

پڑتی ہے۔ اور صبر کئے غیظ و غصہ کے ساتھ لوگ ادا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں "احتکار" کا مسئلہ بھی ہے۔ یعنی غلہ وغیرہ کو اس لئے روک لینا تاکہ جب اکثر تاجروں کا مال ختم ہو جائے گا اور صرف میرے پاس یا متعدد چند آدمیوں کے پاس رہ جائیگا تو منہ مانگے داموں پر بیچیں گے۔

• "احتکار" کے متعلق متعدد حدیثیں پائی جاتی ہیں، جن میں اس کی ممانعت کی گئی ہے مثلاً:۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یحتکر الطعام (دعامی) — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے کہ غلہ کا کوئی احتکار کرے!

فقہائے اسلام نے عموماً اس حکم کو صرف غذائی مواد تک محدود رکھا ہے۔ اگرچہ بعضوں نے اور چیزوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے، نیز مختلف دوسرے قرائن اور روایات سے ہر حال میں اس فعل کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ فروشندہ کا کسی چیز پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ گاہکوں کو "مقابلہ" کی وجہ سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچے۔ اسلام اس کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بدبخت لوگوں کے متعلق ایسی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں کہ شاید دنیا میں بھی ان کو اس عمل کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔

کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو احتکار سے منع کیا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے متعلق جذام اور افلاس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس احتکار کرنے والے کو:۔

رأینا مجذوماً (مغنی) — میں نے دیکھا کہ وہ کوڑھی ہو گیا ہے

## تجارتی مسلک

ان جزئیات کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ تجارت کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر معلوم ہو، اور اس کا اندازہ صرف

دعو الناس یرزق اللہ بعضہم ببعض۔ — لوگوں کو چھوڑ دو، تاکہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے بعض کو روزی پہنچاتا ہے!

سے ہو سکتا ہے۔ اور اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے، جس کا جہاں جی چاہے، ایک ملک سے دوسرے ملک میں، ایک شہر سے دوسرے شہر میں، دیہات سے شہروں میں، شہروں سے دیہات

میں مال لائے لے جائے، نہ باشندوں کو اس میں خلل اندازی کر کے "بھاؤ" کے طبعی معیار کو پست و بلند کرنا چاہئے اور نہ حکومت کو اس باب میں خواہ مخواہ دخل دے کر رعایا پر زندگی تنگ کرنی چاہئے۔

باقی درآمد برآمد پر جو کروڑگیری رہنگی، لی جاتی ہے، اگرچہ اس زمانے میں اس کو ملک کے معاشی حالات کے توازن" کا جو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اور اس ذریعہ سے قوی ممالک ضعیف ممالک پر ظلم کر رہے ہیں۔ اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ کروڑگیری کا محصول اموالِ تجارت میں اسلام میں بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ حکومت کا ایک ٹیکس ہے یعنی مسلمانوں سے تو زکوٰۃ لی جاتی ہے اور اسی مصرف میں صرف ہوتی ہے جس مصرف کے لئے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یوں ہی اسلامی حکومت کی دوسری رعایا بھی اس کو بطور محصول ہی ادا کرتی ہے۔ اور اس لئے ادا کرتی ہے تاکہ جان و مال کی حفاظت کے مصارف کی پابجائی ہو۔ ان تمام مصارف کی تفصیل حکومت کی آمدنی کے باب میں آئے گی۔ البتہ غیر ممالک کے تاجروں سے جو کروڑگیری لی جاتی ہے اس کی بنیاد بھی دوسری ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ جس ملک کے لوگ اسلامی حکومت کی رعایا کے اموالِ تجارت پر کوئی محصول نہ لیں گے۔ ان سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لے گی۔ ہدایہ میں ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| ان کانوا لایاخذون | اگر غیر اسلامی حکومتیں ہماری حکومت کے |
| اصلاً لاناخذ۔ | باشندوں سے بالکل نہ لیں گے تو ہم بھی ان سے کچھ نہ لیں گے۔ |

لیکن اگر وہ ہمارے یہاں کے لوگوں کے مال پر محصول لیتے ہیں تو اس وقت ہم بھی ان سے اسی قدر لیں گے، جتنا ہمارے یہاں کے لوگوں سے وہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی ظالم حکومت اگر مسلمانوں کا سب مال لے لیا کرتی ہے تو ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| ان کانوا یاخذون الکل | اگر وہ سارا مال مسلمانوں کا لے لیتے ہوں تو |
| لاناخذ الکل! | ہم ان کے یہاں کے تاجروں کا سب مال نہ لیں گے! |

صاحب ہدایہ نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| نحن احق بمکارم الاخلاق | اعلیٰ اخلاق اصول کی پابندی کے ہم زیادہ مستحق ہیں |

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "کروڑ گیری" کا تعلق اسلام میں معاشیات سے نہیں، بلکہ سیاسیات سے ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی رعایا سے کروڑ گیری کے نہ لینے کا معاہدہ کرلیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو دستخط کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک جو حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنا رہی تھیں تو ہم بھی بناتے تھے۔ پھر انہوں نے مل کر خواہش کی کہ آئندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا۔ خلیفۂ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورہ سے وہی نحن احق بمکارم الاخلاق کہتے ہوئے اس مقدس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور آج بھی عام تجارت کو آزاد کرانے پر اگر غیر مسلم حکومتیں رضامندی ظاہر کریں تو ان کا نوا لا یاخذون، اصلا لا ناخذ پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس پرانا دستور موجود ہے۔

خیر کروڑ گیری کے مسئلہ کا ذکر یہاں تو ضمنی طور پر آگیا۔ تجارتی کاروبار کے متعلق میں نے چند تفصیلی احکام کا تذکرہ اس لئے کیا تاکہ تجارت کی آزادی وعدم آزادی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سامنے آجائے۔

اور اب اس بحث کو میں اسی پر ختم کرتا ہوں، یوں تجارت کے متعلق اور بھی چند قوانین ہیں جن پر بحث کی حاجت تھی۔ لیکن بخوف طوالت ان کو ترک کرتا ہوں۔ بہر حال سب میں وہی قرآنی حکم لا تظلمون ولا تظلمون کی روح کارفرما ہے۔ جب کوئی تفصیلی کتاب معاشیات پر لکھی جائے گی تو اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ مصارف سے بچے ہوئے سرمایہ کے متعلق ایک پہلو کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔

## سرمایہ کا استعمال وحفاظت!

مقصد یہ ہے کہ اس سرمایہ سے استفادہ کی جو دو شکلیں اسلام نے بتائی ہیں یعنی اگر اس سے کوئی شخص نفع اٹھانا چاہتا ہے، تو خسارہ اور خطرے کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ممکن ہیں۔ اور اگر خطرے کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا تو شخصی نفع سے دست بردار ہو کر ملک کے ضرورت مندوں یا بے سرمایہ لوگوں کو قرض دے کر قومی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس قومی نفع کے ساتھ بالآخر اسی زندگی یا دوسری زندگی میں شخصی منافع سے بھی وہ محروم نہ رہے گا۔ بلکہ خیرات وصدقات سے زیادہ قرض دینے میں شخصی نفع کی توقع کی جا سکتی ہے جس کی تفصیل گذر چکی اور صرف یہی نہیں، بلکہ اس قرض

اور دین کی ادائیگی کی ضمانت کے لئے اسلام نے جو ممکن صورتیں اس دنیا میں ہوسکتی ہیں انہیں
بھی اختیار کیا ہے۔ یعنی رہن اور رجسٹری جس کے ذریعہ سے چاہئے تو اپنے دین کو آپ محفوظ
کر سکتے ہیں۔ رہن کا ایک مفصل باب فقہ میں موجود ہے۔ اور رجسٹری کے اصولی قوانین مع قانون
شہادت تو خود قرآن میں موجود ہیں۔ وہی بات کہ اسلام نے زندگی کے معاشیاتی تعلقات کو کتنی
اہمیت دی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلاف دستور قانون رجسٹری کے لئے
قرآن میں ایک پوری رکوع سورہ بقر کے آخر میں مختص کر دی گئی ہے۔ تاکہ کسی کا دین ضائع ہونے
کے ممکنہ خطرات سے محفوظ ہو جائے۔ اور آخر میں تو :-

| | |
|---|---|
| ماتبدوا مافی انفسکم | اپنے دل کی جو بات ظاہر کرو گے یا جسے |
| او تخفوہ یحاسبکم به | چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ اس کا حساب |
| اللہ ا | فرمائے گا! |

کے ذریعہ سے اس پر بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ معاشیاتی ذمہ داریوں کی رتی رتی کا حساب
ایک دن ہو کر رہے گا۔ اور جس نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے۔ وہ قطعاً ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ
مل کر رہے گا۔ مگر یہ سب سامان تو "پس ماندہ سرمایہ" کے استعمال و حفاظت کا اس وقت
تک کے لئے ہے، جب تک آدمی زندہ ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنے بعد بھی کچھ پس انداز چھوڑ
کر مرنے والا ہے۔ تو اس سرمایہ کے متعلق بھی تقریباً اسلام نے دو ہی صورتیں مقرر کی ہیں۔ یعنی
اگر اپنے جانشینوں میں اس کی صلاحیت نہیں پاتا کہ اس بچائی ہوئی دولت سے صحیح معنوں
میں نفع نہیں اٹھا سکتے یا کم از کم اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو وقف خصوصاً وقف علی الاولاد
کا عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اسلام نے اس کی حفاظت کی ایک محکم اور استوار صورت
پیدا کر دی ہے[1]۔ گویا جیسے قرض میں اصل سرمایہ کو محفوظ کر کے دوسروں کو نفع پہنچایا جا سکتا
ہے۔ یہی حال وقف کے اس قانون کا ہے کہ بچا ہوا پس ماندہ سرمایہ جوں کا توں محفوظ بھی رہ

---

[1] امام شافعیؒ نے کتاب الام میں دعویٰ کیا ہے کہ وقف کی جو شکل اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کی نظیر اسلام سے پہلے نہیں ملتی۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ممکن ہے کہ عرب میں رواج نہ ہو لیکن عیسائیوں میں اوقاف بکثرت تھے۔ روم کے گرجوں میں مصر کی زمینیں وقف تھیں۔ لیکن میرے نزدیک امام شافعیؒ کا مطلب مطلق وقف سے نہیں بلکہ وقف کے منافع کو اپنے اقربا، واعزہ کے ساتھ مختص کرنا یہ اسلامی وقف کی خصوصیت ہے۔"

جاتا ہے، اور جن جن لوگوں کو واقف نفع پہنچانا چاہتا ہے۔ ان کو نفع بھی پہنچتا رہتا ہے۔ "وقف علی الاولاد" کے متعلق لوگوں کو عجیب مغالطہ ہوا۔ کہ اسے وہ خیرات کی ایک قسم قرار دے کر متحیر ہوئے اور بڑے بڑے قانونیوں نے اظہارِ تعجب کیا کہ "اولاد پر" "وقف" کے کیا معنی! قطع نظر اس کے کہ اسلام کا عام قانون صدقہ کے باب میں

| | |
|---|---|
| وابدء بمن تعول امک واباک | جس کا بار تم پر ہو پہلے ان میں سے شروع کرو۔ |
| اختک واخاک ادناک فادناک | یعنی ماں باپ کو، بہن کو، بھائی کو، پھر رشتہ |
| | میں جو زیادہ قریب ہوتا جائے۔ |

کا ہے۔ اور خود "صدقہ" کے مفہوم کو تو اس نے اتنا عام کیا ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قرار دیا۔ سوا اس کے "وقف" میں خیرات کے مفہوم سے زیادہ "پس ماندہ جائداد" کی حفاظت بھی مدِ نظر ہے۔ ابتدائے اسلام میں عموماً صحابہؓ نے بکثرت اپنی اولاد کے نام اوقاف کئے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| قال جابر لم یکن احد من | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے |
| اصحاب النبی صلی اللہ علیہ | کوئی مقدرت والوں میں ایسا نہ تھا جس |
| وسلم ذو مقدرۃ الا وقف | نے وقف نہ کیا ہو! |
| قال الحمیدی تصدق ابوبکر | حمیدی راوی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے |
| بدارہ علی ولدہ و عمر بدارہ | اپنی اولاد پر اپنے گھر کو وقف کیا۔ یہی |
| عند المروۃ علی ولدہ و | عمرؓ نے بھی مروہ کے پاس جو گھر تھا اس کو اپنی |
| عثمان[۱] وتصدق[۲] علی بارومہ | اولاد پر وقف کیا، حضرت عثمانؓ نے بھی یہی |

---

۱؎ حضرت عثمانؓ کے وقف کی قیمت کا اندازہ کتابوں میں مائتی الف دینار کیا گیا ہے یعنی دو لاکھ اشرفی جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روپے کے حساب سے اس کی قیمت کتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے اوقاف کا بھی کم و بیش تھا ۱۲

۲؎ اوقاف کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی چیز مسلمانوں کے یہاں جو ملتی ہے وہ مصارف اوقاف کی گونا گونی ہے امیر شکیب ارسلان جو اسلامی تاریخ کے ایک مستند اور وسیع النظر عالم ہیں، مشہور امریکی مصنف لوتھراپ سٹوڈرڈ نے "نیا عالم اسلام" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اب تو عربی میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، عربی ترجمہ پر امیر کے حواشی صفحہ آئندہ

ینبع وتصدق الزبير بداره بمكة وداره بمصر وامواله بالمدينة وتصدق سعد بداره بالمدينة وداره بمصر على ولده وعمرو بن العاص بداره بالوهط وداره بمكة على ولده وحكيم بن حزام بداره بمكة والمدينة على ولده فذلك الى اليوم (المغنی)

کیا حضرت علیؓ نے اپنی اس زمین کو جو ینبوع میں تھی وقف کیا۔ حضرت زبیرؓ نے اپنے اس گھر کو جو مکہ میں تھا اور جو گھر مصر میں تھا، اور مدینہ میں ان کا جو مال (باغ و زراعت) تھا اسے اپنی اولاد پر وقف کیا۔ حضرت سعدؓ نے مدینے میں ان کا جو گھر تھا اور جو مصر میں تھا اپنی اولاد پر وقف کیا۔ عمرو بن عاص نے وہط کے گھر کو اور جو مکہ میں ان کا گھر تھا اپنی اولاد پر وقف کیا۔ یونہی حکیم بن حزام نے مکہ اور مدینہ کے گھر کو اپنی اولاد پر وقف کیا اور یہ سارے اوقاف اس وقت تک موجود ہیں!

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "وقف" دراصل اس زمانے میں اپنی پسماندہ جائداد کی حفاظت کا ایک

---

بقیہ صفحہ گذشتہ :- بڑے مفید حواشی ہیں۔ ان ہی حاشیوں میں امیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مجنونوں، مجذوبوں بیماروں کے لئے مسلمانوں نے جو اوقاف کئے ہیں۔ وہ تو حد شمار سے خارج ہیں۔ بیمار جانوروں کے لئے مسلمان وقف کرتے تھے۔ شام میں "مرج" نامی جو مرغزار ہے لکھا ہے کہ جہاد میں جو گھوڑے زخمی اور بیکار ہو جاتے تھے ان کے یہ مرغزار وقف تھا۔ کہ کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ہر گھوڑا جس طرح چاہے چرے، رہے۔ دمشق میں ایک وقف کا مصرف صرف یہ تھا کہ چینی کا برتن کسی کا غلام اگر توڑ دے تو توڑنے والے غلام کو صحیح و سالم برتن دے دیا جائے تاکہ مالک اس کو مار پیٹ نہ کرے۔ مکہ میں ایک صاحب نے صرف اس لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے کتوں کو شہر میں رہنے سے روکا جائے۔ مکہ میں ایک وقف تھا جس کا مصرف واقف نے یہ مقرر کیا تھا کہ تقریبات اور شادیوں فرش و فروش، روشنی وغیرہ کا نظم اس کی آمدنی سے کیا جائے۔ ایک وقف تونس میں اسلئے کیا گیا تھا کہ جمعرات کے دن مدارس کے طلباء کا انتظام کیا جائے اور بچوں کو وقف کی آمدنی سے ہر ہفتہ انعام تقسیم کئے جائیں، ایک وقف تونس ہی میں اس لئے کیا گیا تھا کہ حمام کی فیس اس سے ہر اس شخص کے لئے ادا کی جائے جو خود حمام کی فیس ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راہ گیروں کو برف کا ٹھنڈا پانی پلایا جائے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ غرباء کے بچوں کی ختنہ کے مصارف اس سے ادا ہوں۔ تونس میں بھی برتن توڑنے والوں کیلئے (باقی صفحہ آئندہ)

حفوظ طریقہ تھا اور اس قانون کی اصل روح یہی تھی۔ اگرچہ اس قانون میں تبرّع اور نیکی کا مفہوم بھی
شریک تھا، لیکن اُسی معنیٰ میں، جس معنیٰ میں خود اپنے آپ کو، اپنی بیوی کو، کھانا کھلانا بھی اسلام میں
صدقہ ہے۔ ہر ذو مقدرت صحابی کا اس پر عمل کرنا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے
معلوم ہوتا ہے۔ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ بلکہ پس ماندہ رہنے
والی جائداد کے متعلق اسلام نے پہلے "وقف علی الاولاد" اور بعد کو وراثت کا قانون پیش کیا ہے
یعنی اگر جانشینوں سے جائداد کے برباد ہونے کا خطرہ ہے، تو ان کو وقف کر کے محفوظ کر دینا
چاہئے اور اگر ان میں اس کی صلاحیت نظر آتی ہے کہ ان میں ہر ایک کو کچھ سرمایہ اگر دے دیا جائیگا
اس کے اُلٹ پھیر اور اس کو اصل بنا کر اپنی معاشی ترقیوں میں مدد حاصل کر سکتے ہیں تو ایسی صورت
میں وراثت کے قانون سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ورثار جو اپنی زندگی کی
مدت ختم کر کے موت کے انتظار میں ہوں، مثلاً ماں باپ وغیرہ، ان کو میّت کے مال سے بقدر
ضرورت اوقات دلایا جاتا ہے، لیکن جن کے سامنے زندگی کے آئندہ عملی مراحل پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً

---

پیغمبرِ گذشتہ ۔ ایک وقف تھا بعض اوقاف اس لئے تھے کہ رمضان میں مٹھائی روزہ داروں میں اسکی آمدنی سے
تقسیم کی جائے۔ ایک دلچسپ وقف کا تونس میں پتہ چلا ہے، کہ خاص قسم کی مچھلی موسم پر وہاں کے سمندر کے ساحل پر
آتی ہے، غربار کے لئے ان مچھلیوں کو خرید کر تقسیم کیا جائے۔ بعض اوقاف کا مصرف یہ تھا کہ کسی کے کپڑے پر اگر داغ دھبّہ
لگ جائے یا ناقابلِ استعمال ہو جائے تو وہ اس وقف کی آمدنی سے نیا کپڑا خرید سکتا ہے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے
کہ راستوں سے پتھر کانٹے اس کی آمدنی سے ہٹائے جائیں۔ الغرض، اندھوں، لنگڑوں، لولوں، اپاہجوں، کوڑھیوں وغیرہ
کے لئے اکثر اسلامی ممالک میں اوقاف تھے۔ مراکش کے ایک اسلامی وقف کا ذکر اس نے لکھا ہے کہ ایک
عیسوی سیاح نے ان لفظوں میں کیا۔ "لق ودق عمارت ہے، جس میں پانچ ہزار اندھے ہمیشہ رہتے ہیں۔ ان کے کھانے
رہنے سہنے کا باضابطہ انتظام ہے اور تعلیم بھی ان کو دی جاتی ہے۔"

ایک دلچسپ وقف یہ بھی تھا کہ جن شوہروں سے ان کی بیویاں خفا ہو جائیں تو خفگی کے دنوں میں
اس وقف کی آمدنی سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ جب تک میاں بیوی میں صفائی نہ ہو جائے وقف کی طرف سے
ان کے مصارف کی پابجائی کی جائے۔

الغرض نئے مصارف کے علاوہ تعلیم وغیرہ کے لئے تو مسلمانوں نے ہر جگہ اوقاف کئے ہیں لیکن افسوس کہ
موجودہ حکومت ان کا انتظام نہیں کرتی۔ (الحاضر الاسلامی ص ۲۹۲ ج ۱) ۱۲

اولاد باتھ ان میں جس کو دوسرے سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔ یعنی لڑکیاں، جو شوہر کی قوت بھی رکھتی ہیں۔ ان کو لڑکے کے حساب سے نصف دلایا جاتا ہے۔ اور لڑکوں کو چونکہ کسی دوسرے سے امداد کی توقع نہیں ہوتی بلکہ فریضہ بیوی کا بار اس پر پڑتا ہے۔ اس لئے اس کو بجائے نصف کے پورا دلایا گیا۔ اور یہ تو اس وقت ہے کہ آدمی اپنی تمام اولاد کو ایک حال میں چھوڑ کر مر رہا ہو۔ لیکن بجائے اس کے اگر یہ دیکھتا ہو کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ایسے معذور اور بیمار یا کسی ایسی حالت میں ہیں کہ اگر ان کو صرف قانونی حصہ ملے گا تو کفایت نہ کرے۔ ایسی صورت میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ اپنی کسی خاص اولاد کو میراثی حصہ سے زیادہ اپنی زندگی میں ہبہ کر دے۔ امام احمد بن حنبل کا فتویٰ ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| لاباس اذا کان لحاجة | اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ ہبہ کر دینے میں |
| واکرهه اذا کان علی | کوئی مضائقہ نہیں، اگر اس کی ضرورت ہو، مگر |
| سبیل الاثرة. | بغیر ضرورت یہ بات مجھے ناپسند اور میرے |

نزدیک مکروہ ہے۔ یعنی بلا وجہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینی چاہیئے۔

مقدسی نے ان حاجات کی کچھ تفصیل بھی کی ہے :-

| | |
|---|---|
| مثل اختصاصه لحاجة | مثلاً کسی بچہ کو اس کی کسی ضرورت کی وجہ کر |
| او زمانة او عمی او کثرة | ترجیح دی جائے یا وہ کسی مزمن مرض میں مبتلا ہو |
| عائلة او اشتغاله بالعلم | یا اندھا ہو، یا اس کی اولاد زیادہ ہو، یا علم میں |
| او نحوه من الفضائل ! | مشغول ہو یا اسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل کر رہا ہو |

اور اس سے ایک عام سوال کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وقف وہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے جب کوئی اپنی جائداد کا نظم کئے بغیر مر جاتا ہے، تو اسلام نے میراث کا قانون اسی قسم کی جائدادوں کی تقسیم کے لئے بنایا ہے۔ اور قانون ظاہر ہے کہ شخصی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنتا عموماً کلیاتی اصول واضع قانون کے سامنے ہوتے ہیں۔ میراثی قانون کی بنیاد یہ رکھی گئی ہے کہ براہ راست قریب ترین رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر عمل کیا جاتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے۔ اور وراثت کے لئے صرف رشتہ داری کافی ہو، تو غالباً ایک ایک مورث کے سینکڑوں وارث، بلکہ شاید سارے بنی آدم وارث ہو جائیں۔ کیونکہ بالواسطہ رشتہ دار، تو تقریباً ہر آدمی کا دوسرا آدمی ہے۔ کم از کم آدم میں تو سب ہی جا کر شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر اسی اصول پر

کبھی براہِ راست قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ مورث کا کوئی بالواسطہ رشتہ دار ایسا بھی پایا جاتا ہے جو واقعہ کے اعتبار سے براہِ راست رشتہ داروں سے زیادہ قابلِ رحم اور محتاجِ امداد ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کبھی بیٹوں کے ساتھ کوئی یتیم پوتا رہ جاتا ہے۔ میراثی قانون کے مذکورۂ بالا نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پوتا محروم رہ جائے گا۔ کیونکہ پوتا اپنے دادا کا براہِ راست نہیں، بلکہ اپنے باپ کے واسطہ سے رشتہ دار ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی پوتا بوجہ یتیم اور کمسن ہونے کے امداد کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسے مواقع، جو کبھی کبھی پیش آجاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں کو میراث کے قانون میں کچھ نقص نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ قانون کے استعمال کرنے والے کا عقلی نقص ہے۔ یہ تو دادا کا فرض ہے۔ کہ جب وہ اپنے پوتے کو کس حال میں پاتا ہے۔ اور جانتا ہے کہ براہِ راست رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وہ میراثی قانون کے تحت نہ آئے گا، تو اس کو کس نے منع کیا ہے کہ قانونِ ہبہ اور عطیہ سے اس قابلِ رحم پوتے کو نفع نہ پہنچائے۔ خصوصاً جب خاص حالات میں ایک وارث کو دوسرے وارث پر ہبہ اور عطیہ میں ترجیح دی جاسکتی ہے اور مرنے کے بعد کسی وارث کو یہ حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کو اس سے واپس لے لے، مقدسی لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| اذا فاضل بین ولدہ فی العطایا اوخص بعضھم بعطیۃ ثم مات قبل ان یستردہ ثبت ذلک للموھوب لہ ولزمہ ولیس لبقیۃ الورثۃ الرجوع۔ | اگر عطیہ اور ہبہ میں کوئی اپنی اولاد میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دے اور بعضوں کو کسی خاص عطیہ کے ساتھ مختص کرے اور دینے والا اس عطیہ کو واپس کرنے سے پہلے مرجائے تو جسے یہ چیز ہبہ کی گئی ہے اس کی ملک ثابت ہوجائے گی اور اس کا حق واجب ہوجائے گا۔ باقی وارثوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کے متعلق اس پر دعوے کریں |

اس مسئلہ کو تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

| | |
|---|---|
| بہ قال مالک والشافعی واصحاب الرائے واکثر اھل العلم | امام مالک، امام شافعی اور اصحاب رائے (حنفیہ) اور اکثر اہلِ علم کی یہی رائے ہے! |

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آیتِ قرآن:۔

وفی اموالہم حق للسائل والمحروم۔ | ان کے مال میں مانگنے والوں اور جو (قانونی حقوق) سے محروم ہیں۔ ان کا بھی حق ہے!

میں "المحروم" کے تحت اس قسم کے محروموں کا حق قرآن نے سرمایہ داروں کے اموال میں اگر نہیں قائم کیا ہے، تو پھر یہ اور کن کے حقوق ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ اپنے یا اپنے بال بچوں، اپنی آئندہ نسلوں کی رزاقیت کے سررشتہ کو تو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم نہیں دیا ہے، اور الرزاق ذوالقوۃ المتین ہی کو اس کا متکفل قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر صرف ان ہی لوگوں کو نہیں، جو مالتھس وغیرہ وسواسیوں کی طرح نسلِ انسانی اور زمین کی غذائی پیداواروں میں عدم توازن کا خطرہ محسوس کر کے خود بھی ڈرے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو بھی اس نے ڈانٹا ہے جنہیں اولاد کی کثرت میں معاشی تنگ حالی کا خطرہ محسوس ہو حتی کہ ان میں بعضوں نے تو اتنی تنگ دلی اختیار کی، کہ پیدا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی گردن تک مروڑتے پر آمادہ ہو گئے اور ایسا فعل جو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہوئی، کہ اس کے متعلق قرآن میں ؎

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق! | اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ معاشی کے خوف سے!

کا حکم دیا جائے، اور یہ تو کہا جاتا ہے کہ "ایامِ جاہلیت کی قساوت تھی۔ لیکن آج جب ان ہی معاشی مشکلات کے بھوت کو سامنے کھڑا کر کے نسلِ انسانی کے ہمدردوں کا ایک گروہ ضبطِ تولید (برتھ کنٹرول) کے ذریعہ سے پیدا ہونے سے پیشتر انسانی نسل کو تباہ کر دینے کا جو وعظ سنا رہا ہے، کیا جاہلیت" کی اس سنگدلی سے "عالمیت" کی یہ رحمدلی کچھ کم ہے۔ وہی برتھ کنٹرول کا وعظ کہنے والا اگر خدانخواستہ برتھ کنٹرول کی لپیٹ میں آجاتا۔ تو آج اسٹیجوں پر چہک چہک کر یہ باتیں کیا کر سکتا تھا؟ بہر حال اسلام نے "رزاقیت" کی فکر میں شہر کے قاضیوں کو گھلنے سے تو بے نیاز کر دیا ہے۔ حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض معاشیوں نے العزل (صحبت کا ایسا طریقہ جس سے حمل قرار نہ پائے) کی راہ سے جب برتھ کنٹرول کے متعلق منشائے مبارک دریافت کیا، تو ارشاد ہوا کہ یہ وداد خفی ہے۔ یعنی اولاد کو زندہ مار ڈالنے کی یہ ایک مخفی تدبیر ہے۔ اور اس کی واقعیت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت

ہی نہیں دی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی آمدنی کو کوئی اس بے ترتیبی سے اڑائے۔ یا خرچ کرے کہ نتیجۃً اس کی اولاد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو۔ مشہور واقعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حدیثوں میں آتا ہے، کہ اپنی ایک سخت بیماری میں ان کو زندگی سے جب مایوسی ہوگئی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے تو سعدؓ نے کہا کہ میری وارث صرف ایک لڑکی ہے، کیا مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں"۔ سعدؓ نے کہا، تو آدھا؟ پھر جواب ملا "نہیں" سعدؓ نے کہا تو ایک تہائی؟، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تہائی بہت ہے" اس کے بعد آپؐ کے الفاظ یہ تھے۔

| | |
|---|---|
| انک ان تذر ورثتک | تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ، یہ اس |
| اغنیاء خیر من ان تذعھم | سے بہتر ہے کہ انہیں ایسے افلاس کی |
| عالۃ یتکففون الناس۔ | حالت میں چھوڑ دو کہ لوگوں کے سامنے |
| (صحاح) | ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ |

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کے لئے نہیں، بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی اگر کسی کو پس انداز کرنے کا موقعہ ہے تو اسلام اس سے نفع اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ پھر پسماندوں کی حالت اگر وقف کی مقتضی ہو تو منافع کو ان تک پہنچا کر اصل کو محفوظ کر دیا جائے یا اولاد میں سے کوئی لڑکا یا لڑکی زیادہ ضرورت مند ہو یا کوئی رشتہ دار قابل امداد ہونے کے باوجود میراثی حصّہ سے محروم ہوتا ہوا نظر آرہا ہو، ان کو ہبہ کے ذریعہ سے کچھ دے دیا جا سکتا ہے، اور باقی کو قانون سے تقسیم ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ پہنچ جائے، جس کے ذریعہ سے اگر کافی ہو وہ زندگی گذاریں، ناکافی ہو تو اس کو اصل بنا کر آمدنی پیدا کریں۔

مضمون گویا زندگی سے شروع ہو کر ایک حد تک موت اور موت کے بعد تک پہنچ چکا ہے اختصار کی کوشش کے باوجود بات پھیلتی جا رہی ہے، اور ابھی چند اہم نکات اور مصارف دخرچ کا مستقل باب باقی ہے۔

---

# محنت و مزدوری

باہمی لین دین کے سلسلہ کی ایک بڑی اہم چیز اجارہ ہے۔ اردو میں تو اجارہ ٹھیکہ اور گتہ کے معاملہ کو کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں، نوکری، مزدوری، کاری گری، کرایہ داری مکان کی ہو یا زمین کی، سب اجارہ کا معاملہ ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خود چیز دے کر معاوضہ لینا نہیں، جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے۔ بلکہ چیز سے استفادہ کا حق دے کر اس کے معاوضہ میں کچھ لینا یہی اجارہ کا معاملہ ہے۔ پھر اگر مکان، گاڑی، گھوڑا وغیرہ کے متعلق یہ معاملہ کیا جائے تو کرایہ کا معاملہ ہوا۔ اور اگر بجائے اپنی کسی چیز کے خود آدمی اپنی خدمت اور محنت کا معاوضہ حاصل کرے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مستاجر کی ماتحتی میں اگر کام نہ کرے بلکہ اپنے گھر میں مثلاً کام کرتا ہو تو یہ کاریگری ہے اور اگر مستاجر کی ماتحتی میں کرتا ہے، تو اس کی بعض شکلوں کو نوکری، بعضوں کو مزدوری کہتے ہیں۔ فقہاء اسلام نے ہر ایک کے متعلق اپنی کتابوں میں مفصل قوانین بنائے ہیں۔ اس زمانہ میں ربوا دسود کی وجہ سے سرمایہ کے ملنے میں جب آسانیاں ہوئیں تو عموماً کاریگروں کو لوگوں نے نوکر اور مزدور رکھ کر ان کی اجتماعی محنت سے نفع حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طریقہ سے پیداوار تو اجتماعی شکل میں ہونے لگی یعنی ایک ایک کارخانہ میں دس دس ہزار مزدور کام کرنے لگے اور سرمایہ چونکہ ایک ہی یا چند محدود اشخاص کا ہوتا ہے۔ اس لئے اصلی نفع یا چند اشخاص کو ملتی رہی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کا سوال اسی شکل نے پیدا کر دیا۔ سرمایہ دار کو ظاہر ہے بوجہ محدود افراد ہونے کے لاکھوں اور کروڑوں کی شکل میں نفع ملتا رہا۔ اور مزدور جن کی اجتماعی محنت کا یہ ثمرہ ہے ان کو صرف مزدوری ملتی رہی۔ لیکن چونکہ انفرادی طور پر کام کرنے سے اتنا نفع بھی ان کو نہیں ملتا تھا۔ اس لئے قدرتاً کارخانوں میں کام کرنے کو انہوں نے اپنے لئے زیادہ منفعت بخش پایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر مزدور نہ ان مشینوں کو خرید سکتے ہیں اور نہ خام مواد کا اتنا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں جو سرمایہ دار خود، یا اپنی ساکھ پر بنکوں سے سودی قرض لے کر مہیا کر سکتے ہیں۔ کارخانہ داروں نے چونکہ اس کا اندازہ کر لیا، کہ انفرادی مزدوری سے زیادہ اگر مزدوروں کو کارخانہ میں مزدوری دے دی جائیگی، تو سود کے حساب سے نقصان کیا نفع اور کافی نفع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں بھی اگر غور کیا جائے تو مشکلات

کی بڑی وجہ یہی سُودی اور ہنکنگ کا کاروبار ہے۔

اسلام نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے۔ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ پوری تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں تاہم چند کلیات اجارہ کے متعلق ذیل میں ہم درج کرتے ہیں اور علمائے معاشیات کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرمایہ و محنت کی جو گتھی کسی جتن سے آج تک سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے انسانی زندگی کے پہلوؤں کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان کی پیچیدگیوں کا کوئی حل کیا مل سکتا ہے۔ یا کم از کم ان کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج جو باتیں نئی خیال کی جاتی ہیں۔ واقع میں وہ کتنی پُرانی ہیں۔ بہرحال بخاری شریف کی ایک حدیث ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اخوانکم خولکم جعل اللّٰہ | خول (تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے) |
| تحت ایدیکم فمن کان | تمہارے بھائی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو تمہارے |
| اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ | نیچے ڈال دیا ہے۔ پھر جس کا بھائی کسی کے |
| مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس | ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہئے کہ جو کچھ خود |
| ولاتکلفوھم ما یغلبھم | کھاتا ہو اسے کھلائے، اور جو خود پہنتا ہو |
| فان کلفتموھم فاعینوھم | اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو |

اُن کو مغلوب کر دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو اُن کی مدد و اعانت کرو!

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) مزدُور اور جو مزدُوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے، پہننے، رہنے، سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے، وہ مزدُور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدُور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یعنی کم از کم اتنی اُجرت تو بہرحال ہر مزدور کو ملنی چاہئے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔ مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بلند کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش کی کمی کی بہت حد تک توقع کی جا سکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے جو ان کو مغلوب کر کے تھکا دے "لا تکلفوھم ما یغلبھم" یہ ایسا فقرہ ہے جس سے موجودہ زمانے میں وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جا سکتا ہے۔

(۴) اور اگر کوئی کام ایسا پیش آجائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری پیش آرہی ہو تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کام کو نہ کرایا جائے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ خواہ مزدور پر کچھ ہی گذر جائے۔ لیکن بہر حال اس سے وہ کام لیا ہی جائے، بلکہ ایسی صورت میں یہ کام کرنا چاہئے۔ کہ مزدور کی اعانت مزید قوت سے کی جائے" فاعینوھم" کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خود اس کام میں لگ جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بہر حال مزید قوت سے مزدور کی اعانت کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "محنت اور سرمایہ" کے جتنے جھگڑے اس زمانہ میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مندرجہ بالا حدیث کے ذریعہ اس کا حل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی یہ صرف کوئی خوشگوار نری تجویز ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایسے عملی واقعات کی ایک فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ جن میں مسلمانوں نے اسے عملاً کر کے دکھایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوذرؓ ہی کی زندگی کا یہ دستور العمل تھا اور حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس میں نصف راستہ خود سوار ہونا اور نصف راستہ غلام کو اونٹ پر سوار کرانے کا واقعہ تو مشہور رہا ہے مزدوری کے متعلق دوسری حدیث بخاری کی یہ ہے کہ

| | |
|---|---|
| قال اللہ ثلثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر و رجل باع حرًا ثم اکل ثمنہ رجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ۔ | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کا قیامت میں میں فریق مخالف ہوں گا۔ ایک شخص جس نے میرے نام سے کسی کو کچھ دیا اور عہد شکنی کی (یہ پہلا آدمی ہی ہے) دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے تیسرا وہ جس نے کسی مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا۔ لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔ |

تیسری حدیث :-

| | |
|---|---|
| ان ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مزدور کو اس |

اعطوا الاجیر اجرہ قبل — کی مزدوری ادا کر دو۔ قبل اس کے

ان یجف رشحہ (رواہ ابو یعلی) — کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

ایک اور روایت مسند احمد میں یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اعطوا العامل من عملہ — مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو کیونکہ

فان عامل اللہ لا یخیب — اللہ کا عامل یعنی مزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا

اس حدیث کا کیا مطلب ہے۔ کیا علاوہ مزدوری کے "منافع" میں بھی مزدور کا کچھ حصہ اسلام مقرر کرنا چاہتا ہے۔ افسوس ہے کہ فقہاء اسلام کی کتابوں میں اب تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں ملی۔ لیکن ایک اور حدیث ہے۔ جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشادِ مبارک ہے:۔

اذا صنع لاحدکم خادمہ — تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے اور

طعاما ثم جاء بہ وقد ولی — لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی دھوئیں

حرہ ودخانہ فلیقعدہ معہ — کو اس نے برداشت کیا تھا۔ تو چاہیئے کہ

فلیاکل فان الطعام مشفوھا — اپنے ساتھ اس کو بٹھالو، اور کھانے پر زیادہ

فلیضع منہ فی یدہ اکلۃ — آدمی ہوں تو پھر خادم کے ہاتھ میں کھانے

او اکلتین۔ (صحیح بخاری) — سے کچھ چیز اٹھا کر رکھ دو۔ ایک لقمہ یا دو لقمے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا۔ خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیئے۔ کیا مزدور کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟

مزدوروں اور نوکروں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ایک تو اس باب میں بخاری کی روایت گذر چکی کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ نیز اس سلسلہ میں ان کے ساتھ در گذر اور چشم پوشی کے متعلق ایک قابلِ ذکر حدیث وہ ہے۔ جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا:۔

یا رسول اللہ کم اعفو — اے اللہ کے رسول! میں اپنے نوکر

عن الخادم۔ — کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں؟

راوی کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اسی سوال کو دُہرایا آپ نے تب اس کے جواب میں جو بات کہی۔ وہ یاد رکھنے کی ہے۔ ارشاد ہوا:۔

اعفی عنہ کل یوم سبعین | ہر روز ستر مرتبہ (غلام کی)
---|---
مساتہ! (ابوداؤد ترمذی) | معاف کیا کرو!

اسی بنا پر فقہائے اسلام نے یہ طے کر دیا ہے، کہ نوکر، یعنی

| | |
|---|---|
| الذی یستاجر مدۃ فلا | کسی مقررہ مدت کے لئے جو تنخواہ پر نوکر رکھا |
| ضمان علیہ مالم یتعمد۔ | جائے اس پر چیزوں کے نقصان کرنے کا |

تاوان عائد نہ ہوگا۔ اگر اس کی طرف سے قصداً نقصان کرنے کا ارادہ نہ ہوا ہو)

مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

| | |
|---|---|
| وھذا مذھب مالک | یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور ان |
| وابی حنیفۃ واصحابہ۔ | کے اصحاب کا مذہب ہے! |

اس سلسلہ میں بعض ایسی حدیثیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے لیکن میرے نزدیک یہ احکام ہر شخص کے لئے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابومسعودؓ بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے ایک آواز:-

| | |
|---|---|
| اعلم ابا مسعود! | خبردار! ابومسعود! |

کی آئی۔ ابومسعود کہتے ہیں۔ غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور فرما رہے ہیں:-

| | |
|---|---|
| اعلم ابا مسعود! ان اللہ | خبردار ابومسعود! حق تعالیٰ تم پر |
| اقدر علیک علی ھذا | تمہارے غلام سے زیادہ قابو |
| الغلام! (مسلم) | رکھتے ہیں! |

اور غالباً یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کو عبدی (میرا غلام) امتی (میری لونڈی) کہنا، اور ان لوگوں کا اپنے آقاؤں کو ربی (میرا رب اور مالک) ربتی (میری مالکہ) کہنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی تھی۔ اور حکم تھا کہ بجائے غلام کے "فتائی" (میرا جوان) اور آقا کو بجائے رب کے "سیدی (میرے سردار) کہا کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں غریبوں کے اس طبقہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ آخری آواز دنیا کے کانوں نے خدا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبانِ مبارک سے جو سُنی، وہ

الصلوٰۃ وما ملکت — نماز، اور جن کے تم مالک ہو، ان کی

ایمانکم! — خبر لیتے رہنا۔

(یعنی ان دونوں کے حقوق کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنا)

کی تھی ———— صلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامی وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین!

اسی طرح قرآن کی مشہور آیت :-

ان اکرمکم عند اللہ — اللہ کے پاس سب سے زیادہ شریف وہی ہے

اتقٰکم! — جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار رہو!

میں پیشہ ورانہ "طبقات کی جن درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور بجائے پیشوں اور نسلوں کے تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مزدوری کے کسی پیشہ کو افضل اور کسی کو کمتر قرار دینے کی بنیاد ہی نکل گئی۔ اسلام اور اسلام پر صحیح معنوں میں چلنے والوں نے اس سلسلہ میں جو عملی نظائر پیش کئے ہیں تاریخ کے اوراق ان سے معمور ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر ہندوستانی تمدن کے نشہ کا ایک متوالا ابوالفضل تعریضاً کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز کی باتوں کا کیا اعتبار؟ یعنی اسلام میں عموماً بڑے بڑے علماء، فقہاء، جو گذرے ہیں ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مزدوری کے معمولی پیشوں سے تھا۔ افسوس کہ جو چیز اسلام میں باعثِ فخر ہے۔ اس ہندی تمدن کے مسحور کی نگاہ میں وہی باعثِ ننگ قرار پائی۔ مگر بحمداللہ اب دُنیا فہم کے جس نکتہ تک پہنچ چکی ہے، وہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ آج جس چیز کے ماننے کے لئے عالم مضطرب ہے، اسلام صدیوں پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا ہے۔ اور عمل کر کے دکھا چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شمشیروں کو بھی اسلام نے جب تخت و تاج کا مالک بنایا تو صفادیت کے لقب کو انہوں نے بطورِ فخر کے استعمال کیا۔ اور غلاموں کی جو قدر و عزت اسلام میں ہوئی دُنیا کی تاریخ اپنے پاس اس کی نظیر نہ اس سے پہلے رکھتی تھی اور نہ بعد میں رکھتی ہے۔ تقریباً آئمہ حدیث و فقہ کی بڑی جماعت موالی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف دین ہی میں نہیں، مختلف مقامات میں دُنیا کے حساب سے بھی دنیوی ارتقاء کے آخری نقطۂ سلطنت و بادشاہت تک غلاموں کو عروج پاتے ہوئے تم مسلمانوں میں پا سکتے ہو۔

لیکن باوجود اس کے ذلت کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض پیشوں کا چونکہ گندگی اور نجاست

سے تعلق ہے۔ اس لئے چند خاص پیشوں کے متعلق علمائے اسلام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے جن میں ایک تو سنگھی لگانے (حجامت) کا پیشہ ہے۔ چونکہ سنگھی لگانے والے خون کو چوستے ہیں اور خون نجس چیز ہے۔ اس لئے بعض حدیثوں میں آیا ہے:-

کسب الحجام خبیث — سنگھی لگانے والے کی کمائی گندی ہے

لیکن باوجود اس کے بھی اکثر ائمۂ اسلام نے اس کی اُجرت اور مزدوری کو حلال ہی قرار دیا ہے علامہ مقدسی نے اجرۃ مباح، یعنی "سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے"۔ لکھنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ھذا قول ابن عباس قال انا آکلہ وبہ قال عکرمۃ والقاسم والبوجعفر ومحمد بن علی بن الحسین وربیعۃ ومالک والشافعی واصحاب الرائے! | یہ ابن عباس کا قول ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس کو کھاتا ہوں۔ اور یہی فتویٰ عکرمہ، قاسم، ابوجعفر، محمد بن علی بن الحسین اور ربیعہ امام مالک امام شافعی اور اصحاب رائے (ابوحنیفہ) کا ہے! |

اگرچہ بعضوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ تاہم یہ اختلاف حجام کے صرف سنگھی لگانے کے کام کی حد تک محدود ہے۔ باقی عموماً حجام، جو دُوسرے کام کرتے ہیں۔ ان کے جواز میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے۔ مقدسی کا بیان ہے:-

| | |
|---|---|
| استیجار الحجام لغیر الحجامۃ کالفصد وحلق الشعر وتقصیرہ والختان وقطع شیئ من الجسد للحاجۃ نجائز! | پچھنا لگانے کو چھوڑ کر حجاموں کے یہ کام یعنی فصد کا کام، بال مونڈنے کا کام، یا تراشنے کا، یا ختنہ کرنے کا یا جسم کے کسی حصہ کے کاٹنے کا۔ اگر ضرورت پیش آئے تو اسکی مزدوری جائز ہے! |

اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کا تذکرہ بھی فقہائے اسلام نے کیا ہے۔ یعنی خاکروبوں اور بھنگی کا کام ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی مزدوری ہے۔ لیکن بھنگیوں کو چونکہ نجاست سے کام پڑتا ہے۔ اس لئے علماء نے اس پیشہ کو اچھا نہیں خیال کیا ہے۔ ابنِ عباس کا ایک اثر بھی اس باب میں نقل کیا جاتا ہے۔ کہ حج سے فارغ ہو کر ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ:-

| | |
|---|---|
| اُکنس فما تریٰ فی مکسبی! | میں صفائی کا کام کرتا ہوں، میرے پیشہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ |

ابنِ عباسؓ نے پوچھا:۔

ای شیئ تکنس (کس چیز کو صاف کرتے ہو؟) بولا العذرۃ (غلاظت) کو صاف کرتا ہوں، اور آگے اس نے اضافہ بھی کیا:۔

| | |
|---|---|
| ومنہ حججت ومنہ تزوجت | اس کی مزدوری سے میں نے حج بھی کیا اور شادی بھی! |

یہ سُن کر ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سخت کراہت پیدا ہوئی، غصہ میں بولے:۔

| | |
|---|---|
| انت خبیث وحجک خبیث | تُو بھی گندہ، تیرا حج بھی گندہ اور جو تُو نے |
| وما تزوجت خبیث! | شادی کی، وہ بھی گندی! |

لیکن باوجود ابنِ عباس کے اس سخت فتویٰ کے علماء نے اس "خبث" کا مطلب مذہبی "خبث" نہیں لیا ہے، بلکہ طبعی خبث اور کراہت مراد ہے۔ اسی لئے عام خیال یہی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| الاجارۃ فجائزۃ لان الحاجۃ | غلاظت صاف کرنے کی مزدوری جائز ہے |
| داعیۃ الیہا لاتندفع الا | کیونکہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ جب تک اسکی |
| باباحۃ الاجارۃ فوجبت | مزدوری حلال نہ ہوگی یہ ضرورت پوری نہیں |
| اباحتہا کالحجامۃ! | ہوسکتی اس لئے اس کا حلال ہونا ضروری ہوا |
| (المغنی ص ۱۳۶) | جیسے سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔ |

اس موقعہ پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

کھاد، جس میں ہر طرح کی نجس چیزیں شریک ہوتی ہیں، گوبر، غلاظت وغیرہ لیکن مشہور صحابی یعنی فاتح ایران حضرت سعد ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتابوں میں یہ نقل کرتے ہیں کہ:۔

| | |
|---|---|
| کان سعد بن ابی وقاص | حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ |
| رضی اللہ تعالیٰ عنہ یحمل | تعالیٰ عنہ کھاد خود اٹھا کر اپنے کھیت میں |
| مکتلۃ الی ارض لہ وکان یقول | ڈالتے تھے جو ان کی ملکیت میں تھا اور فرماتے |

سعن مکتل عن ثم مکتل کہ ایک ٹوکری کھاد کی گیہوں کی

بتر ! (بیہقی ص ۱۳۹ ج ۲) ایک ٹوکری ہے۔

عزہ کی شرح اصمعی کے حوالہ سے بیہقی نے نقل کیا ہے کہ عذرۃ الناس کو کہتے ہیں، یعنی غلاظت ظاہر ہے، کہ خالص غلاظت تو وہ نہ ہوگی ... بلکہ مختلف چیزوں کو ملا کر کھاد تیار کرتے تھے ترکاری کی کھاد کا ذکر ابن سعد میں بحوالہ ابوالعالیہ یہ ہے، کہ الخرء والبول والحائض تھی۔ یعنی پرندوں کی بیٹ، پیشاب اور حیض کے لتے۔ اس لئے بعض صحابہؓ کھاد ڈالنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ابوالعالیہ بھی عموماً ساگ، پات، ترکاری اس لئے کم کھاتے۔ البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں جو باغ تھا۔ اس سے تحفۃً جب ترکاری آتی تو شوق سے کھاتے۔ شاید بغیر کھاد کے اُگائی جاتی ہوگی۔ حضرت انسؓ کے اس باغ میں، لکھا ہے کہ ایک پھول تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی۔ (ابن سعد ص ۱۰ ج ۷)

اسی قسم کی ایک "گندی اُجرت" جس کا جاہلیت میں غالباً رواج تھا اور اسے اصطلاحاً "عسب الفحل" کہتے تھے۔ یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے وغیرہ کا جس کے پاس نر جانور ہوتا، وہ بچہ کشی کے لئے اس نر کو کرایہ پر چلاتا تھا۔ فقہاء نے اس معاوضہ کو مکروہ لکھا ہے۔ اگرچہ ضرورت کی وجہ سے بعضوں نے اجازت بھی دی ہے۔ بہرحال اگر معاہدہ کے طور پر نہیں، بلکہ بطور ہدیہ کے نر کے مالک کو کچھ دے دیا جائے، اس میں حرج نہیں ہے۔ لکھا ہے ؎

| | |
|---|---|
| اذا اطرق انسان فحله | اپنے نر کو کوئی اگر بغیر کسی اجارہ اور |
| بغیر اجارۃ ولا شرط | شرط کے چھوڑے اور اس کے بعد |
| فاهديت له هدية | کوئی تحفہ دیا جائے یا کوئی عزت افزائی |
| او اكرم بكرامة فلا بأس | ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں! |
| فلا باس به (ص ۱۳۴) | |

خلاصہ یہ ہے کہ بجز ایسی چیزوں کے جن سے استفادہ ہی کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً زنا، گانا بجانا، نوحہ گری، تصویر کشی وغیرہ چونکہ یہ سارے کام بھی اسلامی نقطۂ نظر سے برے ہیں اس لئے ان کو بھی حصولِ معاش کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ آئمہ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے نصوص اور اسلامی مستندات کی بنیاد ہی پر کہا ہے ورنہ جہاں

کہیں تھوڑی سی بھی گنجائش نظر آئی ہے سبھوں نے نہیں تو بعض آئمہ نے معاش کی اس راہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے اس باب میں کس حد تک وسعت نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ کہ شراب جیسی حرام چیز کے متعلق اوروں کا تو نہیں لیکن امام ابوحنیفہ کا یہ فتوی کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| من حمل لذمی خمرا فانه یطیب له الاجر عند ابی حنیفة۔ | اگر کسی غیر مسلم ذمی کی شراب (مسلمان) ڈھوئے تو مسلمان کے لئے اس ڈھونے کی مزدوری امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پاک ہے۔ |

(کتاب الکراہتہ ہدایہ ص ۴۷۵ ج ۴)

امام صاحبؒ کے خیال کی توجیہہ کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ شراب کا پینا حرام ہے اور پینے کی نیت سے اس کا ڈھونڈنا بھی حرام ہے۔ لیکن اس مسلمان بیچارے کی غرض تو مزدوری ہے، خواہ پانی ہو یا شراب۔ پھر اس کی مزدوری کو کس بنیاد پر ناپاک قرار دیا جائے۔ لیکن اور تو اور امام صاحب کے دونوں شاگرد ابو یوسف، محمد بن حسن کا فتوٰے اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث میں چونکہ شراب کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے، ان میں "حاملها" اس کے ڈھونے والے کا لفظ بھی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جو خود پینے کے لئے شراب ڈھوئے۔ اس کے ساتھ یہ حکم مخصوص ہے۔ بہر حال مجھے اس مثال سے فقہار کی معاشی وسعت نظری کا ثبوت پیش کرنا تھا اور یہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ مگر باوجود ان وسعتوں اور اجازتوں کے دو چیزیں فقہاء کی کتابوں میں عجیب پائی جاتی ہیں یعنی ایک تو یہ کہ مسلمان کیا کسی کافر کی ملازمت اور نوکری کر سکتا ہے؟ یہ سوال اٹھایا گیا تھا اور بد قسمت مسلمانوں کے متعلق کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جواب تو جواب، سوال بھی دماغوں سے نکل جائے گا، حتیٰ کہ بالآخران کی ساری قومی اور ملی کوششوں کا آخری محور یہی مسئلہ رہ جائے گا۔ کہ غیر اسلامی حکومتوں میں ملازمت کے حقوق کی کتنی مقدار ان کو حاصل ہوئی۔ مغنی کے متن کا مسئلہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| لا یجوز اجارة المسلم للذمی لخدمته نص علیه احمد. | مسلمان کو ذمی کافر اپنی خدمت کے لئے نوکر رکھے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے! |

دلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ :-

حبس المسلم عند الکافر — مسلمان کا کافر کے پاس قید ہونا بھی

واذلا لا لہ۔ — ہے اور مسلمان کو ذلیل کرنا بھی ہے!

مجھے مسئلہ کے ذکر سے اس وقت جواز و عدم جواز کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ انحرا سے اگر جائز قرار نہ دیا جائے گا تو مسلمانوں کے جلینے کی شکل ہی کیا رہے گی۔ بلکہ دکھانا کسی قوم کے تاریخی انقلاب کا ہے۔

واذا اراد اللہ بقوم سوء — اور اللہ جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا

فلا مرد لہ وما لہ من — ارادہ فرماتا ہے تو پھر اسے کوئی پلٹا

دونہ من وال۔ — نہیں سکتا اور نہ کوئی اس کا والی و مددگار ہوتا ہے

اسی سلسلے کے ایک مسئلہ کا ذکر آخر میں اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ فقہائے اُمت کی بلند نظری کا لوگوں کو کچھ احساس ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی معاشیات کی تدوین میں ان بزرگوں نے کتنی بے لوثی سے کام کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کام ہی قرآن و حدیث کی تدریس و تعلیم یا مساجد کی امامت و خطابت وغیرہ تھا۔ اور اب بھی بے چارے مولویوں کا یہی کام ہے۔ مگر باوجود اس کے حیرت ہوتی ہے کہ چند لوگوں نے نہیں، بلکہ اکثر آئمہ اسلام کا فتویٰ ان تمام امور کے متعلق یہ ہے کہ ان خدمات کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے مقدسی لکھتے ہیں کہ جن کاموں پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے ان میں "الامامۃ والاذان والحج و تعلیم القرآن" بھی ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

نص علیہ احمد وبہ قال — امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے، اور

عطاء والضحاک بن قیس — یہی فتوے ضحاک بن قیس، ابوحنیفہ اور

وابو حنیفۃ والزھری! — زہری کا ہے!

فقہ کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے اور بالآخر زمانے کے حالات کا اندازہ کر کے جواز کا فتویٰ اس بناء پر دے دیا گیا کہ چند آئمہ مثلاً شافعی، مالک جواز کے قائل تھے آخر اگر اس کا فتویٰ نہ دیا جائے تو مفت "حسبۃً للہ" ان خدمات کو انجام دینے کے لئے کون آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ گذشتہ بزرگوں ہی کی ہمت تھی کہ معاش کے لئے کوئی دُوسرا ذریعہ اختیار کر کے دین کی ان خدمات کو مفت انجام دیتے تھے، لیکن جو

زمانہ دگرگوں آئین نہاد!

**مزارعت ومساقات** | چاہیے تو یہی تھا کہ ان دونوں معاملات کا ذکر بھی اجارہ ہی کے ذیل میں کر دیا جاتا کیونکہ اس کا تعلق بھی محنت و مزدوری سے ہے۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ فقہاء اسلام ان دونوں کو الگ الگ کر کے لکھتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان کا علیحدہ ذکر کرتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت و سرمایہ میں جو جھگڑا اس وقت دُنیا میں جاری ہے اس سلسلہ میں جس طرح صنعتی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلاف کے حل کی ایک شکل اسلام نے پیش کی ہے۔ جیسا کہ گذر چکا کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی زندگی کم از کم کھانے پینے کی حد تک ایک ہو۔ یا یوں کہئے کہ مزدوری مزدوروں کو اتنی ملنی چاہئے۔ جس کے ذریعہ سے ان کی خوراک اور ان کا لباس سرمایہ دار کی خوراک اور لباس کے برابر ہو جائے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ مزدور کو منافع سے بھی کچھ حصّہ ملنا چاہیئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مزدوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے یعنی سرمایہ دار کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محض مصارف کے ڈر سے زیادہ مشقت کے کام کو چند ہی مزدوروں سے لے، بلکہ ان کی اعانت کے لئے قوت کا اضافہ کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کا وقت اسی قدر مقرر کیا جائے، جتنا کہ وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ صحاح کی صحیح روایتوں سے یہ تینوں نتائج برآمد ہوتے ہیں، قریب قریب کچھ اسی قسم کا مسئلہ زمین کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قبل اسلام عرب، خصوصاً مدینہ و اطرافِ مدینہ میں زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان مختلف قسم کے معاملات جاری تھے۔ مثلاً:-

(۱) زمین میں کچھ بھی پیدا ہو، مگر زمیندار کو بہر حال بیس من فی بیگھہ مثلاً کاشت کار ادا کرے گا۔ اسی کو مزارعت "بجزءٍ معلوم" کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو صورتیں تھیں۔ اسی کھیت سے غلّہ کی اس مقدار کو ادا کرے گا، یا خود گھر سے دے گا۔

(۲) زمین کے اچھے قطعات کی پیداوار زمیندار کو ملے گی۔ اور معمولی خراب پیداوار قطعہ کا مستحق کاشتکار ہوگا۔

(۳) جو کچھ پیدا ہو اُس کا نصف یا ثلث جو بھی طے ہو جائے، کاشتکار کو ملے گا

گویا یہ ساری شکلیں بٹائی کی عرب میں مروّج تھیں۔ لیکن نقدی بندوبست یعنی فی بیگھہ کاشتکار سالانہ، مثلاً دو روپے، چار روپے، الغرض جو طے ہو جائے ادا کرے گا اور کل پیداوار کا حصہ مالک ہوگا۔

نقدی کی یہ شکل بھی عرب میں مروّج تھی یا نہیں اس کا اب تک صاف صاف پتہ نہ چلا۔ رافع ابن خدیج، جن کا گھرانہ مدینہ کے سب سے بڑے کاشتکاروں میں تھا۔ ان کے ایک بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مدینہ کے لوگ اس سے واقف نہ تھے۔ بہر حال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی کے نمبر (۱) اور نمبر (۲) دونوں طریقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ کیونکہ بسا اوقات ان میں سے بے چارے کاشت کار کے پلے کچھ نہیں پڑتا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر سے تاوان ادا کرنا پڑے۔ تمام فقہاء اسلام بلا استثناء بٹائی کی ان دونوں شکلوں کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

البتہ تیسری شکل کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ جو کچھ من، دو من، دس من کھیت میں پیدا ہو، اس کا ثلث یا نصف بانٹا جائے۔ اس میں کاشتکار کے نقصان کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کو گھر سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ اگر کچھ پیدا نہ ہو تو تخم اور محنت دونوں اس کی ضائع ہو سکتی ہیں۔ مگر زمیندار کی زمین بھی چونکہ اس کی کاشت کی وجہ سے بے کار رہی۔ اس لئے گونہ معاملہ برابر برابر سا ہو جاتا ہے۔ پھر بھی آئمہ اسلام میں اکثر کا اسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ ایسی صورت میں تخم بھی زمیندار ہی کو دینا چاہیئے۔ مغنی میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان المزارعۃ انما تصح اذا | کھیتی کا معاملہ اسی وقت درست ہو سکتا |
| کان البذر من رب الارض | ہے جب تخم مالک زمین (زمیندار) کا ہو اور |
| والعمل من العامل نص | محنت کاشتکار کی۔ امام احمدؒ نے اسی کی |
| علیہ احمد فی روایۃ جماعۃ | تصریح فرمائی ہے جیسا کہ ایک جماعت کی |
| واختارہ عامۃ الاصحاب | ان سے روایت ہے اور عام اصحاب احمدؒ نے |
| وھو مذھب ابن سیرین | اسی کو اختیار کیا یہی ابن سیرینؒ اور امام |
| والشافعی واسحاق! | شافعیؒ اور اسحاقؒ کا مذہب ہے۔ |

وجہ اس کی یہ لکھی ہے کہ:۔

ان یکون راس المال کلہ من عند احد ھما! | تاکہ کل سرمایہ (زمین وتخم) دونوں میں ایک ہی کا ہو!
---|---

اگرچہ کچھ لوگ یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ تخم بھی کاشتکار کا ہو تو کچھ حرج نہیں۔

**نقدی طریقہ زیادہ مفید ہے**

بظاہر یہ صورت ہر دو فریق کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ مگر عملی تجربہ بتاتا ہے کہ عموماً بٹائی کی اس شکل میں کاشتکار جی لگا کر زمین میں محنت نہیں کرتا۔ وہ بے چارہ یہ خیال کرتا ہے کہ جوتنے، بونے، پانی دینے، گھاس اکھاڑنے کاٹنے دانہ نکالنے وغیرہ کا سارا کام تو میں کروں گا۔ یا کوئی قیمتی غلّہ اس میں لگاؤں گا تو اس کا بھی کیا حاصل۔ اس لئے کہ میری محنت کا ایک بڑا حصّہ زمیندار محض اس لئے لے جائے گا کہ اس کی زمین ہے۔ اولاً یوں ہی یہ حصّہ جو اس کا کمایا ہوا ہے۔ دیتے ہوئے جبر گذرتا ہے۔ ثانیاً وہ جانتا ہے کہ میری زیادہ محنت یا زیادہ قیمتی پیداوار سے کیا نفع کہ اس محنت کا بڑا حصّہ تو دوسرے کے گھر پہنچے گا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بٹائی کی زمینوں پر ان ہی وجوہ سے کاشتکار کبھی پوری تندہی سے محنت نہیں کرتے، بلکہ ایک اور طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ بہت سی زمین مختلف زمینداروں سے لے کر کاشت کر لیتے ہیں۔ پوری توجہ کسی پر نہیں کرتے سمجھتے ہیں کہ ہوا تو خیر ہمیں کچھ تو مل جائے گا اور نہ ہوا تو ہمارا کیا بگڑے گا۔ خصوصاً جب ان فقہاء کی رائے اختیار کی جائے جو تخم بھی زمیندار کے سر ڈالتے ہیں۔ کاشتکاری کا یہ بڑا اہم راز ہے جو براہِ راست اس کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کو شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ کاشتکاروں کے لئے بہترین اطمینان بخش شکل نقدی بندوبست کی ہے۔ یعنی فی بگیھ کوئی معین رقم طے کر کے اس کو زمین دے دی جائے۔ ایسے کھیتوں پر کاشتکار پورا زور لگا دیتا ہے کیونکہ رقم تو اس کو بہرحال دینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع ہم زمین سے اٹھا سکتے ہوں اس میں کمی نہ کریں۔ بجائے ایک فصل کے دو دو تین تین فصل تک ایک ایک کھیت سے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ جس کھیت سے بٹائی کی صورت میں کاشتکار تین چار من غلّہ بھی سالانہ پیدا نہیں کرتا تھا۔ نقدی کی صورت میں اسی کھیت سے دو دو سو، تین تین سو روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی قیمت کی چیزوں کی کاشت کرتا ہے۔

بہرحال یہ تو کاشت اور اس کی بندوبست کے مختلف طریقے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے

عرض کیا۔ یوں تو بٹائی کی مذکورہ بالا شکل عام علمائے اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ مگر حدیثوں کے دیکھنے سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جب عموماً صحابہؓ میں بٹائی کا طریقہ مروّج تھا اور بقولِ امام بخاریؒ:-

| | |
|---|---|
| ما بالمدینۃ اہل بیت | مدینہ میں شاید ہی کوئی گھرانا ہوگا |
| الا ویزرعون علی الثلث | جس میں تہائی اور چوتھائی پر کھیتی |
| والربع۔ | نہ ہوتی ہو! |

اور بخاری ہی میں ہے:-

| | |
|---|---|
| وزارع علی وسعد بن مالک | اور حضرت علی، حضرت سعد بن مالک |
| وابن مسعود وعمر بن | وابن مسعود، وعمر بن عبدالعزیز، قاسم |
| عبدالعزیز والقاسم وعروۃ | اور عروہ اور حضرت ابوبکر کے گھرانے |
| وآل ابی بکر وآل عمر وآل | والے، حضرت عمر کے گھرانے والے |
| علی وابن سیرین وقال | حضرت علی کے گھرانے والے، اور |
| عبدالرحمٰن بن الاسود | ابن سیرین سب ہی کاشت بندوبست |
| کنت اشارک عبدالرحمٰن | کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن اسود |
| بن یزید فی الزرع۔ | لکھتے ہیں کہ میں عبدالرحمٰن بن یزید |
| (البیہقی ص ۱۳۰ ج ۲) | کے ساتھ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ |

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عہدِ صحابہؓ میں کاشت کاری کا رواج کس پیمانہ پر تھا۔ وہیں اس سے بٹائی پر کاشتکاری کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کو ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخفی انشارہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہی رافع ابن خدیج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کا گھرانا مدینے کے سب سے بڑے کاشتکاروں کا تھا۔ ان سے ایک روایت عہدِ صحابہؓ میں مشہور ہوئی۔ جس کے الفاظ مختلف ہیں۔ ایک طریقہ اس کا درج کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

| | |
|---|---|
| انما یزرع ثلاثۃ رجل لہ | کھیتی تین ہی قسم کے آدمی کر سکتے ہیں ایک |
| ارض فہو یزارعہا ورجل | تو وہ جس کی زمین ہو اور اس میں کھیتی |

| | |
|---|---|
| منع اخاہ ارضا فہو یزرع | کرے ۔ دوسرا وہ جسے اس کے بھائی |
| درجل اکتری بذھب | نے زمین دی ہو اور وہ اس میں کھیتی کرے |
| وفضة | تیسرا وہ آدمی جو زمین کو سونے یا چاندی |
| (الطحاوی) | کے معاوضہ میں کرایہ پر لے ۔ |

حضرت رافع نیز حضرت جابر بن عبد اللہ دونوں صحابیوں سے اس باب میں اس قسم کے الفاظ مروی ہیں۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو یا اس میں وہ خود کاشت کرے اور اگر خود نہیں کرتا تو پھر اس کے لئے کل دو صورتیں ہیں۔ یا تو اپنے کسی بھائی کو مفت کاشت کرنے کے لئے دے دے، اور یہ بھی پسند نہ ہو تو سونے چاندی کی شکل میں اس کا کرایہ لے ۔ یعنی نقدی بندوبست کر دے ۔ جس کے معنی یہی ہوئے، کہ بٹائی کی مذکورہ بالا شکل کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ جس طرح پسماندہ سرمایہ کو قرض میں دلا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرات کی مدوں میں ایک جدید مد کا اضافہ فرمایا ہے ۔ اسی طرح زائد زمین کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے ایک نئے باب کو کھولا ہے ۔ جس سے شاید دنیا اب تک ناواقف ہے ۔ ٹھیک جس طرح قرض کی صورت میں مقروض سے کسی قسم کے نفع اٹھانے کی ممانعت کر دی گئی ہے ۔ اُسی طرح زائد زمین جو بطور حُسنِ سلوک کے دی گئی ہو، اس سے نفع اٹھانے کی ممانعت ہے ۔ ان ہی رافع سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر ہم زمین میں کچھ نہ بوئیں اور نہ کسی کے ساتھ نقدی بندوبست کریں اور کسی دوسرے نے اس میں کاشت کی ۔ پھر اگر ا۔

| | |
|---|---|
| وھب لی من نباتھا شیئًا | اس کی روئیدگی سے مجھے کچھ حصہ دے، |
| آخذہ قال لا (الطحاوی) | کیا میں اسے لے سکتا ہوں؟ بولے نہیں! |

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

| | |
|---|---|
| قال کان لرجال من فضول | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے |
| ارضین علی عھد رسول | میں بعض لوگوں کے پاس زائد از ضرورت |
| اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | زمینیں تھیں ۔ عموماً لوگ نصف تہائی |
| فکانوا یواجرونھا علی | یا چوتھائی پر اپنی زمینوں کو بندوبست |
| النصف والثلث والربع | کر دیا کرتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ |

| | |
|---|---|
| فقال رسول اللہ صلی اللہ | علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین |
| علیہ وسلم من کان لہ | ہو اس میں وہ خود کاشت کرے |
| ارض فلیزرعہا او یمنح | ورنہ پھر اپنے کسی بھائی کو دے دے |
| اخاہ فان ابی فلیمسک[1]! | اور اگر اس سے وہ انکار کرتا ہے |
| (طحاوی) | تو پھر رُک جائے! |

(فضول ارضین) یعنی زائد از کاشت زمین اگر زمیندار کے پاس ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آخرت کے لئے اس میں کاشت کرائے اور ثواب کی خدا سے توقع کرے، اور یہ نہ ہو سکے تو جیسا کہ حضرت رافع سے مروی ہے۔ زمین کو نقدی بندوبست کر دے۔

**مساقات** اور یہ حال تو زراعت یعنی کاشت کا ہے۔ قریب قریب یہی نقطہ نظر اسلام میں "مساقات" یعنی باغات اور تاکستانوں کے متعلق ہے، کہ عموماً فقہاء یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ مالک باغ کسی کو اپنا باغ اس شرط سے بندوبست کرے کہ جو کچھ پھل آئے، نصف وثلث کے حساب سے تقسیم کر لیا جائے گا۔ البتہ مالک باغ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ کوئی متعین حصہ پھلوں کا، مثلاً یہ کہ چار سو آم، یا دو ہزار جام[2] اس معاملہ سے مستثنیٰ رہیں گے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے باغ میں اسی قدر پھل آئے۔ پھر بے چارے باغ لینے والے کو اپنی محنت کا کیا صلہ ملے گا۔ وہ سال بھر اس میں پانی دے گا۔ درختوں کو چھانٹے گا حفاظت کرے گا اور مالک باغ اس ناجائز شرط کی بناء پر پوری آمدنی اُس کی لے لے گا۔

لیکن باوجود اس عمومی جواز کے خصوصیت کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مشہور اماموں میں ایک ایسے امام گذرے ہیں جو کاشت ہو، یا باغ، یعنی زراعت ہو یا مساقات

---

[1] ان دونوں حدیثوں کے سوا حدیث کی کتابوں سے اور بھی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کو آدمی خود جوتے یا بلا کرایہ کسی کو دے دے یعنی یہ بات کہ نقدی بھی کچھ نہ لے۔ بعض حدیثوں میں اس پر "ربوا" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمینداروں کے اس طبقہ کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت دوسروں کو دیتے ہیں۔ بلکہ زمین کا کرایہ بشکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں، کیا اسلام اس طبقہ کو ختم کر دینا چاہتا ہے، یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے ۱۲ ر

[2] بعض علاقوں میں جام "امرود" کو کہتے ہیں ۱۲

دونوں صورتوں میں بٹائی کے طریقے کو ناجائز قرار دینے پر مُصر ہیں۔ ان کا مذہب اس باب میں نہایت تعجب سے یہ نقل کیا جاتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان لا یجوز المساقاۃ | باغبانی کا معاملہ اور کاشتکاری کا معاملہ |
| ولا المزارعۃ الا بالدراہم | ہر دو صورت کے جواز کی شکل اس کے سوا |
| والدنانیر وما اشبہھما | نہیں ہے کہ ان کو درہم و دینار (نقدی) |
| (طحاوی) | کی شکل میں بندوبست کیا جائے۔ |

اب تک تو دُنیا نے امام کے اس خیال پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے دونوں شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابو یوسف تک کے متعلق طحاوی کو لکھنا پڑا کہ:۔

| | |
|---|---|
| واما ابو یوسف ومحمد | لیکن ابو یوسف اور محمد بن حسن دونوں |
| بن الحسن رحمہما اللہ | کے دونوں (غیر نقدی شکل کے سوا بھی ان |
| قد ذھبا الی جوازھما | معاملات کے جواز کے قائل ہیں یعنی بٹائی |
| جمیعا. | پر بھی معاملہ ہو سکتا ہے! |

مگر اب شاید دُنیا کی آنکھیں کھُل رہی ہیں۔ بٹائی سسٹم نے کتنی زمینوں کی زرخیزیوں کو روک رکھا ہے۔ اس اندیشے سے جو کچھ بویا جائے گا اس کے بڑے حصّے کا مالک زمیندار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ زمینداری اور کاشتکاری کے معاملات سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ کسانوں کی ہمتوں کو اس چیز نے کتنا پست کر رکھا ہے۔ کہ مذکورہ بالا خوف سے نہ کھیتوں پر پوری محنت کرتے ہیں، نہ قیمتی پیداواروں کے لگانے کی ان میں جراٴت[1] ہوتی ہے۔

---

[1] موجودہ زمانے میں اس صورت حال کو دیکھ کر زمیندار جب چاہتا تھا، کسان کو بے دخل کر سکتا تھا اور اس پر لگان بھی بڑھا سکتا تھا۔ ایک تجویز سوچی گئی اور کچھ دن سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ کہ کم از کم کسانوں کو بے دخل کرنے کا اختیار زمیندار کو نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے، کہ اب کسان جو یہ کرنے لگے ہیں کہ کچھ خود برتتے ہیں اور کچھ دوسروں کو نفع کی شرکت کی شرط پر بندوبست کر دیتے ہیں یا بعض تو باوجود کاشت کار ہونے کے کچھ زمین دُوسرے کسانوں سے آباد کراتے ہیں۔ جو خوف بے دخلی کا زمیندار سے کسان کو رہتا تھا وہی دغدغہ اب کسان کے کسان کو اصلی کسان سے رہتا ہے۔ پس اگر یہ حل زمینداروں کے تباہ کرنے کے لئے سوچا گیا تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کسانوں کی (باقی صفحہ آئندہ پر)

خدا کی زمین اپنی سرسبزی اور شادابی اور اپنی نفع بخشی میں بہت آگے بڑھی ہوتی اگر امام کے اصول کو مان لیا جاتا۔ تاہم جیسے جیسے صنعتی کارخانوں سے مزدور و سرمایہ کا سوال آگے بڑھ کر اب زراعتی مزدور و سرمایہ داروں کے درمیان اہمیت حاصل کر رہا ہے اسلام کے معاشی اصول بھی اپنے مقاصد سے نقاب الٹ رہے ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ چل کر دُنیا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ پر یعنی

| | |
| --- | --- |
| من کانت لہ ارض فلیزرعھا | جس کے پاس زمین ہو۔ وہ اس میں |
| او لیمنع اخاہ فان ابی | خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو جوتنے |
| فلیمسک۔ | کے لئے دے دے اور اگر وہ اس سے |
| | انکار کرے تو پھر چاہئے کہ روک رکھے! |

یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ بے ضرورت جو لوگ زمینوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ نہ خود اسے آباد کرتے ہیں نہ ملک کے دوسرے ضرورت مند افراد کو اس سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہیں آخر یہ سوال کب تک معمّہ بنا رہے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق ابھی اور بھی کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں ممکن ہے کہ اس کے متعلق بعض اجزاء کا ذکر حکومت کی آمدنی کے ذیل میں بھی آئے،

---

بقیہ صفحہ گذشتہ سے ہمدردی میں ایسا کیا گیا ہے تو آخر اس ہمدردی کا مستحق کسان کا کسان کیوں نہیں ہے۔ بالفرض وہی حق کسان کے کسان کو بھی دے دیا جائے جو آج زمیندار کے مقابلے میں کسان کو بعض صوبوں میں حاصل ہے تو اگر یہی حرکت کسان کے کسان بھی کرنے لگیں یعنی دوسروں سے کھیت آباد کرائیں، اس وقت کیا ہوگا۔ آخر دور و تسلسل کے قصّہ کو کہاں ختم کیا جائے گا۔ نیز مختلف افراد میں زمینوں کی مختلف مقدار کے آباد کرنے کی صلاحیت مختلف وجوہ سے مختلف ہوتی ہے مثلاً سرمایہ کی زیادتی، یا گھرانے کا بڑا ہونا اسلئے ہر کسان کیلئے کھیت کی مقدار معین کرنا بھی ملک پر ظلم ہوگا۔ میرے خیال میں تسلسل کے اس قصّہ کو چھیڑنا ہی غلط تھا۔

# حکومت کی آمدنی

## اور

# اُس کے مصارف و اغراض

حکومت کی آمدنی پر بحث کرنے سے پہلے دراصل غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے زور سے سرکاری خزانوں میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے اغراض کیا ہیں یا کیا ہونا چاہئیں۔

جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کبھی تو یہ آمدنی محض اس لئے جمع کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے زمین کے کسی حصہ پر کسی ذریعہ سے اپنا ایسا اقتدار قائم کر لیا کہ عام باشندوں سے ان کے مطالبوں کا انکار جان و مال کے لئے خطرہ بن جاتا ہے اب ان کا نام خواہ کچھ رکھ لیا جائے، راجہ یا بادشاہ، یا کنگ یا کچھ اور۔ بہرحال محض ان کے اور ان کے اعزہ و اقربا حوالی و موالی کے عیش و آرام کا مہیا کرنا ہی ان کی حکومت کی آمدنی کی غرض ہوتی ہے۔ حکومتی آمدنی کے متعلق تنگ ترین نقطۂ نظر جو ہو سکتا ہے۔ وہ یہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ دُنیا نے اس کا تماشا اکثر دیکھا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر جو نصب العین اس آمدنی کا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آمدنی کو دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور آمدنی پیدا کرنے والوں کو اطمینان و فراغت کے ساتھ دولت کی پیدائش میں مشغول رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ بھی اس آمدنی سے پوری کی جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہئے کہ شاہی مصارف کے سوا

کشوری (مثلاً عدالت، پولیس) اور فوجی مدات پر خزانہ کا روپیہ صرف کیا جائے۔ پہلی غرض سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری غرض اپنے اندر زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وسعت کی بھی آخری غرض وہی ہوتی ہے کہ راجہ یا بادشاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے عیش و آرام میں خلل واقع نہ ہو۔

اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر تیسرا نصب العین یہ ہے کہ علاوہ مذکورۂ بالا اغراض کے عام باشندوں کی مشترک ضروریات مثلاً صحت و تعلیم، طریقۂ مواصلات (سڑکیں ریلوے، پوسٹ، ٹیلی گرام) وغیرہ اغراض پر بھی حکومت کی قوت سے جمع کردہ رقم صرف کی جائے۔ غالباً اس زمانہ کی مہذب ترین حکومتوں کی آمدنی کا یہ بلند ترین نصب العین ہے۔ جو قائم کیا جاسکتا ہے، یا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ بعض حکومتیں عملاً بھی حاکمانہ اغراض کی تکمیل کے لئے نہیں، بلکہ محض محکوموں کی رفاہیت اور خیر اندیشی کے لئے اپنی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسی کو خیال کرتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام طور پر حکومتوں کی آمدنیوں کے اغراض اس زمانہ تک عموماً مذکورہ بالا نصب العینوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خواہ وہ حکومت قومی ہو، یعنی اپنی قوم پر ہو یا کسی دوسری قوم پر۔

کیا حکومت کی آمدنی کے اغراض اس سے آگے بھی کسی وسعت نظری کو مقتضی ہیں؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مندرجۂ بالا اغراض کے سوا جب یہ واقعہ ہے، کہ ہر حکومت اپنے محروسہ و مقبوضہ علاقہ میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو بسائے رکھتی ہے، اور ان ہی آبادکاروں کی محنت و جانفشانی کی بدولت ایک ایک پیسہ دو دو پیسے اکٹھا کر کے کروڑوں روپے کا خزانہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ اور جب اس زمانے میں کم از کم یہ مان لیا گیا ہے کہ اقتداری قوت خواہ شخصی یا خاندانی رنگ میں ہو، یا کسی جتھے اور ٹولی کی شکل میں ہو۔ ان کے عیش و آرام بنگلے و محلے کے سوا حکومت کی آمدنی کا مصرف رعایا کی سہولتوں کا بھی بہم پہنچانا ہے۔ اسی لئے تعلیم و صحت وغیرہ کو بھی اب حکومتوں نے اپنے موازنوں کا جزو بنا لیا ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری خزانے جن غریبوں کی پیشانیوں کے پسینے کے قطرے قطرے سے سمندر بنتے ہیں۔ کیا ان کی ضرورتیں ان ہی عام ملکی ضرورتوں تک محدود ہیں جن سے محکوموں کے ساتھ ساتھ حاکموں کو بھی نفع پہنچتا ہے۔ سڑکوں پر اگر غریبوں کے چھکڑے اور بنڈیاں چلتی ہیں تو اقتداری قوتوں کی موٹریں اور جوڑیاں بھی تو آخر

ان ہی سے گذرتی ہیں۔ جن ہسپتالوں سے غریبوں کو دوائیں ملتی ہیں ان ہی کے سرجنوں اور نائب سرجنوں سے حاکمانہ دائروں کو بھی تو میڈیکل ایڈ" وقت پر میسّر آتا ہے، اور جن کالجوں اور اسکولوں میں ملک کی عام رعایا کے بچے خواہ کسی قیمت پر بھی ہو علم حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی سے حکومت کو اپنی مختلف مشنری کے لئے پُرزے بھی مہیّا ہوتے ہیں یقیناً ملک کے آبادکاروں کی ضرورتیں ان ہی مشترک اور عام ضرورتوں تک محدود نہیں ہیں۔

آخر ان ہی میں آئے دن کتنے بچے یتیم ہوتے ہیں، کتنے جوان بوڑھے ہو کر بے کار ہوتے رہتے ہیں، کتنی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں، کتنے تاجر نقصان اور خساروں میں مبتلا ہو کر دیوالیہ بنتے رہتے ہیں، اور سب سے آخر میں یہ کہ کتنے کاشتکار، غریب کاشتکار آفاتِ ارضی و سماوی میں شکار ہو کر قرض و وام کے بوجھ کے نیچے دب کر کراہتے رہتے ہیں کتنے جوان باوجود تلاشِ معاش کے بیروزگار پڑے پھرتے ہیں۔

کیا ان غریبوں کی یہ ضرورتیں ضرورتیں نہیں ہیں، یا ان کا حال قابلِ رحم نہیں ہے، وہی اپنی کمائی سے حکومت کے خالی خزانوں کو معمور کرتے ہیں، لیکن جب یہ بیچارے خالی ہوتے ہیں تو ان پر ترس کھانے والا کوئی نہ ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ ملک کی یہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جو (محکوم و حاکم کی) ان مشترکہ ضرورتوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ جن کا نام آج رفاہاتِ عامہ وغیرہ ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے بلند بانگ دعووں والی حکومتوں نے بھی کھُل کر اس سوال کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کہ حکومتوں کی موجودہ آمدنیاں اتنی کافی بھی نہیں ہوتیں جو حاکمانہ قوتوں کے عملوں اور بنگلوں کی تکمیل کے بعد اتنا بچا سکتی ہوں جس سے مشترک ضرورتوں کے سوا ملک کی ان شدید ضرورتوں پر بھی باضابطہ منظم شکل میں کچھ خرچ کر سکتی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی انجمن ہائے امداد باہمی کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں۔ تاکہ ملک کے مقروضوں کا کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں بیمہ کمپنیوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور بیمہ کے ایجنٹ شہر بہ شہر، گاؤں گاؤں میں پھر پھر کر مرے ہوئے باپوں کی لاشوں کے سامنے یتیموں اور بیواؤں کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ہر شخص کو ہول دل میں مبتلا کرتے پھرتے ہیں۔ کبھی مسئلہ بیروزگاری پر میدانوں میں یا پہاڑوں پر کمیٹیوں پر کمیٹیاں منعقد ہوتی رہتی ہیں، سوچا جا رہا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے۔ کبھی سرکاری ملازمتوں

کی نشان دہی کے لئے دفاتر قائم کر کے حکومت کے مصارف میں ایک اور جدید مصرف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

سردست مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ تدبیریں واقعی مفید ہیں یا بے حاصل، اور نہ اُن کی بعض شکلوں، مثلاً بیمہ یا انجمن ہائے اتحادِ باہمی میں جو سُودی کاروبارِ مین دین جاری ہے۔ اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ ان ساری کوششوں سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ ملک کی ضرورتوں کا انحصار صرف ان ہی مشترک ضرورتوں میں نہیں ہے جنہیں آج "پبلک ورکس" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو انجمن ہائے اتحادِ باہمی کا جال بیمہ اور انشورنس والوں کی نوحہ خوانیوں ماتم سرائیوں، بے روزگاری اور روٹی کے ڈھنڈورں کی آخر توجیہہ کیا ہوگی۔

الحمد للہ کہ اسلام نے جس وقت حکومت اور حکومت کے خزانے کی بنیاد ڈالی بنیاد ہی کے وقت ملک کی ضرورتوں کا یہ سب سے آخری سوال اس کے سامنے پہلے آیا اور اس سوال کا حل بھی اس نے سب سے پہلے نکال لیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی دعوت نے مذہبی دعوت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تنظیم کی شکل بھی اختیار کی، تو ظاہر ہے کہ نہ اس وقت ملک تھا نہ خزانہ۔ صرف اللہ کے چند بندے تھے جو اپنے ذاتی مصارف پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں اُترے (۳۱۳) سپاہیوں کو جو پہلی فتح بدر میں ہوئی، اور خواہ جنگ کی تاریخ میں یہ کتنی ہی چھوٹی جنگ کیوں نہ ہو، لیکن عالم کی تاریخ کے جتنے انقلابی فیصلہ کن معرکے ہیں اُن میں یقیناً سب سے بڑا انقلابی معرکہ یہی تھا۔ اسی جنگ نے وہ فیصلہ کیا جو بالآخر تاریخ کا ایک اہم فیصلہ بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔

اس جنگ میں سب سے پہلے ایک ہزار سپاہی اور وہ بھی غریب عرب کے بھاگے ہوئے سپاہیوں کا مسلمانوں کو کچھ سامان ہاتھ آیا اور یہی اسلامی حکومت کی پہلی آمدنی تھی حکومت کی آمدنی کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر آئندہ کیا ہونا چاہیئے۔ کیا اقتدار حاصل کرنے والوں کے عیش و آرام کا وہ ذریعہ ہے یا اور کچھ ہے حالانکہ ابھی حاصل ہی کیا ہوا تھا لیکن

ع گر بہ رُا روزِ اوّل باید کشت

قرآن نے نازل ہو کر اعلان کیا کہ:۔

| | |
|---|---|
| یسئلونک عن الانفال | لوگ انفال (جنگ سے حاصل شدہ مال) کے متعلق |
| قل الانفال للہ والرسول | پوچھتے ہیں تو کہہ دو کہ یہ اللہ کا اور رسول کا ہے |

کسی کا کچھ نہیں ہے، صرف اللہ کا ہے اور اللہ کی مرضی کی نمائندگی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اس لئے رسول کا ہے۔ اب تک جو دُنیا کا نقطہ نظر اموالِ مفتوحہ یا حکومت کی آمدنی کے متعلق تھا، اچانک بدل گیا۔ جب وہ بدل چکا تب اس اجمال کی تفصیل کی گئی۔

| | |
|---|---|
| واعلموا انما غنمتم من | اس کو جان لو کہ تم نے جو کچھ غنیمت |
| شئی فان للہ خمسہ و | میں حاصل کیا تو اللہ اور رسول اور |
| للرسول ولذی القربی | قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور |
| والیتامی والمسٰکین وابن | مسافروں کے لئے اس میں پانچواں |
| السبیل۔ | حصّہ ہے! |

یعنی جنہوں نے لڑائی میں کام کیا ہے، ان کو بھی، ان کا خدا ہی حصّہ دے گا۔ لیکن آئندہ سے قانون بن گیا کہ اس راہ سے جو آمدنی ہوگی اس میں سے پانچواں حصہ حکومت لے لے گی باقی سپاہیوں پر تقسیم کردی جائے گی۔

حکومت کے خزانے میں جو یہ پانچواں حصّہ جمع ہوگا اس کا مصرف کیا ہوگا حالانکہ شدید ضرورتیں تھیں۔ تنہا اسلام مٹھی بھر مددگاروں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا سارا عرب مشرکین یہود، نصاریٰ حتیٰ کہ رومی اور ایرانی حکومتیں جو کرۂ زمین کے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اُس وقت رکھتی تھیں، سب کی نگاہیں مدینہ کی اس دعوت و تنظیم پر لگی ہوئی تھیں اور دُنیا کی حکومتیں جس مسئلہ کو اب تک سوچ ہی نہیں سکی ہیں یا سوچ رہی ہیں تو عمل نہیں کرسکتی ہیں۔

تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پھر پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، پانچوں میں صرف ایک حصّہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لئے مختص کیا گیا جس کے ذریعہ سے یہ اقتدار حاصل ہوا تھا۔ یعنی رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ایک حصّہ آپ کے جاں نثار رشتہ داروں کے لئے جنہوں نے مکّہ سے مدینہ تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا تھا۔ باقی تین حصوں کو بجائے کشوری و فوجی مصارف کے ملک کے الیتامی والمساکین و ابن السبیل (مسافروں) کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اور یہ تو شروع میں ہوا۔ پھر جب کل پندرہ بیس سال

کے قلیل عرصہ میں اسی تین سو تیرہ آدمیوں والی جنگ کی فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت یا زنطینی حکومت کا اکثر حصہ سما گیا تو فرعون بنانے والی زمین کے حامل اور کلاہ کو کج کر دینے والی دولت مدینہ والی حکومت کے خزانے میں سمٹ سمٹ کر آنے لگی۔ تو کیا اُس وقت بھی یہ اصُول فراموش کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب بتدریج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اقتدار عرب میں بڑھنے لگا اور عرب کے قبائل مختلف طریقوں سے آپ کے زیر اثر آ گئے۔ مدینے کے اطراف کے یہود اور خیبر کے یہود کی زمینوں پر خدا نے آپ کو قبضہ دلا دیا۔ اور یوں مختلف ذرائع سے آمدنی کا امکان پیدا ہُوا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مبارک ہی میں ایسی صُورتیں اختیار فرمائیں جن کے ذریعہ سے اسلامی خزانہ میں دو قسم کی آمدنیاں آنے لگیں۔

(۱) ایک آمدنی تو وہ ہوئی جس کا نام خراج رکھا جا سکتا تھا۔ اور یہی بعد کو اس کا نام ہُوا اور ایک آمدنی کی مدوہ تھی جس کا نام "الصدقات" تھا۔

غیر مسلم اقوام کی زمینوں (یعنی کھیتوں اور باغوں) سے جو آمدنی آتی تھی۔ یا جزیہ کے نام سے جو محصول ان سے وصول ہوتا تھا اس کا شمار تو خراج میں تھا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی زمین، مسلمانوں کی تجارت، مسلمانوں کے مویشی (جو بطور کاروبار کے پالے جاتے تھے، اور اکثر زمانہ ان کا جنگلوں میں گذرتا تھا) مسلمانوں کی اندوختہ دولت بہ شکل سونا چاندی، ان چار ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی کا نام "الصدقات" تھا۔ پھر اسی میں غنیمت کے خمس (پانچویں) حصہ سے تیسرا حصہ بھی جو الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کے لئے مخصوص تھا وہ بھی "الصدقات" میں شریک کر دیا جاتا تھا۔

خراج کی آمدنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو تھوڑی تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں خراجی آمدنیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ حکومتوں کے تمام ظالمانہ مطالبات کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اسلامی قانون ہے کہ کسی زمین پر زیادہ سے زیادہ خراج نصف پیداوار سے زیادہ نہ لگایا جائے۔ نیز :-

| | |
|---|---|
| ان عتب علی ارض الخراج | اگر خراجی زمین کو پانی سے نقصان پہنچے |
| الماء او انقطع الماء او | یا آبپاشی کے ذرائع منقطع ہو جائیں |
| اصطلم الزرع فلا خراج | یا کھیتی برباد ہو جائے، تو ایسی زمینوں |

علیہ. (ہدایہ) سے خراج وصول نہ ہوگا!

نیز اسی طرح جزیہ سے ظاہر ہے کہ عورت بچے، بیمار، معذور، بڈھے، بیروزگار، مذہبی طبقہ مثلاً پادری، جوگی، غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے۔ صرف کاروباری آدمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ وہ بھی اگر شرعی جزیہ ہے تو اس کی کوئی مقدار معیّن نہیں۔ ورنہ یوں عموماً امراء سے تقریباً ایک روپیہ ماہوار یعنی بارہ روپے سالانہ اور درمیانی حال میں اگر کوئی مر جاتا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔ پھر جزیہ کے صلہ میں غیر مسلم رعایا کو فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا۔ ہدایہ میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| لانہ وجب نصرۃ للمقاتلۃ. | کیونکہ جزیہ اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ جنگ کرنیوالوں کی باشندوں کی طرف سے امداد ہو! |

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ای خلفاعن نصرتہ مقاتلۃ اھل الدار لان من ھو من اھل دار الاسلام علیہ نصرتہم وقد فاتت. | یعنی اسلامی قلمرو میں جو جماعت جنگی خدمات انجام دیتی ہے ان کی امداد کا کام (چونکہ غیر مسلموں سے نہ لیا جاتا تھا) اس لئے اس کے قائم مقام جزیہ کا محصول ان پر مقرر کیا گیا۔ کیونکہ جو بھی اسلامی قلمرو کا باشندہ ہے اس پر واجب تھا کہ جنگ کرنے والوں کی امداد کرے اور یہ بات چونکہ ذمیوں کے حق میں باقی نہ رہی (اس لئے) ان سے بجائے جنگی امداد کے جزیہ لیا جاتا ہے! |

خلاصہ یہ ہے کہ الخراج (یعنی جزیہ اور غیر مسلم رعایا کی زمین کی آمدنی خواہ اس زمین کو مسلمانوں ہی نے کیوں نہ خرید لیا ہو) یہ حکومت کی آمدنی کی ایک علیحدہ مستقل مد تھی اور اس کے مالک نہ خلفاء ہیں، نہ سلاطین نہ مسلمانوں کا کوئی خاص طبقہ، بلکہ جیسا کہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| الخراج[1] فیٔ لجمیع المسلمین (کتاب الخراج ۴۶) | خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے |

---

[1] فتح کے بعد جن ممالک کی غیر مسلم رعایا کا قبضہ ان کی زمینوں پر بحال رکھا گیا ہو، خواہ لڑائی سے ملک فتح ہوا ہو، یا صلح و آشتی سے اس ملک کے لوگوں نے مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر لی ہو، ان زمینوں کے مالک بھی غیر مسلم (باقی برصفحہ آئندہ)

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف کی کوئی ذاتی کتاب نہیں ہے بلکہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو دستورِ حکومت اپنے لئے اُن سے لکھوایا تھا۔ یہ وہی کتاب ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے کم از کم خلفاء بنی عباس تک وہ مسلّم تھا اور حکومت میں اس کی حیثیت قانون کی تھی۔

بہرحال خراج سارے مسلمانوں کا مال تھا۔ البتہ خلفاء اس کی آمدنی کے نگران تھے، اور اپنے صوابدید پر، جس کے وہ خدا کے پاس ذمہ دار تھے، خرچ کرنے کا اقتدار رکھتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، جیسا کہ کہہ چکا ہوں، خراجی آمدنی تھوڑی تھی۔ اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہر سال اس خراج کے تقسیم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی بلکہ جب کہیں سے خراج آ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صوابدید سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اس تقسیم میں غریب، امیر، معذور و غیر معذور سے بحث نہ ہوتی تھی۔ بلکہ استحقاق کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔

عہدِ نبوی میں خراج کی سب سے بڑی آمدنی ایک لاکھ درہم بحرین سے آئی تھی۔ اب تک کوئی باضابطہ خزانہ کا مکان بھی نہ تھا۔ مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مال ڈال دیا گیا۔ نمازِ صبح سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صوابدید سے لوگوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقسیم فرما دیا۔ اور

| | |
|---|---|
| فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وثم منہا درھم (بخاری) | اور نہ کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے اس وقت تک جب تک وہاں ایک درہم بھی باقی رہ گیا ہو |

اس تقسیم میں امیر و غریب کی خصوصیت نہ تھی۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کو بھی اس میں حصہ ملا تھا۔ حالانکہ صدقہ کا مال بنی ہاشم پر حرام ہے۔ حضرت عمر کو بھی ایک دفعہ اس کا شبہ ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آمدنی کی اس مد سے

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۔۔۔ لوگ رہتے ہیں حکومت کو صرف خراج لینے کا حق ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں میں کوئی ان سے زمین خریدے گا تو لیں گے اس کا، ایک ہو سکتا ہے لیکن اس کو بھی وہی خراج ادا کرنا پڑے گا۔ حسنؓ و حسینؓ و عبداللہ بن مسعودؓ نے خراجی زمینیں خریدی تھیں لیکن ان کو بھی خراج ہی ادا کرنا پڑا۔ ۱۲

کچھ دیا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا:۔

| | |
|---|---|
| اعطہ من ھو افقر منی | جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو اسے دے دیجئے! |

انہوں نے خیال کیا کہ شاید یہ غریبوں کا حق ہے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا

| | |
|---|---|
| خذہ فتمولہ فما جاءک | اسے لو اور اپنا مال بناؤ کیونکہ یہ مال |
| من ھذا المال وانت غیر | تمہارے پاس اس طریقہ سے اگر آئے |
| مشرف ولا سائل فخذہ | کہ تمہارے دل میں اس کی طرف لو لگی نہ ہو |
| وما لا فلا تتبعہ نفسک | اور نہ اس کے متعلق تم نے سوال کیا ہو، تو |
| | اسے لیا کرو اور جو ایسا نہ ہو تو اپنے جی |
| (طحاوی) | کو ادھر نہ لگاؤ! |

امام ابوجعفر طحاوی اس روایت کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی کہ:۔

| | |
|---|---|
| انی لم اعطک ذالک | میں نے تم کو یہ اس لئے نہیں دیا ہے کہ تم فقیر |
| لانک فقیر انما اعطیتک | اور محتاج ہو بلکہ تم کو میں نے کسی اور وجہ سے |
| لمعنی آخر غیر الفقر! | جو فقیری اور محتاجی کے سوا ہے یہ عطیہ دیا ہے! |

پھر اس جملہ کی شرح یہ کرتے ہیں کہ:۔

| | |
|---|---|
| لیس ھذا علی اموال | اس کا شمار صدقات کے مال میں نہیں |
| الصدقات انما ھذا | ہے بلکہ اس مد کا شمار ان اموال میں ہے |
| علی الاموال التی یقسمھا | جنہیں امام لوگوں میں بانٹتا ہے۔ امیروں |
| الامام علی الناس فیقسمھا | کو بھی دیتا ہے اور فقیروں کو بھی! |
| علی اغنیائھم وفقرائھم | |

طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد میں جو عطیہ و وظائف تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ وہ بھی اسی مد کی چیز تھی فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| کما فرض عمر لاصحاب | جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ |
| رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | علیہ وسلم کے صحابیوں میں اسی آمدنی کو |
| حین دون الدواوین ففرض | اس وقت تقسیم کیا جب دیوان مرتب |

للاغنياء منهم وللفقراء فكانت تلك الاموال يعطاها الاغنياء للناس لا من جهة الفقر! (طحاوی)

فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے اس وقت ان کے لئے بھی وظیفہ جاری کیا جو ان میں امیر تھے اور ان کے لئے بھی جو فقیر تھے الغرض یہ ایسی آمدنی تھی جو لوگوں کو اس لئے نہیں دی جاتی تھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہیں!

بہرحال خراج کی آمدنی چونکہ "فی لجمیع المسلمین" ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کا اس میں حق ہے۔ البتہ اب یہ امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جب مال ناکافی ہو تو کن مسلمانوں کو پہلے ترجیح دی جائے۔ اس کا فیصلہ ان کی خدمات یا دوسری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر وہ کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ آیا تو آپؓ نے پہلے ان لوگوں کو ترجیح دی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراجی آمدنی سے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور باقی کو

قسمها بالسويه على الصغير والكبير والحر والمملوك والذكر والانثى (الخراج لابی یوسف)

پھر سب میں برابر بانٹ دیا۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، غلام ہوں یا آزاد، مرد ہوں یا عورتیں!

کہا جاتا ہے کہ فی کس سات سات درہم اور کچھ یعنی پونے دو دو روپے کے قریب حصہ پہنچا۔ دوسرے سال خراج کی آمدنی میں فتوحات کی وسعت کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس سال بھی انہوں نے سب کو برابر برابر طریقہ ہی سے بانٹ دیا۔ اب کے بیس بیس درہم یا فی کس تقریباً پانچ پانچ روپے پڑے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس دفعہ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں۔ آخر جن کے اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ ان کے حقوق کا بھی تو لحاظ کرنا چاہیئے۔ فرمایا خدمات اور حقوق کا واقف کار مجھ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ان خدمات کا صلہ خدا کے یہاں ملے گا۔ باقی یہ آمدنی

فهذه معاش فالاسوة فيه خير من الاثرة!

(یہ تو دنیاوی زندگی گذارنے کا ذریعہ ہے) اس میں برابر برابر تقسیم اس سے بہتر ہے کہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جائے۔

معاشیات میں جو مساوات کے حامی ہیں۔ شاید ان کو خبر نہیں ہے کہ ابھی جو بات سوچی جا رہی ہے

کچھ لوگ اسے کر بھی گذرے ہیں، لیکن عہدِ صدیقی کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے مساوات کے اصول کو بدل دیا اور فرمایا کہ

| | |
|---|---|
| لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ. | جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جنگ کی اور آپ سے لڑے ان کو میں ان لوگوں کے برابر قرار نہیں دے سکتا جنہوں نے حضور صلعم کے ساتھ ہو کر جنگ کی۔ |

پھر انہوں نے خدمات و حقوق وغیرہ کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کی جو مشہور ہے۔ بدر میں جو شریک تھے ان کا سالانہ وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم یا ایک ہزار ڈھائی سو روپے سالانہ، جو بدری نہ تھے ان کو چار چار ہزار درہم سالانہ، اور اسی طریقہ سے مختلف جہات اور حیثیتوں سے انہوں نے بعضوں کا زیادہ اور بعضوں کا کم وظیفہ مقرر کیا۔ سب سے بڑا حصہ امہات المؤمنین کا تھا یعنی بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کا عطیہ اسامہ بن ولید (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے کم مقرر کیا۔ حضرت عبداللہ نے باپ سے شکایت بھی کی، جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| ان ابا اسامة کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ابیک وکان اسامة احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منک | اسامہ کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھا۔ اور اسامہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے۔ |

الغرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو مرکز قرار دے کر جو آپؐ سے جتنا، جس حیثیت سے زیادہ قریب تھا اسی قدر آپ نے اس کو ترجیح دی۔ پھر شہروں میں مدینہ سب سے زیادہ قریب تھا کہ وہی نبیؐ کا مدینہ (شہر) تھا۔ اس لئے اس کو سب پر مقدم کیا گیا۔ مدینہ کے بعد مکہ کی باری آئی۔ آٹھ آٹھ سو درہم سالانہ وہاں کے باشندوں کے نام بھی جاری ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ آمدنی جیسے جیسے بڑھتی جائے گی۔ عطایا کے دائرے کو بھی وسیع تر کیا جائے گا۔

مثلاً ابتداء میں مدینہ کے صرف بالغ مردوں اور عورتوں کے نام وظائف مقرر ہوئے

مگر جب وسعت پیدا ہوئی تو۔

للمنفوس اذا طرحته امه مائه درهم واذا ترعرع مائتین!

زندہ لڑکے کا بھی وظیفہ سو درہم اسی وقت سے مقرر کر دیا جاتا تھا جونہی ماں کے پیٹ سے جدا ہوتا۔ اور جب جوان ہو جاتا وظیفہ دو سو درہم کر دیا جاتا تھا۔

اور یہ طرزِ عمل تو خراج کی اس آمدنی میں اختیار کیا گیا تھا جو روپے کی شکل میں ہوتی تھی چونکہ بعض علاقوں سے غلہ بھی لیا جاتا تھا۔ اس لئے مدینہ والوں کے نام سالانہ غلہ کی مقدار بھی مقرر کر دی گئی یعنی فی کس سات ہزار دو سو گز مربع زمین کی پیداوار گیہوں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ ایک دفعہ خراج لائے حضرت عمرؓ نے پوچھا کتنی رقم ہے بولے "الف الف" اس عدد کو سُن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حیرت ہوئی اور فرمایا کہ۔

هل تدری ما تقول؟

تم سمجھ بھی رہے ہو، کیا کہہ رہے ہو؟

ابو موسیٰ نے کہا۔

نعم قدمت بمائة الف ومائة الف حتی عد عشر مرات!

جی ہاں، میں ایک لاکھ اور ایک لاکھ پھر دس تک اسی کو شمار کرتے گئے اپنے ساتھ لایا ہوں!

حضرت عمرؓ نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا۔

ان کنت صادقا لیوتین الراعی نصیبه من هذا المال وهو بالیمن ودمه فی وجهه.

اگر تم سچے ہو، تو اس چرواہے کو بھی اس مال سے حصہ پہنچایا جائے گا جو یمن میں ہوگا اور اس کا پسینہ ابھی چہرے ہی پر ہو!

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ چند شہروں یعنی مدینہ یا مکہ یا فوجی چھاؤنیوں کوفہ و بصرہ وغیرہ تک اس تقسیم کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، بلکہ ہر مسلمان تک اگر یہ پہنچ سکتی تو آپ کا خیال تھا کہ اسے پہنچایا جائے۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے خراج کی ساری آمدنی مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نقطۂ نظر کا اعادہ بار بار اپنے خطبوں میں بایں الفاظ

فرماتے ہیں:۔

واللہ الذی لا الٰہ الا ھو ما احد الا ولہ فی ھذا المال حق (الخراج لابی یوسف)

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جس کا اس آمدنی میں حق نہ ہو!

یعنی بات تو یہی ہے۔ لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر پہلے اُن لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے جو اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان توضیحی خصوصیات کا اظہار بھی آپ نے بایں الفاظ خود فرمایا ہے:۔

ولکنا نازلنا من کتاب اللہ عز وجل وقسمنا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فالرجل تلادہ فی الاسلام والرجل قدمہ فی الاسلام والرجل غناہ فی الاسلام والرجل حاجتہ فی الاسلام

قرآن نے جو مدارج مقرر کئے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے قرب بعد کے حساب سے جو حصہ لوگوں کو پہنچ سکتا ہو۔ اس لئے تقسیم کے باب میں آدمی کو دیکھا جائے گا اسلام میں اس کی قدامت کیا ہے۔ اسلام میں اسکی مالی وسعت کا کیا حال ہے۔ اسلام میں اس کی مالی ضرورت کا کیا حال ہے!

مطلب وہی تھا کہ قرآن مجید نے خود یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ:۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ!

فتح مکہ سے پہلے جن لوگوں نے خرچ کیا اور جنگ کی ان کے برابر وہ نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کی۔ وہ لوگ درجہ کے حساب سے زیادہ بڑے ہیں بہ نسبت ان کے جنہوں نے بعد کو خرچ کیا اور لڑے باقی ہر ایک سے خدا نے اچھی باتوں کا وعدہ فرمایا ہے!

یہ فرق مراتب تو اُن لوگوں میں تھا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد اسلام کی راہ میں جانی و مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ پھر جن لوگوں نے یہ قربانیاں کی تھیں اور جنہوں نے نہیں کی تھیں ان میں بھی قرآن نے مدارج قائم کر دیئے تھے یعنی:۔

| | |
|---|---|
| لا یستوی القاعدون من | ایمان والوں میں جو لوگ (جہاد) سے |
| المؤمنین غیر اولی الضرر | بیٹھنے والے ہیں یعنی ان کو کچھ ضرر اور دکھ نہ |
| والمجاھدون فی سبیل اللہ | تھا وہ پھر بھی جنگ میں شریک ہوئے) یہ |
| باموالھم وانفسھم فضل | لوگ ان کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے |
| المجاھدین باموالھم | اپنے مال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی |
| وانفسھم علی القاعدین | راہ میں مالی، جانی جہاد کیا ہے، جہاد کرنے |
| درجۃ وکلا وعد اللہ | والوں کو خدا نے جہاد سے بیٹھنے والوں پر |
| الحسنی وفضل اللہ المجاھدین | فضیلت عطا کی ہے اور اچھا وعدہ تو خدا کا |
| علی القاعدین اجرا | سب ہی سے ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے |
| عظیما ! | والوں پر خدا نے بڑے اجر کی فضیلت دی ہے |

پھر اسی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی بنا پر بھی قرآن ہی میں :۔

| | |
|---|---|
| یا نساء النبی لستن کاحد | اے نبی کی بیبیو ! تمہاری حیثیت عام |
| من النساء۔ | عورتوں جیسی نہیں ہے ! |

وغیرہ آیات میں اس کی جانب اشارہ تھا اور احسان مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سارے فضائل کے ثمرات کو اخروی قرار دے کہ معاشی لحاظ سے سب کو مساوی کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے معاشیاتی استحقاق میں بھی اس کا خیال کیا۔ بہرحال دونوں ہی کے اجتہاد کی صحیح بنیاد اسلام میں موجود تھی۔ مگر یہ روایت اگر صحیح ہے کہ آخر عمر میں حضرت عمرؓ نے

| | |
|---|---|
| لما رای المال قد کثر | جب انہوں نے دیکھا کہ آمدنی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے |

تو یہ آرزو ظاہر کی کہ :۔

| | |
|---|---|
| لئن عشت من ھذہ اللیلۃ | اگر آئندہ سال اسی رات تک میں زندہ رہا |
| من قابل لالحقن اخری | تو پچھلے لوگوں کو پہلے لوگوں کے ساتھ ملا |
| الناس باولھم حتی یکونوا | دوں گا، تاکہ وظیفہ میں سب برابر ہو جائیں |
| فی العطاء سواء ولکن توفی | (روایت ہے کہ) لیکن حضرت عمرؓ کی وفات |
| رحمہ اللہ قبل ذلک (الخراج ابی یوسفؒ) | اس سے پہلے ہو گئی |

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ آمدنی کی شکل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے۔ یعنی اگر آمدنی اتنی ہو کہ سب پر تقسیم کرنے کی صورت میں ناکافی ہو۔ اس وقت تو ترجیح و تفضیل پر عمل کرنا چاہئے۔ لیکن اگر سب کو کافی ہوسکتی ہو تو اس وقت حضرت عمرؓ بھی مساوات ہی کے قائل تھے۔ گویا ان کا خیال تھا کہ کماً و کیفاً مسلمانوں کا یہ مال ہر مستحق تک پہنچا دیا جائے۔ آخر جب یمن کے چرواہے تک اس مال کو وہ پہنچانا چاہتے تھے تو اس کا مطلب اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہر مسلمان کو خراج کی آمدنی کا وہ حصہ دینا چاہتے تھے۔ نیز اگر وہ دوسرے سال تک زندہ رہتے تو سب کو برابر حصہ دے دیتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

سنن بیہقی اور دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ کی ایک اور تقریر کا بھی ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا اس لئے حکم دیا کہ

| | |
|---|---|
| اجتمعوا لهذا المال فانظروا | اس مال کے متعلق طے کریں کہ آخر اس |
| لمن تردونه | کے مالک کون لوگ ہیں؟ |

(یعنی بیت المال میں جو آمدنی جمع ہوئی ہے)

لوگ جمع ہوگئے تو کھڑے ہوکر آپ نے تقریر فرمائی:۔

| | |
|---|---|
| انی امرتکم ان تجتمعوا لهذا | میں نے آپ لوگوں کو اس لئے اکٹھا کیا ہے |
| المال فتنظروا لمن تردونه | تاکہ غور کریں کہ یہ مال کس کا ہے تو میں نے |
| وانی قد قرأت آیات من | قرآن کی ان آیتوں کو پڑھا ہے یعنی اللہ |
| کتاب الله یقول ما افاء | نے جن بستیوں والوں کو اپنے رسولؐ کی |
| الله علی رسوله الخ | طرف پلٹایا ہے۔ |

اس کے بعد حضرت عمرؓ ان آیتوں کو تلاوت کرتے جاتے اور فرماتے کہ صرف ان ہی لوگوں کا نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا۔

| | |
|---|---|
| والذین جاءوا من بعدهم | اور جو لوگ آئے مہاجرین وانصار کے بعد |

اس کے بعد پھر فرمایا۔

| | |
|---|---|
| والله ما من احد من المسلمین | خدا کی قسم کوئی ایسا مسلمان نہیں ہے جس کا |
| الا وله حق فی هذا المال اعطی | حق اس مال میں نہ ہو خواہ اسے دیا جائے یا نہ |
| منه او منع حتی راع بعدن | دیا جائے حتیٰ کہ عدن میں جو چرواہا ہے اس کا بھی |
| (البیہقی ص ۳۵۱ ج ۶) | |

## خراج کے دوسرے مصارف

خراج کی آمدنی کے متعلق جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس آمدنی کا صرف یہی ایک مصرف تھا کہ مال جمع کیا جائے اور یہ قاعدہ صدیقی (یعنی مساوات) یا بہ قاعدہ فاروقی (یعنی تفضیل و ترجیح) مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ بلکہ اس آمدنی کا پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے عام کشوری و فوجی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ بالاتفاق تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| ماجباہ الامام من الخراج ومن اموال بنی تغلب وما اھداہ اھل الحرب الی الامام والجزیۃ یصرف فی مصالح المسلمین کالثغور وبناء القناطر والجسور ویعطی قضاۃ المسلمین وعمالھم وعلماءھم منہ مایکفیھم منہ ویدفع منہ ارزاق المقاتلہ وذراریھم۔ (ہدایہ) | امام (حکومت) کو جو آمدنی خراج سے ہو اور بنی تغلب کے مال سے جو ملے اور اہل عرب سے جو کچھ بطور تحفہ و ہدیہ کے اسلامی حکومت کو ملیں اور جزیہ کے ذریعہ سے جو آمدنی ہو۔ یہ ساری آمدنیاں مسلمانوں کی عام ضرورتوں پر خرچ کی جائیں مثلاً سرحدوں کی حفاظت اور دریاؤں پر پل بنایا جائے اور مسلمانوں کے قاضیوں کو ان کے عمال اور حکام و علماء کو دیا جائے جو ان کے لئے کافی ہو اور فوجیوں کے بال بچوں کی تنخواہوں پر یہ آمدنی صرف کی جائے |

جس سے معلوم ہوا کہ عدالت و فوج، پبلک ورکس (مواصلات مثل پل سڑک) وغیرہ۔ یہ تمام مصارف خراج اور متعلقات خراج کی آمدنی سے پورے کئے جائیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تعلیمات کے مصارف کی پابجائی بھی اسی آمدنی سے ہونی چاہئے۔ ابن ہمام لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ولیعطی ایضا المعلمین والمتعلمین! | پڑھنے اور پڑھانے والوں کو بھی اسی آمدنی سے دیا جائے۔ |

نیز ہمیشہ اسلامی حکومتوں نے عہد خلافت راشدہ سے آخر زمانہ تک صحت عامہ کے لئے دواخانے اور شفاخانے بھی جاری رکھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مد پر بھی اس روپے کو خرچ ہونا چاہئے

ان مشترک ضرورتوں کے بعد جو بچ رہے بچ جائے وہ مسلمانوں میں خواہ صدیقی، خواہ فاروقی اصول سے بانٹ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کو اس پر حیرت ہو۔ لیکن جب مسلمانوں کا امیر اپنے آپ کو

ما انا فیہ الا کاحدکم ـ میں تم میں نہیں، لیکن تم ہی میں کسی ایک

(الخراج) کے جیسا! (حضرت عمرؓ)

قرار دیتا ہو اور اپنے بیٹے کو مسلمانوں کے آزاد شدہ غلاموں کے خاندان والوں سے کم حصہ دینے کی اپنے اندر قوت اور ہمت رکھتا ہو تو جو کچھ کر کے دکھایا جا چکا تھا صرف وہی نہیں، بلکہ جس کا آئندہ تعہد تھا وہ بھی ہو کر رہتا، ولکن کان امر اللہ قدرا مقدورا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے آنے والے حادثہ کی طرف اشارا فرما دیا تھا کہ:۔

انکم ستلقون بعدی اثرۃ ـ تم لوگ میرے بعد بہت ترجیحی سلوک

(بخاری) کا مشاہدہ کرو گے۔

بخاری ہی کی بعض روایتوں میں اثرۃ شدیدہ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سو دیکھا گیا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوںؓ نے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل فرماتے ہوئے کہ

فاصبروا حتی تلقونی علی ـ پھر صبر کرنا حتی کہ حوض پر آ کر مجھ سے

الحوض (بخاری) مل جاؤ۔

جو کچھ ہوتا رہا دیکھتے رہے اور جن سے اسی حال میں "حوض" پر ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان سے اسی حال میں حوض پر

غداً نلقی الاحبہ ـ محمداً وحزبہ

کہتے ہوئے مل گئے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون!

بہر حال خراج و متعلقات خراج کے نام سے جو سرمایہ اسلامی حکومت کے خزانے میں جمع ہوتا تھا جیسے اس کے متعلق سچ پوچھیے تو خاص بات کچھ بھی نہ تھی۔ تقریباً اس کے اغراض وہی تھے جو عام طور پر مہذب حکومتوں کے خراج کی غرض ہوتی ہے۔ البتہ اس آمدنی کا ایک بڑا حصہ علاوہ

---

اُٹھاکر اپنے دو شعر پڑھے ... کل محمد سے اور ان کی جماعت سے صحابہ کرامؓ عموماً موت سے پہلے اس شعر کو زبان پر جاری فرماتے تھے!

رفاہیاتِ عامہ کے جو اقتداری حاکمانہ قوتوں کے رنگ رلیوں، طمطراق پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اسلام نے بجائے اس کے اس کا مصرف خود مسلمانوں کو قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان ہی کا مال ہے۔ حتیٰ کہ کشوری و فوجی ملازمین کو جو تنخواہیں ملتی تھیں بے جھجک اس کی توجیہ ہمارے فقہاء یہی کرتے تھے۔ مثلاً ہدایہ میں ہے کہ یہ خرچ اس لئے ہے کہ

هؤلاء عملتهم ونفقة الذراري على الآباء فلو لم يعطوا كفايتهم لاحتاجوا الى الاكتساب فلا يتفرغون للقتال۔

یعنی (سول اور ملٹری) دونوں محکموں کے ملازمین چونکہ مسلمانوں کے عملے اور نوکر ہیں (اس لئے) ان کو تنخواہ مسلمانوں کے مال سے ہی ملنی چاہئے اسی طرح ان کی عورتوں اور بچوں کو جو ملتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے مصارف باپ پر عائد ہوتے ہیں، اگر ان کی اولاد کو اتنا نہ دیا جائے جو ان کے لئے کافی ہو سکے تو پھر ان کو مزید کمانے کی ضرورت باقی رہ جائے گی۔ پھر جنگ کے لئے فارغ البال ہو کر اپنے آپ کو ہمیشہ تیار نہیں رکھ سکتے۔

جب "اثرہ" کا دور نہیں آیا تھا، اس وقت حکومت کے ان ملازمین کو کیا ملتا تھا۔ قاضی ابو یوسف راوی ہیں، کہ:

بعث عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه عمار بن ياسر على الصلاة والحرب وبعث عبد الله بن مسعود على القضاء وبيت المال وبعث عثمان بن حنيف على مساحة الارضين وجعل بينهم شاة كل يوم شطرها وبطنها لعمار بن ياسر وربعها لعبد الله بن مسعود وربعها لعثمان بن حنيف وقال اني انزلت نفسي واياكم من هذا

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عمار بن یاسر کو بھیجا کہ نماز اور جنگ کی نگرانی ان کے سپرد ہے اور عبداللہ بن مسعود کو قضا (عدالت) اور بیت المال (خزانہ) پر مقرر کر کے بھیجا۔ عثمان بن حنیف کو زمین کی پیمائش کے لئے مقرر کر کے روانہ کیا، ان سب کے لئے روزانہ ایک بکری نکالنے کے لئے مقرر ہوئی، عمار بن یاسر نصف اور چوتھائی اس کا عبداللہ بن مسعود کے لئے دوسری چوتھائی عثمان بن حنیف کے لئے اور کہا کہ میں نے اپنے کو اور تم کو اس مال کے

المال بمنزلۃ والی الیتیم فان اللہ تبارک و تعالیٰ قال من کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف!

حساب سے وہی خیال کرتا ہوں جو یتیم کے مال کا حال اس کے ولی کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو امیر ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے اور جو غریب ہو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

ظاہر ہے کہ یہ عطا (وظیفۂ بیت المال) کے سوا ان بزرگوں کا یومیہ (راشن) تھا لیکن فوج خزانہ، پیمائش و بندوبست تینوں محکموں کے اعلیٰ ترین افسروں کے راشن میں بھی کل ایک بکری روز اور اس پر بھی حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ:-

ما اری ارضا یوخذ منھا شاۃ فی کل یوم الا استسرع خرابھا۔

ایسی زمین (ملک) جس میں روزانہ ایک بکری (حکام) کے لئے لی جائے میں نہیں خیال کرتا کہ اس کی بربادی جلد کیوں نہ آئے۔

بلکہ اسی سے حضرت عمرؓ کے طریقۂ ذیل

کان عمر یرزق العامل بحسب حاجتہ وبلدہ۔
(الاسلام والحضارۃ العربیہ ص ۱۴۱)

حضرت عمرؓ اپنے عامل (ملازم حکومت) کی تنخواہ اس کی حاجت اور جس شہر میں رہتا ہو اس کے حساب سے دیا کرتے تھے۔

کی شرح ہو سکتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفۂ اعظم تک کے لئے یہ طے کر دیا تھا کہ بیت المال میں ان کا حق بھی

قوتہ وقوت عیالہ لاوکس ولاشطط وکسوتھم وکسوۃ عیالہ للشتاء والصیف و دابتان الی جہادہ وحوائجہ وصلاتہ وحجہ وعمرتہ و

صرف ان کی خوراک اور ان کے بال بچوں کی خوراک نہ زیادہ نہ کم، خلیفہ کا لباس جاڑے اور گرمی کے لئے۔ دو سواری کے جانور جہاد اور عام ضرورتوں، نماز اور حج و عمرہ کے لئے (بس کرتا ہے)

(الاسلام والحضارۃ العربیہ)

سے زیادہ نہیں ہے۔ تو اس کی ماتحت قوتوں تک چہ رسد۔ ایک دلچسپ واقعہ اسی سلسلہ میں

قابلِ ذکر یہ ہے جیسے مشہور راوی حدیث حضرت سعید المقری خود اپنے متعلق بیان کرتے تھے کہتے ہیں کہ میں پہلے بنی جندع جو مدینہ میں ایک خاندان تھا۔ اسی خاندان کے ایک آدمی کا غلام تھا میرے اور میرے آقا کے درمیان طے ہوا کہ اگر چالیس ہزار درم اور ہر بقر عید کے موقع پر ایک بکرا دینے کا وعدہ کروں تو مجھے وہ آزاد کر دیں گے۔ سعید کہتے ہیں کہ یہ رقم جمع ہو گئی۔ یعنی چالیس ہزار درم کما کر انہوں نے اکٹھے کر لئے اور اپنے آقا کو کہا کہ لیجئے رقم حاضر ہے۔ آزادی کا سرخط عطا ہو۔ اس شخص نے کہا کہ میں ایک ہی دفعہ سب رقم نہیں لوں گا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے قسط وار لوں گا۔ سعید کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں چلا گیا جو اُس وقت خلیفہ تھے۔ حال عرض کیا۔ آپ نے اپنے غلام یرفا کو آواز دی کہ سعید کی رقم کو خزانہ میں جمع کر دو اور سعید سے فرمایا کہ پچھلے پہر آنا۔ میں تمہارے آقا کو بلاتا ہوں۔ اگر یکمشت رقم لینے پر وہ تیار ہو گیا تو خیر، ورنہ میں خود تم کو آزادی کا سرخط لکھ دوں گا۔ سعید نے حسب حکم خزانہ میں چالیس ہزار کی رقم جمع کرا دی۔ سعید کے آقا کو خبر ہوئی تو خود دوڑے ہوئے آئے اور اپنی رقم اٹھائی اور مجھے آزاد کر دیا۔

سعید فرماتے ہیں کہ چند دن کے بعد اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے خزانے سے تم نے کچھ لیا بھی ہے؟ میں نے عرض کیا۔ جی نہیں ابھی تو مجھے کچھ نہیں ملا ہے۔ تب آپؓ نے فرمایا کہ

| | |
|---|---|
| فارجع به حتی تاخذ منا | تو ابھی واپس لے جاؤ۔ اپنی زکوٰۃ کی رقم |
| شيئا ثم آتنا بعد | پھر جب ہمارے خزانے سے تمہیں مل چکو |
| (ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۵) | تب اسے لے کر آنا۔ |

اس سے بیت المال کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے ابھی بیت المال سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ بیت المال بھی اس سے مستفید ہونا نہیں چاہتا تھا۔

**زائد محصول کے عائد کرنے کا حکومت کو اختیار**

ایسی صورت میں اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ ہر مسلمان کو بیت المال سے وظائف برابر برابر مساوی مقداروں میں تقسیم کروں گا تو کیا تعجب ہے خصوصاً جب ہمارے فقہاء بھی یہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عام مصالح یا مشترکہ ضرورتوں کے لئے حکومت باشندوں پر حسب سوابدید زائد ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے۔ جسے اصطلاحاً النوائب کہتے ہیں۔ النوائب کی

تعریف ہدایہ، باب الکفالہ میں یہ کی گئی ہے :-

| | |
|---|---|
| ما یکون بحق ککری النھر | جو محصول واقعی ضرورت کیلئے عائد کیا جائے |
| المشترك واجرة الحارس | مثلاً ایسی نہر کھودنے کیلئے جو عام مشترک ضرورت کے |
| للمحلة والموظف لتجهیز | کے لئے ہو، پہرہ دینے والوں کی تنخواہ کے لئے |
| الجیش وفداء الاساری | جو محلہ کی حفاظت کرتے ہوں اور وہ محصول |

جو فوج کی تیاری کے لئے عائد کیا جائے یا قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کیلئے حکومت کو ضرورت ہو!

مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت پڑ جائے تو اس وقت حکومت باشندوں پر جدید ٹیکس خواہ وہ ایک دفعہ وصول کیا جائے یا قسطوں پر تقسیم کر دیا جائے جائز ہے۔ اور عام پبلک پر اس قسم کے محصول کا ادا کرنا واجب ہے جس کی وجہ ابن ہمام نے یہ لکھی ہے کہ

| | |
|---|---|
| لانھا واجبة علی کل مسلم | ہر مستطیع مسلمان پر اس محصول کا ادا کرنا اس |
| موسر بایجاب طاعة اولی | لئے واجب ہے کہ اولوالامر کی اطاعت |
| الامر فیما فیہ مصلحة | ان امور میں ضروری ہے جس میں مسلمانوں |
| المسلمین (ص ۳۲۲) | کی بھلائی ہو! |

غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ حکومت کے ہر مطالبہ کی ادائیگی کو فقہاء واجب نہیں کہتے بلکہ یہ وجوب ان ہی مطالبوں تک محدود ہیں۔ جن کا تعلق مسلمانوں کی عام واقعی ضرورتوں اور ملک کے ضروری مصالح سے ہوں۔ ورنہ ہدایہ اور اس کی شرح میں اس کے بعد تصریح کر دی گئی ہے، کہ حکومت کے ایسے مطالبات جو

| | |
|---|---|
| لیس بحق کالجبایات فی | حق نہ ہوں، مثلاً جو محصول ہمارے زمانے |
| زماننا ببلاد فارس علی الخیاط | میں فارسی ممالک میں درزیوں اور رنگ |
| والصباغ وغیرھم للسلطان | ریزوں وغیرہ پر بادشاہ کی طرف سے ہر روز |
| فی کل یوم او الشھر او ثلاثة | یا ہر مہینہ یا ہر تین مہینہ میں وصول کئے جاتے |
| اشھر فانھا ظلم. | ہیں (کہ اس کا ادا کرنا ضروری نہیں) کہ یہ ظلم ہے |

شمس الائمہ سے ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ ایسے مطالبات کا نہ ادا کرنا ثواب ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :-

| | |
|---|---|
| اما فی زماننا اکثر النوائب | ہمارے زمانے میں یہ عموماً جو محصول وصول |

| | |
|---|---|
| توخذ ظلما ومن تمکن من | کئے جاتے ہیں، چونکہ یہ ظلم سے وصول |
| دفع الظلم عن نفسه فهو | کئے جاتے ہیں اور ظلم کے ازالہ کا جس کو |
| خیرله (فتح القدیر ص ۳۴۳ ج ۵) | جتنا موقعہ ملے وہ اس کے لئے بہتر ہے |

یہ تو ایک ضمنی بات آگئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خراج اور خراج کے مصارف بجز اس نقطہ نظر کے کہ وہ حکومت کی نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اس لئے مسلمانوں کی عام ضرورتوں سے جب بچ جائے تو قدرتاً بچی ہوئی رقم کو ان ہی میں بانٹ دیا جائے اس کے سوا اور کوئی اہم خصوصیت حکومت کی اس آمد کی نہیں ہے یا جی چاہے تو پیداوار کے نصف سے خراج کا تجاوز نہ ہونا۔ وصول کرنے میں حتی الوسع نرمی اختیار کرنا سیلاب یا خشکی یا کسی دوسری وجہ سے اگر فصل خراب ہو جائے تو خراج کا کم کر دینا، یا معاف کر دینا، ان باتوں کا بھی اسلامی خراج کی خصوصیات میں کوئی چاہے تو اضافہ کر سکتا ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ زبان سے تو آج تقریباً دُنیا کی اکثر حکومتیں اس کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ مراعات کی مدعی ہیں۔ پھر ایسی باتوں کے ذکر میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ یا ان معاملات میں دُنیا اگر اسلامی اصلاحات کی منت شناسی سے انکار کرنا چاہتی ہے تو اب ان سے خواہ مخواہ لڑنے کی کیا حاجت ہے۔ روم اور ایران کی حکومتوں کا کسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور اسلام نے اس میں کیا ترمیم کی۔ ایک طویل مقالہ کا مضمون ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسی "حق پوش" ہستی، جسے اسلام کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے میں معصومانہ کمال حاصل ہے۔ اس کا قلم بھی زمین کے خراج کے متعلق نہیں بلکہ اسلامی خراج کے مشہور بدنام جز یعنی "جزیہ" ٹیکس کے متعلق اضطراراً اس اعتراف پر مجبور ہوا۔

| | |
|---|---|
| والجزیة التی کانوا یتکلفون | (رومی و ایرانی رعایا) جزیہ کے نام سے |
| دفعها الی المسلمین اقل کثیر | جو رقم مسلمانوں کو ادا کرتی تھی۔ اُن |
| عن مجموع الضرائب التی کانوا | محصولوں کی مجموعی تعداد سے وہ بہت ہی |
| یودونها الی الروم او الفرس | کم تھی جو یہی لوگ روم اور ایران کی |
| (تاریخ التمدن اسلامی ج ا ص ۱۹۸) | حکومتوں کو ادا کیا کرتے تھے۔ |

بہرحال حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے تک اس کے اغراض اس سے زیادہ نہیں بڑھے ہیں کہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ اور عام ضرورتوں یا مصالح کے لئے اس آمدنی کے ایک حصہ کو مخصوص کرنا چاہئے۔ میں بتا چکا ہوں کہ خراجی آمدنی کا ایک بڑا

مصرف اسلام نے بجا ہی مقرر کیا ہے۔ پہلے بھی اس کے متعلق ہدایہ سے ایک عبارت پیش کی جا چکی ہے۔ ابنِ ہمام لکھتے ہیں کہ جو مصارف خراج کے ہیں اسی طرح :-

| | |
|---|---|
| كذا الجزية في عمارة القناطر والجسور وسد الثغور وكري الانهار العظام التي لا ملك لاحد فيها كجيحون والفرات ودجلة والى ارزاق القضاة والمحتسبين والمعلمين والمقاتلة وحفظ الطريق من اللصوص. | اسی طرح جزیہ کی آمدنی پلوں اور گذر گاہوں کی تعمیر، سرحدوں کے استحکام بڑی بڑی نہریں جو کسی کی ملک نہیں ہیں مثلاً جیحون، فرات، دجلہ سے نہریں کھود کر نکالنا، قاضیوں کی محتسبوں معلموں، فوجیوں کی تنخواہ۔ چوروں سے راستے کی حفاظت وغیرہ ان ہی مصارف میں یہ آمدنی خرچ ہوگی۔ |

(باب الجزیہ ص ۳۵۴)

گویا مواصلات (پل سڑک) محکمہ آبپاشی، عدالت، پولیس، تعلیمات وغیرہ اور فوجی شعبوں پر ان کو خرچ ہونا چاہیئے۔ اور عام طور پر دُنیا کی مہذب حکومتیں یہی کرتی ہیں۔ البتہ جو رقم اس مد کے خزانے میں بچ جائے۔ اس کو پھر اس کے حقیقی مالک کو، یعنی عام مسلمانوں میں امام اپنے صوابدید سے تقسیم کر دے۔ بس یہی ایک بات اسلام میں نئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ملک کی ایک اور بڑی ضرورت ہے جس سے کسی حال میں بھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی معذوروں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں کا مسئلہ جس کے حل کے لئے آج دُنیا مختلف شکلیں، بیمہ، انشورنس انجمن ہائے اتحاد باہمی وغیرہ کی صورتوں میں اختیار کر رہی ہے اور حکومتیں بھی کچھ ان کے ساتھ نیم دلچسپی لے رہی ہیں۔ لیکن ابھی باضابطہ اس مسئلہ کو کسی حکومت نے براہِ راست ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی ہے۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اس سلسلہ کو چھیڑا گیا تو حکومت کی موجودہ آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اور محصولات کے بڑھانے میں ملک کی عام ناراضی کا خطرہ ہے لیکن اسلام نے ٹھیک اسی وقت جس وقت پہلی آمدنی نبوّدیہ حکومت اس کے خزانہ میں آئی۔ اسی مسئلہ کو سب سے پہلے اس نے اپنے سامنے رکھ دیا۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بدر کی فتح سے غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) کی صورت میں جو پہلی آمدنی ہاتھ آئی اس پہلی آمدنی کے تین حصوں کو ملک کے اسی طبقہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ جن کے مسئلہ کو باوجود شدید احساس

کے اس وقت تک حکومتیں اپنے ہاتھوں میں لینے سے ہچکچا رہی ہیں۔ لیکن قرآن میں اُس وقت جو آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی وہ مجمل تھی۔ یعنی الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل محض ان تین قسم کے لوگوں کا نام تھا۔ لیکن جونہی اسلام کا قدم آگے بڑھنے لگا اور حکومتی اقتدار میں دن بدن اضافہ شروع ہؤا تو قرآن مجید میں حکومت کے ذریعہ سے اس حاصل شدہ اقتدار وقوت کے استعمال کا مسلمانوں کو ایک ایسے طریقہ سے روشناس کیا گیا جس سے شاید اُس وقت تک دُنیا کی حکومتیں ناواقف تھیں اور اب تک ان میں سے کسی کو حکومت کی قوت کو اس راہ میں استعمال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

تفصیل[1] اس اجمال کی یہ ہے کہ گو ملک کے غربا، فقرا، معذوروں کا مسئلہ اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا۔ لیکن ابتدا، میں (خمس غنیمت) یعنی غنیمت کے پانچویں حصہ سے جو حصہ ان لوگوں کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اس وقت اجمالاً محض اس گروہ کے تین ہی طبقہ تک بات محدود تھی۔ لیکن اب قرآن میں باضابطہ ملک کے ان معاشی حاجت مندوں کی ایک تفصیلی فہرست[2] نازل ہوگئی۔ جس کا دائرہ علاوہ ان تین جماعتوں کے چند ایسے طبقات کو محیط تھا۔ جن کی طرف شاید حاجت مندوں کے لفظ سے بھی لوگوں کا اکثر ذہن منتقل نہیں ہوتا میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن میں معاشی جدوجہد کی قوت ہی گویا ساکن اور ابھی ہوئی ہو۔ مثلاً جو یتیموں کا حال ہے کہ معاش حاصل کرنے کے لئے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے ابھی ان کا نشوونما بھی ان میں صحیح طور پر ہونے نہیں پاتا، اور جس طاقت کے وہ زیر پرورش تھے۔ اس سے بھی وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں اُبھری ہوں، لیکن

---

[1] آگے جو کچھ بیان کیا جائے گا دراصل وہ قرآن کی مشہور آیت صدقہ کی تفسیر ہوگی یعنی انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل (نہیں ہے اس کے سوا الصدقات کا مصرف کہ وہ فقرا، ومساکین کو دیا جائے اور ان لوگوں کو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو نیز الرقاب (غلاموں کے آزاد کرنے میں)، اور الغارمین (تاوان زدہ) لوگوں پر اور اللہ کی راہ میں اور مسافر پر ان ہی کا مختصر اصطلاحی نام مصارف زکوٰۃ وصدقات ہے) آئندہ اگرچہ اسی آیت کی تفصیل کی گئی ہے۔ لیکن بیان میں ترتیب وہ نہیں ہے جو قرآن میں آپ پاتے ہیں ۱۲

[2] یہ فہرست یہی آیت ہے ۱۲

بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جد وجہد کی صلاحیت ساکن ہو گئی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ حصولِ معاش کی قوتیں جن کی متحرک نہ رہی ہوں، اب خواہ یہ سکون اس لئے ہو کہ ابھی ان کی حرکت کا وقت نہیں آیا۔ یا متحرک ہو کر ساکن ہو گئی ہوں۔ بہرحال ان سب پر "المسکین" کا لفظ بولا جاتا ہے جو سکون سے ماخذ ہے۔ اور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی انتہائی سکون کی حالت میں جس کی معاشی قوتیں ہوں المسکین کے ذیل میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| من السکون کان العجز اسکنہ۔ | المسکین کا لفظ "السکون" سے ماخذ ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ عجز اور بے چارگی نے اس کو شل اور غیر متحرک ساکن بنا دیا۔ |

یا حصولِ معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود تو نہ ہوں۔ لیکن کچھ حالاتِ اتفاقی کے شکار ہو کر معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں۔ مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج و معالجہ میں کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا بیوپار کھیتی میں اسے نقصان پہنچا ہو' یا اسی قسم کے دوسرے حوادث کے جو شکار ہوئے ہوں۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کا حال تھا۔ جو مہاجرین کے نام سے موسوم ہیں کہ گھر بار' جائداد چھوڑنے پر ان کو مکہ معظمہ کے حالات نے مجبور کیا۔ اور مدینہ منورہ میں آکر انہوں نے پناہ لی۔ حوادثِ روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے والے ناداروں کو "الفقراء" کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں مہاجرین" کے ساتھ فقراء کی صفت کا استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ حصولِ معاش کے لئے جن جسمانی و عقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک' ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکروں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتوں کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے۔ دوسروں کو حیرت ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے' چاق چوبند ہوتے ہوئے یہ لکھنے پڑھنے والوں کا گروہ آخر معاشی پریشانیوں میں کیوں مبتلا ہے۔ کہ معمولی ان پڑھ جاہلوں سے زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لئے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ مجھے اس وقت تعلیم یافتوں کے اس قابلِ رحم گروہ سے بحث نہیں اور نہ اس سے کہ ان کی شکایت بے جا ہے یا بجا۔ بلکہ صرف ایک واقعہ کو بتانا ہے کہ باوجود سب کچھ ہونے کے اور سب کچھ رکھنے کے معاشی ذرائع ان پر بند

ہیں۔ یہ سب کا مشاہدہ ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ بظاہر حالات کسی کے کیسے کچھ بھی ہوں لیکن اس کے واقعی حال کا وہ کوئی صحیح معیار نہیں ہو سکتا۔ حضرت اکبر مرحوم کا شعر اس موقع پر یاد آتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ دُنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے

خدا ہی خُوب واقف ہے کسی پر کیا گذرتی ہے

اسی لئے اسلام نے جہاں ایک طرف مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام قرار دیا ہے۔ جب تک بالکل مخمصہ اور اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ

| | |
|---|---|
| قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ |
| للسائل حق وان جاء | مانگنے والے کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے |
| علی فرس (بیہقی فی سننہ) | ہی پر کیوں مانگنے نہ آیا ہو! |

کیا معلوم کہ گھوڑے سوار کی حالت کیا ہے اور وہ بے چارہ کس حال میں مبتلا ہے۔ جبکہ اس زمانے کے زیادہ تر سائیکل سواروں کے حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس فہرست میں قرآن نے پہلے تو "الفقراء والمساکین" کا ذکر کیا۔ اور دونوں الفاظ ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو مندرجہ بالا صفات سے موسوم ہوں۔ عمر بن عاص فاتح مصر رضی اللہ عنہ سے کسی نے ان الفاظ کی تفسیر پوچھی۔ بطور مثال کے ان چند طبقات

| | |
|---|---|
| العمیان والعرجان والکسحان | اندھے، لنگڑے، اپاہج اور |
| والیتامی۔ | یتیموں، |

کا ذکر کر کے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| کل منقطع بہ[1] | ہر وہ شخص (جو وجہ معاش سے) جدا ہو گیا ہو |

اور واقعہ یہ ہے کہ حاجت مندوں کے ان طبقات پر تو یوں بھی لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔ ہر قوم اور ملک کے ارباب ثروت وحیثیت ان کی امداد اپنا ایک اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں۔ اگرچہ حکومتوں نے اپنی آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے لیکن یوں بے قاعدہ طور

---

[1] سنن بیہقی ص ۱۳ ج ۷، کتاب الصدقات ۱۲

بہ غیر منظم شکلوں میں مختلف تقریبات کے سلسلہ میں یا یوں بھی ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ خوشی اور مسرت کے مواقع میں اندھوں، لنگڑوں، غریبوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیا جاتا ہے۔ یا کچھ پیسے بانٹ دیئے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نظر اس سے بھی آگے پہنچی۔ آج ابراہیم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد کرانے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کے راجواڑوں نے غلاموں کے آزاد کرنے یا کرانے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا، جب ترکوں، عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلہ میں ان کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ نظر آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضامند نہ ہوں گے بری اور بحری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈی بنانے کے طریقہ کو مسلمان نہ چھوڑیں گے۔ آخر اس پر اتفاق ہوا۔ مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا۔ شیخ الاسلام نے نحن احق بمکارم الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام میں لبیک کہا۔ خلیفہ کے دستخط ہو گئے۔ کیونکہ ظاہر ہے غلام بنانا اسلام میں نہ فرض تھا، نہ واجب، نہ سنت، نہ مستحب۔ بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی تجربات[1] کی بناء پر قیدیوں کو قتل کر دینے سے ان کو غلام بنا لینا نسبتاً آسان خیال کیا تھا البتہ چونکہ غلام ہمیشہ دشمن قوموں کے افراد ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ طبعاً نہ کیا جاتا تھا۔ جس کی داستانِ درد سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس جنگی صورت کی بناء پر اسلام نے

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑی جنگ میں قیدیوں کی ہزاروں بلکہ لاکھوں تعداد گرفتار ہوتی ہے ان کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا کہ دشمن کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ورنہ قید کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جنگ کے زمانہ میں خود اپنی فوجوں کے مصارف میں جب دشواری ہوتی ہے تو ان ہزاروں اور لاکھوں قیدیوں کا رکھنا آسان نہیں ہے۔ قتل کر دینا بے رحمی ہے پس اسی قتل کا بدل غلامی ہے۔ گویا ایک طرح کا احسان ہے کہ جو مستحق قتل تھے ان کی جان بخشی کر دی گئی اور سچ پوچھئے تو بجائے قتل کے ان قیدیوں کے زندہ رہنے کی خدائی کی صورت میں ایک صورت نکل آتی ہے۔ آج جبکہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا سے غلامی کا رواج اٹھا دیا گیا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کا مسئلہ اسی طرح پیچیدہ بنا ہوا ہے جیسے پہلے تھا۔ دشمن کی فوج کے قیدیوں سے جس قسم کے ناقابلِ برداشت کام لئے جاتے ہیں یا اندرونی طور پر ان قیدیوں کے نگران (اطباء جیسا کہ سنا جاتا ہے) مخفی طور پر جو سلوک ان کے ساتھ کرتے ہیں، اگر واقعی وہ صحیح ہیں تو میرے نزدیک ان قیدیوں کی حالت غلامی کے عہد کے قیدیوں سے زیادہ قابل رحم ہے۔ مسئلہ غلامی کی تفصیل میری کتاب "الدین القیم" کے حصہ دوم میں پڑھنا چاہئے۔ ۱۲

بھی دیکھا کہ جب دُنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کو غلام بناتی ہیں تو اس نے بھی دُشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک ان کو غلام بنا کر رکھا جائے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے۔ اور جب امن کا زمانہ آجائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں کہ بیسیوں شکلیں قانونی اور مذہبی، مثلاً کفارات وغیرہ کے ذرائع سے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں، بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بڑی اہم مد فَکُّ رَقَبَۃٍ (غلام کا آزاد کرنا) بھی قرار دیا۔ پھر معاوضہ لے کر بھی غلاموں کے آزاد کرنے کی ایک صورت جو عرب میں جاری تھی، یعنی کتابت، اس کی بھی اسلام نے ہمت افزائی کی اور عام مسلمانوں کو ان مکاتب غلاموں کی امداد پر اُبھارا۔

خیر، یہ سب تو غلامی کی راہ میں اسلام کی غیر متعین کوشش ہیں۔ لیکن آخر میں تو وہ یہ بھی کر گذرا کہ جس فہرست میں اس نے "الفقراء والمساکین" کو رکھا تھا، باضابطہ اسی فہرست میں "فی الرقاب" کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ "الرقاب" کے نیچے ایسے غلام داخل ہیں، جن کے آقاؤں نے معاوضہ لے کر ان کے آزاد کرنے کا معاہدہ کیا ہو اور جس وقت قرآن میں یہ فہرست نازل ہوئی اس وقت نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے ہر حصّہ میں آباد کاروں کے ساتھ انسانوں کا یہ گروہ بہ تعداد کثیر پایا جاتا تھا۔ جن کے مالکوں نے کہہ رکھا تھا کہ اتنی رقم اگر تم ادا کر دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی۔ مگر ان بے کسوں کے مددگار بہت کم تھے۔ تاآنکہ اسلامی حکومت نے ان کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہرحال "الرقاب" کا لفظ اگرچہ ہر قسم کے غلاموں کے لئے عام ہے۔ لیکن عموماً فقہاء امت نے "مکاتب" والی قسم ہی مراد لی ہے۔ مگر امام مالکؒ کا خیال ہے کہ :۔

| | |
|---|---|
| انھا رقاب یبتاعون من الزکوٰۃ فیعتقون ! | "الرقاب سے وہ غلام مراد ہیں جنہیں الزکوٰۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور آزاد کر دیئے جاتے ہیں" |

گویا غیر مکاتب غلام بھی اس کے نیچے داخل ہیں جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ صرف مکاتب غلاموں کے مسئلہ کو نہیں بلکہ اس عہد کے اس پورے طبقہ کو جو "غلام" طبقہ خیال کیا جاتا تھا قرآن نے اپنی اس فہرست میں داخل کر لیا ہے اور اس وقت داخل کیا جب ابراہیم لنکن جیسوں کے باپ دادا غلاموں کو درندوں سے پھڑوا کر اور ان کی جوڑیوں کو لڑا لڑا کر تڑپتی ہوئی لاشوں سے اپنی دعوتوں کی رونق بڑھاتے تھے۔

خیر اس وقت نہ سہی بعد ہی کو سہی ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے یا واقعی انسانی ہمدردی کے تحت غلاموں کی طرف حکومتوں کی توجہ ضرور منعطف ہوئی۔ لیکن ہر ایک ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی بدتر حال میں ایک اور طبقہ رہتا ہے۔ یہ اس لئے زیادہ قابلِ رحم ہے کہ اوروں کے ساتھ حکومت نہ سہی۔ عوام انفرادی طور پر حسنِ سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن اب انسانیت کے جس طبقہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ وہ بیکس مرحوم طبقہ ہے جس کو کسی زمانہ میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا۔ اور نہ ان کے ساتھ نیکی کرنی نیکی سمجھی گئی۔ میری مراد مقروضوں سے ہے۔ یہ دنیا کا وہ مظلوم گروہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک تو بڑی بات ہے۔ اس وقت تک دُنیا کی حکومتوں نے ان کے ستانے والوں اور ان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے والوں کی صرف زبانی نہیں، بلکہ قانونی امداد و اعانت کو اپنا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ ہر حکومت کی فوجی اور عسکری قوت اس لئے تیار رہتی ہے۔ کہ مقروضوں کے ذمہ قرض خواہوں کا جو دین اور مطالبہ ہے۔ صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرا دیا جائے۔ خواہ اس راہ میں اس کی ساری جائداد، گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ نیلام ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور تمدن و تہذیب کی ترقی اور روشنیوں میں یہ اندھیر کھلم کھلا اودھم مچائے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا فہرست کی گو تمام مدوں کے ساتھ دُنیا کی حکومتوں نے اب تک کسی باضابطہ نیکی کا ارادہ نہیں کیا۔ لیکن باضابطہ ظلم بھی ان حکومتوں نے روا رکھا تھا الّا ایک یہ بے چارہ مقروضوں کا طبقہ ہے کہ خدا جانے کن مشکلات میں مبتلا ہو کر قرض کے بوجھ کو لادنے پر یہ آمادہ ہوتا ہے، اور پھر ان مشکلات سے نجات تو کوئی کیا دلاتا۔ سود در سود کی زنجیروں میں ساہوکار اس کو جکڑتا چلا جاتا ہے اور حکومتوں کے سارے سوار و پیادے توپ اور بندوق سے ہر زنجیر کے جکڑنے میں اس کے معاون و مددگار بنے ہوئے ہیں حکومت پبلک کے لئے ہے، بلکہ پبلک ہی کے لئے ہے۔ اس دعویٰ کے مدعیوں کا پبلک ہی کے ایک طبقہ کے ساتھ یہ طرزِ عمل قابلِ غور ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ قرآن نے قرض کو دُنیاوی کاروبار یا معاملہ کی مد سے نکال کر ایک تو یوں ہی اس کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا۔ اور بجائے مقروض کے قرض دینے والے کے سامنے خدا نے خود اپنا ہاتھ پیش کیا۔ جس سے اس

نیکی کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ بالآخر اسی فہرست میں "الغارمین" کے لفظ کے ساتھ ملک کے قرضہ دار طبقہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ائمہ فقہ کا اتفاق ہے کہ "الغارمین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مقروض ہوں یا زراعت وتجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں ان کو نقصان پہنچ گیا ہو۔ بیت المال میں ایک مد ہر سال الغارمین کی بھی رکھی جاتی تھی۔ خصوصاً مقروضوں کے متعلق تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے زمانے ہی میں یہ اعلان فرما دیا تھا۔

| | |
|---|---|
| من ترک مالا فلورثتۃ | مرنے کے بعد جو کوئی مال چھوڑے وہ تو |
| ومن ترک کلاً فالینا! | اس کے وارثوں کا حق ہے لیکن کوئی بوجھ |
| | (قرض) چھوڑ کر مرا ہے تو اس کی ذمہ داری |
| (البخاری) | ہم پر ہے (مراد حکومت پر ہے) |

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دوسری روایت یہ بھی ہے کہ:

| | |
|---|---|
| قال رسول اللہ صلی اللہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ |
| علیہ وسلم من حمل من امتی | میری امت کے کسی آدمی پر اگر قرض چڑھ |
| دینار جہد فی قضائہ | جائے اور وہ اس قرض کے ادا کرنے کی |
| فمات قبل ان یقضیہ | کوشش کرتا رہا لیکن ادا کرنے سے |
| فانا ولیہ | پہلے مر گیا تو اس قرض کا ذمہ دار میں ہوں |
| (البیہقی فی سننہ ص ۲۲ ج ۷) | (یعنی میں ادا کروں گا) |

ان چند اہم مدوں کے علاوہ ہر شہر اور ہر آبادی میں ایک اور واقعہ بھی پیش آتا ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب معاملات کے ذرائع اتنے وسیع اور سہل نہ تھے۔ میری مراد اُن لوگوں سے ہے جو مختلف کاروبار کے سلسلہ میں اپنے ملک یا شہر، یا گاؤں سے پردیس جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں بسا اوقات مختلف حالات کے تحت کبھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ وطن میں خواہ کتنے بڑے امیر ہی کیوں نہ ہوں، لیکن پردیس میں وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چونکہ پردیسی ہوتے ہیں اس لئے کسی سے نہ ان کی جان ہوتی ہے نہ پہچان۔ ایسی صورت میں ان کی حالت نہایت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ یوں تو پہلے زمانہ میں لوگ ایسے پردیسیوں کے ساتھ

انفرادی طور پر اچھا سلوک کرتے تھے۔ خصوصاً بعض قوموں میں اس نیکی اور ہمدردی کا خاص ذوق تھا جس میں عرب کا بھی نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن جن اقوام و ممالک میں، ذات پات یا قومیت و وطنیت کا مرض شدت پذیر ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں تو اس غریب مسافر کی سخت درگت بنتی ہے بھلا جہاں اپنے ملک، اپنے وطن، اپنی نسل، اپنے رنگ کے سوا ہر دوسرے آدمی کو بجائے آدمی کے کسی جانور کا بچہ خیال کیا جاتا ہو، وہاں کے باشندوں سے کوئی پردیسی کیا توقع رکھ سکتا ہے۔ اور یہ مرض گو موجودہ مغربی تمدن کی راہ سے بہت عام اور مہلک ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قومیں اس کا شکار رہی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک ہندوستان ہی کی حالت پہلے کیا تھی۔ بلکہ اب بھی یہی ہے کہ اس ملک کے بعض طبقے اپنے سوا دوسروں کو کتوں سے بھی زیادہ ناپاک قرار دیتے ہیں جن بستیوں اور گاؤں میں صرف اس قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اب بھی جا کر جس کا جی چاہے تجربہ کر سکتا ہے کہ مسافر کی گاؤں میں شام ہو جاتی ہے۔ کسی درخت کے نیچے صبر کا پیاسا پڑا ہوا ہے۔ لیکن گاؤں والوں میں کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ ایک لوٹا پانی یا ایک لقمہ کھانے سے اس کی تواضع کریں بہرحال انسانی افراد کا یہ طبقہ بھی ہر ملک اور ہر قوم میں قابلِ توجہ تھا۔ اسی لئے قرآن کی فہرست میں "ابن السبیل" (راہ والے) مسافر کے نام سے ان کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اور اسلامی حکومت نے ان کی خبر گیری و پرسش کو بھی حکومت کا ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔

الحاصل خراج و جزیہ وغیرہ کی آمدنی تو کشوری و فوجی ضرورتوں اور رفاہات عامہ کے لئے تھی۔ لیکن جب اسلام نے انسانیت کے مصالح عامہ اور ضروریات مشترکہ کے ساتھ بنی آدم کے ان قابلِ رحم طبقات یعنی "الفقراء و المساکین و الغارمین و ابن السبیل" کے معاشی مشکلات کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور اسلامی حکومت کے بجٹ (موازنہ) میں مصارف کی فہرست میں ان کا بھی اضافہ کیا تو ظاہر ہے کہ مصارف کی پابجائی کس مد سے ہوگی۔ اس کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہئے تھا سو ہوا۔

مگر جب حال یہ ہے کہ دنیا کی حکومتوں کی آمدنیاں، فوجی اور کشوری (سول اینڈ ملٹری) ضرورتوں کے لئے بھی بسا اوقات ناکافی ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ مصالح عامہ کی مد کا اضافہ جب سے حکومتوں نے اپنے مصارف میں کیا ہے۔ اس وقت سے نئے نئے ناموں اور نئی نئی تدبیروں سے رعایا پر محصول بھی عائد ہونے لگے اور تجربہ بتاتا ہے کہ ان جدید محصولوں اور مطالبات کا خواہ کچھ بھی نام رکھ دیا جائے لوگ آسانی سے دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ عموماً جو بھی ہوتے

ہیں جبراً و قہراً حکومت کے خوف سے دیتے ہیں، لیکن اکثریت حبّ دلی سے ان کی ادائی پر آمادہ نہیں ہوتی۔

صفائی، صحتِ عامہ، تعلیم عامہ وغیرہ کے فوائد کا لاکھ فلسفہ پروفیسروں، اخبار نویسوں کتب سازوں کے ذریعہ سے بیان کرایا جائے۔ لیکن عام طور پر پھر بھی اکثریت ان کو حکومت کا جبر ہی قرار دیتی ہے۔ اس تجربہ کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا طبقات کی امداد کے نام سے پبلک پر اگر کوئی جدید ٹیکس عائد کیا جائے گا تو کوئی تعجب نہیں کہ باشندوں کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑے اور خود حکومت کی جان کے لالے پڑ جائیں۔

اسلام کے سامنے بھی یہ ساری مشکلات تھیں۔ پھر اس نے ان کے حل کی راہ کیا پیدا کی اب میں اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ حکومت کی آمدنی میں اسلام نے حاکمانہ قوتوں کا حصہ قدرِ ضرورت سے زیادہ نہیں رکھا۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی حکومت کے پہلے امام اور امیر تھے جیسا کہ بیان کر آیا ہوں حکومت کی پہلی آمدنی سے بحیثیت امام یا امیر آپؐ کو خمس کے نام سے جو حصہ ملا اس خمس سے بھی تین ثلث کو خداوند تعالیٰ نے قرآن میں "الیتامٰی والمساکین وابن السبیل" کے لئے مخصوص فرما دیا۔ باقی دو حصوں میں سے ایک حصہ آپ کے اقربا کا تھا، اور اس خمس کا خمس (یعنی پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ) صرف یہ صرف خاص مبارک ؐ کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن اس کا حال بھی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ضروریات سے جو کچھ بچ جاتا تھا اور آپ کی ذاتی ضرورتوں کا معیار ہی کیا تھا۔ جو نہ بچتا۔ اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ علانیہ بھرے مجمعوں میں اعلان فرماتے کہ۔

ما یحل لی مما افاء اللہ علیکم مثل ھذہ الا الخمس ! — خدا نے جو آمدنی اے مسلمانو، تم پر واپس کی ہیں (یعنی جن کا دروازہ تم پر کھولا ہے) اس میں خود میرے لئے بجز پانچویں حصہ کے اور کچھ لینا جائز نہیں۔

جب پیغمبر کے لئے "خمس" کے سوا کچھ حلال نہ تھا تو اسی سے دوسرے امراء و ائمہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے۔ اور

والخمس مردود فیکم — اور یہ پانچواں حصہ بھی تم ہی لوگوں پر واپس کر دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ اس پانچویں حصہ کی بڑی تعداد مسلمانوں کی عام ضرورتوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

اس فقرہ کی شرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے :۔

| | |
|---|---|
| یعنی بالخمس حقبہ من الخمس | یعنی حضور صلعم کی مراد اس سے آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔ |

بعد کو آپ کے راشدین خلفاء نے جو عملی ثبوت خود اپنی اور اپنے عمال کی زندگی کی مثالوں سے پیش کی ہیں۔ تاریخ کے اوراق ان واقعات سے لبریز ہیں۔ اور اجمالاً بعض چیزوں کا ذکر آ چکا ہے اور اسی کو میں اسلام کا ایک جدید اقدامی کارنامہ خیال کرتا ہوں۔ بنی آدم کے اس کسمپرس ماندہ طبقے جو ہمیشہ دوسروں کے سینہ کے بوجھ بنے رہے، بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام میں عملاً حتیٰ کہ کہیں کہیں قانوناً بھی افلاس و غربت، مقروضیت، دائم المریضی غلامی وغیرہ اتفاقی، غیر اختیاری مصائب کو جرم اور سرمایۂ صد رسوائی و خواری قرار دیا گیا[1] حقارت و ذلت کے بدترین سلوکوں کے جو ہمیشہ مستحق ٹھہرائے گئے ان کی باضابطہ منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لئے حکومت کا اپنی تمام عسکری اور فوجی قوتوں کے ساتھ کمر بستہ ہو جانا اور اس کو عملاً کر گذرنا غالباً انسانیت کی تاریخ میں دنیا کی حکومتیں اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتیں۔

اور صرف یہی نہیں، بلکہ اسلامی بجٹ (موازنہ) میں جدید مصارف کی ان غیر معمولی مدوں کی تکمیل و پابجائی کے علاوہ خمس کے حصول کی آمدنی کے جو ذرائع اسلام نے اختیار کئے اور حصول آمدنی کے اس سلسلہ میں جن حکیمانہ نکتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی بجائے خود کچھ کم تعجب انگیز نہیں بلکہ اسلام کی صداقت یا قدرتی قانون ہونے کی وہ ایک بین دلیل ہو سکتی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ موازنہ میں مصارف کی متعدد مدوں کا جو اضافہ کیا گیا یہ معمولی مدیں نہیں ہیں۔ مذکورہ بالا طبقات میں سے تقریباً ہر ملک میں ہر طبقہ کے ہزاروں اور لاکھوں افراد رہتے بستے ہیں۔ ان کی انفرادی مالی اعانت کا بیڑہ اٹھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ معمولی رقوم سے مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا ضرورت وافر آمدنی کی تھی۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے، یوں تو سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن شاید ان کی حکمتوں پر غور نہیں کیا گیا۔ میں ان میں سے بعض نکات اور مصالح کو نمبروار بیان کرتا ہوں

---

[1] جیسا کہ اسپارٹا (یونان) والوں کے قانون کے متعلق مؤرخین ذکر کرتے ہیں ۱۲

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موازنہ کے ان مصارف کی تکمیل کے لئے اسلام جن لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا تھا۔ ان کے لئے اس نے اس عجیب و غریب رعایت کا اعلان کیا ہے کہ جو لوگ اس محصول کے اداکرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو ان تمام مالی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ جو عموماً دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ ایک تو اسلام نے یوں ہی اپنی رعایا کو رومی و عجمی سلاطین کے ناجائز مطالبات سے سبکدوش کر ہی دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ رعایت کی حد کر دی گئی، یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا ایک قانونی اور فطری حق ہے اس سے بھی اس مد کے محصول اداکرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

(۲) حکم دیا گیا کہ جس طرح ہر قوم و ملک کے لوگ، خصوصاً جو کسی نہ کسی قسم کا مذہب رکھتے ہیں، منجملہ دیگر مذہبی امور کے آخر خیر و خیرات بھی ضرور کرتے ہیں۔ پس خیر و خیرات کی یہی مد جیسے بہر حال ہر مذہبی زندگی رکھنے والا آدمی اپنی آمدنی سے ضرور نکالتا ہے۔ لیکن اب تک اس کو لوگوں نے مبہم، غیر متعین شکل میں رکھا ہے۔ آمدنی سے نکالی ہوئی اس رقم کو اسلام ذرا متعین و مشخص شکل دے کر لوگوں سے وصول کرے گا اور بجائے اس کے کہ حاجت مندوں تک اپنی آمدنی سے بچائی ہوئی اس رقم کو لوگ انفرادی طریقہ سے پہنچاتے تھے۔ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اور اپنے صوابدید سے مستحقین تک پہنچا دے گی۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ ایک طرف حکومت کے تمام مطالبوں سے سبکدوشی بھی ہوئی اور لوگوں کی مالیات اور آمدنی پر مزید کوئی بار بھی نہ پڑا۔ بلکہ وہی چیز جسے غیر منظم شکلوں میں لوگ ادھر اُدھر بانٹ دیا کرتے تھے۔ اب منظم شکل میں تقسیم ہوگی۔

(۳) آمدنیوں سے پس انداز ہونے والی اس رقم سے چونکہ ملک کے مذکورہ بالا اتفاقی آفات و مصائب کے شکار طبقات کی امداد کی جائے گی۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ خود ان رقوم کے جمع کرنے والے یا ان کے خاندان میں سے کوئی آدمی کسی وقت خدانخواستہ ان مصائب آفات کا شکار ہو تو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ گویا جن اتفاقی مصائب و آفات کی تصویریں کھینچ کھینچ کر بیمہ کمپنی والوں کے ایجنٹ آج یہ حکم دیتے ہیں کہ ان کا خیال کر کے اپنی آمدنی سے فی صدی کچھ رقم ان کی کمپنیوں میں جمع کی جائے، یا انجمن ہائے اتحاد باہمی کے مبلغین جن اتفاقی ضرورتوں کے لئے قرضہ دوام وغیرہ کا ہول دل میں پیدا کر کے انجمن کی کسی شاخ سے متعلق ہونے کی تلقین کرتے پھرتے ہیں۔ ان ساری ضرورتوں کی کفالت خود بخود ہو جاتی ہے۔ ملک کے یتامیٰ

فقراء، مساکین، بیوائیں، مسافر، جب سب ہی کا اس میں حق ہے تو خزانہ کا روپیہ ان تمام خطرات کے وقت جیسے دوسروں کی مدد کرے گا۔ خدانخواستہ اگر دینے والوں پر یا ان کے خاندان والوں پر کسی وقت وہی مصیبت آجائے تو اس کی اعانت سے کیسے گریز کیا جا سکتا ہے۔ البتہ فرق صرف اس قدر ہے کہ بیمہ یا انجمن اتحاد باہمی یا دوسری امدادی یونینیں، جو ان ہی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر قائم ہوتی ہیں۔ ان کی جمع شدہ رقوم سے اتفاقی حوادثات کی صورت میں جمع کرنے والے یا ان کے خاندان والوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے۔ اور اسلامی تنظیم کی شکل میں اگر ان پر، ان کے خاندان پر کوئی حادثہ پیش آئے تو ان کی امداد بھی وہ کرے گا۔ اور اگر ان کے سوا ملک کے دوسرے باشندوں کو اگر ان حادثات میں مبتلا ہونا پڑے تو ان کی بھی وقت پر مدد کی جائے گی۔

علاوہ اس کے پہلی صورت میں ایک بڑی خرابی یہی ہے کہ آمدنیوں سے رقم اس لئے پس انداز کرائی جاتی ہے کہ اتفاقی حوادث کے موقع پر کام آئے گی۔ لیکن اگر اتفاقاً کیا، اکثر یہی ہوتا ہے۔ کہ ان رقوم کے جمع کرانے والے ان مفروضہ یا متوقع حوادث سے محفوظ رہتے ہیں اور خواہ ان کا پڑوسی، بلکہ حقیقی بھائی بھی کسی اتفاقی حادثہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کی بھی امداد ان رقوم سے نہیں ہو سکتی۔ گویا ملک کی یہ رقم جو باشندگانِ ملک کے ان حوادث کو پیشِ نظر رکھ کر جمع کرائی جاتی ہے، عموماً ان اغراض میں بہت کم کام آتی ہے اور جمع کرنے والے ان کو یہ آمد کر کے عموماً غیر ضروری مصارف میں پھونک دیتے ہیں۔ گویا بیمہ ہو یا انجمن ہائے اتحاد باہمی یا از قبیل دوسرے ادارہ جات ان سب کا قرآنی الفاظ میں۔

دولۃ بین الاغنیاء      تونگروں ہی میں چرخ کھاتی ہے

منکم!      وہ دولت!

ہی کی شکل میں زیادہ تر انجام ہوتا ہے۔ یعنی گھوم گھما کر اور ہر پھر کر امیروں ہی کے دائرے میں وہ سرمایہ گشت کرتا رہتا ہے۔ غریبوں کے منہ میں اڑ کر اس کی ایک کھیل بھی نہیں پہنچ سکتی وہی جو حال ملک کے اس سرمایہ کا ہوتا ہے جسے گو ملک کے اکثر افراد میں بظاہر پھیلا دیا جاتا ہے لیکن گھوم پھر کر بالآخر اصل مع اپنے تمام بیٹوں پوتوں، پروتوں کے "الاغنیاء" یا سرمایہ داروں ہی کی جیبوں میں اپنا آخری ٹھکانا بنا تا ہے۔ میرا اشارہ سود اور بیاج کی طرف ہے۔

لیکن اسلام ملک کی آمدنیوں سے جو کچھ پس انداز کراتا ہے۔ وہ بہر حال ان ہی اغراض میں

خرچ ہوتا ہے۔ جس کے لئے وہ جمع کیا جاتا ہے۔ خواہ ان اغراض کے لئے خود جمع کرانے والے اور اس کے خاندان کو ضرورت پیش آئے خواہ ملک کے کسی اور دُوسرے باشندے کو ان کی ضرورت ہو۔

(۴) اسلام یہ محصول ملک کے ہر باشندے پر عائد نہیں کرتا، بلکہ یہ تمام مطالبات محض ان لوگوں تک محدود رکھے گئے ہیں۔ جو اپنی اور اپنے زیر پرورش متعلقین کے روز مرّہ معمولی مصارف کی تکمیل کے بعد اپنے پاس کچھ پس انداز کر سکتے ہوں۔ اصطلاحاً اسی کا نام نصاب ہے اور ہر چیز کا نصاب اسلام نے جداجدا مقرر کیا ہے۔ جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہے عموماً لوگوں کو معلوم بھی ہے۔

(۵) اس کے بعد بھی یہ مطالبات ہر قسم کے مملوکات پر عائد نہیں ہوتے۔ بلکہ صرف ان چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں، جن میں عموماً بڑھنے بڑھانے کی صلاحیت ہو۔ مثلاً تجارت، زراعت بغرض افزائش نسل جن مویشیوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ یا نقد سرمایہ بہ شکل سونا چاندی ظاہر ہے کہ آدمی ان کو بڑھا سکتا ہے۔ اور ان سے آمدنی پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ آمدنی پیدا کرنے کے عام ذرائع دُنیا میں عموماً یہی نقدیں (سونا چاندی) اور ان کے سکّے ہیں۔

(۶) اس محصول اندازی میں اس کا بھی خاص طور پر بڑی احتیاط سے خیال کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں زیادہ محنت اور کدو کاوش ہوتی ہو۔ اسی نسبت سے مطالبہ میں تخفیف کی جائے۔ اور جس حد تک اس کی پیدائش میں محنت کم اور قدرتی وسائل کو زیادہ دخل ہو، محصول میں اضافہ ہوگا۔ یعنی تجارتی اموال یا سونا چاندی، یا اُن کے سکّے چونکہ ان سے آمدنی حاصل کرنے میں پُورا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ بجز سرمایہ کے سارا بار تاجر ہی پر پڑتا ہے اس لئے اس قسم کے اموال سے چالیس روپے میں ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ بخلاف کاشت کے، کہ اگر اس کی سیرابی وغیرہ میں مصنوعی ذرائع مثلاً رہٹ، چرس وغیرہ سے کام لینا نہیں پڑتا، بلکہ قدرتی بارش یا نہروں کے پانی سے سیرابی ہوتی ہے تو مثلاً دس من سے ایک من، یعنی دسواں حصہ اور اگر آبپاشی کے مصنوعی ذرائع رہٹ، موٹ، چرس وغیرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے تو بیسواں حصہ۔ اسی طرح اگر کسی کو خزانہ مل جائے (جس کی مختلف شکلیں ہیں) بہرحال خزانہ پانے کی جن صورتوں میں پانے والا قانونی طور پر اس کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ایک غیر مترقبہ شئے اس طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کہ اس میں محنت کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ اس لئے حکومت پانچواں حصہ اس سے لے گی۔ اور یہی حکم سونے، چاندی، لوہا، سیسہ، پیتل وغیرہ

کے معدنیات کا ہے۔ یعنی حکومت پانچواں حصہ لے گی۔ البتہ ایسے مویشی مثلاً اونٹ گائے بکریاں وغیرہ جن کا زیادہ وقت چراگاہ اور جنگل میں گذرتا ہو۔ یعنی عموماً جن سے افزائش نسل کا کام لیا جاتا ہے۔ اصطلاحاً انہیں "السوائم" کہتے ہیں۔ اور دُنیا کے مختلف علاقوں میں لوگ اس کا مستقل روزگار کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آباد علاقوں میں اس کا رواج کم ہے ورنہ صحرائی علاقوں کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کی گذر اوقات مویشیوں کی اسی قسم کی پرورش سے ہوتی ہے۔ اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکوٰۃِ نبوت کی روشنی میں ان میں ہر قسم یعنی اونٹ کا الگ، بیل کا الگ، بکروں دُنبوں، بھیڑوں کا الگ الگ نصاب اور جو کچھ محصول ان سے لیا جائے ان کی تعداد مقرر فرمادی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی وہی چالیسویں حصہ کا عمل ہوا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ عرب میں زیادہ تر مذکورہ بالا جانوروں ہی کی پرورش بطور ذریعہ معاش کے گلوں اور ریوڑوں کی شکل میں کی جاتی تھی۔ لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں یہی کاروبار گھوڑوں کا بھی جاری تھا۔ جیسا کہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں۔

| | |
|---|---|
| لم یکن اصحاب الخیل السائمہ | (عہدِ نبوت میں) مسلمانوں کے کسی طبقہ میں |
| من المسلمین بل اھل الابل | گھوڑوں کی پرورش کا افزائش نسل کی غرض |
| وما تقدم اذا اصحاب ھذہ | سے عموماً رواج نہ تھا، بلکہ اونٹوں اور جن |
| انما ھم اھل المدائن | اموں کا ذکر ہوا۔ ان ہی کی پرورش کا رواج |
| والدشت والتراکہ وانما | تھا۔ کیونکہ گھوڑوں کی پرورش کرنیوالے |
| فتحت بلادھم فی زمن | اس زمانہ میں یا مدائن کے لوگ ہیں یا دشت |
| عمر وعثمان | کے یا ترکمانی خرگاہوں والوں میں اس کا رواج |
| (ص ۵۰۷ ج ۱) | ہے اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ حضرت |
| | عمرؓ وعثمانؓ کے عہد میں ہوا۔ |

بہرحال جب گھوڑوں والی رعایا بھی اسلامی محروسہ میں داخل ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ ان گھوڑوں پر بھی محصول عائد کیا جائے۔ جیسا کہ دوسرے جانوروں پہ ہے۔ لیکن محصول کی مقدار کیا ہو؟ تو حنفی فقہا لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا۔

صاحبها بالخيار ان شاء
اعطى من كل فرس دينارا
وان شاء قومها واعطى من
كل مائتي درهم خمسة
دراهم (ہدایہ)

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو
اختیار ہے، چاہیں ہر گھوڑے کی زکوٰۃ
ایک دینار (اشرفی) ادا کریں اور چاہیں تو یہ
بھی کر سکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت لگا کر ہر دو
سو درم پر پانچ درم زکوٰۃ ادا کریں

جب دو سو درہم کی قیمت سے پانچ درہم کا یہاں بھی حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہی چالیسواں حصہ اس میں بھی ہوا۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً مویشیوں میں بھی چالیسواں حصہ کے اصول کو محفوظ رکھا گیا ہو، واللہ اعلم بالصواب!

(۷) عام طور سے جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے، عموماً محصول اسی وقت ان کا وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آئی ہو، بلکہ مالک ہونے کے کامل ایک سال (حولانِ حول) گذرنے کی ضرورت ہے۔ یہ عام دستور ہے۔ زراعت میں کچھ ترمیم بھی ہوئی ہے۔

(۸) نہایت شدید تاکیدی احکام اس باب میں بھی ہیں۔ کہ حکومت کی خراجی وغیرہ مدوں کی آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد کے لئے جو آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا خاص نام "الصدقات" ہے۔ اور الصدقات کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس فنڈ کی رقم کو حکومت کی دوسری آمدنیوں میں نہ ملایا جائے اور نہ ان خراجی مصارف پر اس آمدنی کا کوئی حصہ (بجز خاص صورتوں کے) ایک حبہ خرچ ہو سکتا ہے۔ قاضی ابویوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سخت تہدیدی لہجے میں بار بار پلٹ پلٹ کر یہ فتوےٰ صادر کیا ہے کہ

لا ينبغي ان يجمع مال الخراج
الى مال الصدقات والعشور
لان الخراج فئ لجميع المسلمين
والصدقات لمن سمى الله
عز وجل في كتابه.
(الخراج ص ۴۶)

جائز نہ ہوگا کہ خراج کی آمدنی الصدقات اور
العشور کی آمدنی کے ساتھ جمع کی جائے کیونکہ
خراج تو ہر قسم کے مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے
اور الصدقات تو صرف ان لوگوں کیلئے مخصوص
ہے جن کے نام کا ذکر حق تعالیٰ نے اپنی
کتاب میں فرمایا ہے۔

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک تاکید کی ہے کہ دونوں مدوں (خراج وصدقات) کے تحصیلدار بھی

الگ الگ ہونے چاہئیں، فرماتے ہیں۔

ولا یتولاھا عمال الخراج فان مال الصدقۃ لا ینبغی ان ید خل فی المال الخراج! (کتاب الخراج ص ۴۶)

بلکہ خراج کے کلکٹروں اور تحصیلداروں کے ہاتھ میں الصدقات کی آمدنی کی وصول کا مسئلہ نہ سپرد کیا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ الصدقات کی آمدنی خراج کی آمدنی میں شریک کی جائے۔

(۹) جس علاقہ، یا ضلع یا تعلقہ سے الصدقات کی آمدنی وصول کی جائے سب سے پہلے ان صدقات کے مستحق اسی علاقہ کے مندرجہ بالا طبقات کے اہلِ حاجت ہیں۔ ہدایہ میں ہے۔

ویکرہ نقل الزکوٰۃ من بلد الی بلد و انما تفرق صدقۃ کل فریق فیہم (ج ۲)

ایک شہر سے دوسرے شہر میں صدقہ کو منتقل کرنا مکروہ ہے بلکہ ہر فریق کا صدقہ ان ہی لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔

ابنِ ہمام نے کلیہ لکھا ہے کہ۔

والمعتبر فی الزکوٰۃ مکان المال

زکوٰۃ میں دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی کس جگہ سے وصول ہوئی ہے!

(یعنی جس مقام سے وصول ہوئی ہے اسی مقام کے مستحقوں میں تقسیم ہوگی)

اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث مشہور ہے کہ۔

توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم! (بخاری و مسلم)

جس علاقہ کے تونگروں اور سرمایہ داروں سے الصدقات وصول کئے جائیں اسی علاقہ کے فقراء میں وہ تقسیم کی جائے۔

حضرت عمران ابن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کسی جگہ وہ الصدقات کے تحصیلدار بنا کر بھیجے گئے۔ کچھ دن کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے پوچھا "این المال؟" (مال کہاں ہے؟) تو بولے۔

للمال ارسلتمونی اخذناھا من حیث کنا ناخذھا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضعناھا حیث

کیا آمدنی لانے کیلئے تم نے ہمیں بھیجا تھا ہم نے اس کو ان ہی مقامات سے وصول کیا جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور انکو خرچ

| | |
|---|---|
| كنا نقسمها ! | صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جہاں اس کو تقسیم کرتے تھے وہیں ہم نے اسے بانٹ دیا۔ |
| (سنن بیہقی) | |

البتہ اگر وہاں کی ضروریات سے بچ جائے تو پھر باقی ماندہ حصّہ کو "مرکز" کے خزانے میں جمع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن اور قبیلۂ طے و تمیم تک کے صدقات آتے تھے۔ بہر حال کلیہ یہی ہے کہ "الصدقات" پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے، جہاں کے اربابِ حیثیت سے وصول کیا گیا ہو۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ بعض فقہاء نے تو مختلف اصولی حدیثوں کی بنا پر اس قانون میں یہاں تک تفصیل کی ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| الافضل ان يصرفها الى اخوته الفقراء ثم الى اولادهم ثم اعمامه الفقراء ثم اخواله ثم ذوى ارحامه ثم جيرانه ثم اهل مكة. ثم اهل مصره | یہ زیادہ بہتر ہے کہ "الصدقات" کی آمدنی محصول ادا کرنے والوں کے محتاج بھائیوں میں تقسیم کی جائے پھر ان کے بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کو ہے۔ پھر محتاج چچاؤں کا حق ہے پھر ماموؤں۔ پھر عام رشتہ دار پھر پڑوسی، پھر جو لوگ اس محلہ پر رہتے ہوں، جس پر صدقہ ادا کرنے والا رہتا ہو۔ پھر اس کے شہر والے! |
| (فتح القدیر ص ۲۹ ج ۲) | |

جس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف مقام ہی کو ترجیح حاصل نہیں ہے بلکہ دینے والوں کے رشتہ داروں کو غیر رشتہ داروں پر اور رشتہ داروں میں بھی جو جتنا زیادہ رشتہ میں قریب ہو، وہ اگر مذکورہ بالا مصائب و آفات میں گرفتار ہو گیا ہے۔ تو اس مال کا وہ زیادہ مستحق ہے۔

"الصدقات" کے متعلق ان نازک حکیمانہ اصولوں کے ساتھ یہ اعلان کہ جو مسلمان اس محصول کو ادا کرے گا اس کو دوسرے حکومتی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ اس کا قدرتی اثر یہ تھا کہ برضا و رغبت لوگ اسی "الصدقاتی" مطالبہ کو قبول کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی عربوں کو مخاطب فرما کر ارشاد فرماتے:-

| | |
|---|---|
| يا معشر العرب احمدوا الله اذ رفع عنكم العشور ! | عرب کے لوگو! خدا کا شکر کرو کہ تم سے اس نے حکومتی عشور (ٹیکس) کو اٹھا دیا! |
| (الطحاوی ص ۳۱۲) | |

لوگوں کو اس حدیث کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی حالانکہ صاف مطلب یہی تھا کہ حکومتیں اپنی رعایا پر جو چنگی (عشر) وغیرہ کے نام سے ٹیکس اور رنٹ عائد کرتی تھیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے معاف فرما دیا ہے۔ اس لئے آپ کبھی یہ فرماتے کہ

| | |
|---|---|
| ليس على المسلمين عشور | اہلِ اسلام پر عشور (حکومتی ٹیکس) نہیں |
| انما العشور على اهل الذمة | ہیں۔ بلکہ العشور صرف اہلِ ذمہ پر |
| (طحاوی ص ۳۱۲) | ہے۔ |

مطلب یہ ہے کہ اہلِ اسلام چونکہ "الصدقات" ادا کرتے ہیں۔ اس لئے حکومتی ٹیکس باج و خراج وغیرہ سے وہ مستثنیٰ ہیں۔ اور اب خراجی آمدنی صرف اہلِ ذمہ پر رہ جاتی ہے۔ حکومتی ٹیکسوں سے استثنا ہی کا شرف تھا۔ جسے بعض مسلمان کھونا نہیں چاہتے تھے اور اسلام کے اس قانون کی بنیاد پر یعنی غیر مسلم رعایا کی مملوکہ خراجی زمین اگر مسلمان بھی خریدے گا تو اس سے بھی خراج ہی لیا جائے گا۔ بہت سے مسلمان ابتداء میں خراج کی اس ذلت کو برداشت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی کتاب الخراج میں یہ سوال اٹھا کر، کہ خراجی زمین خرید کر کیا اس کا خراج اپنے ذمہ کوئی مسلمان لے سکتا ہے۔ مختلف اکابرِ اسلام کا یہ فتوے جواب میں نقل کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لا تجعل فی عنقك صغارا | اپنی گردن میں ذلت کا طوق کیوں ڈالتے ہو۔ |
| (کتاب الخراج قرشی ص ۴۵) | (یعنی بلاوجہ خراج کی ذلت کیوں برداشت کرتے ہو) |

الغرض الصدقات کے خفیف محصول کو قبول کر لینے کے بعد اتنی قیمتی آزادی کا حصول ہے۔ "الصدقات" کے نام سے مسلمانوں کے مال و جائداد، مویشی پر جو محصول عائد کیا گیا وہ کوئی نئی چیز کبھی بھی نہیں ہے۔ ہر مذہب والے اپنی آمدنی کا ایک حصہ خیر و خیرات میں صرف ہی کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسی مبہم، غیر منظم خیرات کو صرف منظم اور باقاعدہ شکل میں تبدیل کر دیا۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے اگر نسبتاً عام خیرات سے کچھ رقم بڑھ بھی گئی ہو۔ جب بھی ہر قسم کے مطالبات سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سے الصدقات کے فنڈ میں شریک ہونے والے قطعاً نفع ہی میں رہتے ہیں۔ کہاں پیداوار کا نصف حصہ، کہاں دسواں اور بیسواں حصہ، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے۔ اور اس پر لطف یہ ہے کہ جس علاقہ کے لوگوں سے لیا جاتا تھا زیادہ تر اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اسی علاقہ کے حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جو ان اتفاقی مصائب کے

شکار ہو گئے ہوں۔ بلکہ ان کے اعزہ اقربا خاندان والوں کو جب ترجیح دی جاتی تھی، تو گویا قریب قریب الصدقات میں شریک ہونے سے وہی غرض حاصل ہوئی جس غرض سے آدمی آج کل بیمہ کمپنیوں یا انجمن ہائے امداد باہمی میں شریک ہوتا ہے۔ پھر محصول عائد کرنے میں اتنی نرمی کہ اپنے اور اپنے خاندان بھر کے روزمرہ مصارف سے بچانے اور فراغ بالی کے ایک خاص معیار کے بعد اس محصول کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ وقت رسی کے تمام اصولوں، محنت و جانکاہی کی تمام نزاکتوں کا خیال کرتے ہوئے سال بھر کے استفادہ کا موقع دینے کے بعد ان کو وصول کرنا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ اس کو خدا کی خوشنودی کا ایک بہترین ذریعہ قرار دینا قرآن و حدیث جن کے فضائل سے معمور ہیں۔ اس کے بعد ملک کے ان واقعی حاجت مندوں کی اعانت کا ارادہ کر کے حکومت کا اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تمام فوجی و عسکری قوتوں کو اس کی وصولی کے لئے مختص کر دینا، حتیٰ کہ ایسے خطرناک وقت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کے ایک حصہ میں بغاوت پھیل گئی ہو، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکومت کے خراج کے لئے نہیں، جیسا کہ اکثر مغربی مورخین کو دھوکا ہوا ہے بلکہ غریبوں کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آخری قوت تک مقابلہ کا چیلنج دینا کہ۔

| | |
|---|---|
| لومنعونی عقالا مما | اگر الصدقات کے سلسلہ میں کسی ایسی رسی کے |
| اعطوہ رسول اللہ صلی اللہ | ادا کرنے سے انکار کریں گے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |
| علیہ وسلم لجاھدتھم ! | کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا! |

جیسا کہ صحاح کی ہر کتاب میں مذکور ہے حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود اس پر اصرار کرنا۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے موازنہ میں جہاں ان جدید مصارف کا اضافہ کیا ہے وہیں اس کی وصولی کی کتنی آسان اور کتنی قطعی و یقینی راہیں اس نے اختیار کی تھیں خود الصدقات کا ایک مذہبی فریضہ ہونا اور کیسا مذہبی فریضہ کہ صحابہؓ میں بعضوں کا خیال تھا۔

| | |
|---|---|
| ما مانع الزکوٰۃ بمسلم ومن | زکوٰۃ کا نہ ادا کرنے والا مسلمان ہی نہیں |
| لم یؤدھا فلا صلوٰۃ لہ۔ | ہے اور جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کی نماز |
| (الخراج لابی یوسف ص ۴۵) | بھی نہیں ہوتی! |

قرآن اور صحیح حدیثوں میں اس مطالبہ کے نہ ادا کرنے والوں کے متعلق اتنی شدید تاکیدیں، مثلاً اس کی پیشانی، اس کے پہلو قیامت میں داغ دیئے جائیں گے (قرآن)، قیامت کے دن

اس کا مال، جس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوئی ہو اس شخص کے سر پر بشکل اژدر یا چیختے ہوئے اونٹ اور بکریوں کی شکل میں آنا۔ اوسان سب پر مزید برآں حکومت کی تلوار کا اس کی وصولی کی ضمانت لینا کون کہہ سکتا ہے کہ دینے والے کے پاس اس مد کا ایک پیسہ بھی باقی رہ سکتا ہوگا۔ پھر سوچنا چاہئے کہ جس حکومت کے خزانے میں ملک کے ان ناپرساں حال طبقات کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہو اس ملک کی امن وعافیت کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوفزدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ بیوی بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرائے گا۔ میرے بچے کیا کھائیں گے۔ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آجائے، کسان کو زراعت میں نقصان پہنچے، کوئی لنگڑا ہو جائے، اندھا ہو جائے، بڈھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کے لئے سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم موجود ہے۔ جس ملک کے مقروضوں کو قرض توڑنے کے لئے نہ سودی قرض کی حاجت، نہ جائیداد بیچنے کی ضرورت، کہ ان کے قرض کی ادائی کا سامان حکومت کے خزانے میں موجود ہے۔ بیوپار، کاروبار کرنیوالے مسافر، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ نہ ان کو اس کی فکر کہ کس جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا کہ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے۔ شاید صاحب حیثیت مسافروں کو شبہ ہو کہ اس مد کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر مطمئن کر دیا کہ:۔

| | |
|---|---|
| لا تحل صدقۃ الا فی | صدقہ کا مال جائز نہیں (مستطیع لوگوں کیلئے) |
| سبیل اللہ وابن السبیل! | لیکن جہاد اور مسافر کیلئے (جائز ہے) |

(سنن بیہقی)

بلکہ مسافروں کے لئے تو اسلام نے ایک جدید سہولت کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ یوں تو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا کہ:۔

| | |
|---|---|
| ان نزلتم بقوم فان ادوا لکم | تم کسی کے یہاں مہمان بن کر جب اترو، اور |
| بما ینبغی للضیف فاقبلوا فان | میزبان اگر مہمان کیلئے مناسب انتظام کرے، تو |
| لم یفعلوا فخذوا منھم حق | اسکی مہمانی کو قبول کر لیا کرو اور اگر میزبان ایسا نہ |
| الضیف الذی ینبغی لھم (رواہ البخاری) | کرے تو پھر ان سے مہمانی کا مناسب حق وصول کر لیا کرو |

اسی طرح غیر اقوام جب اسلامی حکومت کی رعایا بننے پر آمادہ ہوتی تھیں تو اس وقت ان سے جو معاہدہ لیا جاتا تھا۔ اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ:۔

| | |
|---|---|
| ضیافۃ من مربھم من المسلمین (بیہقی) | مسلمانوں کا جو آدمی ان پر گذرے اس کی مہمانی کریں گے۔ |

اگرچہ فقہاء نے اب ضیافت کے مسئلہ کو بجائے واجب کے مستحب قرار دیا ہے۔ لیکن جب یہ کثرت حدیثوں میں:۔

| | |
|---|---|
| من اصبح الضیف بفنائہ فھو علیہ حق اوقال دین ان شاء اقتضاہ وان شاء ترکہ۔ (بیہقی) | جس کے گھر کی انگنائی میں مہمان پہنچے تو مہمان کا اس پر حق قائم ہوجاتا ہے (بعض رعایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزبان پر وہ دین ہے، چاہے اس دین کو مہمان وصول کرے چاہے چھوڑ دے! |

وغیرہ الفاظ میں آئے ہیں تو مسافروں کے لئے اسلام کی مہیا کردہ سہولت کو آسان کیوں نہ کیا جائے۔ گھر میں رہنے والے کے لئے کسی باہر سے آنے والے مسافر کا کھانا غالباً باعث مشقت نہیں ہوسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتداء میں جو نقشہ قائم کیا تھا۔ کاش! کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے تو آج گھبرا گھبرا کر نہ دنیا بیمہ اور انشورنس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی، نہ غریب مخلوق اور کاشتکاروں کی مشکلات کا حل باہمی اتحاد والی سود خوار انجمنوں میں سوچا جاتا گویا "پنجہ گرگ" (ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنوں کی چھری چلائی جاتی ہے مسلمان علماء کو مجبور کیا جارہا ہے کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کریں سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا اب یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف منتقل ہوا۔ لیکن کیا کیجئے کہ کسی تصویر کے کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ صرف زندگی کا یہی ایک شعبہ ہے جس میں اسلام کی ان نکتہ نوازیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہے۔ ابھی یورپ اور اس قسم کے دوسرے مفکروں کو مدت چاہئے جو اللہ کے بنائے ہوئے نظام نامۂ حیات کو خود تو کیا بنا سکیں گے۔ سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔

**الصدقات کے متعلق ایک تاریخی تغیر**

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدید اسلامی نظامِ زندگی کی جو شادابی و تروتازگی عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہؓ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی۔ لیکن

اس معاشی نظام کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت کہتے ہیں کہ حضرتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں اپنی جگہ سے سرک گئی۔ آپ نے "صدقات" کی اور تمام مدون (یعنی مویشی، کاشت، کروڑگیری) کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی۔ ان کو تو باقی رکھا لیکن روپیہ اور اشرفی، سونا چاندی کی شکل میں جو اندوختہ مسلمانوں کے پاس تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کے سپرد انفرادی طور پر دینے کی اجازت دے دی۔ امام ابوبکر جصاص رازی اپنی تفسیر میں ناقل ہیں:۔

اما زکوٰۃ الاموال فقد کانت تحمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان ثم خطب عثمان فقال ھذا شھر زکوٰتکم فمن کان علیہ دین فلیودہ ثم لیترک بقیۃ مالہ

(احکام القرآن جصاص ص۱۵۵ ج۲)

الاموال (سونا چاندی) کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد تک ان ہی بزرگوں تک پہنچائی جاتی تھی (یعنی حکومت میں یہ آمدنی داخل ہوتی تھی) پھر حضرت عثمانؓ نے ایک دن خطبہ دیا اور فرمایا کہ (رمضان کا) یہ مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے پھر جس پر کچھ دین (باقی) ہو، وہ ادا کر دے اور اپنے باقی مال کو چھوڑ دے۔

جصاص لکھتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے:۔

فجعل لھم اداءھا الی المساکین وسقط من اجل ذالک حق الامام فی اخذھا!

(حضرت عثمان نے زکوٰۃ دینے والوں کو) اختیار دے دیا کہ خود براہِ راست مسکینوں کو دے دیا کریں اس وجہ سے امام (حکومت) کا جو حق اس مد میں وصولی کا تھا وہ ساقط ہو گیا۔

حالانکہ چند سطر پہلے جصاص ہی نے آیتِ قرآنی:۔

خذ من اموالھم صدقۃ

ان کے مال سے اے پیغمبر! صدقہ لیا کرو!

کے تحت یہ لکھا تھا کہ:۔

یدل علی ان اخذ الصدقات الی الامام وانہ متی ادّاھا

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ "الصدقات" کی وصولی امام (حکومت) کے سپرد ہے اور وہ شخص جس پر

| | |
|---|---|
| من وجبت عليه المساكين | زکوٰۃ واجب ہے اگر خود مسکین کو دیرا و دات |
| لم یجزہ لان حق الامام | او اکر دے گا تو زکوٰۃ اعادہ ہوگی کیونکہ زکوٰۃ کی |
| قائم فی اخذها فلا | وصولی کا جو حق حکومت کو حاصل تھا وہ ابتک |
| سبیل الی اسقاطه. | باقی ہے اور اسکے ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں |

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جس کا قرآن نے ارادہ کیا تھا۔ اس کا اقتضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ علیہ کے اس قول سے یہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہو گیا حضرت عثمان کے قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس سال حضرت نے کسی خاص وجہ سے "اموال" کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا کر دیا تھا اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے۔ لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمانؓ کے بعد ہر امام سے اس حق کو چھین لینا، جو قرآن کا عطا کیا ہوا حق، بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے۔ آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔ مگر باوجود اس ایک مد کے انفرادی ہونے کے "الصدقات" کی اور دوسری مدیں جو کم نہ تھیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت عباسیہ تک ان مدوں کی آمدنی کروڑوں سے متجاوز ہوگی۔ جرجی زیدان نے موجودہ مورخوں کی تحقیقات کی بناء پر لکھا ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| ان متوسط جباية الدولة | عباسی عہد کی ابتداء میں آمدنی |
| فی العصر العباسی الاولی | دولت کی تین سو ساٹھ ملین |
| بلغ ۳۶۰ مليون درهم فی | درہم سالانہ تھی! |
| العام (ص ۶۷ ج ۳) | |

جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ خراجی آمدنی جو حکومت کے مصارف پر خرچ ہوتی تھی :-

| | |
|---|---|
| لاينفق منها على مصالح | حکومتی کاروبار میں گذشتہ بالا آمدنی |
| الدولة اكثر من ۵۰ مليون | میں سے صرف پچاس ملین خرچ ہوتا تھا |
| والباقی نحو ......۳۰ درهم | اور تیس کروڑ درہم بیت المال |
| تبقى فی بيت المال (ص ۶۷ ج ۳) | میں باقی رہ جاتا تھا۔ |

بظاہر یہ تیس کروڑ درہم والی آمدنی یہی "الصدقات" کی آمدنی تھی۔ جن کے معارف "مصالح الدولۃ" کے سوا ہی تھے۔ جن کی فہرست حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل کی تھی اور جہاں تک میرا خیال ہے

اکثر و بیشتر ان میں بے ضابطگی کم برتی جاتی تھی۔ آخر کتاب الخراج امام ابو یوسف ہارون الرشید کے زمانہ کی کتاب ہے۔ اس کو ہارون نے فرمائش کر کے لکھوایا ہے۔ کہ حکومت کے دستور العمل کی حیثیت سے وہ کام آئے۔ اس کتاب میں "الصدقات" کے متعلق جو قوانین درج ہیں ان کے بعض اجزاء گذر چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو مسلمان عباسیوں کے عہد تک پہنچے ہوئے بہت کچھ اصل راہ سے ہٹ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی عام مسلمانوں کی فراغبالیاں ایسی تھیں جنہیں تاریخ کی زبان باوجود چھپانے کی انتہائی کوششوں کے اب بھی چھپا نہ سکی۔ جرجی زیدان جیسے آدمی کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل پڑے کہ حکومت کے خزانے میں ملک کا جو کچھ روپیہ جاتا تھا۔

| | |
|---|---|
| فیعود الی العامة کانه | وہ بالآخر عامہ (ملک کے عام باشندوں) |
| لم یوخذ منهم وهی سنة | کی طرف واپس آجاتا تھا۔ ایسا معلوم |
| الارتزاق[1] تظهر لاول | ہوتا تھا کہ گویا لوگوں سے کچھ لیا ہی نہیں |
| وهلة انها من خصائص | گیا۔ اور یہ نتیجہ اس خاص رواج کا تھا جسے |
| التمدن الاسلامی! | وظائف کہتے ہیں۔ پہلی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے |
| | کہ اسلامی حکومتوں کی یہ خاص خصوصیت تھی! |

جرجی زیدان اگرچہ اس ہنر پر "عیب" کی چادر اڑھانے کے لئے اس پر اضافہ بھی کرتا ہے یعنی شاید یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ قدیم زمانہ میں ؛۔

---

[1] الارتزاق دراصل ہمارے یہاں کے "وظائف" کے لفظ کا ترجمہ ہے۔ اسلامی حکومتوں کے بیت المال۔ اور خزانہ کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کی یادگار بحمد اللہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک ان ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں اسلامی حکومت قائم ہے خصوصاً سلطنت آصفیہ کا خزانہ عامرہ اس زمانے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب و عجم میں بھی اس خاص معاملہ میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ اب تک وظائف کے نام سے ہر سال بیش قرار رقوم ماہانہ بحیثیت ارباب استحقاق میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ جن لوگوں کو اسلامی بیت المال کی اس خصوصیت اور نقطۂ نظر کا علم نہیں ہے وہ حیدر آباد میں وظائف کے رواج پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے بعضوں سے تو یہاں تک سنا کہ اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر صرف سلطنت آصفیہ کا ہی خزانہ ہے جہاں سے کسی معاوضہ کے بغیر لوگوں کو امدادیں ملتی ہیں۔ یہ ساری باتیں سقوط حیدرآباد کے بعد شاید ختم کر دی گئی ہوں۔ یا ختم کر دینے کے ارادے ہونگے کیونکہ اب وہاں کے کلی اختیارات ایک غیر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں آچکے ہیں۔ مگر یہ بات بیحد اہم ہے کہ دنیا کی اکثر غیر اسلامی حکومتیں ایسے ہی وظائف جاری کر چکی ہیں"

فاهل اثينا خاصة
اليونانيين كانوا لا يعلمون عملا
ولا يحترفون حرفة في
سبيل الرزق وانما كانت
ارزاقهم من خزينة الدولة
تنيلها او توزع رواتب في اوقات
معينة او هبات في اوقات
غير معينة ولم يكن لهم
شغل غير سماع الخطب
السياسية او العلمية او التمشي
في حدائق المدينة وحضور
الاحتفالات الرسمية
ونحوها!

ایتھنز کے باشندوں کا بھی یہی حال تھا اور یہ یونانیوں میں خواص کا طبقہ تھا۔ جو نہ کوئی کاروبار کرتے تھے اور نہ کوئی دستکاری کا پیشہ روزی حاصل کرنے کی راہ میں اختیار کرتے تھے، ان کے وظائف حکومت کے خزانے سے جاری تھے، جیسے وہ ماہ بماہ مقررہ اوقات میں وصول کرتے تھے یا غیر معین طور پر بطور ہبہ اور بخشش کے ان کو مل جاتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایتھنز والوں کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سیاسی یا علمی لیکچروں کو گھوم گھوم کر سنا کریں یا باغوں اور پارکوں میں گھوما کریں یا ملک کی سرکاری محفلوں میں شرکت کیا کریں۔

مگر اس بندۂ خدا کو پھر خیال آیا کہ آخر پھر وہ کیا چیز ہے جو اسلامی تمدن کو دنیا کے سارے تمدنوں سے ہر مؤرخ کو جدا نظر آتا ہے۔ پھر خود جواب دیتا ہے کہ یونانیوں کی یہ خصوصیت:۔

كانت محصورة في اثينا او
غيرها من العواصم الكبرى!
اما المسلمون فتوسعوا فيه
حتى شمل كل مدينة وكل
طبقة! (ص ۶۷)

یونانیوں کی یہ خصوصیت صرف ایتھنز شہر یا چند دوسرے مرکزی شہروں تک محدود تھی لیکن مسلمانوں نے اس میں وسعت پیدا کی، حتی کہ ہر شہر اور ہر طبقہ تک اس کو عام کر دیا۔

پھر اس کی توجیہ و تاویل میں حسب عادت آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی بیکار کوشش کی ہے۔ یہ مذبوحی کوشش یہاں تک پہنچتی ہے۔ یعنی زیدان نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام سے پہلے سلاطین عرب کا بھی یہی دستور تھا۔ غریب عرب بھلا سلاطین سے آشنا ہی کب تھا اور کچھ تھا بھی تو عرب کو اس سرسبزی و شادابی اس امن و عافیت سے قبل الاسلام کیا تعلق تھا۔ جس کا نظارہ عرب اور عجم کی آنکھوں نے اسلامی دور میں دیکھا، کہ ہر یتیم، ہر بیوہ، ہر معذور، ہر مقروض، ہر تاوان رسیدہ تاجر

مصیبت زدہ کسان، سب اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ کہ ان کے انجمن اتحاد باہمی اور بیمہ کمپنی میں ان کا کثیر سرمایہ جمع شدہ ہے۔ خصوصاً کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی دلچسپیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ زمین اور آبپاشی کے انتظامات کے ساتھ ساتھ مسلم ہی نہیں غیر مسلم کاشتکاروں تک کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر تخم اور ہل بیل وغیرہ کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو

| | |
|---|---|
| ان یدفع للعاجز کفایته | جو کسان تخم وغیرہ کے مہیا کرنے سے معذور |
| من بیت المال قرضا لیعمل | ہو اسے سرکاری خزانہ سے بطور قرض کے |
| فیہا ؕ | اتنا سرمایہ دیا جائے جس سے وہ اپنے کاروبار |
| (فتح القدیر ص ۳۶۲ ج ۴) | کو جاری کر سکے۔ |

کون کہہ سکتا ہے کہ تقاوی کی رقم مسلمانوں ہی کی نکالی ہوئی ہے یا ہندوستان میں ابتک اس کا رواج ان ہی کی بدولت باقی ہے۔

کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ کس حد تک خراج کے لینے میں نرمی اختیار کرنی چاہئے اس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس اثر سے ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب جنہیں اپنی خلافت کے عہد میں مالگذاری کی تحصیل کے لئے حضرت والا نے روانہ کیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| استعملنی علی بن ابی طالب | مجھے حضرت علی بن ابی طالب نے بزرگ سابور |
| علی بزرج سابور فقال لا | (نامی تحصیل) کا تحصیلدار مقرر فرمایا جب روانہ |
| تضربن رجلا سوطا فی جبایة | کرنے لگے تو فرمایا، دیکھو روپے (درم) کی تحصیل |
| درهم ولا تبیعن رزقا ولا | میں کسی کو کوڑے سے نہ مارنا اور نہ کسی کی خوراک |
| کسوة شتاء ولا صیف ولا | کو بیچنا اور نہ سرما و گرما کے کپڑے ان کے نیلام |
| دابة یعملون علیها ولا تقم | کرنا اور نہ ان کے ان جانوروں (بیل وغیرہ) کو |
| رجلا قائما فی طلب درهم | نیلام کرنا جس سے وہ کام کرتے ہیں اور روپے |
| قال قلت یا امیر المؤمنین | کی تحصیل میں کسی کو ایک ٹانگ پر کھڑا بھی نہ کرنا |
| اذا ارجع الیک کما ذهبت | (تحصیلدار نے کہا) ایسی صورت میں تو حضور میں اسی |
| من عندک قال ویحک انما | طرح واپس آ جاؤں گا، جیسے گیا تھا یعنی خالی ہاتھ |
| امرنا ان ناخذ منهم العفو | آنا پڑے گا۔ تب حضرت علیؓ نے فرمایا تجھ پر افسوس |

یعنی الفضل۔ ہے یعنی حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ العفو سے وصول
(سنن بیہقی ص ۵۰۲ ج ۹) کریں یعنی جو ضرورت سے زائد بچا ہوا ہو!

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے ساتھ اسلام کا صحیح نقطۂ نظر کیا تھا۔ العفو کی شرح میں نے کسی اور موقعہ پر بھی کی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی پر دست اندازی نہیں کرنا چاہئیے۔ بلکہ آمدنی سے مالگذاری وصول کرنا چاہیے۔ جب بیل وغیرہ تک کو نیلام کرنے کی اجازت حضرت نہیں دے رہے تھے تو اس سے اندازہ کرنا چاہئیے، اور چیزوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہوگا۔ اس سلسلہ میں خیال کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ معاہدے کے بعد کسانوں کو جو زمین اسلامی حکومت بندوبست کر دیتی تھی۔ تو جو مالگذاری معاہدے کے وقت طے ہو جاتی تھی اس پر اضافہ کا استحقاق بھی آئندہ حکومت کو نہیں رہتا تھا۔ اس باب میں متعدد روائتیں ہیں، جن میں ایک روایت حضرت عمرؓ کی ہے۔ ابراہیم نخعی اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| جاء رجل الی عمر فقال ان | ایک آدمی حضرت عمر کے پاس آیا اور آکر اس نے |
| ارض کذا وکذا یطیقون من | خبر دی کہ فلاں فلاں اراضی سے جتنا اس وقت |
| الخراج اکثر مما علیھم فقال | وصول ہوتا ہے اس سے زیادہ مالگذاری ادا کرنے |
| لا سبیل الیھم انما صالحناھم | کی پاس میں صلاحیت ہے، تب حضرت عمرؓ نے فرمایا |
| صلحا۔ | ان لوگوں پر اضافہ کی راہ بند ہے، جو مالگذاری اس |
| (البیہقی ص ۱۴۲ ج ۹) | وقت لی جا رہی ہے اسی پر ان سے صلح ہوتی ہے |

بہر حال اسلامی حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے جو اغراض تھے یا ان کو ہونا چاہئیے غالباً اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی۔ جن لوگوں کے سامنے معاش کا یہ نظام پیش کیا گیا ہے وہ اب فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بیت المال کے اس عجیب و غریب نظام کے بعد پھر کیا دنیا کو بیمہ انشورنس انجمن ہائے اتحاد باہمی جیسی سطحی اور وقتی معالجوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ بیروزگاری کی جو عام شکایت پھیل گئی ہے کیا اس کا احتمال اس وقت بھی باقی رہ سکتا ہے، جب حکومت اپنی رعایا کے بے سرمایوں کو سرمایہ دینے کے لئے اپنے پاس مستقل بیش قرار رقم رکھتی ہو، ہبۃً بھی دینے کے لئے تیار ہو، اور قرضۃً بھی!

"الصدقات" کی وصولی اور صرف کے متعلق اسلام نے جن نکات کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اگرچہ موٹی موٹی باتیں اس سلسلے میں جو قابلِ اندراج ہو سکتی تھیں، ان کا بیان

گذر چکا۔ لیکن اسی ذیل کی دو چیزیں چھوٹ گئی تھیں، مناسب ہے کہ آخر میں ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ گذشتہ بالا امور کے "الصدقات" کے متعلق اسلام نے ان دو شرطوں کا بھی اضافہ کیا ہے

(۱) ایک تو یہ ہے کہ جس طرح الصدقات کی مد کی آمدنی کو الخراج والجزیہ وغیرہ کی آمدنیوں سے بالکلیہ جُدا رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا ایک حبہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا، جو اسلامی نکتۂ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ ان "غنی" سے مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کا مالک ہو۔ بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ چاندی[1] یا اس کے ساد ی کسی سرمایہ کا مالک ہو اس کے لئے اس آمدنی کا ایک حبہ تک حرام ہے۔ اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک آدمی آیا، جس کے مشکیزے میں دودھ تھا، حضرت عمر کو بھی ایک پیالہ اس دودھ کا ملا۔ دودھ کچھ مزے دار تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے ہو۔ بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر میرا گذر ہوا۔ وہاں "الصدقات" کے اونٹ چر رہے تھے۔ ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے، میں نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنے چھاگل میں رکھ لیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمر پر عجب حالت طاری ہو گئی۔ راوی کا بیان ہے۔

| | |
|---|---|
| فدخل اصبعه فی فیه | اپنی انگلی منہ میں ڈالی۔ اور قے کرتے |
| واستقاءه (بیہقی) | جاتے تھے۔ |

بہرحال قانونی "الغنی" کے لئے تو قطعاً اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو قانونی غنا نہ رکھتا ہو، بلکہ شب و روز کی خوراک سے زیادہ اس کے پاس سامان ہو، ایسے آدمیوں کیلئے یہ حرام تو نہیں ہے لیکن "الصدقات" کے شعبہ سے مانگنا اس کے لئے بھی ناجائز ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ملک کے ان مصیبت زدہ طبقات کے لئے اسلامی حکومت نے

---

[1] یہ ہندوستان کے قدیم فقہاء کے حساب کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں ساڑھے چھتیس تولہ ہی کو غنا کا نصاب قرار دیا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک پہلی صورت زیادہ درست ہے ۱۲

اپنے خزانے میں اگرچہ یہ سارا انتظام بڑی طاقت سے کر رکھا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مد پر بھروسہ کرکے ایتھنز کے خوش باشوں کی طرح بے کاری اور بے کار وقت گذاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی اس مد سے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف الفاظ میں ان کو سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتی الوسع "الصدقات" کے مال سے صاحبِ استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت میں بڑی تنگی پیدا ہو گئی۔ گھبرا کر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا کہ الصدقات کی رقم سے کچھ میری مدد فرمائی جائے۔ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا:۔

من استغنی اغناه الله — جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا خدا اسے

من استعف اعفه الله! — بے نیاز رکھے گا۔ اور جو دوسروں سے لینے

میں احتیاط برتے گا۔ خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا!

حضرت ابو سعید پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ:۔

لا استعف فیغنی الله و — میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط کروں گا

لا استغنی فیغنی الله! — خدا میری آبرو بچائے گا۔ اور میں اپنے کو

مخلوق سے بے نیاز رکھوں گا، خدا مجھے بے نیاز رکھے گا!

کہتے ہوئے واپس ہوئے، ان کا بیان ہے کہ اپنے اس استعفاف و استغناء کے نتائج کو بالآخر میں نے اپنی آنکھوں سے اس شکل میں دیکھا کہ:۔

سالت علینا الدنیا فغرقتنا — ہم پر دنیا کا سیلاب چھا گیا اور ہمیں اس

الا من عصم الله! — نے ڈبو دیا۔ لیکن وہی جنہیں اللہ نے

(الطحاوی) — محفوظ رکھا ہو!

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لئے تقریباً عام مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چند اور باتیں فرماتے، ان میں ایک فقرہ عموماً یہ بھی ہوتا تھا:۔

الید العلیا خیر من الید — اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے

| | |
|---|---|
| السفلی! (صحاح) | (لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے! |

یہ بھی ارشاد ہوتا کہ ہے

| | |
|---|---|
| الایدی ثلث فید اللہ | ہاتھ تین ہیں، تو سب سے اونچا ہاتھ خدا |
| العلیاء وید المعطی التی | کا ہے، اور دینے والے کا ہاتھ (خدا کے ہاتھ |
| تلیھا وید السائل السفلی | کے بعد ہے) اور مانگنے والے کا ہاتھ سب سے |
| الی یوم القیمۃ فاستعفف | نچلا ہاتھ ہے (اور یہ نسبت قیامت تک |
| مااستطعت ولا تعجز | قائم رہے گی، پس جہاں تک مانگنے سے بچ |
| عن نفسک ولا تلام | سکتے ہو بچو اور خود کمانے سے نہ تھکو۔ اور |
| علی کفاف واذا اتاک | بقدر کفایت اگر تمہارے پاس ہو تو پھر تم قابلِ |
| اللہ خیرا فلیر علیک! | ملامت نہ ہو۔ اور خدا تمہیں جب خیر دیا کرے |
| (الطحاوی) | تو چاہیئے کہ اس کو اپنے اوپر نمایاں کرو! |

حتی الوسع لوگوں کو واقعی مستحقین کے اس "حق" سے بچنے اور کنارہ کش رہنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ اصرار اس پر کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خداداد قوتوں سے روزی حاصل کرنے میں کوشش کی جائے (لا تعجز عن نفسک) کا یہی مطلب ہے۔ اور زیادہ امیر نہ ہونے کو کوئی جرم نہ خیال کرے اور اس جرم سے بری ہونے کے لئے "الصدقات" کی رقم سے امیری نہ پیدا کی جائے (مثلاً عموماً اپنی لڑکیوں کی شادی میں نمائشی مصارف کیلئے لوگ کنیا دان مانگا کرتے ہیں کہ سوسائیٹی میں ورنہ بے عزتی ہوگی)

(۲) دوسری بات اس سلسلہ میں جو یہاں قابلِ ذکر ہے وہ "الصدقات" کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں سے "الصدقات" کا مطالبہ کیا گیا۔ بدگمانوں کو شاید اندیشہ ہو سکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) خود اپنی اور اپنے اہلِ خاندان کی معاشی مشکلات کے حل کی یہ راہ تو نہیں بنائی ہے۔ خصوصاً جب اس زمانے میں بھی اکثر ممالک میں اس وقت تک خیر و خیرات کی رقوم یا معارفِ دعوت وغیرہ کا استحقاق انہیں لوگوں کے ساتھ زیادہ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ جن کی زندگی مذہبی ہو اور جو مذہب کی نمائندگی کرتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی نمائندہ ہونا، اس کے بناء پر آپؐ کے بعد مسلمانوں میں مذہبی نمائندگی کا قدرتاً زیادہ استحقاق آپ کی آل اور آپ کے خاندان والوں ہی کو ہو سکتا تھا خصوصاً اس لئے بھی کہ عموماً اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لئے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو عموماً دخیل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں اور یہی حال تقریباً اکثر غیر اسلامی سوسائٹیوں کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالباً یہ بھی ایک مصلحت تھی، جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں "الصدقات" کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام فرما دیا۔ اس سلسلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا نازک احساس رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے۔ سامنے "الصدقات" کے مد کی کھجوروں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ سرکتے ہوئے ڈھیر کے پاس پہنچ گئے۔ اور صرف ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑ گئی۔ جھپٹ کر دوڑے اور بیقرار ہو کر فرمانے لگے

| | |
|---|---|
| کخ کخ ارمبہا! | تھو تھو، اسے پھینک دو! |

اور فرمانے لگے ۔

| | |
|---|---|
| اما شعرت انا لا ناکل الصدقۃ (رواہ البخاری) | تم نہیں سمجھتے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے! |

بعض روایتوں کے الفاظ ہیں ۔

| | |
|---|---|
| انا لا تحل لنا الصدقۃ | ہم لوگوں کیلئے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے |

اسی بناء پر فقہاء اسلام نے بھی بالاتفاق اپنی قانونی کتابوں میں اس دفعہ کو قانون کی شکل میں داخل فرمایا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ سادات اور آل فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ داروں پر الصدقات کی آمدنی حرام ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ باقی رہ جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ "الصدقات" کے مطالبوں کو ادا کرنے والوں کو اسلام ہر قسم کے حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی رعایا مسلمان ہو کر اس طرح اپنے آپ کو حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کراتے رہے تو پھر حکومت کی کشوری و ملٹری و رفاہیاتِ عامہ کے مصارف کے لئے کہاں سے رقم آئے گی؟

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہی ہے جو گذر چکا کہ اسلامی حکومت کی پوری آمدنی جو غیر مسلم رعایا کے قبضہ میں ہو خراجی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کو خرید بھی لے گا۔ اور اس کے سوا اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوئی دوسری قانونی شکل نہیں، جب بھی وہ خراجی ہی باقی رہتی ہے البتہ جزیہ کی آمدنی مسلمان ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بنی امیہ کے حریص امراء نے مسلموں پر جزیہ باقی رکھا تھا لیکن بہت جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس غلط قانون کی اصلاح ہو گئی۔

بہرحال خراج کی وصول کے لئے خراجی زمینیں پہلے تو کافی ہیں۔ نیز "الصدقات" کے مصارف جہاں مذکورہ بالا طبقات کے لوگ قرآن نے بتائے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ اس آمدنی کو خود مکتفی بنانے کے لئے شروع سے ایک اور مد کا الصدقات کے مصارف میں قرآن ہی نے اضافہ کر دیا ہے۔ یعنی العاملین علیہا (یعنی جو لوگ صدقات کے تحصیل وصول کا کام کرتے ہیں وہ بھی خواہ امیر ہوں یا غریب) اپنی تنخواہ "الصدقات" کی مد سے بخوشی لے سکتے ہیں۔ اس نے محکمۂ مال کے مصارف کی ادائیگی کی گنجائش تو خود "الصدقات" میں ہے۔ نیز ایک مد اس میں فی سبیل اللہ" کی بھی ہے یعنی تبلیغی مصارف بھی تو توں پر بھی یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ رہ گیا محکمۂ مدیریہ سو اسلام میں قضا کا کام در اصل ایک قسم کی عبادت ہے۔ اگر قاضی غیر مستطیع ہے تو اس کو بھی تنخواہ اس مد سے دلائی جا سکتی ہے اور محکمۂ تعلیمات کے لوگوں کو بھی فقہاء نے بصورت احتیاج اس آمدنی کے مصارف میں شریک کیا ہے۔ بیضاوی نے سبیل اللہ کے ذیل میں القناطر والمصانع بھی لکھا ہے۔ گویا اس بنا پر مواصلات پر جو مصالح مسلمین ہی کی ایک چیز ہے۔ یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے "الصدقات" کے مصارف ایک قدرہ رکھے ہیں جن کا تعلق مصیبت زدہ طبقات سے ہے۔ لیکن اس لئے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت کے پاس بجز "الصدقات" کی مد کے اور کوئی آمدنی نہ رہ جائے تو چند ایسے مصارف کا اس کی ذیل میں اضافہ کیا ہے۔ جن کے بعد ایک حکومت کے قیام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے۔ سب کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان ہی مصارف میں ایک مصارف ان لوگوں کی بھی ہے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت بلکہ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کی یہی حالت ہے۔ ان لوگوں کو چپ کرانے کے لئے بھی الصدقات کے مصارف میں قرآن نے "مؤلفۃ القلوب" کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہاء کہتے ہیں کہ

یہ مصرف صرف ابتداء اسلام کی حد تک محدود تھا اور اب ساقط ہو گیا مدلیل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے۔ کہ آپ نے مؤلفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے۔ کہ ان لوگوں کی تالیف قلوب کی ضرورت نہ رہی۔ حالانکہ قصہ صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمرؓ نے دینے سے یہ فرماتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ :-

ان اللہ اعز الاسلام — اب خدا اسلام کو شوکت و عزت عطا کر چکا

فاذھبا! — پس تم دونوں جاؤ (کچھ نہ ملے گا)

لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لئے حضرت عمرؓ نے اس مد کو ساقط کر دیا۔ میری کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اولاً حضرت عمرؓ منسوخ ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خطِ نسخ نہیں پھیرا جا سکتا۔ بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کی صوابدید پر ہے۔ جس وقت جن لوگوں کے لئے اس کی ضرورت سمجھے دے۔ جن کے لئے ضرورت نہ سمجھے نہ دے آخر میں اس مسئلہ میں فقہاء کے اس مذکورہ بالا مسئلہ کو بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ واقعی ضرورتوں[1] کے لئے اسلامی حکومت رعایا پر بقدر ضرورت جدید محصول عائد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ ان امور کے ہوتے ہوئے اسلامی حکومت کو کبھی دشواری کا سامنا ہو گا۔[2]

---

[1] یہ مضمون پریس میں جب جا رہا تھا کہ ۴ دسمبر ۱۹۴۲ء کا چھپا ہوا ایک مغربی پیام لندن سے ہندوستان وصول ہوا جس کو چاہتا ہوں کہ ناظرین کرام کیلئے اس کو یہاں نقل کر دوں۔ اخبار مدینہ بجنور مورخہ ۵ دسمبر میں اس تار کا ترجمہ ان الفاظ میں شائع ہوا۔

"لندن ۳ دسمبر۔ سر ولیم بیورج (مشہور ماہر معاشیات) نے برطانیہ میں غربت کا خاتمہ کرنے کیلئے جو لائحہ عمل پیش کیا ہے اس کو انگلستان اور امریکہ دونوں جگہ اخبارات میں صفحات پر نمایاں کیا گیا ہے۔ "ڈیلی ٹیلیگراف" کہتا ہے کہ لائحہ عمل کا اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس میں معیشت کی ایک قومی اقل سطح مقرر کی گئی ہے جسے نیچے گرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی مسٹر بیورج کے پیش نظر وظائف (جو شوہر اور بیوی کے لئے دو دو پونڈ ماہانہ ہوں گے) ہر شخص کیلئے طبی معالجہ جو بیمہ کے علاوہ ہو، بچوں کے لئے فی نفر ۸ پونڈ اور ازدواج و مادری کے وظائف شامل ہیں بیکاری سے بچانا یہ لائحہ عمل ایک ہمہ گیر بیمہ ہے جس سے تمام مردوں اور عورتوں کی یکساں بہبودی کی (باقی بر صفحہ آئندہ)

قبل اس کے کہ اسلام کے معاشی مداخل (درآمدنیوں) کا باب ختم کیا جائے۔ چند اور ذیلی ماخذ آمد کو بھی کم از کم اجمالی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ "زر" یا "سکہ" کا بھی ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اس سلسلہ کی جو اہم ترین امتیازی چیز ہے وہ توحید سکہ کا مسئلہ ہے۔ جس کا ذکر "ربوا (سود)" کے باب میں گذر چکا ہے۔ بتایا گیا تھا کہ مختلف ممالک و اقالیم کے مختلف سکوں کے مبادلہ میں جو بٹاون کا رواج ہے یہ اسلام کے اس قانون کی بنا پر کہ چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے جب تبادلہ کیا جائے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو یا زیور یا بترد (پتر)، کی شکل میں ہو۔ برابر برابر ہونا چاہیے۔ اور بٹاون لگانے کی صورت میں چونکہ یہ ممانعت ہو جاتا ہے۔ جس کے حل کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کر بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے نقرئی اور طلائی سکوں کو ہم وزن کریں۔ اور جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہیں، ہر جگہ سات دن ہی کا ہفتہ اور بارہ مہینے ہی کا سال ہوتا ہے۔ جس سے بین الاقوامی تعلقات میں بے شمار سہولتیں ہیں۔ اسی طرح کچھ حرج نہ ہوگا اگر سکوں کے وزن کو بھی ساری دنیا میں برابر کر دیا جائے۔ اور بٹاون کے رواج کو مسدود کر دیا جائے۔ ایکسچینج کے مغالطوں سے جو نتائج کاروباری دنیا کو آئے دن بھگتنے پڑتے ہیں، خصوصاً محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں اس باب میں جو سلوک کر رہی ہیں وہ علماء معاشیات سے مخفی نہیں ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ حیثیت پیغمبر عالم ہونے کے دنیا سے آپ کا یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ علماء معاشیات اس کے فوائد و ثمرات اور اس کی مخالف موجودہ شکل کے نقصانات واضح کریں۔

اس مسئلہ کے سوا بھی فقہ اسلام کو تجارت، اجارہ وغیرہ کے ابواب میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے اور اسلامی قانون کے بعض دقیق پہلوؤں سے ان کا تعلق ہے۔ اگر تفصیل کی جائے گی تو پھر ایک مستقل کتاب اس کے لئے درکار ہوگی اس لئے چند اشارات پر کفایت کی جاتی ہے۔ منجملہ

---

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ گہوارہ سے گور تک کی نگہداشت ہوگی تدفین کے مصارف تک کی گنجائش نکل گئی ہے اور میعادی۔ برسر روزگار ہو یا بے روزگار، جوانی ہو یا بڑھاپا کسی کو اس معین سطح سے پست تر ہونے نہیں دیا جائے گا۔ غرب میں حوالہ محمل جدید پیش خدا کی طرف سے بنی آدم کو سپرد کیا گیا تھا اس کی حد و حساب کے تاریں دیکھئے کہ اسی ضرورت کو مغرب بھی پانے لگا ہے۔ زمانہ بعد کردہ"

ذیل سوالات کے ذیل میں زر کے متعلق آپ کو اسلامی قانون کے مباحث ملیں گے۔

(۱) فطری اور مصنوعی سکوں میں کیا فرق ہے؟ یہ مانا گیا ہے کہ سونا اور چاندی یہ اصلی دھات ہے جسے قدرت نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ معاملات کے معیار کو قائم رکھے۔ بعض حدیثیں بھی اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان دونوں دھاتوں کے سوا اور بھی دوسری چیزوں کو بطورِ سکہ کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فلوس دتانبے کے پیسے، لیکن ان کے سکہ ہونے کی حیثیت آیا پبلک کے ہاتھ میں ہے، یا معاملہ کے فریقین پر اس کا دارومدار ہے امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے۔ اس کی بحث کچھ آئندہ بھی آ رہی ہے

(۲) ہر وہ چیز جو بطورِ سکہ استعمال ہوتی ہو، غیر معین ہو جاتی ہے۔ یعنی معاملہ میں اگر خاص سکہ کو دکھا کر معاملہ کیا جائے۔ لیکن ادا کرنے کے وقت بجائے اس کے دوسرا سکہ دیا جائے تو یہ جائز ہے۔ اس کلیہ کا یعنی سکہ غیر معین ہوتا ہے۔ بے شمار تجارتی مسائل پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۳) سکوں کے مقطعات (یعنی اٹھنی، چونی، دونی) جس کو اصطلاحاً دراہم فلوس کہتے ہیں، ان کی بھی ایک مستقل بحث ہے۔ چیز کا دام مثلاً سو روپیہ طے ہوا اور کوئی بجائے اس کے سو روپے کے پیسے یا اکنیاں دونیاں دے تو کیا یہ جائز ہو سکتا ہے۔

(۴) چاندی سونے کے ایسے سکے جن میں کسی دوسری دھات کی آمیزش ہو، ان کے احکام کا بھی ایک سلسلہ ان کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ العطارفہ والعدالیہ اسی قسم کے سکوں کے نام ہیں۔ سود کے باب میں بعض عجیب نتائج ان سکوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ صاحبِ ہدایہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

| | |
|---|---|
| ومشائخنا رحمہم اللہ لم | ہمارے بزرگوں نے اس کے جواز کا |
| یفتوا بجواز ذلک (کتاب الصرف) | فتویٰ نہیں دیا) |

وجہ یہ لکھی ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| فلو ابیح التفاضل فیہ | اگر ان معاملات میں زیادہ کمی کی اجازت |
| ینفتح باب الربوا. | دے دی جائے گی، تو سود کا دروازہ |
| (کتاب الصرف) | کھل جائے گا۔ |

ایک وہ زمانہ تھا کہ جواز کی بعض قانونی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن اس خوف سے کہ سود کا

دروازہ کھل جائے گا. علماء ان سوراخوں کو بھی بند کرتے تھے. جن سے معاشی رگوں میں ایسے زہریلے خون کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہوتا. آج یہ حال ہے کہ ربوا کی صریح لوث واضح بلکہ بین الاقوامی شکلوں تک کے متعلق بعض علماء نے جواز کی کوشش کی حد یہ ہو گئی کہ قرض ہی کے سود کے متعلق ایک بڑے عالم صاحب نے فتوےٰ دیا کہ قرآن نے اس کو حرام نہیں کیا ہے بلکہ عرب کے کسی گمنام مبادلے اس حکم کا تعلق ہے. عربی میں کتاب لکھی گئی اور علماء کی خدمت میں پیش ہوئی. فانا للہ وانا الیہ راجعون!

(۵) کھوٹے کھرے اور آمیزش کے اعتبار سے سکوں کے متعلق ایک اور اصطلاح بھی ہے. یعنی بعضوں کو "زیوف" (یہ خاص کر ان کھوٹے سکوں کو کہتے ہیں جنہیں حکومت کا خزانہ مسترد کر دے) "النبہرجہ" (ایسے سکے جنہیں کاروباری لوگ بیوپار میں لینے سے انکار کرتے ہوں) اسی نوعیت کے سکوں میں ایک قسم کا سکہ "الستوقہ" بھی تھا. ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ فارسی کے "سہ طاقہ" کا معرب ہے. اوپر نیچے تو چاندی کا پتر چڑھا جاتا تھا اور بیچ میں تانبا بھر دیا جاتا تھا. یہ "المموہ" (قلعی کئے ہوئے سکوں) سے ایک الگ چیز تھی مختلف قانونی ابواب میں ان کے نام آتے ہیں. اور معاملات کے لحاظ سے ان پر حکم لگایا گیا ہے.

باقی اس زمانے میں مصنوعی زر کی ایک شکل جو نوٹ کی پیدا ہو گئی ہے. اگرچہ عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مغربی تمدن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے. لیکن جہاں تک تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے. یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے. ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ

---

لہ جیسے "ستوقہ" کو "سہ طاقہ" کا معرب کہتے ہیں. "نبہرجہ" بھی کیا ہندوستان کے "نہ بہنے والا" لفظ کی کوئی بگڑی ہوئی صورت ہے؟ کیونکہ "بہنے" کی اصلی ہندی شکل "بہنا" اور "بھنایا" ہے. "بہنجت" کے لفظ میں اس وقت اصل ہندی مصدر کا مادہ اب تک باقی ہے. ہندوستان اور قدیم عرب کے تجارتی تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ملاحظہ فرمائی جائے. اسلام کے ابعد بصرہ کی بندرگاہ کا نام "باب الہند" تھا. اور بعد آنے جو حدیث کی معتبر کتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں ایک محلہ ہی "دار الہند" کے نام سے موسوم تھا ۱۲

لہ چین کے متعلق اسی موقعہ پر ابن بطوطہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ موتا ختا اور چین والے اندر جن کا کام ایک خاص قسم کی مٹی سے بیتے ہیں. ہاتھیوں پر لاد لاد کر شہر میں وہ لائی جاتی ہے. اسے توڑ توڑ کر کوئلے کے برابر کر دیتے ہیں اور جھونکتے یا جھونکتے ہیں اتنی تیز آگ. اس سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئلے کی آگ کی اس کے سامنے (باقی برصفحہ آئندہ)

میں بجنسہٖ اس کے الفاظ ترجمہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں۔

واهل الصين لايتبايعون
بدينار ولا درهم وجميع
ما يتحصل ببلادهم من
ذلك يسبكونه قطعا كما
ذكرنا وانما بيعهم وشراؤهم
بقطع كاغد كل قطعة منها
بقدر الكف مطبوعة بطابع
السلطان وتسمى الخمس
والعشرون منها "بالشت"
وهي بمعنى الدينار عندنا
واذا تمزقت تلك الكواغد
في يد انسان حملها الى
دار كدار السكة عندنا
فاخذ عوضها جددا ودفع
تلك ولا يعطى على ذلك اجرة
ولا سواها لان الذين يتولون
عملها لهم الارزاق الجارية
من السلطان وقد وكل بتلك
الدار امير من كبار الامراء
واذا مضى الانسان الى السوق

اور چین کے لوگ خرید و فروخت نہ اشرفیوں
سے کرتے ہیں اور نہ درہم سے اور اس ملک میں
جب یہ چیزیں آتی ہیں (یعنی درہم یا اشرفیاں)
تو اسے پگھلا کر ٹکڑے ٹکڑے بنا لیتے ہیں ان
لوگوں میں باہم خرید و فروخت کا ذریعہ کاغذ
کے ٹکڑے ہیں، ہر ٹکڑا اس کاغذ کا کف دست
کے برابر ہوتا ہے اور اس پر حکومت کی مہر
ہوتی ہے۔ ان ٹکڑوں کے پچیس کاغذوں
کے مجموعہ کو "بالشت" کہتے ہیں۔ بالشت ہمارے
یہاں کی اشرفی کے برابر ہے۔ جب یہ کاغذ
پھٹ جاتے ہیں تو جس کے ہاتھ میں یہ پھٹا
ہوا کاغذ ہوتا ہے اسے لے کر وہ ایک کوٹھی
میں لے جاتا ہے۔ یہ اسی قسم کی کوٹھی ہوتی ہے
جیسے ہمارے یہاں ٹکسال ہے۔ اور ان پھٹے
ہوئے کاغذوں کو داخل کر دیتا ہے معاوضہ
میں اس کو نئے کاغذ مل جاتے ہیں اور اس کی
کوئی اجرت اسے ادا کرنا نہیں پڑتی۔ کیونکہ
جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہے وہ
حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان مقامات کا
جہاں یہ کاغذ ڈھلتا ہے اور بدلا جاتا ہے متعلق

---

بقیہ صفحہ گزشتہ:۔ کوئی حقیقت نہیں، پھر جل جانے کے بعد بھی اس کو جلاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اس کی راکھ میں بعض دوسرے پتھروں کا سفوف ملا کر جو مواد تیار کرتے ہیں اسی سے چینی برتن بنتے ہیں۔ دیکھو ص ۲۱۵ ج ۲۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کے کوئلہ کا رواج بھی چینیوں میں عام تھا۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اسی راکھ سے کپڑے بھی دھوتے ہیں ۱۲

بدرهم فضة او دينار
شراء شئ لم يوخذ منه
ولا يلتفت اليه حتى يعرفه
بالشت ويشترى به
ما اراد.

(سفرنامہ ص ۱۹۵ ج ۲)

بڑے بڑے سارا حکومت سے ہے۔ کوئی
اگر چین کے بازار میں چاندی یا سونے کے
سے کچھ خریدنا چاہے تو لوگ ان کو قبول کرتے نہیں
یعنے ان کی طرف توجہ کرتے ہی جب تک
کہ بالشت سے ان کو بھنا نہ لے تب ہی
چیز کے خریدنے کا ارادہ کرے خرید سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ابن بطوطہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور آج کل کے نوٹوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔ ابن بطوطہ جس زمانے کا حال چین کے متعلق بیان کرتا ہے۔ اس وقت وہاں چنگیز خاں کی اولاد کی حکومت تھی۔ تاتاریوں کی تمام تاریخوں میں اسی بالشت کا ذکر آتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل اور تاتار میں زیادہ تر اسی کاغذی سکے کا رواج تھا۔

محمد تغلق کے متعلق بھی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ چرمی سکے کو ہندوستان میں اس بادشاہ نے مروج کیا تھا۔ کیا تعجب ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں ہی سے اس خیال کو اس نے اخذ کیا ہو۔ لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے جسے الکتانی نے بعض کتابوں سے نقل کیا ہے

ان عمر بن الخطاب رض كان
يستعمل الورق والجلود مكان
النقود للحاجة.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
ورق اور چمڑے کو نقود کی جگہ ضرورت
کے وقت استعمال کرتے تھے۔

(کتاب التراتیب الاداریہ ص ۴۲۴ ج ۱)

پھر مشہور اسلامی شاعر ابو تمام کا ایک شعر بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے جو یہ ہے :-

الم يشتد بـ عمر للابل يجعل من
جلودها النقد حتى عز ذا الذهب

کیا حضرت عمرؓ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا کہ
اونٹ کے چمڑے کو نقد کی جگہ استعمال کیا جائے
جب سونا نایاب ہو گیا تھا؟

(کتاب التراتیب الاداریہ ص ۴۲۴ ج ۱)

واللہ اعلم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن درایۃً میرے نزدیک یہ بات محل تعجب نہیں ہو سکتی۔ چین میں جب اس کا رواج عام طور پر پایا جاتا ہے اور عرب و چین میں جو تجارتی تعلقات تھے۔ کیا بعید ہے کہ ان ہی تاجروں سے یہ خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی ہو۔ اور بضرورت آپ نے کسی وقت اس طریقہ کو اختیار کیا ہو۔ ابو تمام کے شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت

ہی کے موقعہ پر حضرت عمرؓ نے اس کو اختیار فرمایا تھا۔ بہرحال چونکہ اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔ اور نہ اس عبارت کے سوا اور کسی دوسری چیز سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کر سکتے۔

**چک کا رواج** البتہ نوٹ ہی کے قریب قریب بنکوں کے چک کی جو کیفیت ہے، یہ تو ابتدائے اسلام یعنی عہد صحابہ و تابعین کی عام بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ چک دکھا کر عام بنکوں سے یا سرکاری خزانہ سے روپیہ برآمد کرانے کا عام رواج معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں جاری تھا۔ بلکہ خود "چک" کا یہ لفظ عربی کے "صک" کے لفظ ہی سے بنا ہے۔ اس موقعہ پر البیہقی کی ایک دلچسپ روایت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مشہور وجلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل اس قصہ کے راوی ہیں، فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| استعملنی ابن زیاد علی | مجھے بیت المال پر ابن زیاد گورنر کوفہ |
| بیت المال فاتانی رجل | نے مقرر کیا۔ تو میرے پاس ایک آدمی |
| بصك فيه اعط صاحب | چک لے کر پہنچا۔ جس میں تھا: بادرچی خانہ |
| المطبخ ثمانمائة درهم | کے داروغہ کو آٹھ سو درہم ادا کر دو۔ میں |
| فقلت مكانك ودخلت | نے اس شخص سے کہا ٹھہر جا۔ اور میں ابن |
| على ابن زياد فحدثته | زیاد کے پاس پہنچا۔ اس سے گفتگو کی۔ |

اس کے بعد اپنی پوری گفتگو انہوں نے نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں تین تین افسروں کے درمیان روزانہ صرف ایک بکرے کا راشن مقرر تھا۔ اس پر بھی حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ جس مال سے روزانہ ایک بکرا لیا جائے گا وہ جلد ختم ہو جائے گا۔ ابو وائل کا مطلب یہ تھا۔ کہ تم آٹھ آٹھ سو روپے خزانے سے صرف مطبخ کے داروغہ کو دلواؤ گے تو بیت المال کا آخر انجام کیا ہوگا؟ ابو وائل فرماتے ہیں، میں جب یہ کہہ چکا تو دیکھا کہ ابن زیاد مجھ سے کہہ رہا ہے

| | |
|---|---|
| ضع المفتاح واذهب | خزانے کی کنجی رکھ دو اور جہاں جی |
| حيث شئت (دسنن بیہقی) | چاہے چلے جاؤ! |

میری غرض اس قصہ کے نقل کرنے سے "چک" کے رواج کو بتانا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، کہ موجودہ زمانے کے چکوں اور اس زمانے کے "چک" میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے!

(۹) جیسا کہ میں نے عرض کیا زر خلقی و فطری اور زر صنعی کی اصطلاح تو ہمارے فقہا کے

ں بھی مروج ہے۔ ہدایہ وغیرہ عام فقہ کی کتابوں میں سونے اور چاندی کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں۔ یعنی لکونہ ثمنا خلقۃ (فتح القدیر ص ۲۷ ج ۵ کتاب الصرف) جس کا مطلب یہی ہے کہ دھات کی ان دونوں قسموں کے متعلق یہی طے کیا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو ثمن (دام اور قیمت) ہی بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ابن ہمام اسی کتاب الصرف میں ایک موقعہ پہ لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| واعلم ان الاموال تنقسم الی ثمن علی کل حال وھی الدراھم والدنانیر۔ (ص ۲۶۸ ج ۵) | معلوم ہونا چاہئے کہ الاموال کی چند قسمیں ہیں جن میں ایک قسم تو مال کی وہ ہے جو ہر حال میں ثمن (دام) ہی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ دراہم اور دنانیر ہیں۔ |

الدراہم سے مراد چاندی کے سکے ہیں اور الدنانیر سے سونے کے۔ پھر آگے چل کر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| وینقسم باعتبار الاصطلاح علی الثمنیۃ وھو فی الاصل سلعۃ فان کانت رائجۃ فھی ثمن لاتتعین بالتعیین وان کانت کاسدۃ فھی سلعۃ کالفلوس (ص ۱۱) | پھر ال کی وہی قسم جو ثمن (یعنی دام اور قیمت) کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی ایک قسم ذیہی ہے کہ فی الحقیقت ہے تو وہ سلعہ[1] لیکن لوگوں نے بطور دام کے اس کو چلانا شروع کیا پس جب تک وہ رائج رہتا ہے تو اس وقت وہ ثمن ہی سمجھا جائے گا یعنی معین کرنے سے معین نہ ہوگا۔ لیکن اگر رواج پذیر نہ رہا ہو تو پھر وہ معمولی سلعہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً الفلوس (یعنی پیسوں) کا یہی حال ہے! |

ں سے معلوم ہوا کہ الدراہم والدنانیر کے سوا اور جن چیزوں کو بطور سکے کے لوگ چلاتے ہیں ان

---

[1] سکے سے جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، عربی میں ان کو سلعہ کہتے ہیں۔ مثلاً کپڑے گھوڑے وغیرہ۔ اردو میں کوئی ں لفظ اس کے لئے نہیں ملا اپنے درس میں طلبہ کو اس کا ترجمہ سودا بتایا کرتا ہوں۔ یعنی جو چیز بعوض سکے کے بکتی ہے لیکن پھر بھی دل اس ترجمہ سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لئے اصل عربی لفظ ترجمہ میں بھی رکھ دیا گیا۔ سلعہ ہی کو فقہاء ں عروض بھی کہتے ہیں۔ یعنی علاوہ سکے کے عام طور پر استعمال اور برتنے کی چیزیں ۱۲

کی حیثیت مصنوعی زر کی ہے۔ البتہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو تو پبلک بطور سکے کے چلا دیتی ہے۔ مثلاً کوڑیوں کا رواج ہندوستان میں کچھ دن پہلے اسی حیثیت سے تھا یعنی حکومت کی طرف سے یہ مقررہ سکے کی حیثیت کوڑیوں کو نہیں دی گئی تھی۔ اور غالباً تانبے کے جو کھدرے ٹکے جو ان ہی کوڑیوں کے ساتھ ہندوستان میں مروج تھے۔ ان کی حیثیت بھی یہی تھی یعنی حکومت سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ ہمارے فقہا بھی ان کو پبلک ہی کی چلائی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ شرح ہدایہ ہی میں ایک موقعہ پر الفلوس کے بعض احکام کا ذکر کرتے ہوئے امام محمد کی طرف ان الفاظ کو منسوب کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| الثمنية فی الفلس تثبت | پیسے میں ثمن (دام) ہونے کی حیثیت عمل |
| باصطلاح الکل۔ (ص ۲۸۰) | (عام مخلوق) کی اصطلاح سے پیدا ہوتی ہے |

لیکن حکومت اگر کسی سکے کو الدراہم والدنانیر کے سوا مروج کر دے تو یہ تیسری قسم کے سکے کی ہوگی، گویا زر مصنوعی وضعی کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تو وہ جنہیں لوگ باخود طور سکے کے چلاتے ہوں۔ اور دوسری قسم ان سکوں کی ہوئی جو سونے چاندی کے تو نہ ہوں لیکن حکومت نے ان کو چلایا ہو۔ بہرحال ان کی حیثیت وضعی اور مصنوعی سکے ہی کی ہوگی۔ ابن ہمام نے الفلوس کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| الفلوس فی الاصل عروض | پیسے اپنی اصل حقیقت کے اعتبار |
| (فتح القدیر ص ۲۰۸) | سے عروض ہی ہیں! |

(یعنی سکے ہونے کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں)

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز کا پتہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں دیا ہے۔ یعنی لکھتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وکثیرا ما یتمدون جواهر | بسا اوقات بڑی رقموں کی جگہ |
| بدلا من الکثیرة فاذا عزم | لوگ جواہرات سے کام لیتے تھے |
| احدهم علی سفر طویل | مثلاً کسی طویل سفر پر جانا ہے جہاں |
| لیستغرق نفقه عشرة الاف | دس ہزار رقم کے مصارف کی ضرورت |
| دینار مثلا فبدلا من ان | ہوتی تو سونا یا چاندی کی جگہ ایک |
| یحمل ذلک ذهبا او فضة | یا چند عدد جواہرات رکھ لیتے اور |

| | |
|---|---|
| استبدل له بجهة ارعدة | مقام مقصود پر پہنچ کر اسے |
| جواهر ليسهل حملها في الجيب | فروخت کر کے پھر اسی رقم کو |
| فاذا وصل الى البلد المقصود | صرف کرتے! |
| باع الجواهر وانفق ثمنها! | |

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کو بیان کرنے کے بعد میز خود لکھتا ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| كما يفعل الناس اليوم | جیسا کہ اس زمانے میں لوگ مالی کاروبار |
| بتحاويل المالية او البنك | میں چیکوں اور بنک کے نوٹوں سے |
| نوط! (الحضارة الاسلامية ص ٥٠ ج ٢) | کام چلاتے ہیں۔ |

لیکن اس تدبیر کے سوا بھی ایک اور طریقہ مسلمانوں میں جاری تھا جو دوسری قوموں کے میل جول سے انہوں نے بھی قبول کر لیا تھا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو "سفتجہ" کہتے ہیں۔ جس کی جمع "اسفاتج" ہے۔ غالباً یہ کسی فارسی لفظ کا معرب[1] ہے۔ چونکہ یہ تجارتی کاروبار کی چیز ہے اس لئے سفاتج التجار کے نام سے بھی اس کو موسوم کرتے ہیں اور یہ وہی "ہنڈی" ہے جو اب بھی دُنیا میں اس لئے مروّج ہے کہ روپیہ کی منتقلی میں اس سے آسانی بھی ہوتی ہے۔ نیز راستہ کے خطرات سے بھی مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ ہی میں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ اثر نقل کیا ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| ان عبد الله بن الزبير كان | عبداللہ بن زبیر لوگوں سے مکہ میں درہم |
| ياخذ من قوم بمكة دراهم | لیتے اور مصعب بن الزبیر کے نام اس |
| ثم يكتب بها الى مصعب | کی ہنڈی لکھ کر دیتے جو عراق کے گورنر |
| ابن الزبير بالعراق فياخذ | تھے اور وہ شخص اتنی رقم مصعب سے عراق |
| منه. | پہنچ کر وصول کر لیا کرتا تھا! |

اسی طرح ایک روایت ابن عباسؓ کے متعلق بھی یہ درج کی ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| سئل ابن عباس عن ذلك | ابن عباس سے ہنڈی کے متعلق پوچھا گیا، تو |
| فلم يربه باس. | انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے! |

---

[1] سفتہ دراصل فارسی لفظ ہے۔ شاید ہنڈی کے کاغذ وغیرہ کو سختی کرتے ہوں۔ اس لئے سفتجہ نام ہوا ۱۲

بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| وروی فی ذلک ایضاً عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (سنن بیہقی کتاب البیوع) | ہنڈی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض روایت بیان کی گئی ہے۔ |

مگر باوجود ان تمام باتوں کے فقہاء عموماً اور حنفی فقہاء خصوصاً کیوں اس شکل کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتے رہے "تذبذب" کے اسباب کیا تھے۔ کیا ان کو اس کا اندیشہ تھا کہ بتدریج ہنڈی کی یہ شکل نوٹ کی صورت شاید نہ اختیار کر لے اور نوٹ کے جن نقصانات کو باوجود منافع کے آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ کیا یہ خطرات اُن کے سامنے آگئے تھے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہنڈی میں ان کو گونہ "ربوا" کی بُو آتی تھی کیونکہ پہلے زمانے میں، بلکہ شاید اب بھی اس میں زیادہ تر یہ کیا جاتا تھا کہ لوگ ایک شہر میں روپیہ بطور قرض کے لیتے تھے اور ہنڈی لکھ کر قرض خواہ کو دے دیتے تھے کہ وہ دوسرے شہر میں اُن کے نمائندے سے وصول کر لے۔ قرض دینے والا اس ذریعہ سے اپنے روپوں کو راہ کے خطرات اور بار برداری کے مصارف سے محفوظ کر لیتا تھا۔ گویا قرض دے کر مقروض سے نفع اٹھاتا تھا گو حقیقی سود کی تو یہ شکل نہیں ہے لیکن ایک قسم کا غیر مادی نفع قرض دینے والے کو ضرور پہنچتا ہے۔ چونکہ فقہاء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مشہور ہے کہ

| | |
|---|---|
| کل قرض جر نفعا فھو ربوا۔ | ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے، سُود ہے! |

اس حدیث کی بناء پر "سفتجہ" کو بھی انہوں نے مکروہ قرار دیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا حدیث خواہ فقہاء میں کس درجہ بھی مشہور ہو، مگر محدثین کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے راویوں میں سوار بن مصعب ایک ایسا شخص ہے جس سے حدیث روایت کرنی محدثین نے ترک کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور روایت بھی ہے جسے مشہور صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی سمرہ بن جندب کہتے تھے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

| | |
|---|---|
| السفتجات حرام۔ | ہُنڈیاں حرام ہیں! |

ابن جوزی نے اس روایت کا شمار "موضوعات" میں کیا ہے اور واقعہ بھی کچھ ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ عہدِ نبوت میں "سفتجہ" کے لفظ کا سراغ نہیں ملتا۔ نیز اس کے راویوں میں عمر بن موسےٰ انتہا درجہ کا غیر معتبر آدمی ہے۔ اور یہ کراہت ان ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال روایات کی بنیاد پر "سفتجہ" کی حرمت کراہیت تک کا فیصلہ مشکل ہے۔ البتہ ربوا کے کلی قواعد کے تحت چونکہ "کل قرض جر نفعا فھو حرام" کے اصول کو عہدِ تابعین میں تسلیم کر دیا گیا تھا جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عطار سے مصنف بن ابی شیبہ میں منقول ہے۔ اس نے ایسے "سفتجے" جو قرض لینے کے بعد کسی کو دیئے گئے ہوں۔ ان کو مکروہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا روپیہ کسی بنک یا سیٹھ ساہوکار کی دکان میں جمع کر دے اور بنک سے چک لے کر یا ساہوکار سے ہنڈی لے کر دوسرے شہر میں وصول کرے، یا جیسے آجکل منی آرڈر کا اصول ہے کہ آدمی ڈاکخانے میں روپیہ جمع کرا دیتا ہے ڈاک والے اس کے اس "منی آرڈر" کو مقامِ مطلوب میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کر دیتا ہے۔ بظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

فقہار حتیٰ کہ حنفی فقہار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرض ہی روپیہ دیا جائے، لیکن قرض دینے میں ہنڈی کی شرط نہ ہو، اور بعد کو ہنڈی لکھ دی جائے کہ اس قرض کو فلاں شہر میں فلاں شخص کو دکھا کر وصول کر لینا تو جائز ہے!

ابن ہمام نے "الواقعات" وغیرہ فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ ؎

| | |
|---|---|
| ان اقرضہ بغیر شرط | اگر بغیر کسی شرط کے قرض دے |
| وکتب جاز۔ | اور پھر ہنڈی لکھ دی جائے |
| (فتح القدیر ص ۲۵۴ ج ۵) | تو جائز ہے۔ |

کفایۃ البیہقی سے ابن ہمام ہی نے یہ جزئیہ بھی نقل کیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| ان یقرض مطلقا | اگر مطلقاً قرض دے، پھر ہنڈی |
| ثم یکتب السفتجہ | لکھ کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ |
| فلا باس بہ۔ | نہیں ہے! |

اور جب قرض کی صورت میں بھی غیر مشروط ہونے کے بعد سفتجہ جائز ہے، تو جہاں قرض نہ ہو وہاں اسے بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔

ذیلی مباحث میں جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ "عشر" یا "چنگی" یا ہماری حکومت (حیدرآباد دکن) کی اصطلاح میں جس کا نام "کروڑگیری" ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ لیکن جرجی زیدان نے اپنی کتاب "التمدن الاسلامی" میں اس سلسلہ میں ایسا طرز تعبیر اختیار کیا ہے جس سے مغالطہ کا اندیشہ ہے۔ مسئلہ کو صاف کرنے کے لئے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

جرجی زیدان نے اسلامی حکومتوں کی آمدنیوں کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا داخل کے سا چند جدید چیزوں کا اضافہ "توابع الخراج" کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں اس نے معدنیات، اجمات (نیستان) وغیرہ کے محصولوں کے ساتھ، جن کا ذکر اپنے اپنے موقعہ پر میں کر چکا ہوں۔ "اعشار السفن" (جہازوں کی چنگی) "اعشار المراصد" (ناکوں کی چنگی) کو بھی درج کیا ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ عام عشر کے سوا شاید مسافروں پر اسلامی حکومتیں کوئی جدید قسم کے ٹیکس عائد کرتی تھیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی عشر ہے جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ مسلمانوں سے دوسری چیزیں یعنی مویشی و کاشت سے الصدقات کے مد کا محصول بنام زکوٰۃ و عشر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح تجارتی اموال سے زکوٰۃ بحساب چالیس فی صدی وصول کی جاتی تھی۔ پھر کبھی یہ زکوٰۃ دکانوں سے وصول ہوتی تھی۔ اور کبھی تری یا بحری گذرگاہوں سے۔ جب کوئی تجارتی مال گذرتا تھا۔ اس سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اور "پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلم کی دکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے۔ تو ان سے بجائے زکوٰۃ کے چالیس فی صدی کے حساب سے خراج کے طور پر محصول لیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تجار جب اسلامی علاقہ میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو علاوہ یہ مقرر تھا کہ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی۔ اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی تھی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہیں لیتی ہے۔ البتہ اگر ان کی حکومت کا طرز عمل معلوم نہ ہوتا تھا۔ مثلاً وہاں مسلمان تجارت کے لئے کبھی نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ کسی نوعیت کے ہوں

دس فی صدی کے حساب سے وصول لیا جاتا تھا۔ لیکن غیر مسلموں سے جو یہ آمدنی ہوتی تھی اس کو خزانے میں خراج کے فنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ بخلاف مسلمانوں کے تجارتی اموال کی آمدنی "الصدقات" کی مد میں جمع ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ دراصل ان کے تجارتی مال کی زکوٰۃ ہوتی تھی قاضی ابو یوسف "کتاب الخراج" میں لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وکل ما اخذ من المسلمین من العشور فسبیله سبیل الصدقه وسبیل ما یوخذ من اھل الذمة واھل الحرب جمیعا سبیل الخراج! (ص ۷۸) | مسلمانوں سے العشور (چنگی) کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے اس کا شمار زکوٰۃ کی مد میں ہوگا اور اسلامی حکومت کی غیر مسلم ذمی رعایا کے مال سے جو العشور وصول کیا جاتا ہے یا دار غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا یعنی حربیوں سے جو العشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج کی مد میں ہوگا۔ |

خلاصہ یہ ہے کہ اموال تجارت اسلامی ملک میں کسی راستے سے آئیں، بری ہوں یا بحری ان سے وہی ایک "عشر" والی مد کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا جرجی زیدان کا عشر السفن، عشر المراصد وغیرہ کو الگ الگ کر کے بیان کرنا ایک قسم کا مغالطہ ہے۔ نہ صرف مسلمانوں، بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اس کا خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ کہ سال بھر میں ایک ہی مال پر دو دفعہ قطعاً محصول وصول نہ کیا جائے۔ مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے چنگی کے عامل نے دو دفعہ محصول وصول کر لیا۔ عیسائی حضرت عمرؓ کے پاس سیدھا دوڑا ہوا پہنچا۔ آپؓ اس وقت بتقریب حج مکہ میں تھے۔ مل کر شکایت کی۔ اس وقت آپ نے عامل کو سخت ڈانٹ کہلا بھیجی اور اس کا مال واپس دلایا گیا۔ مدت کے بعد یہی عیسائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا کہ:۔

| | |
|---|---|
| انا الشیخ النصرانی الذی کلمتک فی نیاد. | میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے تم سے زیاد (عشار) کے متعلق بات کی تھی۔ |

حضرت عمرؓ نے اسی لہجہ میں جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| وانا الشیخ الحنیف الذی قضیت حاجتک (کتاب الخراج) | میں بھی تو وہی حنیفی بوڑھا ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی۔ |

واقعہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے تاجروں کے ساتھ اسلامی حکومت رواداری اور انصاف کا ایسا برتاؤ کرتی تھی کہ دُور دراز ممالک کے باشندے خصوصاً سمندر پار ممالک جاتے ہوئے اب تک گھبراتے تھے۔ عدلِ فاروقی کا شہرہ سُن کر انہوں نے اسلامی ممالک میں پہنچ کر تجارت کرنے کی خود درخواست کی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ:۔

ان اهل منبج قوم من اهل الحرب وراء البحر كتبوا الى عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه دعنا ندخل ارضك تجارا وتعشرنا

منبج کے لوگ جو غیر اسلامی قلمرو کے باشندے تھے انھوں نے سمندر پار سے حضرت عمرؓ کے پاس درخواست بھیجی کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ آپکے ملک میں سوداگری کیلئے ہم داخل ہوں اور ہم سے چُنگی وصول کیجیے!

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ:۔

فقد كان عمال اليمن يأخذون هذه الضريبة من السفن التى تمر بسواحلهم قادمة من الهند تحمل الاعواد المختلفة والمسك والكافور والعنبر والصندل الصينى

یمن کے عمال (کروڑگیری والے) اس محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے جو ان کے ساحلوں پر ہندستان سے آتے ہوئے گذرتے تھے جن پر خوشبو دار لکڑیاں مختلف قسم کی مُشک کافور، عنبر صندل چینی وغیرہ ہوتے!

میرا خیال ہے کہ جرجی زیدان کو جو یہ مغالطہ ہُوا کہ معمولی محصول " جو تجارتی اموال پر مسلم غیر مسلم ہر قسم کے سوداگروں سے لیا جاتا تھا اس سے "عشر السفن" کوئی الگ چیز تھی۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں امن وامان کی فراوانی، عام فراغبالی وثروت کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کے طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تجار مسلمانوں کے ملکوں میں تجارت کے لئے آتے جاتے رہتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بڑی کافی آمدنی حکومت کو ہو جاتی تھی۔ جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ:۔

قد بلغت اعشار السفن فى ايام الواثق بالله مالا كثيرا.

واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں کے محصول کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی!

بلکہ زیدان کا خیال تو یہ ہے کہ زمین ممالک کے تجار ابنائے جبل الطارق پر بحیثیت اس محصول کے ادا کرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں TAREF کا جو لفظ مغربی زبانوں میں تجارتی محصول کے لئے مستعمل ہے کیا عربی کے لفظ "طریف" جو جبل الطارق کی کسی چنگی چوکی کا نام تھا اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یا "تعریفہ" سے ٹیرف بنا ہے۔ بہر حال عشور کے متعلق اس غلط فہمی کا ہمیں ازالہ مقصود تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں جرجی زیدان نے بعض نئے ناموں کے محاصل کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں ایک کا نام "غلہ دار الضرب" ہے یعنی سرکاری ٹکسالوں میں لوگ اپنی اپنی چاندی یا سونا جمع کر کے سکوں کی شکل میں ڈھلواتے تھے۔ اور لکڑی، آگ، محنت وغیرہ کے معاوضہ میں فی صد ایک درہم دیا جاتا تھا۔ جرجی زیدان کا بیان ہے کہ یہ بھی اسلامی حکومتوں کے مداخل کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ہر ہر صوبہ جاتی اسلامی مرکزوں میں ٹکسال بنے ہوئے تھے۔ مخلوق ان میں اپنے سکے ڈھلواتی تھی۔ چونکہ بمقدار کثیر سکے ڈھلتے تھے۔ حتیٰ کہ صرف ایک شہر اندلس کے متعلق اس نے لکھا ہے۔ کہ کسی کسی سال میں ایک ایک کروڑ طلائی سکے ڈھالے جاتے تھے۔ جرجی کے قلم سے اضطراراً یہاں پر یہ الفاظ ٹپک پڑے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وذلک نحو ضعفی ما تضربہ | انگریزی حکومت جو اس وقت اپنے عنفوان |
| دولۃ الانکلیز الیوم | شباب میں ہے وہ سالانہ جتنے سکے |
| فتأمل مجدہا! | ڈھالتی ہے یہ اس کی چوگنی رقم ہے |

اور پھر حیرت سے پوچھتا ہے کہ جب ایک اندلس کا یہ حال تھا تو مصر و بغداد وغیرہا من المدن الاسلامیہ کا اس باب میں کیا حال ہوگا؟

ظاہر ہے کہ دار الضرب کی بنیاد خلافت بنی امیہ کے زمانے میں باضابطہ شکل میں قائم ہوئی۔ ورنہ اس سے پہلے عموماً اسلامی ممالک میں رومی و ایرانی سکے چلتے تھے جنہیں دنانیر قلبہ اور دراہم کسرویہ بھی کہتے تھے۔ اس نے رعایا پر اس مزید محصول کا اضافہ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کی بات تو نہیں ہو سکتی۔

اب تک اس محصول کے متعلق کوئی تصریح مجھے اسلام کی قانونی کتابوں میں نہیں ملی۔ البتہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے والی (گورنر) عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کو خراج

کے وصول کرنے میں رعایا کے ساتھ ملائمت و نرمی کی تاکید کرتے ہوئے اقدام فرمایا کہ خراج کی مد میں مندرجہ ذیل محصل کو ہرگز رعایا سے نہ لو، یعنی

| | |
|---|---|
| اجور الضرابین ولا اذابة | سکہ ڈھلانے والوں، اور چاندی |
| الفضة ولا ھدیة النیروز | کے پگھلانے کی مزدوری نہ لی جائے |
| ولا مہرجان ولا ثمن الصحف | اور نیروز و مہرجان دخیر اسلامی تہواروں) |
| ولا اجور الفتوح ولا اجور البیوت | کا ہدیہ بھی نہ لیا جائے۔ اور نہ کاغذ |
| ولا دراھم النکاح ولا خراج | کے دام لئے جائیں اور نہ گھروں کا ٹیکس |
| علی من اسلم من اھل | اور نہ نکاح کا لگان اسی طرح باشندگان |
| الارض۔ (کتاب الخراج ص ۱۹) | میں جو مسلمان ہو جائیں ان پر بھی خراج نہ عائد ہوگا! |

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر کے خلفاء بنی امیہ کے زمانے میں کچھ اس قسم کے نئے محصولوں کا گذشتہ حکومتوں کی تقلید میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بلکہ "ثمن الصحف" کے مستثنیٰ کرنے کا کچھ واضح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول نہ لیا جائے ـــ یا حکومت میں بہ سلسلۂ مقدمات کاغذی مصارف کا صرفہ رعایا سے وصول کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں عدالتی محکموں تک میں کورٹ فیس ہر بیچارے دادخواہ سے وصول کی جاتی ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس محصول کو معاف کر دیا تھا۔

بہر حال حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس مکتوب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نائب ثر الموارب میں "اجور الضرابین واجور اذابۃ الفضۃ" بھی ہے۔ اگرچہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آخر سکہ بنا کر تولنے کی بار بار جھنجھٹ سے اور کاٹنے، گھٹانے، بدلنے وغیرہ کے دخل وعمل سے حکومت لوگوں کو مطمئن کر دیتی ہے اور اس کے صلہ میں ایک فی صدی اگر اُجرت لیتی ہے تو اس کو بجائے جبایات الظلم کے "السوائب" میں کیوں شریک نہ کیا جائے۔ جس کے عائد کرنے کا ذکر گذر چکا کہ حکومت کو قانوناً اختیار ہے:

# صرفِ دولت

حدیث من این اکتسبہ کی تفصیل کے بعد فیما انفقہ کے ٹکڑے کی اب توضیح باقی رہ جاتی ہے اور اب آئندہ صفحات میں ہم اسی کے متعلق مختصر الفاظ میں اسلام کے نقاطِ نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گو عام مذاہب و ادیان میں مال و دولت کی بہت کچھ مذمت کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مذہب اور دُنیا کی نفرت دونوں تقریب تقریب ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے ہیں اور اسلامی مستندات میں بھی اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مولانا روم کے مشہور شعر چیست دنیا وا ے نے تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان تک اس دُنیا کا صحیح مطلب پہنچا دیا ہے۔ جس کی اسلام نے مذمت کی ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ اگر دولت کمانے میں آدمی خدا سے غافل نہ ہو اور اکتساب دولت کے جن قوانین کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے۔ اگر ان قانونی جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود سے لاپروائی نہ برتی جائے تو صرف حدیثوں میں نہیں، بلکہ قرآن میں بھی:۔

اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما! — تمہارا مال جسے خدا نے تمہارے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے!

کے عجیب و غریب جامع مانع الفاظ میں "مالی قوت" کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ گویا حق تعالیٰ کی ذات جس طرح سمٰوات و ارض کی قیوم ہے۔ اسی "قیومیت" اور بقاء کا ایک حصہ اس عالمِ مجاز میں "اموال" کو دیا گیا ہے۔ یعنی بنی آدم کے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ مال ہے، یہ قرآن کا نظریہ ہے۔

انسانیت کی ہر آرزو اور اس کی تمنائیں زیادہ تر مالی قوت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں اس لئے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ:۔

الدراہم والدنانیر خواتم — درہم اور دنانیر (روپیہ و اشرفی) اللہ کی

الله فی الارض من جاء غائم | بھولی ہیں۔ جو اپنے ملک کی خیر لے کر
مولاہ قضیت حاجته۔ | آئے گا۔ اس کی حاجت پوری ہوگی

(طبرانی فی الاوسط)

قدرت کی ایک ایسی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے، کہ ہم اس کو صرف کرتے ہیں پوری احتیاط اور بیداری سے کام لیں۔ اگرچہ یوں بھی قدرت نے انسانی فطرت میں مال کی حفاظت وحمایت کا جذبہ محفوظ کر دیا ہے۔ قرآن ہی میں ہے:۔

احضرت الانفس الشح | نفوس انسانی لالچ کے سامنے حاضر کی گئیں!

انسان کا یہی فطری شح (اور دولت کی لو) ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف دولت میں لوگ اتنی لاپروائی نہیں برتتے جتنی حصولِ دولت میں عموماً برتی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے، کہ صرف دولت پر اسلام نے اتنی پابندیاں عائد نہیں کی ہیں جتنی حصولِ دولت میں عائد کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی صرفِ دولت کے سلسلہ میں اسلام کا جو "ہدایت نامہ" ہے، گو وہ مختصر ہی سہی تاہم جو کچھ بھی اس باب میں ہدایتیں دی گئی ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے آدمی اس وقت تک اُن نکات تک نہیں پہنچا ہے۔

"صرفِ دولت" کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے چند سوالات کو رکھ لینا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس جب جائز اور قانونی ذریعے سے دولت جمع ہوگئی تو قدرتاً اس کے سامنے دو سوالات آتے ہیں یا ان کو آنا چاہیئے۔

کن کن چیزوں پر اس دولت کو نہ صرف ہونا چاہیئے۔ جب اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے تب اس کے بعد دُوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر کن چیزوں پر اس کو صرف کرنا چاہیئے۔ اور یہی دُوسرا سوال ہے۔ گویا پہلے سلب پھر ایجاب کی تحقیق ہونی چاہیئے۔

پہلے ہم سوالِ اوّل کو لیتے ہیں۔ یعنی اسلام کن چیزوں پر صرفِ دولت سے آدمی کو منع کرتا ہے۔

**تبذیر** ظاہر ہے کہ جب ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسلام دولت کمانے کی اجازت نہیں دیتا تو پھر ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں بھی صرفِ دولت کی وہ کیسے اجازت دے سکتا ہے۔ الغرض قانوناً جن افعال و اعمال سے اسلام نے روکا ہے۔ ان راہوں پر صرفِ دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے۔ قرآنی آیت ہے:۔

ولا تبذر تبذیرا ! اور غلط مصارف پر ہرگز خرچ نہ کرو !

میں صرف دولت کے اساسی، انتظامی قانون کا اعلان کیا گیا ہے۔ اگرچہ عام طور پر "تبذیر" اور "اسراف" کو لوگ ہم معنی خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا کہ صرف دولت کے یہ دو مستقل دفعات ہیں۔ فضول خرچی کے معنی تو یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔

مثلاً اگر کسی کا پیٹ جَو کی روٹی سے بھر سکتا ہے۔ گیہوں کی روٹی کھانا اس کے لئے بایں معنی فضول خرچی ہوئی۔ پھر کیا اسلام میں یہ جرم ہے ؟ گذر چکا کہ اسلام جب زیب و زینت اور آرائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جَو کے جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اس کو اسلام میں "مبذر" کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جب اسی آیت کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو

| | |
|---|---|
| ان المبذرین کانوا اخوان | تبذیر کرنے والے شیاطین کے بھائی |
| الشیاطین وکان الشیطان | ہیں۔ اور شیطان تو اپنے رب کا |
| لربہ کفورا ! | ناشکرا ہے ! |

قرار دیا ہے۔ "شیطان کا بھائی ہونا" اور اس کی صفت "کفوریت" میں مبذرین کو شریک کرنا یہ سزا کیا اس شخص کی قرآن مقرر کر سکتا ہے۔ جو بجائے جَو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ "تبذیر" کا مادہ "بذر" ہے۔ بذر کے معنی تخم کے ہیں۔ تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں۔ پھر جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے۔ اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کہ دانے کہاں گریں گے۔ کہاں نہ گریں گے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے۔ جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے۔ یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے۔ لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے۔ جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے۔ کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور

شر کے حصول میں صرف کرتا ہے۔ اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا قرار پایا۔ یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل "تبذیر" کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کیلئے انسان کو دیا گیا ہے۔ اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کرنا مثلاً شاہد بازی، حرام کاری، شراب خواری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے۔ وہ مبذر ہے۔ پس "تبذیر" کے حقیقی معنی یہی ہیں رہا اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ اپنے محل پر اس کا ذکر آئے گا۔ تعجب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں تبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر دونوں ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دُہرانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ جب "تبذیر" کی حقیقت واضح ہو گئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت میں داخل ہے۔ اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہیئے۔ اور سمجھ لینا چاہیئے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

ولو دانقا[۱]      اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو!

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے، جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے، اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے حالانکہ ایسا دُنیا میں کون ہے؟

"تبذیر" کے بعد صرف دولت کے متعلق اسلام میں اور بھی دو امتناعی قانون ہیں جن میں ایک کی تعبیر اسراف سے اور دُوسری کی تعبیر ریاء الناس سے کی جاتی ہے۔ طبعی ترتیب کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ان دونوں قوانین کی تشریح بھی اسی وقت کر دی جائے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ان دونوں قوانین کی صحیح حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے

---

[۱] تنویر المقیاس ص ۱۲۵ جلد ۲ برحاشیہ درمنثور ۱۲

جب ہم پہلے صرفِ دولت کے ایجابی سوال کو سمجھ لیں۔ اس لئے خلاف ترتیب میں اسوقت ان دو لوں سے الگ ہو کر دُوسرے سوال کو چھیڑ دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا سلبی سوال کے بعد دُوسرا مرتبہ ایجابی سوال کا ہے:

### کن چیزوں پر دولت کو صَرف کرنا چاہیئے؟

اسلام کے لئے یہ بڑا دل چسپ سوال ہے۔ یعنی اس باب میں دُنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے خاص نقاطِ نظر پیش کئے ہیں۔ پہلی خصوصیت تو اس باب میں اسلام کی وہی ہے۔ جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یعنی اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ جیسا کہ عموماً دُنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے۔ حتیٰ کہ کھانا جتنے دن آدمی چھوڑ دے، پانی ترک کر دے، سانس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک بدن سے اتار سکتا ہو اتار دے گویا ان ہی چیزوں کو مذہبی جذبے کے افراط کا ثبوت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں بار بار دُہراتا چلا آ رہا ہوں کہ ضرورت تو بہرحال ضرورت ہے۔ اسلام زینت و آرائش کے حدود تک بھی جانے والوں کو مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لئے تیار ہے۔ سلیمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوّت تک مل سکتی ہے۔ رسُول علیہ السلام کے خلیفہ برحق بھی "الغنی" کے لقب کو اپنے لئے باعثِ فخر قرار دے سکتے ہیں اور یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں، جو کچھ اب تک اس سلسلہ میں کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

دُوسری خصوصیت اس سے بھی عجیب تر یہ ہے۔ کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے بھی دو حصّے کر دیئے ہیں۔ ایک دینی مصارف دُوسرے دنیوی مصارف لیکن اسلام نے اس تقسیم ہی کو حذف کر دیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جنہیں عام طور پر دنیوی مصارف میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے تمام مصارف جنہیں عام طور پر دینی مصارف خیال کیا جاتا ہے دنیوی بن سکتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرفِ دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دو دفعہ ماذا ینفقون (کیا خرچ کریں)، کے الفاظ میں استفسار کیا۔ اس سوال

کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن نے دیا ہے وہ یہ ہے :۔

قل ما انفقتم من خیر — کہہ خیر سے جو کچھ تم خرچ کرو

یعنی خیر اور نیکی کی راہ جسے عموماً دینی مصارف بھی کہتے ہیں، اگر اس کے متعلق تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا یہ خیر اور خیرات ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا، یہ بھی دینی خرچ ہے، اور اپنے خاندان والوں، مثلاً والدین یا اقربا، اعزا، پر خرچ کرنا یہ بھی "خیر" ہے۔ "خیر" کے معنی عربی میں "مال" کے بھی آتے ہیں۔ اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں بھی اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے :۔

وما تنفقوا من خیر فان — اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ کرو گے

اللہ بہ علیم۔ ! — تمہارا اس سے باخبر ہے!

میں "خیر" کے جو معنی یہاں مراد ہیں اس کو متعین کر دیا گیا ہے کہ "خیریت" اور "نیکی" کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے متعلق کیا جانتے ہیں! یعنی اگر تم نے اپنے اقربا، اور خاندان والوں پر اس لئے خرچ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ جو بظاہر دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے۔ دینی خرچ ہے اور یتامیٰ و مساکین پر جو تم صرف کر رہے ہو اگر اس سے خدا کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے۔ تو گو بہ ظاہر وہ کتنا ہی بڑا دینی صرف سمجھا جائے لیکن پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہی ہے۔ قرآن میں تو اس کی طرف کلیاتی رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو تفصیلات اس باب میں ارشاد فرمائی ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں ان کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

اس اصول کی تشریح میں کہ عام طور پر جسے دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے صرف نیت اور نقطۂ نظر کی تصحیح سے وہ بھی دینی خرچ بن جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

ان المسلم اذا انفق علی — اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے

اھلہ نفقۃ وھو یحتسبھا — رکھ کر خرچ کرتا ہے یہ اس کی طرف سے

کان لہ صدقۃ (بخاری مسلم) — صدقہ ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ دینی خرچ بن جاتا ہے بلکہ تمام دینی مصارف میں اس دنیوی خرچ کو برتری

حاصل ہے۔ فرمایا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| دینار انفقته فی سبیل الله | وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ |
| دینار انفقته فی رقبة | کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں |
| دینار تصدقت به علیٰ | صرف کی اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے |
| مسکین ودینار انفقته | صدقہ کی اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی بیوی پر |
| علیٰ اهلک اعظمها اجر | خرچ کی ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر |
| الذی انفقته علیٰ اهلک | کے حساب سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے |
| (بخاری مسلم) | اپنی بیوی پر خرچ کیا! |

اور بیوی بچوں کو تو خیر ایک حد تک غیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا کہ آدمی خود اپنی ذات پر جو دولت صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے۔

| | |
|---|---|
| ما اطعمت نفسک فهو | تم نے خود اپنے کو جو کھلایا یہ بھی تمہاری |
| لک صدقة ما اطعمت | طرف سے صدقہ ہے جو اپنی اولاد کو کھلایا |
| ولدک فهو لک صدقة | یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور اپنی |
| ما اطعمت زوجک فهو | بیوی کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے |
| لک صدقة ما اطعمت | صدقہ ہے اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی |
| خادمک فهو لک صدقة | تمہاری طرف سے صدقہ ہے۔ |

خلاصہ یہ ہے کہ "احتساب" (یعنی حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کو اپنے دھیان میں سامنے رکھ کر) تبذیر کے سوا دولت کے تمام مصارف "صدقہ" اور دینی خرچ ہیں۔ گویا مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا ایک مصداق یہ بھی ہے۔ لیکن "صدقہ" کے باب میں "احتساب" کا مفہوم کتنا وسیع ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے مسند احمد کی اس حدیث کو رکھ لینا چاہئے۔ جس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ۔

| | |
|---|---|
| ومباضعتک اهلک صدقة | تیرا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا |
| | یہ بھی صدقہ ہے! |

حضرت ابوذرؓ نے اس پر سوال کیا کہ :-

| | |
|---|---|
| انصیب شھوتنا ونوجر ؟ | ہم اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں اور ثواب بھی دیا جاتا ہے ؟ |

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا :-

| | |
|---|---|
| لو وضعتہ فی غیر حقہ کان علیہ وزر - | تم سمجھتے ہو کہ اگر اس خواہش کو بے موقعہ تم پورا کرتے تو کیا اس کا گناہ تم کو نہ ہوتا ؟ |

ابوذرؓ نے عرض کیا جی (کیوں نہیں) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احتساب" کے اس معنی کو بیان فرمایا۔ جس کے بعد تقریباً ہر مسلمان کا جائز فعل صدقہ بن جاتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ :-

| | |
|---|---|
| تحتسبون بالسیئۃ ولا تحتسبون بالخیر ! | تم لوگ برائی کا احتساب کرتے ہو اور خیر و نیکی کا احتساب نہیں کرتے ! |

"الغرض" اپنے مال کو جو آدمی نہ استعمال کرکے جو خود اپنے اوپر، اپنے عیال پر، خاندان پر خرچ کرے گا۔ یہ سارے مصارف "صدقہ" اور دینی مصارف میں شمار ہوں گے۔

**رئاء الناس** لیکن ٹھیک جس طرح دنیوی مصارف "احتساب" کے قانون کی بنا پر دینی مصارف بن جاتے ہیں : بعینہ ہمارے تمام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنی "تبذیر" کے تحت داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے ؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے :-

| | |
|---|---|
| الذین ینفقون اموالہم رئاء الناس ولا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر و من یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا ! | جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو دکھا کر اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا ساتھی شیطان ہو اس کا بہت برا ساتھی ہے ! |

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے۔ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ "الناس" (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے۔ اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ معاد،

جزا ہے، بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، قبیلے، بستی یا شہر میں یا دُنیا میں نام آوری حاصل کرنا، اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا، اس شخص کے ساتھ وہی بدخود غلط طاقت، یعنی شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر اسی طریقہ سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ اسی ریاء الناس والے خرچ کے متعلق ارشاد ہے کہ

| | |
|---|---|
| مثلہ کمثل صفوان علیہ | اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان |
| تراب فاصابہ وابل فترکہ | پر گرد ہو، اور اس پر بادل برسے، پھر |
| صلدا لا یقدرون علیٰ شئ | اسے سپاٹ بنا کر چھوڑ دے، ایسے لوگ |
| مما کسبوا واللہ لا یہدی | جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر |
| القوم الکافرین! | قابو نہیں رکھتے اور ناشکروں کی خدا |
| (آل عمران) | رہنمائی نہیں کرتا! |

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والی تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری زور آزمائیوں کا اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا، ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا۔ اور سب صاف۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گنڈوں اور لاٹھیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جا پڑے لڑکے کی ختنہ یا شادی کی یاد ٹھونسنا چاہتے ہیں، خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے۔ تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل ریاء الناس کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یہ اپنے تمام مصارف خواہ بظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک مدرسہ میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کی رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی معارف کی ان دو قسموں کو ختم کر کے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے۔ اسلام نے جہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف و میلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جائے۔

یہی "ریا رالناس" والا قانون ہے۔ عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا مگر کیا کیجئے کہ انسان میں دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں۔ اسی جذبہ کی رعایت ہے جس کا سراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دولت مندوں کو پھٹے کپڑوں اور بُرے حال میں دیکھ کر فرمایا کہ

الک مال (کیا تمہارے پاس مال ہے؟)

جواب میں کہا گیا۔

نعم (ہاں)

آپؐ نے فرمایا۔

من ای المال (کس قسم کے اموال تمہارے پاس ہیں)

جواب ملا۔

من کل المال! (ہر قسم کا مال!) مثلاً اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سبھی کچھ ہیں! یہ اس شخص نے کہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

فاذا آتاک اللہ مالا فلیر اثر نعمۃ اللہ علیک وکرامتہ (نسائی)

(جب خدا نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور جو تمہیں سرفراز کیا ہے وہ دکھایا جائے۔

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو الناس ہی کو دکھایا جائے گا۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیے۔ اس کا حکم ہے لیکن بُرائی کی تصحیح کے لئے احتساب کا

ایک پہلو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت و نعمت کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمائش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور ریاء الناس بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا۔ اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا۔ اسی نقطۂ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔ کہ :-

| | |
|---|---|
| ان اللہ یحب ان یریٰ اثر | اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی |
| نعمتہ علیٰ عبدہ ! | نعمت کے نشانات کو اپنے بندے |
| (ترمذی) | پر دیکھیں ! |

گویا "الناس" کو یہ دکھانا، الناس کو دکھانا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے کہ وہی اس کو پسند فرماتا ہے۔ کہ جن پر اپنی نعمتیں نازل کروں وہ دوسروں کو یہ دکھائیں کہ ہمارے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہی انما الاعمال بالنیات کے قانون سے ریاء الناس جیسا لغو بلکہ شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے۔ اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور اندر سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ یوم تبلی السرائر[1] ہی کے دن ہوگا۔ کہ اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ جس کے ذریعہ سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

**خیرات اور صدقات** | بہرحال دولت کے مصارف میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہی ہے کہ اس نے دینی و دنیوی دو قسم کے مصارف کا باب حذف کر دیا ہے۔ اور اب باب صرف دنیوی مصرف دولت کا رہ گیا ہے۔ یا مَصرفِ دینی اور "صدقہ" کی وسعتِ دامانی کا حال جب یہ ہے کہ ناجائز مصارف سے بچا کر جائز مصارف میں خرچ کرنا بھی اسلام میں خیرات اور صدقہ کی مدمیں داخل ہو کر دینی خرچ نہ بن جاتا ہو۔ البتہ ان دینی مصارف میں پھر اسلام نے ایک ترتیب قائم کی ہے۔

سب سے پہلا حق تو آدمی کا خود اپنا ہے۔ اور اس لئے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا

---

[1] جس دن دلوں کے بھید نمایاں کئے جائیں گے ۱۲

دیا ہے کہ کوئی اپنے کو قتل کر دے یا اپنے کسی عضو کو ضائع کرے یا بگاڑ دے حتیٰ کہ اسلامی قانون کی رُو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا پینا اس حد تک چھوڑ بیٹھے کہ اس کی جان باقی نہ رہے یا اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے۔ زیلعی میں ہے۔

| | |
|---|---|
| ھلاک النفس او العضو | جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی |
| بالامتناع عن المباح | جان ضائع کرنی یا کسی عضو کو نقصان |
| حرام (شامی ص ۲۲۲ ج ۵) | پہنچانا حرام ہے! |

بہر حال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے۔

| | |
|---|---|
| اذا کان احدکم فقیرا | تم میں جو کوئی نادار مفلس ہو تو چاہیے کہ |
| فلیبدأ بنفسہ (مغنی ص ۲۵۰) | خرچ کی ابتدا خود اپنی ذات سے کرے |

دوسری حدیث ہے۔

| | |
|---|---|
| ابدأ بنفسک ثم بمن تعول | پہلے اپنی ذات سے شروع کرو پھر ان پر |
| (المغنی) | جو تمہارے زیر پرورش ہیں! |

ابو داؤد میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میرے پاس ایک اشرفی ہے، کیا کروں؟ پہلا جواب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ

| | |
|---|---|
| تصدق بہ علی نفسک | اپنی ذات پر اسے خیرات کرو یعنی خرچ کرو |

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے۔

مشہور حدیث ہے۔

| | |
|---|---|
| وابدء بمن تعول | شروع کرو خرچ کرنا ان لوگوں سے جو |
| (صحاح ستہ) | تمہارے زیر پرورش ہیں! |

فقہاء نے اس سلسلہ میں بیوی بچے اور ان کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے۔ جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

ان لوگوں کے بعد پھر ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو فقیر ہوں۔ ابن

قدامہ لکھتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| اجمع اھل العلم علی | علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے |
| ان نفقۃ الوالدین الفقیرین | نادار والدین جن کی نہ کمائی ہو اور نہ |
| الذین لا کسب لھما ولا | ان کے پاس مال ہو، ان کا خرچ اولاد |
| مال واجبۃ فی مال الولد | کے مال پر واجب ہے! |

والدین کے مصارف قانونی طور پر تو اسی وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں. یعنی حکومت مجبور کر کے لڑکے کے مال سے والدین کے مصارف کی بجا آوری کرے گی۔ لیکن غیر قانونی طور پر، یعنی حکومت جبر تو نہیں کر سکتی۔ لیکن اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے۔ خصوصاً اس سلسلہ میں ماں کے حقوق کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی اہمیت دی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ حسن سلوک کروں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

| | |
|---|---|
| امک! امک! امک! | ماں کے ساتھ! ماں کے ساتھ! ماں کے |
| ثم الاقرب فالاقرب | ساتھ! پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو اور |
| (ابوداؤد) | جو اس کے بعد! |

پھر آپ نے خود ہی تشریح بھی فرمائی :-

| | |
|---|---|
| امک واباک واختک | ماں کو دو باپ کو، بہن کو، بھائی کو |
| واخاک، ادناک فادناک | قریبی رشتہ دار کو، پھر جو ان کے |
| (صحاح) | بعد قریب ہوں! |

رشتہ داروں کو، غیروں پر اسلام نے کیوں ترجیح دی؟ اس کی وجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر بیان فرمائی کہ ایسی صورت میں :-

| | |
|---|---|
| لہ اجران اجر القرابۃ | دینے والے کو دو ثواب حاصل |
| واجر الصدقۃ! | ہوتے ہیں، رشتہ داری کا ثواب، |
| (بخاری ومسلم) | اور صدقہ کا ثواب! |

الغرض یوں ہی درجہ بدرجہ مصارف کا استحقاق آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ

اس میں بھی اسلام نے انسان کی فطرت کے ایک خاص میلان کا لحاظ رکھا ہے۔ یوں تو لوگ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ لیکن مختلف تعلقات اور موانسات کے تحت آدمی کا میلان زیادہ تر اپنے رشتہ داروں ہی کی طرف ہوتا ہے۔ مگر خدا جانے دنیا والوں نے یہ کیسے سمجھ رکھا تھا کہ اپنوں پر خرچ کرنا تو خودغرضی ہوئی اور خودغرضی کے بعد نیکی کہاں؟

اسلام نے صلۂ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا تھا نقطۂ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات وصدقات میں شریک کر دیا۔ اور یہ ایک ایسا نظم ہے کہ ہر شخص بآسانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کی ان اسلامی ذمہ داریوں کا احساس اگر کرنے لگیں، تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔

بہرکیف یہ تو صرف دولت کی ایک تنظیمی ترتیب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض مصارف، تو فرض ہیں۔ جیسے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے مصارف، جب وہ فقیر ہوں۔ ازیں قبیل بھائی بہن وغیرہ، بلکہ دور کے رشتہ داروں کے مصارف بھی بعض حالات میں آدمی پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر نصاب کا آدمی مالک ہو تو پھر اسلام نے ہر شخص کے مال میں فقراء و غرباء، غارمین، مقروضین وغیرہ کا جو حق قائم کیا ہے جس کی تفصیل حکومت کی آمدنی میں گذر چکی ہے۔ ان مصارف کا شمار بھی فرائض میں ہے۔ فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسلام نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنے مال سے اور بھی خرچ کر سکتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک خرچ کر سکتا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے آدمی کو اس معاملہ میں بہت دور تک آزادی دے رکھی ہے، بلکہ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر کر کے۔

| | |
|---|---|
| لینفق ذو سعة من سعته | وسعت (گنجائش والوں کو چاہیے کہ اپنی |
| ومن قدر علیه رزقه | گنجائش کے لحاظ سے خرچ کریں اور جس کی |
| فلینفق مما آتاه الله! | روزی نپی تلی کر دی گئی ہے چاہئے کہ جو کچھ |
| | اسے خدا نے دے رکھا ہے اسی سے وہ خرچ کرے۔ |

گویا اس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اپنے مصارف کے مدارج آمدنی کی حیثیت سے رکھنی چاہئے۔ یہی بات ہے جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا اگر نعمت

کسی پر ہو تو چاہیے کہ نعمت کے اثر کو اپنے اوپر دکھائے (جیسا کہ گذر چکا)، لیکن کیا اس سلسلہ میں اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سارے مال ومنال، زمین وجائداد کو کھا پی کر برابر کر دے گذشتہ ابواب میں اس حدیث کے ایک ٹکڑے کا ذکر آچکا ہے۔ جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی جانب سے مُنہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی۔ بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رُخی برتتے تھے۔ تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گذر گیا۔ تب بجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ راوی کا بیان ہے کہ

لو اصابتہ لاوجعتہ او لعقرتہ ! — اگر اس پر پڑ جاتا تو اسے دُکھ پہنچتا یا زخمی ہو جاتا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے وہ مشہور فقرہ استعمال فرمایا۔

خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی — سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو!

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے، کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور در اصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔

میں اپنی اس بحث کو اسی مسئلہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا

ماذا ینفقون — کتنا خرچ کریں مسلمان؟

کا سوال پوچھا گیا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

قل العفو — کہہ کہ "العفو"

یعنی "عفو" خرچ کریں۔ یہ "عفو" کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا — پہلے

دوسری آیتوں کو بھی نقل کر لوں۔ سورۂ اسرائیل میں ارشاد ہے۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا

اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں مت ڈالو اور نہ اس کو اتنا کھولو کہ بالکل کھل جائے (کیونکہ اگر ایسا کرو گے) تو بیٹھ جاؤ گے اس حال میں کہ لوگوں کی ملامت کا نشانہ بنے ہوئے ہو اور درماندہ ہو

پھر سورۂ "الفرقان" میں ہے :-

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما ۔

جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے ہیں اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ برتاؤ خرچ ان کا درمیان ان دونوں راہوں کے اعتدال کے ساتھ ۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ "العفو" کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو با سانی ہو سکے۔ اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں "اعتدال" کی فہمائش کی گئی ہے۔ امام رازی اور ان کے سوا بھی عموماً العفو کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق :-

فیما یفضل من حاجۃ الانسان فی نفسہ وعیالہ

آدمی کی ذات اور اہل وعیال کی ضرورت سے جو بچ جائے !

یعنی اپنے اور اپنے اہل وعیال و زیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کر دو۔

مگر ابھی حدیث گزر چکی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ سونے کے ٹکڑے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ :-

خیر الصدقۃ ما کان عن ظہر غنی (البخاری)

بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو !

مشہور شارح حدیث امام خطابی "ظہر غنی" کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں :-

ای عن غنی یعتمد علیہ ویستظہر بہ علی النوائب

ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر

الّتی تنوبہ؛ — سکتا ہو، اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو!

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں:-

خیر الصدقۃ ما ابقت غنی! — بہترین صدقہ وہ ہے، جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے!

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ "صدقہ" یا "انفاق" یا "صرف" کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے، کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ یستظہر بہ (یعنی جس سے پشت پناہی حاصل کر سکے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

ماسوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے، کہ آدمی کل البسط کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں جا کر ذلیل ورسوا، تھکا ماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے۔ حدیث میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی گذر چکی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل مال کے صدقہ سے یہ کہتے ہوئے منع فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے؟

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں کا ذریعۂ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی، یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت ومزدوری نوکری کر کے زندگی گذارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ اگر روز جو کچھ کمائے خرچ کر دے تو دوسرے دن یا دوسرے مہینہ اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے۔ اس لئے اس کو تو شاید کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ لیکن اول الذکر طبقہ اگر العفو کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا گیا ہے، اپنی پونجی، یا زمین ومکان، باغ کو بھی ختم کر دے، کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد اس کا یہ سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے۔ تو کیا اس کو دوسرے دن ملوم ومحسور ہو کر اسے بیٹھنا نہ پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے "العفو" کا مطلب وہی ہے، جو واحدی سے امام رازی نے نقل کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اصل العفو فی اللغۃ | "العفو" کے معنی لغت میں زیادتی |
| الزیادۃ قال اللہ تعالیٰ | کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں |
| خذ العفو ای الزیادۃ | سے "العفو" یعنی زیادتی، نیز ارشاد باری |
| قال ایضاً حتی عفو | ہے حتی عفوا یعنی اس قوم کے لوگ |
| ای کثروا۔ | جب بڑھ گئے اور بہت ہو گئے! |

مطلب یہ ہے کہ گذشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گذر بسر کسی "سرمایہ"۔ یا "جائداد"۔ "زمین"۔ "مکان" وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہئے جو شغل اصل کے منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ "العفو" یا (الزیادۃ) کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں۔ کہ ان کا یہی خرچ عن ظہر غنی ہو سکتا ہے۔

مشہور امام لغت الفراء سے منقول ہے کہ:-

| | |
|---|---|
| قولہ تعالیٰ قل العفو | اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو |
| وھو فضل المال! | ہے اس سے مراد المال (سرمایہ) کا |
| (لسان العرب) | فضل یا بڑھوتری ہے! |

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "العفو" مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| لا اعفی قتل بعد | دیت (خون بہا) لینے کے بعد |
| اخذ الدیۃ | لینے والوں نے عفو نہ کیا! |

پھر "اعفی" کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ای لا کثر مالہ ولا | یعنی اس کا مال نہ بڑھے اور نہ |
| استغنی | وہ خوشحال ہو! |

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سرمایہ" کی آمدنی یا "اصل" کے منافع کو "العفو" کہتے ہیں

پس اس قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں اداے فرائض کے بعد عام مصارف انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ حتی الوسع اصل کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

| | |
|---|---|
| لا یبارک فی ثمن ارض | نہ برکت دے اللہ اس زمین اور اس |
| ولا دار لا یجعل فی ارض | گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی یا گھر ہی |
| ولا دار۔ (مسند احمد) | میں نہ لگا دی جائے۔ |

ابنِ ماجہ کے الفاظ یہ ہیں:-

| | |
|---|---|
| من باع دارا او عقارا | جو شخص کوئی گھر یا جائداد فروخت کرے |
| فلم یجعل ثمنه فی | اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنی گھر یا جائداد |
| مثله کان قمنا ان | کے خریدنے میں نہ لگا دے تو وہ اس کا مستحق |
| لا یبارک فیه۔ | ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے۔ |

یحیٰی ابن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب "الخراج" میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

| | |
|---|---|
| لا یبارک فی ثمن ارض | نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی |
| او دار الا ان یجعل فی | قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین |
| ارض او دار | یا گھر ہی میں لگا دیا جائے۔ |

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو "اصل" کی حیثیت سے کام کرتی ہیں، اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہئے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیلِ مقام یا اور کسی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے بھی تو چاہئے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو "اصل" کا کام دے سکیں۔

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے تھا جن کے مال میں "الاصل" اور "العفو" کی صورت بھی پیدا ہو سکے۔ باقی جن کی گذر اوقات کسی "اصل" کی آمدنی پر نہیں ہے۔ مثلاً ملازم پیشہ لوگ یا جو مزدوری وغیرہ کرتے ہیں۔ ان کو اپنے مصارف میں کس قانون کی پابندی کرنا چاہئے اسی کا جواب سورۂ "بنی اسرائیل" کی آیت:-

لا تجعل یدک الی — نہ ڈال و اپنے ہاتھ کو اپنی گردن اور
عنقک ولا تبسطھا — نہ کھولو اس کو پورے طور پر کھول
کل البسط ! — دینا !

اور سورۃ "الفرقان" کی آیت :۔

الذین اذا انفقوا لم — جو لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں، تو
یسرفوا ولم یقتروا — نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں
وکان بین ذالک قواما — اور ہوتی ہے سداہ ان کی ان کے درمیان
"قوام"

"قواما" کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنی قاف کے زبر کی صورت میں اس کا ترجمہ "وسطاً عدلاً" (بیچ اور معتدل)، کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لاستقامۃ الطرفین — چونکہ دونوں پہلو اس میں برابر ہوتے ہیں!

اور "قوام" قاف کے زیر سے اس کا ترجمہ :۔

مایقام بہ الحاجۃ — جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور
لا یفضل عنھا ! — قدر حاجت سے زائد ہے!

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر شخص کے یہ اختیار و تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے، نہ روکتے ہیں، نہ خرچ کرتے ہیں۔ اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی "اصل" نہیں ہے۔ بجز ان کے اختیار و تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے۔ اور یہی کیا گیا ہے۔

---

**تمام شد**

(مطبوعہ "انٹرنیشنل پریس" میکلوڈ روڈ کراچی)

# اُفق لائبریری کا پہلا سیٹ

| | | |
|---|---|---|
| سوداگر | رئیس احمد جعفری | ۳٫۰۰ |
| صلاح الدین ایوبی | رئیس احمد جعفری | ۳٫۷۵ |
| طوفان | رئیس احمد جعفری | ۳٫۰۰ |
| تسنیم | قیسی رامپوری | ۳٫۷۵ |
| سلمیٰ | قیسی رامپوری | ۳٫۰۰ |
| دردِ محبت | مجاہد لکھنوی | ۳٫۵۰ |
| ازدواجی الجھنیں | ڈاکٹر جی ایم فاز | ۳٫۰۰ |
| جینے کا فن | عابدی جعفر | ۳٫۰۰ |
| تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات | عبداللہ عنان | ۳٫۰۰ |
| اَلوری | عذرا جمال | ۳٫۲۵ |

شیخ شوکت علی اینڈ سنز بندر روڈ کراچی